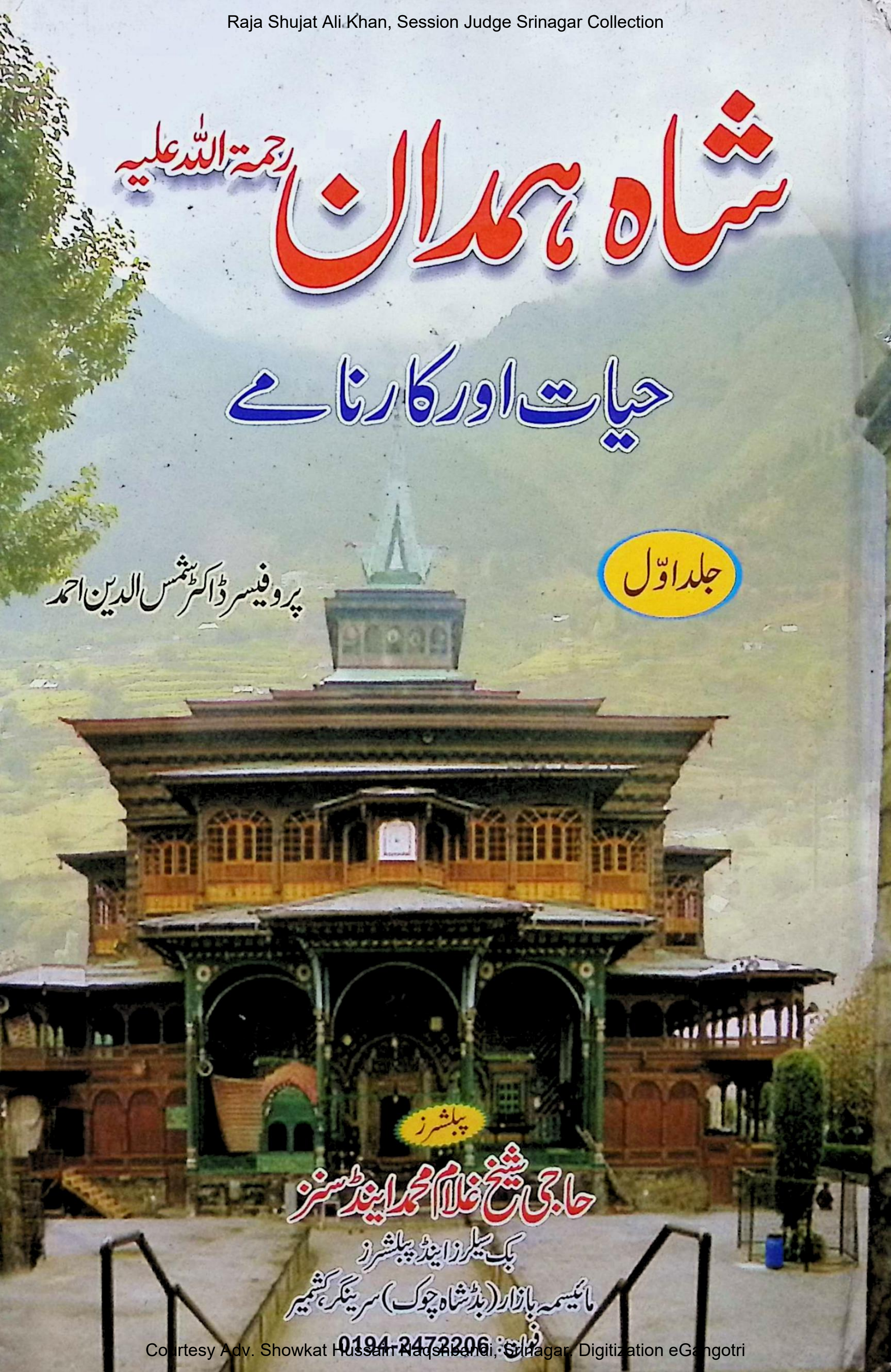

شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ

حیات اور کارنامے

جلد اوّل

پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد

پبلشرز
حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز
بک سیلرز اینڈ پبلشرز
مائیسمہ بازار (بڈشاہ چوک) سرینگر، کشمیر
فون: 0194-2472206

شاہ ہمدان رحمتہ اللہ علیہ

حیات اور کارنامے

جلد اوّل

پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد

پبلیشرز
حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز بک سیلرز
مائیسمہ بازار (بڈ شاہ چوک) سرینگر، کشمیر

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : شاہ ہمدانؒ
حیات اور کارنامے
مصنف : پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد
سن اشاعت : پہلی بار ۱۹۹۵ء
دوسری بار ۲۰۱۰ء
قیمت : ۷۵۰ مکمل دو حصے
ناشر : حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز
مائیسمہ بازار (بڈشاہ چوک) سرینگر، کشمیر
فون: 0194-2472206

عرضِ ناشر

ریاست جموں و کشمیر کے کُتب فروشوں میں اوّلین نام مرحوم شیخ عبدالغفار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مرحوم نے پہلی بار آزادی ملک سے پہلے اپنی فرم وادی کے علاقہ چھتہ بل سرینگر میں قائم کر کے تشنگانِ علم کیلئے چشمہ درصحرا کا کام انجام دیا۔ پہلی بار اورادفتحیہ کو لاہور سے چھاپ کر ریاست کے مسلمانوں کیلئے راحت کا سامان بہم پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُن کے فرزند مرحوم حاجی شیخ غلام محمد صاحب نے تجارتی مرکز مہاراج گنج میں میسرز شیخ غلام محمد تاجرانِ کتب کے نام سے اس فرم کی ازسرِ نو بنیاد ڈالی۔ مرحوم حاجی صاحب نے کئی نادر اور نایاب کتابوں کو حاصل کر کے تشنگانِ علوم کیلئے مہیا کر کے اور ہندوستان و پاکستان کے علاوہ عرب ممالک سے کتابیں لا کر ریاست کے لوگوں کو بہم پہنچائیں۔ مہاراج گنج میں کام کی وسعت اور جگہ کی تنگی کے باعث اُنہوں نے سرینگر کے مشہور مرکزی علاقہ مائسیمہ بازار بڈشاہ چوک میں اپنی دُکان ''حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز'' کے نام سے شروع کی۔ جہاں اُنہوں نے کُتب تفسیر، کُتب حدیث، کُتب تاریخ، کُتب سیرت وغیرہ کے علاوہ مرّوجہ تعلیمی نصاب کی کتابیں بیرون ریاست سے منگا کر مہیّا رکھی۔ ریاست کے کئی ادبی، تعلیمی، ثقافتی مراکز کیلئے ان کتابوں کو ہمیشہ وافر اسٹاک کر کے اداروں سے وابستہ دانشوروں محققوں، طالب علموں کیلئے راحت جان کا سامان کیا۔

حاجی صاحب خود بھی علمی ذوق کے حامل انسان تھے۔ اُنہوں نے خود بھی کئی کتابیں مرتّب کر کے شائع کیں۔ اور ریاست کے ادبی اور علمی شخصیتوں کو ایک پلیٹ فارم عطا کر کے اُن کی لکھی ہوئی کتابیں چھاپ کر ریاست اور بیرون ریاست اُن کو متعارف کرایا۔ مرحوم نے ہمیشہ معیّار کو پیش نظر رکھا۔

مرحوم حاجی صاحب کی دِلی تمنا و خواہش تھی کہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدان ؒ کے مفصل حالات و کوائف کو ایک دینی فریضہ جان کر کتابی صورت میں چھاپ کر قارئین تک پہنچا سکیں۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے ریاست کے معروف قلم کار اور مصنف جناب پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد صاحب کو اس جانب متوجہ کیا اور کتاب چھاپنے کا وعدہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرحوم کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ''شاہ ہمدان ؒ حیات اور کارنامے'' لکھ کر پیش کی۔ جس پر مرحوم حاجی صاحب نے زرِ کثیر خرچ کر کے آفسٹ پریس پر چھاپ کر ۱۹۹۵ء میں پہلی مرتبہ شائع کی۔

مارکیٹ میں کتاب کے آتے ہی اس کو زبردست پذیرائی ملی اور مختصر مدت میں کتاب کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قارئین کرام کے زبردست اسرار و تقاضے اور مرحوم حاجی صاحب کی دِلی خواہش اور حضرت شاہ ہمدان ؒ سے عقیدت کے پیش نظر ہم اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

اس ایڈیشن کو پہلے ایڈیشن سے ذرا مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ایک ہی جلد میں تھا جبکہ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں کتابت کی کچھ خامیاں تھی جو اس ایڈیشن میں دُور کی گئی ہیں۔ اس ایڈیشن کو اعلیٰ آفسٹ پرنٹنگ اور معیاری کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔

اُمید ہے کہ اس کتاب کو پہلے سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوگی (انشاء اللہ)۔ قارئین کو اگر کوئی خامی یا کمی نظر آئیں تو ہمیں مطلع فرما کر مشکور فرمائیگے۔

والسّلام

شیخ محمد فیاض
مالک میسرز حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز

کتاب کے بارے میں

کشمیری مسلمانوں کے محسنِ اعظم حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی شاہ ہمدانؒ کے حیات مقدّس کے حالات، علمی و دینی کمالات، دینی خدمات، عالم اسلام میں ان کے سفروں، تبلیغِ دین حق کی راہ میں ان کے علمی اقدامات، مشقّتوں کی تفصیل پر مشتمل مفصّل تحقیقی کتاب۔

مصنّف نے کتاب ھذا کو ایران، روس، وسط ایشیاء بالخصوص دوشنبہ، سمرقند، تاشقند، بدخشان، ماوراء النہر، حصار، ختلان وغیرہ کے علمی و ادبی اور تحقیقی اداروں اور دانشگاہوں میں موجود مختلف کُتب اور بعض منتخب دانشوروں، محققوں اور استادوں سے استفادہ کر کے حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں وسیع تر اطلاعات یکجا پہنچا کر ایک کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔

دانشوروں، محققوں، اساتذہ، طالب علموں، عام قارئین کے علاوہ مسلمانوں کے لئے بالعموم اور کشمیری مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک نادر تحفہ۔

شاہ ہمدانؒ

حیات اور کارنامے

فہرست مطالب

انتساب ۵
گذارش احوال ۷

۱۔ پہلا باب

بچپن۔ ظاہری اور معنوی تعلیم و تربیت اور خارجی ممالک میں سفر ۱۵

۲۔ دوسرا باب

کشمیر میں ورود۔ تبلیغِ دین ۱۸۷

۳۔ تیسرا باب

ایرانی اور وسطِ ایشیائی اثرات ۲۰۵

۴۔ چوتھا باب

شاہ ہمدانؒ، غنی کشمیریؒ اور علاّمہ اقبالؒ ۳۵۳

۵۔ پانچواں باب

علم و عرفان اور تعلیمات ۳۸۷

۶۔ چھٹا باب
تصنیفات و تالیفات ۴۵۱

۷۔ ساتواں باب
کاروانیانِ قافلۂ نور ۶۶۹

۸۔ آٹھواں باب
واقعہ ذائقۃ الموت ۷۴۹

۹۔ نواں باب
خانقاہِ مُعلّیٰ ۸۸۲

فہرستِ منابع و مآخذ ۹۳۸

انتسابِ کتاب!

۱۔ اپنے جواں سال فرزند شہید نثار احمد جانؒ کے نام جس نے حضرت احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قرآن مجید کی اہانت کیے جانے کے خلاف ایمانی غیرت و حمیّت کا مظاہرہ کر کے سال ۱۹۶۷ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی جان نثار کر دی [1]

۲۔ اپنی درویش صفت والدۂ مرحومہ مغفورہ کے نام جن کی نیک دُعاؤں کی برکت سے زندگی میں ہمیں خوش حالی نصیب ہوئی۔

۳۔ اپنے والد بزرگوار کے نام جن کی راہنمائی میں دین و دنیا سے شناسائی حاصل ہوئی۔

۴۔ اپنی وفا شعار رفیقۂ حیات کے نام جو زندگی کے نشیب و فراز میں خلوص کے ساتھ میرے سفر میں شریک رہی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد

جان منزل
۱۷۲۔ بال گارڈن۔ سری نگر کشمیر

---

[1] سال ۱۹۶۷ء کے اکتوبر ماہ کی تین کو جب دشمنانِ اسلام نے سرینگر میں قرآن مجید کی ناقابلِ برداشت توہین و اہانت کی تو مسلمانوں نے اس ذلیل ترین اقدام کے خلاف اپنی دینی غیرت کا مظاہرہ کیا۔ میرے اٹھارہ برس کے جواں سال فرزند جسے ایک ہفتہ بعد میڈیکل کالج سرینگر میں داخل ہونا تھا، کو ایک مقامی مسلمان دشمن پولیس ڈی، آئی، جی کے ایما پر لال چوک (جسے اب شہید چوک کہتے ہیں) میں پُر حرارت و ایمان مظاہرہ کرنے اور قرآن مجید کا نام بار بار لینے پر شہید کر دیا گیا۔ ہزاروں سوگوار فرزندانِ اسلام شہید فرزند نثار احمد جان رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے میں شریک تھے۔ شہیدِ موصوفؒ، جو سید حسن بلادرومیؒ، رازے کدل سرینگر کے قبرستان میں آسودہ ہیں کی قبر پر فارسی شعراء کے اصرار پر یہ اشعار کندہ ہیں: جواں مرد و جواں بخت و جواں سال ؛ نثار احمد شدہ رخصت ز دنیا ز خونش کرد قرآن را حفاظت ؛ خدایا! حافظش قرآن بادا ؛ اور گویا خود شہید نثار احمد جانؒ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے ان کے ذاتی احساسات کو اس شعر کی صورت میں مجسّم کیا گیا ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ؛ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم،

سیّدُ السّادات سالارِ عجمؒ   دستِ اُو معمارِ تقدیرِ اُمم
تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت   ذکر و فکر از دُودمانِ او گرفت
سیّدِ آن کشورِ مینُو نظیر   میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطّہ را آن شاہِ دریا آستین   داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مردِ ایرانِ صغیر   با ہُنرہای غریب و دلپذیر
یک نگاہِ او گُشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بہ دل راہی بدہ

(جاوید نامہ حضرت علّامہ اقبالؒ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِؕ

گزارشِ احوال

آج سے دو سال پہلے میں نے حضرت امیرِ کبیر میر سیّد علی ہمدانی شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی شاہ کار فارسی تصنیف ذخیرۃ الملوک کا اس کی دینی و اخلاقی اور علمی اہمیّت کے پیشِ نظر اردو ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا جو عنایتِ ربّانی سے مع تعلیقات و توضیحات کے ذخیرۂ سعادت کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جب میں نے اس عظیم مصنّف کے شرحِ حالات قلمبند کرنے کے سلسلہ میں تعارف نامہ لکھنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ محض چند اوراق تحریر کرنے سے شاہ ہمدانؒ جیسے عالمِ دین، مبلّغِ اسلام، عارفِ کامل، ولیٔ اکمل اور مجاہدِ کم نظیر کا تسلّی بخش حد تک تعارف نہیں ہو سکتا اور بالخصوص آپؒ نے دینِ اسلام کے نور کو پھیلانے اور وسعت دینے میں جو جہاد کشمیر کی سرزمین میں تیر و کمان اور شمشیر و خنجر کے بغیر کیا اور پھر شرعی قوانین کو عام کرنے، اور ان کی درس و تدریس کے سلسلے میں نیز عرفانِ الٰہی اور راہِ سلوک سے مربوط جو مدرسے اور روحانی حلقے قائم کیے اور ساری وادی میں بیک وقت اپنے ہمراہ مجاہد مبلّغین اور ساداتِ کرام کی مساعی سے ملکوتی فضا بکھیر دی، اس کی حتّی المقدور اطلاعات عام مسلمانوں اور خاص کر کشمیر کے مسلمانوں تک محض چند سطور لکھنے سے بہم نہیں پہنچائی جا سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ ڈالی جس کے لکھنے کا مجھے اوّل میں وہم و گمان تک نہ تھا۔ لیکن اس میں فضل و رضائے ربّانی شامل تھا اور بالمشافہ و مشاہدہ حضرت شاہِ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی بشارت و

خوشنودی بھی، اِس لیے کتاب مکمّل ہوگئی۔[۱]

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی عالی مرتبت شخصیت کا، ان کے ایک ولی اللہ، درویش، زاہد، متّقی، عابد، پرہیزگار، عارفِ رفیع مکان، صوفی، مجاہدِ دین، مُعلّمِ دین، مُصلحِ دین، جہاں بین، سیاستمدار، نثر نگار، شاعر، اور ادیب کی حیثیت سے احاطہ کرنا دُشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ اِن صفات میں اُن کے مراتب کو متعیّن کرنا مجھ جیسے

---

[۱] یہ کتاب لکھنے کے دوران نیز ذخیرۃ الملوک کا اُردو ترجمہ (مع توضیحات و تعلیقات) کرنے کی مدّت میں مجھے رُؤیا میں تین بار حضرت شاہ ہمدانؒ امیرکبیر حضرت علی ثانی میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دیدار مبارک سے شرفِ سعادت بخشا۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر یہ فضل و کرم تھا اور خود حضرت شاہ ہمدانؒ کی زکوٰۃ تھی۔ سال ۱۹۸۸ء کے ستمبر ماہ میں کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر نیز یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین کی حیثیت سے میں نے حضرت شاہ ہمدانؒ پر اوّلین بین الاقوامی سمینار کیا جو پانچ دن تک رہا۔ اُس میں ایران، افغانستان، اور روس کے محقّقین بھی شامل تھے۔ مقامی شرکاء میں سے میرے عزیز دوست اور معروف سخن شناس، ادب دوست اور مشہور صحافی خواجہ محمد امین بچھ نے، سمینار کے دوسرے دن عالمِ رؤیا میں جو مشاہدہ کیا وہ اُنھوں نے مجھے کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر لکھ کے بھیج دیا جسے میں حرف بہ حرف یہاں پر نقل کر رہا ہوں: "عالمِ رؤیا۔ جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی قدس سرّہ را در خواب دیدم گفتند، مرا از فرزندِ معنوی خود شمس الدّین احمد ہمین گمان بود۔ بسیار خوشنود گشتیم۔ در حضرت ایزد تعالیٰ دُعا کردیم کہ نسبت انعقاد مجلس شاہ ہمدان مرشدِ خطّۂ مینو نظیر در دانشگاہ مساعی این عزیز بارآور، مشکور و قبول شوند۔ ہنگام فجر ۲۸ر۹ر۱۹۸۸، محمد امین بچھ۔"

[ترجمہ: "عالم خواب! جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی قُدس سرّہٗ کو میں نے خواب میں دیکھا، انھوں نے فرمایا کہ مجھے اپنے معنوی بیٹے شمس الدّین احمد سے یہی امیّد تھی۔ ہم بہت خوش ہوئے اور ہم نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ خطّۂ مینو نظیر (کشمیر) کے مرشد حضرت شاہ ہمدان کی مجلس کے انعقاد سے مربُوط اِس عزیز کی کوششیں مشکور اور بارآور، اور قبول ہوں۔

صبح صادق کا وقت؛ تاریخ ۲۸ر۹ر۱۹۸۸ء، محمد امین بچھ]

معمولی آدمی کی سطحی بصارت سے بہت دُور ہے، حقیقتاً اس کے لیے معنوی دُنیا کا صاحب دل اور صاحبِ بصیرت عارفِ حق آگاہ چاہیئے جو ہمیں حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے صَحیح مرتبہ ومکان ومقام سے آگاہ کر سکتا ہے۔ پس میں نے اس کتاب میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ دراصل اُس بے انتہا عقیدت وارادت کا ایک ذریعۂ اظہار بھی ہے جو مجھے اُن کی ذاتِ گرامی سے ہے اور کشمیر کے تمام مسلمانوں کو بھی ہے۔

اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ کشمیری مسلمانوں کے اِس محسنِ اعظم کے بارے میں آج بھی جبکہ آپ کی آسمانی اور رُوحانی ماموریت کو چھ سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، عام مسلمانانِ کشمیر ان کی حیاتِ مقدّس کے حالات، ان کے علمی کمالات، دینی کمالات، دینی خدمات، ہمراہ مبلغینِ مجاہد اور ساداتِ کبار، اور عالمِ اسلام میں ان کے سفروں، تبلیغِ دینِ حق کی راہ میں ان کے عملی اقدامات اور حق وراستی کے سفر میں ان کی آزمائشوں، امتحانوں اور مصائب ومشقّتوں کی تفصیل سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ پر یا ان کے کسی ایک بھی پہلو پر تحقیق وتفصیل سے کچھ نہیں لکھا گیا ہے اور اگر کچھ لکھا بھی گیا ہوگا تو وہ اطلاع ہم تک نہیں پہنچی اور نہ ہی وہ اطلاع یا اطّلاعات کشمیر میں نہ منظرِ عام پر ہیں اور نہ ہی کشادگی کے ساتھ دستیاب۔ اس لیے حضرت شاہ ھمدانؒ پر کشمیری پس منظر میں اُن کے کارناموں پر شامل قدرے تفصیل کے ساتھ کتابی صورت میں اطّلاعات کی فراہمی ایک اہم ضرورت تھی۔

میری دانست میں ابھی تک کسی کشمیری مؤلّف یا مصنّف وادیب کے قلم سے حضرت شاہ ہمدانؒ کی حیاتِ طیبّہ اور ان کی سرگرم وعملی زندگی اور کارناموں کے بارے میں کوئی مفصّل یا مجمل کتاب نہیں گذری، حالانکہ ایسا اقدام مستحسن اور دُنیائے اسلام کے اس خِطّۂ زمین کے مسلمانوں پر ایک قرض اور فرض تھا۔ کسی حد تک اسی قرض اور فرض کی ادائیگی کے پیشِ نظر یہ کتاب لکھی گئی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی دینِ اسلام کی عمومی خدمات؛ اور اُن کی ہمہ جہت شخصیت اور بالخصوص کشمیر میں اُن کی تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں عام مسلمانانِ عالم بے خبر ہیں۔

ایران میں بعض معدودے چند دانشوروں اور اُستادوں کے بغیر، جنہوں نے گاہ بہ گاہ اپنے علمی مقالات یا تصانیف میں حضرت شاہ ہمدانؒ کا ایک دو جملوں میں مختصر سا ذکر کیا ہے، حضرت شاہ ہمدانؒ وسیع طور پر متعارف نہیں، حالانکہ ایران اُن کا وطن ہے۔ اس لیے یہ کتاب اس نیّت سے بھی لکھی گئی کہ شاہ ہمدانؒ کا عمومی تعارف ہو اور آئندہ کشمیر کے دانشور، محقّق اور اساتذہ اپنی علمی کاوشوں اور جستجوؤں کی راہ سے حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں وسیع تر اطّلاعات بہم پہنچائیں۔

میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایران میں صرف کیا۔ ایک کشمیری فارسی شاعر محمّد رضا مشتاق پر میں نے تحقیقی کام دانشگاہِ تہران میں تین سال میں مکمّل کر لیا اور اس عرصہ میں، میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں بھی مختلف کتاب خانوں اور تہران کے بعض منتخب دانشوروں، محقّقوں اور استادوں سے، جن سے اکثر میری علمی صحبتیں رہتی تھیں، حتیّ المقدور اطّلاعات فراہم کرتا رہا۔ ڈی لِٹ کی ڈگری پا کر میں کشمیر لوٹ آیا اور پھر اگلے سال سے کشمیر یونیورسٹی کے اُستاذ ادبیاتِ فارسی کی حیثیت سے پیہم بارہ سال تک یعنی سال ۱۹۷۸ء تک حکومتِ ایران ہر سال تین ماہ کے عرصے کے لیے ایران کی مختلف دانشگاہوں میں فارسی ادب کے بارے میں تقاریر اور تحقیقی کام کے سلسلے میں مجھے مدعو کرتی رہی۔ تحقیق کے بارے میں اور ایران اور کشمیر کی باہمی دینی، تمدّنی اور تہذیبی اور ادبی روابط کے چشم دید مطالعہ کے حق میں یہ میرے لیے ایک طلائی دور تھا جس سے میں نے حتی الامکان فیض پایا۔ اسی عرصہ میں میں نے ایران کے مشہور کتاب خانوں میں اُن دستیاب آثار کا بھی مطالعہ کیا جو حضرت شاہ ہمدانؒ کی تصنیفات ہیں یا اُن سے منسوب ہیں۔ اگرچہ یہ سارے آثار، جن کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی زائد ہے، مشاہدے میں نہیں آئے اور اکثر "اسمش معلوم جسمش معدوم" کے زمرے میں ہیں لیکن جن کو دیکھا اُن کی تفصیل کا موجودہ کتاب میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

رُوس اور رُوس کے تابع مسلمان نشین وسط ایشیا کی دانشگاہوں اور علمی و ادبی اور تحقیقی اداروں میں فارسی ادب پر تقریریں اور تحقیقی کام انجام دینے کے سلسلے میں

میں حکومتِ روس کا مہمان بھی رہا۔ یہ عرصہ بھی میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش اور فیض رساں تر وقفہ تھا کیونکہ نہ صرف ماسکو اور لینن گراڈ کے علوم شرقی کے تحقیقی اداروں میں تقریریں کرنے کا موقع ملا بلکہ وہاں کے عظیم الشّان کتاب خانوں میں بیٹھکر مطالعہ بھی کیا اور اِن دونوں شہرہائے عجیب کے شرقی علوم کے نامور محققین، دانشوروں اور اساتذہ سے بھی ادبی ملاقاتیں رہیں۔

یورپی روس سے مستفید ہو کر جب میں وسط ایشیا کے رُؤیائی اور طلسماتی خطّۂ ارض پر اُترا تو میں جیسے قرونِ وسطیٰ کی اُس بھیڑ میں شامل ہوا جو عالمِ اسلام میں ابھی تک اپنی روشنیاں بکھیر رہی ہے۔ علم و آگہی اور دانش و بصیرت افروزی کے مراکز ابھی بھی سمرقند و بخارا اور تاشقند و دوشنبہ میں ظاہر و باطن میں پُر رنگ بھی ہیں اور پُر نور بھی۔

وسط ایشیا کے قیام میں میں نے ان تمام علم افروز دانشکدوں میں جا کر حتّی المقدور تحقیقی کام انجام دیا جن میں بالخصوص دوشنبہ اور سمرقند، تاشقند کے کتاب خانے، تحقیقی مراکز اور ادارے و یونیورسٹی دوشنبہ شامل تھے۔ شاہ ہمدانؒ کے جن آثار کو میں نے اس خطّۂ ارض کے کتابخانوں میں دیکھا اور مطالعہ کیا اُن کا اس کتاب میں، میں نے ذکر کر دیا ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ وسط ایشیا میں رہے، خاص کر انھوں نے آخری عمر شریف میں ختلان کو اپنا وطن بنایا تھا لیکن سارے وسطِ ایشیا پر حاوی رہے اور بدخشان، ماوراء النہر، حصار اور موجودہ افغانستان کے شہروں میں آپ کا بہت آنا جانا رہا اور ان ہی علاقوں کے بیشتر مجاہد مبلّغین کشمیر میں آپ کے قافلۂ نور کے ہمراہی تھے۔ اس لیے قیامِ وسطِ ایشیا میں میں تے اُن جگہوں کو بھی جا کر دیکھا جہاں میری دانست میں شاہ ہمدانؒ قیام پذیر رہے، یا اُن جگہوں سے گزرے، اور یا جہاں کے سادات و مبلّغین نے آپ کے ہمراہ دور دراز سفر کر کے کشمیر میں اسلام کی روشنی پھیلائی۔ ان جگہوں میں فرغانہ، بدخشان، خجند، مرو حصار، غجدوان، ختلان، بخارا، تاشقند، سمرقند، دوشنبہ، گلستان، آذربائیجان اور ترکمنستان کا دارالخلافہ عشق آباد شامل ہے۔

ختلان میں، میں نے کولاب جاکر حضرت شاہ ہمدانؒ کے روضۂ مبارک کی زیارت کرنے کی بھی سعادت پائی۔ اس کا تفصیلی ذکر میں نے اِس کتاب میں کیا ہے۔ روضۂ مبارک کے عکس بھی تبرّکاً شامل کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ ؎

تہی دست رفتن سوئے دوستان　　دریغ آمدم زاں ہمہ بوستان

گویا حضرت شاہ ہمدانؒ کے آثار کے مطالعاتی نتائج ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں اور اُن کے روضۂ شریف، نیز تاجکستان کی اطلاعات (جس صوبہ میں کولاب واقع ہے) بھی میرے اپنے مطالعات پر مبنی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ کتاب حضرت شاہ ہمدانؒ کے کارناموں اور اُن کی حیاتِ مبارکہ پر حرفِ آخر نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی ذات اور شخصیت اتنی وسیع الجہات ہے کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے دراصل ایک ایک پہلو پر تدقیق و تحقیق انجام دینے پر محققین کا الگ الگ گروہ ہونا چاہیے، جن کے لیے علمی کاوش و جستجو اور تلاش و تحقیق سے مربوط تمام تسہیلات فراہم ہوں جیسے کہ بالعموم یورپی محققین کے لیے ان سہولتوں کے علاوہ فراخ مالی امداد بھی سرپرستوں کی طرف سے، خواہ وہ حکومت ہو یا شخصی ادارے، مہیا رہتے ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل اور عزیمتِ آغاز میں میرا خالص اپنا ذوق و شوق اور حضرت شاہ ہمدانؒ سے غیر معمولی ارادت و عقیدت ذریعۂ مہمیز رہا ہے اور بس! ورنہ تحقیق کی علمی بُنیادوں پر مبنی اہم اور ناگزیر وسائل کی عدم موجودگی کے سبب جو نقائص اور خامیاں اِس کتاب میں رہ گئی ہوں گی ان کا مجھے احساس ہے، لیکن اس احساس میں میں تنہا نہیں ہوں۔

اُمید بڑی چیز ہے۔ امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں اگر سب کچھ بھلائی میں بدل جائے تو علمی کاوش و تحقیق کی موجودہ تنگنائیاں اور ظلمتیں بھی وسعتوں اور روشنیوں میں بدل جائیں گی۔ خدا کرے ایسا ہوتا کہ ہمارے محققوں اور دانشوروں کی زمین آسمان میں بدل جائے! ورنہ اگر ہمارے ہی نور سے غیر ممالک کے کتاب خانے روشن ہوتے رہے اور خود ہمارے لیے اپنے ہی نور سے منوّر ہونے کی راہیں مسدود رہیں تو پھر دور نہیں کہ

رات کی طرح ہمارے دن بھی سیاہ تر ہو جائیں گے۔

اس لیے حکومت چلانے والے، دردمندانِ قوم ہونے کے علاوہ روشن دماغ، روشن دل، عاقبت اندیش، ذہین، تعلیم یافتہ اور تاریخ شناس ہونے چاہئیں جو علمی سرگرمیوں کو ترجیحی بنیادوں پر قوم میں عام کرنے کے اہل ہوں۔ قوم کے دانشور اور محقّق ہی روشنی کے مینار ہیں جو ماضی پر بھی نور بکھیرتے ہیں اور حال و مستقبل کو بھی دُور دُور تک نُور خیز بناتے ہیں۔ اس طائفہ خاص کی علمی، تمدنی، تہذیبی، ادبی، روایتی، اخلاقی اور دینی تحقیق کے حُسنِ رہ گزر سے ہی ہماری قوم زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر یہ طائفہ خدانخواستہ "صیدِ زبونِ شہریاری" بنا دیا گیا تو ہماری قوم کی داستان تک بھی داستانوں میں نہیں ہوگی۔

مجھے اپنی تحقیقی خامیوں کا احساس ہے۔ لیکن جیسا میں نے کہا اس احساس میں تحقیقی مشکلات میں تنہا نہیں بلکہ کشمیر کا ہر محقّق میرا رفیق ہے، پھر بھی ایک کشمیری فرض شناس مسلمان اور قرضدار عقیدت مند کی طرف سے حضرت شاہ ہمدانؒ کی حیاتِ مقدّس اور ان کے کارناموں سے متعارف ہونے کی پہلی کوشش کے طور پر اور ہدیہ کی حیثیت میں قارئین اسے قبول اور پسند فرمائیں تو یہ ان کی عین کرامت ہوگی۔ قارئین اور محقّقین کے خیال میں اگر کہیں کوئی فاحش خامی یا اشتباہ یا غلطی اس کتاب میں سہواً موجود ہو تو از راہِ کرم مجھے مطلع فرمائیں تاکہ اسے دور کیا جا سکے۔

ہمارا خاندان کبروی سلسلہ سے منسلک ہے اور چونکہ حضرت شاہ ہمدانؒ کشمیر میں بانی مسلمانی ہونے کے علاوہ کبروی سلسلے کے بھی بنیاد گذار ہیں اس لیے ہر کبروی گھر میں اکثر و بیشتر شاہ ہمدانؒ اور اُن کے ہمراہ آئے ہوئے بزرگانِ دین میں سے کسی نہ کسی بزرگ اور ولی کا ذکر ہوتا ہی رہتا ہے۔

شاہ ہمدانؒ کے بارے میں اور ان کے ہمراہ آئے مجاہد مبلّغین کے بارے میں جو حضرات شاہ ہمدانؒ کی اجازت سے دینی فریضہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے مقصد سے کشمیر میں مستقل طور پر سکونت پذیر اور وادی کی زمین پر ہر طرف منتشر ہو کر بالآخر اسی زمین میں

آسودہ ہوئے، مجھ پر اپنے گھر کے تمام افرادِ محترم کی طرف سے کتاب کی صورت میں ایک تعارف نامہ لکھنے پر سخت اصرار رہا اور اس میں بالخصوص میری بیگم صاحبہ، میری دو بیٹیاں اور میرے دو بیٹے بلال اور طارق پیش پیش تھے۔ میرے تین بھائی، خواجہ غلام نبی جان۔ ڈاکٹر غلام محمد جان اور خواجہ نظام الدین جان اور احباب میں سے خواجہ غلام نبی شونٹھو (ساکن نشاط، سری نگر) پیوستہ درپے بسم اللہ رہے اور بالآخر فضلِ ربانی اور رضایت حضرتِ غوثِ صمدانی رض اور افرادِ خانہ بالخصوص بیگم صاحبہ کی تشویق سے یہ کتاب دستیاب مواد و منابع اور آگہی و اطلاعات کی فراہمی سے تکمیل تک پہنچی۔

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین!

قارئینِ محترم بھی فرض شناسی سے کام لیں اور مجھے اپنے تأثرات سے مطلع کر کے ممنون فرمائیں۔

بدھوار۔ اوّل ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۰ھ
مطابق
۲۸ ماہ فروری سنہ ۱۹۹۰ء

پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد

جان منزل
۱،۲۔ بال گارڈن۔
سرینگر۔ کشمیر

پہلا باب

بچپن

ظاہری اور معنوی تعلیم و تربیّت

خارجی ممالک میں سفر

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

(بالِ جبریل، حضرت علاّمہ اقبالؒ

۱

میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی علی تھا۔ آپ ایران کے مشہور صوبہ ہمدان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے خود فرمایا ہے:

پرسید عزیزی کہ علی اہلِ کجائی گفتم بولایاتِ علی، کز ہمدانم

صحیفۃ الاولیاء میں سیّد محمد نوربخش نے بھی آپ کو "الوندی المولد" کہا ہے:

دگر شیخ شیخم کہ او سیّد است علی نام، والوندی المولد است

الوند کا مشہور پہاڑ ہمدان میں ہے اس لیے الوند کا اشارہ اسی شہر سے ہے۔

مسلک الاخیار میں بھی حضرت شیخ یعقوبؒ صرفی کشمیری واضح طور پر حضرت امیر کبیرؒ کی جائے پیدائش ہمدان بتلاتے ہیں ؎

آں ہمدان مولد وختلان وطن شیوۂ او طیِّ زمین وزمن

حضرت امیر کبیرؒ کی تاریخِ ولادت تذکرہ نویسوں نے ۱۲؍رجب سال ۷۱۴ ہجری (۲۲؍اکتوبر ۱۳۱۴ء) سوموار کے دن لکھی ہے۔ رحمۃ اللہ کے الفاظ سے جو آپ کی تاریخ ولادت پر کہے ہیں، یہ تاریخ بالکل صحیح ہے۔ آپ کے خاص خلیفوں میں سے مولانا نورالدین جعفر رستاق بازاری بدخشیؒ صاحب خلاصۃ المناقب لہ نے اگرچہ آپ کا سال ولادت نہیں لکھا ہے لیکن آپ کی تاریخِ وفات ۷۳ سال کی عمر میں سال ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء) لکھی ہے جس سے

لہ مولانا نورالدین جعفر کی یہ تصنیف حضرت امیر کبیرؒ کی حیاتِ مبارک کے کئی اہم باطنی اور ظاہری امور سے واقف ہو جانے سے متعلق معتبر ترین اطلاع نامہ ہے کیونکہ مؤلف کئی سالوں تک آپ کی خدمت میں رہ کر باطنی فیض پاتا رہا۔ یہ کتاب حضرت امیر کبیرؒ کے بعض ملفوظات پر بھی مشتمل ہے، بیشتر فضلا نے جن کی اس کتاب تک دسترس رہی ہے حضرت امیر کبیرؒ سے متعلق اسی اہم کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

بظاہر آپ کا سالِ ولادت سال ۷۱۳ھ (۱۳۸۳ء) ہے لیکن عمر شریف کے تہتّرویں[1] سال کو حساب میں لازماً لاکر سالِ پیدائش ۷۱۴ھ (۱۳۱۴ء) صحیح ہے جو رحمۃ اللہ علیہ کے ابجدی حساب کے لحاظ سے بھی درست ہے۔

آپ کے والد کا نام سیّد شہاب الدّین رح اور والدہ کا سیّدہ فاطمہ رح تھا۔ والد بزرگوار ہمدان کی حکومت میں عمل دخل رکھتے تھے اور امیر کے لقب سے معروف تھے[2] سیّد شہاب الدّین رح حسب و نسب کے لحاظ سے ایک اصیل سیّد تھے اور اُن کا خاندان اُنّیس واسطوں سے براہِ راست جناب حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے، خلاصۃ المناقب میں حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کا شجرۂ مبارک، جس سے تمام تذکرہ نگاروں نے استفادہ کیا اور جو اسی معتبر کتاب سے دیگر تذکروں میں نقل ہوا ہے، یوں درج ہے:

"...... وہو ابن السیّد شہاب الدین بن محمد بن علی بن یوسف بن شرف بن محب ا بن محمد بن جعفر بن عبد اللہ بن محمد بن علی بن حسن بن حسین بن جعفر الحجہ بن عبد اللہ

---

[1] کشمیر۔ صوفی غلام محی الدین جلد اوّل صفحہ ۸۵۔

[2] خلاصۃ المناقب میں لکھا ہے کہ حضرت سیّد (علی ہمدانی رح) کے والد ہمدان کے حاکم تھے۔ لیکن وہ مطلق والی یا حاکم نہیں تھے بلکہ اہم عہدہ پر متعین تھے اور مہمان سلاطین و امراسے ان کا رابطہ رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ اعلیٰ درجہ کے حکومتی افسر تھے۔ تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتابخانہ میں قلمی نسخہ تاریخ اولجائیتو کے نام سے (شمارہ ۲۴۲) جسے ابو القاسم عبد اللہ کاشانی نے لکھا ہے، اولجائیتو بادشاہ ایلخانی (۷۰۴ - ۷۱۶ھ / ۱۳۰۴ ء ۱۳۱۶) کے عہدِ حکومت میں حاکموں کی فہرست میں سیّد شہاب الدین رح کا نام موجود نہیں اور نہ ہی غازان خان ایلخانی (وفات ۷۰۴ھ / ۱۳۰۴ء) اور سلطان ابو سعید ایلخانی (۷۱۶-۷۳۶ھ / ۱۳۱۶ - ۱۳۳۵ء) کے دورہ ہائے حکومت میں آپ کا اسم گرامی حاکموں یا والیوں کے زمرے میں آیا ہے۔

حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کے حالاتِ زندگانی سے متعلق جن اہم منابع اور مربوط ماخذ تک ہمیں یہاں کشمیر میں دسترس نہیں اُن میں سے بعض اہم مربوط قلمی نسخوں کا (باقی اگلے صفحے پر)

زاہد بن حسین بن علی زین العابدین بن حسین الشہید رضی اللہ تعالی علیہم اجمعین..."[1] والدہ مکرمہ کی طرف سے بھی حضرت میر سید علی ہمدانی رح سید تھے، چنانچہ آپ کی والدہ کا خاندان سترہ واسطوں سے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ مولانا نورالدین جعفر بدخشی رح کہتے ہیں:

> "... حضرت سیادت فرمودند، قدس اللہ سرہٗ وزادلنا برّہٗ از جانب والدہ ہفدہ نسب بحضرت مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم میرسد..."[2]
>
> [حضرت سید رح نے فرمایا: والدہ کی طرف سے سترہ نسب سے ہمارا خاندان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے]

اس لحاظ سے حضرت میر سید علی ہمدانی رح کا خاندان بے حد معزز اور محترم تھا نیز والد بزرگوار کے حکومت وقت کے ایک مقتدر اور صاحب اختیار رکن ہونے کی حیثیت سے بھی یہ خاندان ہمدان کا نہ صرف معروف بلکہ بہت ہی موقر اور لائق ستائش و تعظیم خاندان تھا۔ بدقسمتی سے حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے والد محترم بلکہ ان کی والدۂ مکرمہ دونوں کے بارے میں حالات سے کوئی آگاہی دستیاب نہیں۔ البتہ خلاصۃ المناقب میں درج بیانات سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مطالعہ تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتاب خانے میں وہاں کے فاضل اور دانشمند اساتذہ و احباب جناب ڈاکٹر ایرج افشار، جناب محمد تقی دانش پژوہ اور جناب شیروانی کی ہدایات پر کئی سال پہلے اپنے اکثر مطالعاتی اور علمی دوروں کے درمیان میرے نصیب میں رہا۔ انہی اہم مطالعات میں تاریخ اولجایتو کا مطالعہ بھی تاریخی اعتبار سے اہم تھا۔ اس تاریخ میں ایلخانی بادشاہ اولجایتو کے عہد حکومت میں (جبکہ سید شہاب الدین رح اور حضرت میر سید علی ہمدانی رح دونوں حیات تھے) متعین حکام، والیان اور بزرگان عہد کا ذکر ہے۔

[1] خلاصۃ المناقب۔ ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز ڈپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر۔ اس میں خلاصۃ المناقب کی دو نقلیں موجود ہیں ایک شمارہ ۶۱۹۸۳ اور دوسری شمارہ ۶۵۸ کے تحت۔ اوّل الذکر نامکمل ہے اور موخرالذکر مکمل ہے۔ میں نے بیشتر موخرالذکر کا مطالعہ کیا ہے۔ [2] ایضاً۔

اتنی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے کہ آپ کے والد بزرگوار جاہ وحشم والے تھے اور حکومتی منصب کے تقاضوں اور ضرورت کے پیشِ نظر اُن کے نوکر چاکر بھی تھے۔ صاحبِ خلاصۃ المناقب لکھتے ہیں :

"جناب حضرت سیادت فرمود کہ وقتی در سفر بودم و میرفتم۔ ناگاہ چند سواری ملاقات نمودند و یکی ازان سواران فرود آمد و سر بر قدم این درویش نہاد و بسیار بگریست۔ پس ازو سوال کردم کہ تو کیستی ؟ گفت : من فلان ترکم ، بندۂ شما کہ حضرت امیر شہاب الدین مرا بہ فلان امیر بخشیدہ بود۔۔۔۔"[1]

ترجمہ [جناب حضرت سیدؒ نے فرمایا کہ ایک بار میں سفر میں تھا اور جا رہا تھا۔ اچانک چند سواروں سے ملاقات ہو گئی ، اور ان میں سے ایک سواری سے نیچے اُتر آیا اور اپنا سر میرے قدموں پر رکھ دیا اور بہت رو دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا تم کون ہو؟ اُس نے کہا : میں فلاں تُرک ہوں ، آپ کا غلام ، جسے امیر شہاب الدینؒ نے فلاں امیر کو بخش دیا تھا۔]

سید شہاب الدینؒ خود دنیوی امور سے وابستہ رہ کر بھی اپنے خاندانِ عالیہ کے موروثی اعلیٰ ترین اقدار کے پیشِ نظر علماء و فقراء اور درویشانِ حق جُو اور بزرگانِ دین سے ارادت و عقیدت رکھتے تھے اور ان کی تکریم و عزّت کرتے تھے ، چنانچہ بادشاہ کی خواہش پر جب خراسان اور عراق کے برگزیدہ بزرگانِ دین اور علماء و فقراء ، اور درویشانِ راہِ حق کو ایک بڑے دینی اجتماع میں مدعو کیا گیا تو سید شہاب الدینؒ نے ازراہِ عقیدت اپنے فرزندِ عزیز میر سید علی ہمدانیؒ کا ہاتھ پکڑ کر ، جبکہ وہ کم سن تھے ، تمام حاضرینِ مجلس سے اُن کے حق میں دُعائے خیر فرمانے کی التجا کی اور پھر اس کے بعد اُن کے لیے ہر ایک بزرگ سے ایک ایک حدیثِ مبارک تلقین کرنے کی بھی استدعا کی۔ چنانچہ اس بارے میں خلاصۃ المناقب میں نقل ہے کہ :-

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز ڈپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر۔ اس میں خلاصۃ المناقب کی دو نقلیں موجود ہیں ایک شمارہ ۱۹۸۳ اور دوسری شمارہ ۶۵۸ کے تحت۔ اوّل الذّکر نامکمل ہے اور مؤخر الذّکر مکمل ہے۔ میں نے بیشتر مؤخر الذکر کا مطالعہ کیا ہے۔

"...... ووالدم دست من بگرفت وفاتحۂ التماس نمود وجمیع علماء وفقراء جمیع مجلس از برای من فاتحہ خواندند۔ پس دیگر بار التماس کرد کہ باید کہ ہر یک از فقرای مجلس از برای این فرزند حدیثی فرمایند ......" [1]

[...... اور میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دعائے خیر کی التماس کی اور تمام علماء اور مجلس کے سبھی فقراء نے میرے حق میں دعائے خیر کی۔ اس کے بعد انھوں نے دوسری بار التجا کی کہ فقراءِ مجلس اب میرے اس فرزند کے لیے ایک ایک حدیث بیان فرمائیں ......]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ والدِ محترم اپنے فرزند کی نسبت فرض شناس تھے باوجود اس کے کہ دنیوی مشاغل میں منہمک رہ کر ان کے پاس فرصت بہت کم تھی۔ لیکن بہرحال تعلیم و تربیت کے لیے انہیں فرزندِ دلبند کو اپنے برادرِ نسبتی، جو خود بڑے عالم، متقی اور اولیاء اللہ میں سے تھے، سیّد علاء الدّین کے سپرد کرنا پڑا۔ اس بارے میں خود حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کا بیان ہے کہ :

"...... ومرا خالی بود کہ وی را بہ لقب سیّد علاء الدّین گفتندی واو از اولیاء اللہ بود۔ بہ حسنِ تربیّتِ او مرا در صغرِ سن قرآن محفوظ گشت۔ ودر امور والد التفات نمی کردم بدان سبب کہ او حاکم بود در ہمدان ملتفت بہ سلاطین واعوان ......" [2]

[...... اور میرے ایک ماموں تھے جنہیں سیّد علاء الدّین کے لقب سے پکارتے تھے اور وہ خدا دوستوں میں سے تھے۔ ان کی اچھی تربیّت سے کم سنی میں ہی مجھے قرآن مجید یاد ہو گیا۔ اور میں اپنے والد کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ ہمدان میں حاکم تھے اور سلاطین و امراء کی طرف متوجّہ رہتے تھے ......"]

یہاں پر بعض تذکرہ نگاروں کو سیّد علاء الدین کے نام سے اشتباہ ہوا ہے کہ یہ علاء الدولہ سمنانیؒ تھے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے۔ علاء الدّین اور علاء الدولہ نہ صرف دو الگ نام ہیں بلکہ

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] ایضاً

دو علیحدہ شخصیتیں بھی۔ علاء الدّولہ سمنانیؒ اپنے اس لقب سے اس قدر مشہور و معروف تھے کہ اپنے نام احمد بن محمد بن احمد بیابانکی کی بجائے صرف اسی لقب سے جانے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر معروف شخصیت کا نام یا لقب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ علاء الدّولہ سمنانی ہی فرماتے نہ کہ سیّد علاء الدین اور نہ ہی صاحبِ خلاصۃ المناقب سے علاء الدّولہ کو سیّد علاء الدین لکھنے میں اشتباہ ہوتا۔ اس بارے میں درج ذیل عبارت قابلِ غور ہے:

"... حضرت سیادت فرمودند، قُدِّس سِرّہٗ وزادلنا برُّہٗ کہ ہزار و چہار صد ولی را، قُدِّسَ اسرارُہُم، دریافتم۔ امّا چہار صد از این اولیاء را در یک مجلس در صغرِ سن دریافتہ ام۔ و سبب آن اجتماع این بود کہ پادشاہ دیار ما را داعیۂ سعادت ملاقات اکابرِ عراق و خُراسان پیدا آمد و با وزراء مشورت کرد۔ وزرائے نیک رای گفتند بی سببی طلب اکابرِ دین مصلحت نہ باشد بلکہ مدرسہ و خانقاہی بنا باید فرمودن و بعد از اتمام بنا التماس اجتماع نمودن۔ پادشاہ را بغایت خوش آمد، و آن بنا امر کردند۔ چون بنا تمام شد، علماء و فقراء خراسان و عراق را طلب نمودند از برای اجلاس۔ و والد و خالم نیز حاضر آمدند دران مجمع و مرا با خود حاضر آوردند ہم دران مجمع الاکابر۔ پس چہار صد محقّق بر دستِ راست پادشاہ بنشستند، و علماء نامدار بسیار بر دست چپ پادشاہ نشستند۔ و والدم دستِ من بگرفت و فاتحۂ التماس نمود۔ و جمیع علماء و فقراء جمیع مجلس از برای من فاتحہ خواندند۔ پس دیگر بار التماس کرد کہ باید کہ ہریک از فقرای مجلس از برای این فرزند حدیثی فرمایند تا از راہ تبرّک سماع نماید۔ لاجرم اوّل شیخ علاء الدّولہ سمنانی بر من حدیث خواند و آخر خواجہ قطب الدّین نیشاپوری۔ پس چہار صد حدیث باسعادت بمن رسید دران مجمع الاکابر۔۔۔۔"[۱]

ترجمہ: [..... حضرت سیّدؒ نے فرمایا : کہ میں نے ایک ہزار اور چار سو اولیاء کو پایا ہے۔

---

[۱] خلاصۃ المناقب۔

لیکن ان اولیاء میں سے چار سو اولیاء کو میں نے کم سنی میں ایک ہی مجلس میں دیکھا ہے۔[1] اور انکے ایک ہی مجلس میں جمع ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے بادشاہ کو عراق اور خراسان کے اکابرین سے ملاقات کی سعادت حاصل کرنے کی خواہش ہوئی اور اس بارے میں وزیروں سے مشورہ کیا۔ نیک مشورہ دینے والے وزیروں نے کہا کہ بلا وجہ دینی بزرگوں کو بلانا مصلحت اندیشی نہیں ہے، بلکہ کوئی مدرسہ یا خانقاہ تعمیر کی جائے اور اس کی تعمیر مکمّل ہو جانے کے بعد ایسی مجلس بلائی جائے۔ بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی اور عمارت بنانے کا حکم دیا۔ جب عمارت مکمّل ہوئی تو خراسان اور عراق کے علماء و فقراء کو اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اور میرے والد اور میرے ماموں بھی اس مجلس میں حاضر ہوئے اور اکابرین کے اس مجمع میں مجھے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بادشاہ کے دائیں طرف چار سو اہلِ حقیقت حضرات بیٹھ گئے اور بہت سے مشہور علماء بادشاہ کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اہلِ مجلس سے فاتحہ (دعائے خیر) کی التجا کی اور پھر مجلس کے تمام علماء و فقراء نے میرے حق میں دعائے خیر کی پھر اس کے بعد ایک اور بار استدعا کی کہ مجلس کے تمام بزرگان و فقراء میں سے ہر کوئی میرے اس فرزند کے لیے ایک حدیث شریف بیان فرمائے تاکہ تبرک کے طور پر یہ اس حدیث پاک کو سُنے، سب سے پہلے شیخ علاء الدّولہ سمنانی نے مجھے حدیث سنائی اور سب سے آخر میں خواجہ قطب الدّین نیشاپوری نے۔ اس طرح اکابرین کے اس مجمع میں چار سو احادیثِ مبارکہ مجھ تک پہنچیں ....]

اس بیان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کے ماموں سیّد علاء الدّینؒ ایک الگ شخصیت تھی اور شیخ علاء الدّولہ سمنانیؒ ایک دوسرے بزرگ تھے، اگر شیخ علاء الدّولہ

---

[1] ملاحظہ ہو منظوم مثنوی بنام نظم المناقب مؤلّفہ غلام محمد ترالی خطی نسخہ زیر شمارہ ۱۹۷۷۔ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ حکومت کشمیر۔ اس مثنوی کے تمام مطالب خلاصۃ المناقب اور منقبت الجواہر مؤلّفہ ملّا حیدر بدخشی (جو مستورات کے نام سے اب بھی معروف ہے) سے ماخوذ ہیں اور دونوں کو زیرِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

سمنانیؒ آپ کے ماموں ہوتے تو مذکورہ مجمع اکابرین میں اُن کے بارے میں آپ فرماتے کہ "اوّل خالم سیّد علاءالدینؒ بر من حدیث خواند" [پہلے میرے ماموں سیّد علاءالدّینؒ نے مجھے حدیث سنائی] لیکن آپ نے شیخ علاؤالدّولہ سمنانیؒ کا نام لے کر ہم پر روشن کر دیا کہ وہ مدعو بزرگانِ خراسان و عراق میں سے تھے اور حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے ماموں نہیں تھے۔ نیز کسی بھی جگہ شیخ علاءالدّولہ سمنانیؒ کا نام بالقب سیّد علاءالدّینؒ درج نہیں بلکہ ان کو ہر جگہ یعنی ہر رسالے، ہر مجلّہ، ہر کتاب اور ہر طرح کے مربوط کتابی مآخذ و منابع اور تذکروں میں شیخ علاءالدّولہ سمنانیؒ کے لقب سے، نہ کہ سیّد علاءالدّین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک اور بات اس سلسلے میں اہم ہے اور وہ یہ کہ شیخ علاءالدّولہ سمنانیؒ سمنان میں رہتے تھے جب کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ اپنے تمام تر اہلِ دودمان کے ساتھ ہمدان میں۔ یہ بات بعید از قیاس ہے اور کہیں بھی نظر سے نہیں گذری کہ صغر سنی میں تعلیم و تربیت کے لیے آپ کے والد محترم نے آپ کو علاءالدّولہ سمنانیؒ کے پاس سمنان بھیجدیا ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو یقیناً اس کا ذکر اور بیان وہ نورالدّین جعفر بدخشیؒ سے کرتے جب کہ آپ نے اپنی بچپن کی تعلیم و تربیت کی حکایت ان کو سنائی تھی، سیّد علاءالدّینؒ ہی انکے ماموں تھے جو یقیناً ایک بڑے عالم اور خدا دوست بزرگ تھے اور جنہوں نے بچپن سے ہی حضرت میر سیّد علیؒ ہمدانی کو اپنی تربیت کی آغوش میں لے کر دینی اور مروّجہ دنیوی علوم کا حتّی المقدور حد تک عالم بنا دیا۔ لیکن شیخ علاءالدّولہ سمنانیؒ ہرگز آپ کے ماموں نہیں تھے[1]

بارہ سال کی تعلیم و تربیت نے حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کو سخت تجسّس اور اشتیاق کے ساتھ

---

[1] مرحوم سیّد مظفر صدر سمنانی نے بھی "شرح احوال و آثار و افکار علاءالدولہ سمنانیؒ" نام کی کتاب میں جو انھوں نے سال ۱۳۳۴ھ شمسی (۱۹۵۴ عیسوی) میں تہران سے چھاپ دی ہے ثابت کیا ہے کہ شیخ علاؤالدّولہ سمنانیؒ، حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے ماموں نہیں تھے۔ نیز عبدالرفیع حقیقت نے خمخانۂ وحدت (چھاپ تہران۔ سال ۱۳۶۲ھ شمسی/۱۹۸۲ء) میں جو شیخ علاءالدّولہ سمنانیؒ کی زندگانی اور اُن کے کلام کے بعض نمونہ جات کا مختصر مجموعہ ہے اُن کے حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے ماموں ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کا بھی اس کتاب میں مؤلّف نے مختصر ذکر کیا ہے۔

باطنی تربیّت کی طرف رجوع کرنے کے قابل بنا دیا۔ اس بارے میں خود حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ فرماتے ہیں:

"..... حضرتِ سیادت قُدِسَ سِرّہٗ فرمودند کہ خالِ مَن یک عالمِ حضرتِ متّقی را محافظت می نمود تا من از وی فائدہ گیرم۔ وچون در سنِ دوازدہ رسیدم، و در حالِ استادِ متّقی نظر کردم، دیدم کہ، در خلوت خانہ میرود، و در صباح ورواح سر می جنبانند۔ از وی پرسیدم کہ حال چیست؟ جواب داد کہ ذکر می گویم۔ بارِ دیگر پرسیدم کہ، ذکر را بہ سر جنبانیدن احتیاج است؟ در جواب گفت آری! مرا شیخ محمودِ مزدقانی، قدّس اللہ سرّہٗ چنین تعلیم دادہ است۔ پس، از استاد التماس کردم کہ، مرا نیز تو این ذکر تعلیم بدہ۔ اجابت نمود، وچون سہ روز با او در ذکر موافقت کردم، ناگاہ مرا غیبتی بحصول موصول گشت، و جمالِ جہان آرای مصطفیٰ (صلّے اللہ علیہ وسلّم) را دیدم بر بام بلندی۔ چون خواستم تا دران مقام بروم، مصطفےٰ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) فرمود کہ: فرزند! تو نتوانی درین مقام آمدن، بہ نزدیک شیخ محمود برو تا ترا درین مقام بیارد۔ لاجرم از غیبت باز آمدم واز استاد التماس نمودم کہ در صحبت شیخ محمود بروم۔ اجابت کرد۔ وچون بہ صحبت شریف شیخ مشرّف گشتم فرمود کہ: یا سیّد! اگر برای مخدومی در خانقاہ آمدی من در خدمت شما از سر قدم سازم کہ مریدان نہ باید کہ در خدمت تقصیر کنند، و اگر از برای طلب دین آمدہ ای، کفشِ این غلام سیاہ، کہ اوست کنّاس خانقاہ پیش باید نہاد تا بہ مقصود بہ رسی کہ رسم طلب، ترک ہستی باشد۔ لاجرم، زود بصورتِ ادب قیام نمودم و قبول کردم، و بعدہٗ بہ شیخ بیعت کردم و ملازمِ خانقاہ می بودم... و تا یک سال ذکر گفتم، و حضوری نہ یافتم۔ روزی، بہ نزدیک شیخ آمدم و التماس کردم کہ مرا کنّاسی فرماید و کنّاس را در خلوت من ذکر گفتن فرماید۔ شیخ فرمود کہ: کنّاس مُبرزِ خانقاہ پاک میسازد، و تو نفس خود را پاک نمی توانی ساخت برو! در خلوت بنشین، و ہمّت بلند دار، تا برآید کار، انشاءاللہ تعالیٰ اللطیف۔

لاجرم، چون بہ مددِ ہمتِ کاملۂ شیخ، در خلوت رفتم و بہ ذکر مشغول شدم، اندک حضورِ پیدا شدن آغاز کرد، و از بعد آن، در حضور مستغرق شدم، چنانکہ طاقتِ شنودن ذکر نہ ماند۔ پس شیخ فرمود کہ کسی بہ نزدیکِ سیّد ذکرِ بلند نہ گوید، کہ خوفِ انزہاقِ رُوح است۔ و مدّتِ سہ ماہ مرا در زنجیر داشتند و طعام بازار دادند تا وجود آرام گرفت و با این ہمہ تربیت، در وقتِ سماع صحنِ خانقاہ را بہ سر رقص میکردم و در ہر ہفتۂ دو بار سماع می فرمود۔۔۔۔"۱؎

[۔۔۔۔ حضرت سیّدؒ (ان کی روح پاک ہے) نے فرمایا کہ میرے ماموں نے ایک متّقی عالم استاد کو اپنے پاس محفوظ رکھا تھا تا کہ میں اُس سے استفادہ کروں ؎۲ جب میں بارہ سال کا ہوا اور میں نے اس متقی استاد کے حال و احوال کی طرف توجہ کی تو میں نے دیکھا کہ وہ خلوت خانے میں جاتا رہتا ہے، اور صبح و شام سر ہلاتا رہتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں ذکر کر رہا ہوں۔ میں نے پھر پوچھا کہ کیا ذکر کرنے کے لیے سر کا ہلانا ضروری ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں مجھے شیخ محمود مزدقانیؒ، قدس سرہٗ نے یہی سکھایا ہے، تب میں نے استاد سے استدعا کی کہ آپ مجھے بھی یہ ذکر کرنا سکھا دیں۔ اس نے قبول کیا اور جب ذکر کرنے میں تین دن تک میں نے اس کا ساتھ دیا تو اچانک مجھ پر غیبت کا حال طاری ہو گیا اور میں نے ایک اونچی جگہ پر حضرت رسولِ اکرم صلّے اللہ علیہ وسلم کے حُسنِ جہاں آرا کو دیکھا۔ جب میں نے اُس مقام تک جانا چاہا تو حضرت محمد مصطفٰے صلّے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بیٹے! اس جگہ تک تم نہیں آ سکتے۔ تم شیخ محمود کے پاس جاؤ وہی تجھے اس جگہ تک لے آئے گا۔ میں اس حال سے لوٹ آیا اور استاد سے التجا کی کہ میں شیخ محمود کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔ اس نے مان لیا۔ جب میں شیخ محمود کی صحبتِ شریف سے مشرف ہوا تو انھوں نے فرمایا:

"اے سیّد! اگر تم میری خانقاہ میں مخدوم بن کر آئے ہو تو میں اپنے سر کو قدم بنا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کیونکہ مُریدوں کو خدمت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اگر دین

۱؎ خلاصۃ المناقب۔ ۲؎ گویا آپ کے ماموں سیّد علاء الدینؒ اور یہ متقی عالم استاد (جن کا نام معلوم نہیں) دونوں بارہ سال تک آپ کے اتالیق تھے۔

کی تلاش و تحصیل کے لیے آئے ہو تو پھر اس کالی رنگت والے ملازم، جو اس خانقاہ کا خاکروب ہے، کے جوتے اس کے سامنے پہننے کیلئے سیدھے کرنے ہوں گے تاکہ تم اس طرح سے اپنی مُراد پا سکو کیونکہ تلاش و تحصیل کی شرط، اپنی ذات اور ہستی کو ترک کر دینا ہے۔ لازماً میں نے فوراً ہی قاعدے کو اپنایا اور قبول کیا اور پھر شیخ سے بیعت کی اور خانقاہ میں ملازم رہا.... اور ایک سال تک ذکر کرتا رہا لیکن مجھے حضورِ قلب حاصل نہیں ہوا۔ ایک دن میں شیخ کے پاس آیا اور استدعا کی کہ مجھے خاکروبی کا کام دیا جائے اور خاکروب کو میرے خلوت خانے میں ذکر کرنے کا حکم دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ: خاکروب خانقاہ کے پاخانے کو پاک کرتا ہے اور تم اپنے نفس کو پاک نہیں کر سکتے؟ جاؤ اور خلوت خانے میں بیٹھو۔ ہمت کو بلند رکھو، جب تک کہ تمھاری مراد پوری ہو جائے انشاء اللہ تعالیٰ۔ بہرحال جب میں شیخ کی کامل ہمّت و توجّہ کے ساتھ خلوت میں بیٹھ گیا اور ذکر میں مشغول ہوا تو تھوڑا سا حضورِ قلب پیدا ہونا شروع ہو گیا اور پھر اس کے بعد تو میں حضورِ قلب میں ڈوب ہی گیا۔ چنانچہ ذکر سننے کی مجھ میں طاقت ہی نہیں رہی۔ اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ سیّد کے آگے اونچی آواز میں کوئی ذکر نہ کرے۔ کیونکہ ان کی روح کے نکل جانے کا خطرہ ہے۔ تین مہینوں تک مجھے زنجیروں میں باندھ کے رکھا گیا اور بازاری غذا کھلائی گئی، جب تک کہ میرے وجود کو سکون ملا۔ اور اِس ساری تربیت کے باوجود سماع کے وقت میں خانقاہ کے صحن میں سر کے بل رقص بھی کیا کرتا تھا اور اس طرح کی سماع کی مجالس ہفتے میں دو بار منعقد ہوا کرتی تھیں....]

رسالۂ مستورات میں لکھا ہے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے ذمّے اُن کے مُرشدِ طریقت حضرت شیخ محمود مزدقانیؒ[۱] نے خانقاہ کی خاک روبی کا کام بھی کر دیا تھا جسے کچھ مدّت کے بعد معاف کر دیا اور پھر پانی لانے پر مامور کیا۔ اور یہ کام میر سیّد علی ہمدانیؒ نے ایک عرصے تک انجام دیا۔[۲] حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ مٹّی کے جن ڈھیلوں کو اپنے مرشد کے لیے

---

[۱] مزدقان، ساوہ، اور ہمدان کے درمیان واقع نوبران قصبہ میں ایک گاؤں ہے جہاں کی آبادی اس وقت قریب تین ہزار لوگوں پر مشتمل ہے۔ غلّہ، آلو، میوے اور خشک دالیں یہاں خاص پیداوار ہیں۔ [۲] رسالہ مستورات یا منقبت الجواہر مؤلّفہ حیدر بدخشیؒ (مجموعۂ رسائل ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر شمارہ ۱۵۴۸، ۱۶۰۰، ۲۱۵۰)۔

بیت الخلا میں رکھتے تھے اُن کو پہلے اپنی پیشانی پر رگڑ کر صاف کیا کرتے یہاں تک کہ ایسا کرنے سے آپ کی پیشانی کا گوشت اس قدر گھس گیا کہ ہڈیاں نظر آنے لگی تھیں لیکن آپ اپنی پیشانی کو ٹوپی سے ڈھانکے رکھتے تھے، چنانچہ ایک دن شیخ نے بھانپ لیا تو فرمایا:

”یا سیّد! این قدر رنج بر جانِ خود نہ باید کرد۔ اگر بتوانی آب طہارت درویشان آوردہ باشی“ [۱]

[اے سیّد! اپنی جان کو اتنی تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ اگر ہو سکے تو درویشوں کے لیے طہارت کا پانی لایا کرو]۔

نظم المناقب کا مؤلّف بھی اس بارے میں یوں بیان کرتا ہے :۔

پس بصافی مبزرم بُد کار   مدتی دور کردن از مردار
(پس میرا کام پاخانہ صاف کرنا تھا   اور ایک عرصے تک میں پاخانہ سے نجاست دھوتا رہا)
ہم کلوخی کہ بہر حاجتِ پیر   در خلا داشت ایں ضعیف حقیر
(مُرشد کی ضرورت کے لیے مٹی کے ڈھیلے بھی   یہ ضعیفِ حقیر بیت الخلا میں رکھ دیتا تھا)
دست در کار خاک می بردم   از جبین صاف و پاک می کردم
(مٹّی کے بنے ان ڈھیلوں کو ہاتھ میں رکھ دیتا تھا   اور اپنی پیشانی سے ان کو پاک و صاف کرتا تھا)
اندک اندک بدان بُدم منسرور   تا کہ شد لحم از جبینم دور
(آہستہ آہستہ یہ کام کرنے پر میں خوش تھا   یہاں تک کہ میری پیشانی کا گوشت گھُل گیا)
لحم و چرب از جبین چو اخفا شد   استخوان زان میان ہُویدا شد
(پیشانی سے گوشت و چربی اوجھل ہو گئی   تو بیچ میں سے ہڈّیاں نمودار ہو گئیں)
لیک زیر کلاہ میکردم   رنج خدمت بہ راہ می بردم
(لیکن میں اسے ٹوپی کے نیچے چھپایا کرتا تھا   اور خدمت گذاری کے رنج کو برداشت کرتا رہتا تھا)

---

[۱] رسالہ مستورات یا منقبت الجواہر مؤلّفہ حیدر بدخشی رح (مجموعہ رسائل ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر شمارہ ۱۵۴۸، ۱۶۰۰، ۲۱۵۰۔

حضرت شیخ از بصارتِ خویش   کرد روزی بحالِ من تفتیش
(حضرت شیخ نے اپنی بصارت سے   ایک دن میری اس حالت کو بھانپ لیا)
گفت: ای سیّد! این قدر بر جان   نیست رنج آزمودنت شایان
(فرمایا: اے سیّد! اپنی جان پر اس قدر   رنج و تکلیف کو آزمانا اچھّا نہیں ہے)
گر توانی کنون ازین بگذر   از برائے طہارت آب آور[1]
(اگر ہو سکے تو اب تم اسے چھوڑ دو اور   طہارت کے لیے پانی لایا کرو)

حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نے نورِ باطن کی تحصیل میں آرامشِ قلب کے ساتھ بڑے شدائد و مصائب برداشت کیے۔ مُرشد شیخ محمود مزدقانیؒ سفر میں بھی آپ کو ہمراہ لے جاتے تھے اور تربیّتِ ظاہر و باطن اور رُشد و ہدایت سے بدستور آپ کو نوازتے رہتے تھے۔ ایک سفر کے بارے میں مولانا نُورالدّین جعفر رُستاق بازاری بدخشیؒ خلاصۃ المناقب میں لکھتا ہے:

"..... جناب سیادت فرمود که وقتی در سفر بودم بخدمتِ شیخ محمود، وحال آنکه خدمتِ شیخ با درویشان به روزه بود و آبِ افطارِ شیخ را من برداشته بودم و چون ازان منزل که آب برداشته بودم، شش فرسنگ راه برفتند، در اوّلِ وقتِ عصر، باداي عصر اشتغال نمودند۔ در میانِ نماز بودم که یکی از سفہاء که در راه بود آب بخورد۔ لاجرم آن بقیت را ریختم و باز سوی آن منزل که آب بود برفتم و آب بگرفتم و بمنزل بیتوته رسیدم۔ در وقت افطارِ شیخ به غایت حدید در من دید و نفحۂ تبسّم نمود۔ در آن شب کشود

---

[1] نظم المناقب مؤلفہ غلام محمد ترالی (قلمی نسخہ۔ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر شمارہ ۱۹۷۷ء۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی حیاتِ طیّبہ پر یہ غلام محمد ترالی، خانقاہِ ترال کے "خادم خاصِ درگہِ عالی" کی لکھی ہوئی مثنوی ہے، جس کے بیشتر مطالب خلاصۃ المناقب اور منقبت الجواہر سے ماخوذ ہیں۔ لیکن کئی لحاظ سے یہ کتاب جو ۱۳ھ میں لکھی گئی ہے اہم ہے۔

برمن اسراری کہ نہ بود بہ اربعینات مرادر وجود، بہ برکت نظر آن صاحب وجود!.....”

“حضرت سید نے فرمایا کہ ایک بار میں حضرت شیخ کی خدمت میں سفر میں ہمراہ تھا۔ حال یہ تھا کہ حضرت شیخ معہ درویشوں کے روزے سے تھے اور افطار کے لیے حضرت شیخ کا پانی میں اٹھائے ہوئے تھا۔ جہاں سے میں نے شیخ کے لیے پانی لیا تھا اس مقام سے ہم چھ فرسنگ راہ آگے چلے تھے۔ عصر ہوتے ہی عصر کی نماز میں مشغول ہو گئے۔ میں نماز میں تھا کہ ایک نادان راہگیر نے اس پانی میں سے پی لیا۔ لازماً میں نے باقی پانی کو پھینک دیا اور پھر اسی مقام کی طرف چل پڑا جہاں سے میں نے پانی لیا تھا اور پانی لاکر اس جگہ پر پہنچا، جہاں رات کو ہمیں ٹھہرنا تھا۔ افطار کے وقت حضرت شیخ رح نے گرم نگاہی سے مجھے دیکھا، اور تبسّم کی خوشبو سے نوازا۔ اس رات مجھ پر وہ اسرار کھل گئے۔ جو میرے وجود کو چلّوں میں کبھی حاصل نہ ہو پائے تھے، اس صاحب وجود مرشد گرامی کی نظر کی برکت سے.....”[۱]

حضرت شیخ محمود مزدقانی رح کی ذاتی خواہش سے ہی حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ مرشد کے مرشد حضرت ابوالبرکات شیخ تقی الدّین علی دوستی (یا دوسی)[۲] سمنانی رح جو خود حضرت علاء الدّولہ سمنانی رح کے عالی مرتبہ اصحاب خاص اور نامور خلفاء میں سے تھے، مزید راہنمائی اور رشد و ہدایت سے فیضیاب ہونے کے لیے اُن کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت علاؤالدّولہ رح، شیخ تقی الدّین علی دوستی رح کو فرزند کہہ کر پکارتے تھے اور بعد میں اُن کو اپنا جانشین بنا لیا۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کا قیام خانقاہ علاء الدّولہ[۳] میں دو سال تک رہا۔ اور بدستور باطنی اور

---

[۱] خلاصۃ المناقب۔ [۲] مرحوم سیّد مظفّر صدر نے "شرح احوال و افکار و آثار شیخ علاء الدّولہ سمنانی" میں (صفحہ ۵۸) لکھا ہے کہ دوسی سمنان میں ایک قبیلے کا نام ہے۔ لغت نامہ دھخدا میں حرف دال کے ضمن میں مصدر دوسیدن کے معنی "دل سے دوستی" بیان ہوا ہے۔

[۳] اس خانقاہ کا نام خانقاہ روضہ تھا جسے شیخ علاؤالدّولہ رح نے شیخ علی دوستی رح کی تحویل میں دیدیا تھا۔ تاریخ سمنان از عبدالرفیع حقیقت اور خمخانہ وحدت از عبدالرفیع حقیقت۔

ظاہری تربیت کی محنتِ شاقّہ سے گذرتے رہے۔ آپ نے وہاں کئی چلّے کاٹے اور ترکِ نفس کے مقام کو مضبوطی سے تھام رکھنے کے مقصد سے جسمانی صعوبتیں برداشت کیں حضرت اخی علی دوستی" کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ:

”.....خدمتِ شیخ علی دوستی، قدس اللہ سرّہٗ چنان صافی بود کہ طاقتِ یک ذکر نہ داشت، زیراک در آخرِ اثبات از یک دیگر غیبت کردی۔ خدمتش بحرِ موّاج، و در اسرار دائم البسط بود۔ تا روزی از حضرتِ شیخ علاؤالدّولہ سوال کردہ شد کہ، خدمتِ اخی دائم البسط چراست؟ فرمود: از برای آنکہ حق تعالی او را از لطف آفریدہ است۔ و در ایامِ دیگر سوال کردہ شد کہ در حق اخی محبت بلاغایت است، حال آنکہ اخی را در اربعین کہ بگذرد چند واقعہ می باشد و شیخ محمد دہستانی را ہر روز چندین واقعہ دست میداد۔ جواب فرمود کہ علی دوستی را در ہر مقامی توقّف می بخشند تا تحقیقِ مقامات کند و سالکان را ارشاد نماید۔ محمد دہستانی از برای خود می دود۔ [و حضرت شیخ بزرگ او را دوندہ می خواندی] و در وقت دیگر فرمود کہ علی دوستی از محبوبانست تا اگر ہر روز او ہزار[1] نفس را قتل کند در روزِ محشر مسئول نباشد۔ محمد دہستانی از محبّان است اگر ادبی را ترک کند، مسئول باشد.....“[2]

[حضرت شیخ علی دوسنی، قدس سرّہٗ کی ذات اس قدر صاف و خالص تھی کہ ایک ذکر کی تکمیل کی بھی ان میں طاقت نہیں رہی تھی کیونکہ اثبات کے آخر میں وہ ایک دوسرے سے غیب ہو جاتے تھے۔ آپ کی ذات ایک طوفان آمیز سمندر تھی اور اسرارِ الٰہی آپ پر ہمیشہ کھلے رہتے تھے چنانچہ ایک دن حضرت شیخ علاؤالدّولہ سے پوچھا گیا کہ اخی (علی دوستی) کی ذات پر کیونکہ اسرارِ الٰہی ہمیشہ کھلے رہا کرتے ہیں؟ فرمایا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو

---

[1] روضات الجنان و جنات الجنان تالیف حافظ حسین کربلائی جلد ۲ ص ۲۷۶ میں لکھا ہے: "اگر ہر روز او نفسی را قتل کند" اگر وہ ہر روز ایک نفس کو قتل کرے۔

[2] خلاصتہ المنافت۔

لطف (صفتِ جمالِ الٰہی) سے پیدا کیا ہے۔ ایک اور موقع پر پوچھا گیا کہ آپ کی محبّت اخی (علی دوستی) کے حق میں بے نہایت ہے حالانکہ چلّوں میں جو وہ کاٹتے ہیں اُن پر محض چند واقعات گزرتے ہیں جب کہ شیخ محمد دہستانی پر اس طرح کے واقعات بڑی تعداد میں ہر روز ہی گذرتے ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ علی دوستی کو ہر مقام پر ٹھہرا دیا جاتا ہے تاکہ مقامات کی تحقیق کرے اور پھر سالکوں کی رُشد و راہنمائی کرے۔ محمد دہستانی تو اپنے لیے دوڑتا رہتا ہے [اور حضرت شیخ بزرگ اُسے دوڑنے والا کہا کرتے] اور ایک اور موقع پر فرمایا کہ علی دوستی محبوبوں میں سے ہے چنانچہ اگر وہ ہر روز ہزار نفوس کو بھی قتل کرے جب بھی قیامت کے دن اُس سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں ہوگی، محمد دہستانی محبّوں میں سے ہے، اگر ایک ادب کو بھی چھوڑ دے گا، تو اُسے جواب دینا ہوگا ....]

خانقاہِ موصوف میں آپ مُرشدِ ثانی کے احکام کی تعمیل میں شب و روز مستعد رہتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

> "..... در مدّت صحبت شریف اخی علی دوستی چون از وظیفۂ صباح فارغ حاصل آمدی، اگر کاری بودی که در او مصلحت دینی و دنیوی در آن بودی به وی اشتغال می بود و الّا فرمودی که درویشان سنگها را از موضعی به موضعی کشبندی که ظاہراً فایدۂ بر آن مترتب نبودی۔ روزی گستاخی نمودم و سوال کردم که در نقل این سنگها فایده چیست؟ حضرت شیخ با وجود آن که این درویش را چنان تعظیم می نمود که مگر حضرت شیخ علاؤ الدّوله را، قدس سرّہٗ، تعظیم می نموده باشد، در غیرت شد از این سوال، و کفش از پای مبارک بیرون آورد و بر قفای من چنان زد که نعل کفش در گوشت بنشست و حالیا گوئیا خوشی آن آواز کفش بگوش من میرسد، و بعد از آن فرمود که فایده این آنست که کفار نفوس در زمرۂ اہلِ اسلام درآیند..."[1]

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

[.... حضرت شیخ اخی علی دوستی کی صحبتِ شریف کے عرصے میں جب صبح کے وظائف سے فراغت ملتی تھی، اگر کوئی ایسا کام ہوتا جس میں دینی یا دنیاوی مصلحت ہوتی تو وہ کام انجام دیا جاتا، ورنہ فرماتے تھے کہ درویش حضرات پتھروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جائیں اور بظاہر ایسا کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک روز گستاخی سے کام لے کر پوچھا کہ حضرت ان پتھروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے میں آخر فائدہ کیا ہے؟ حضرت شیخ کو، باوجود اس کے کہ مجھ درویش کی اتنی تعظیم کرتے تھے جتنی کہ گویا وہ حضرت شیخ علاؤ الدولہ قدس سرہٗ کی کیا کرتے ہوں گے، میرے اس سوال سے غصہ آگیا اور اپنے پائے مبارک سے جوتہ باہر نکالا اور میری پیٹھ پر ایسے زور سے مارا کہ جوتے کے نعل کا نقش گوشت پر باقی رہا اور ابھی بھی جوتہ مارنے کی آواز کی وہ خوشی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اور اس کے بعد فرمایا کہ فائدہ یہ ہے کہ سالنسوں کے کافر دائرۂ اسلام میں آجائیں ...]

گویا مرشد ثانیؒ نے بھی حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی بغیر کسی جانبداری، یا اُن کے خاندانی علوِ مرتبہ کا لحاظ سے ماوراء، اُن کی باطنی اور ظاہری رہنمائی کی اور ہر طرح کی آزمائشوں سے گذار کر انھیں مستقبل میں خود ایک روحانی رہبر اور مرشد طریقت بن جانے اور ایک صاحبِ استعداد مبلّغِ دین ہوجانے کے اہل بنادیا۔ دونوں مرشدوں نے آپ کو دینی اور دنیاوی تربیت کی دشوار گذار گھاٹیوں سے سخت مشقّتوں کا متحمل کر کے گذار دیا۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی ریاضت کی موجودہ اصلاح میں یہ سخت "فوجی مشقیں" بالآخر ان کے کشف و شہود پر ختم ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت اور عمل میں درویش کا مقصد یا نصب العین، راہِ حق میں سلوک ہے، اور اُس کی راہ ہر صورت میں ریاضت بھی ہے اور کشف و شہود بھی۔ غالبًا اس کا پہلا قدم توبہ ہے تاکہ سالک کا جان و دل پاک ہوجائے اور حق کے ساتھ اتّصال کی قابلیت پیدا کرے۔ اس کے بعد مجاہدے کی باری ہے، یعنی مجاہدہ نفس کے ساتھ، جو نفس آدمی کو دُنیا، دنیوی لذّتوں اور خواہشات کی طرف پکارتا ہے اور راہِ حق میں سعی و عمل سے روکتا ہے، مجاہدہ کی بھی شرط یہ ہے کہ ایک کار آزمودہ اور تجربہ کار پیر اور رہبر کی ذاتی راہنمائی اور اس کی رُشد و ہدایت اور ارشاد کے تحت ہو جسے شیخ یا مرشد کہتے

ہیں۔ ایک مریدِ سالک کو مرشد کے ہاتھوں میں غسّال کے ہاتھوں میں مُردے کی طرح ہونا چاہیئے، بغیر اختیار کے اور بغیر ارادے کے۔ یہی مرشد ہے جو سالک کو حسبِ استعداد اور حسبِ سرمایہ جو اس کے پاس ہے اُسے ریاضت اور مجاہدہ کرنے کی راہ پر لے آتا ہے اور روزہ، طویل خاموشی، غور و فکر، نفس کا محاسبہ، جسمانی مشقّت، صبر و تحمّل اور اسی طرح کی دوسری ریاضتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یہ ریاضتیں اگر سالک کے حقیقی صدق و اخلاص کے ہمراہ ہوں، تو اُسے درجاتِ کمال پر لے جاتی ہیں۔ مجاہدہ اور ریاضت سے وہ کئی سالوں میں طریقت کے مرحلوں کو، جنہیں مقامات کہتے ہیں، طے کرتا ہے۔ مثلاً توبہ کے مقام سے ورع (پارسائی) کے مقام پر پہنچتا ہے اور وہاں سے مقامِ زُہد پر، پھر مقامِ فقر، اور وہاں سے صبر، اور صبر سے آخری مقام توکّل پر پہنچتا ہے۔ یہ مقامات جن کی تعداد اور ترتیب میں مشایخ میں اختلاف ہے البتہ مجاہدے سے حاصل ہوتے ہیں[1] اور مجاہدے میں وہ محنتِ شاقّہ بھی شامل ہے جو اوائلِ سلوک میں تحمل کرنا پڑتی ہے۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی سخت کوشی اور جسمانی و روحانی مجاہدے کے بارے میں صاحبِ خلاصۃ المناقب نے جو ملفوظاتِ مبارک خود حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ سے ہم تک خلاصۃ المناقب کی راہ سے پہنچائے ہیں، ان میں سے، علاوہ اُس کے جو اوراقِ قبل میں درج ہوا ہے، بعض کا ذکر ناگزیر ہے:

(۱) ”شش سال در خلوت خانہ بودم کہ ہرگز بر زبان سخنِ دنیا نہ رفت، و چون از وظیفۂ صباح فراغ حاصل آمد، بیل زدن فرمودندی در غیر ایّام اربعین[2]،

[چھ سال تک خلوت خانہ میں رہا اور اس عرصے میں دُنیا کی بات مطلق زبان پر نہیں آئی، اور جب صبح کے وظائف سے فراغت ہوتی تو (مرشد شیخ محمود مزدقانیؒ) بیل سے زمین کھودنے کا حکم دیتے، البتّہ چلّے کے بغیر والے ایام میں]

(۲) ”شیخ محیّ الدّین ابن عربی، قدس اللہ سرّہٗ در بعضی از مصنّفاتِ خود ذکر

---

[1] ارزشِ میراثِ صوفیہ۔ عبدالحسین زرّین کوب صفحہ ۳۲۔ [2] خلاصۃ المناقب۔

کرده است که وقتی هفتاد روز چیزی نخوردم۔ پس این درویش نیز خود را آزمود به ناخوردن، و صد و هفتاد روز چیزی نخوردم، و اگر چیزی خوردن سنّت نه بودی، در باقی عمر، این درویش چیزی نخوردی"۔ [1]

[شیخ محی الدّین ابن عربی، قدس اللہ سرہ، نے اپنی بعض تصنیفات میں بیان کیا ہے کہ ایک بار میں نے ستّر دنوں تک کچھ نہیں کھایا۔ ـــــ ـــــ ـــــ تو پھر مجھ درویش نے بھی نہ کھانے پر خود کو آزمایا، اور ایک سو ستّر دنوں تک میں نے کچھ بھی نہیں کھایا، اور اگر کچھ نہ کچھ کھانا سنّت نہ ہوتا، تو باقی عمر تک میں کچھ نہ کھاتا]

۳۔ "وقتی در دیارِ روم در مسجدی نیّتِ اقامت کرده بودم در فصلِ شتا، و هوا به غایت سرد بود۔ ناگاه شبی احتلام افتاد، و نفس، از غسل، متکاسل آمد۔ پس غیرت کردم، و بر نفس واجب گردانیدم به حسبِ نیّت که چهل شب در آبِ یخ بسته غسل کنم۔ سنگ گرانی در آنجا بود۔ بر سر آبِ یخ بسته رفتم، و بآن سنگ، یخ را بشکستم و غسل آوردم، و حال آنک از جامه جز خرقهٔ کهنه نداشتم، و هم چنین تا چهل روز و شب، آن سنگ را می بردم و یخ را می شکستم و غسل می آوردم ......" [2]

[ایک بار روم کے ملک میں میں نے ایک مسجد میں ٹھہرنے کی نیّت کی تھی۔ یہ جاڑے کا موسم تھا اور ہوا بے انتہا ٹھنڈی تھی۔ ایک رات نیند میں اچانک انزال ہوا اور میرے نفس نے غسل کرنے میں سُستی دکھائی، مجھے اپنے نفس پر غصّہ آگیا اور میں نے اس پر واجب ٹھہرایا کہ اب تو یخ سے منجمد پانی میں چالیس رات تک نہلائے گا۔ وہاں پر ایک بھاری پتّھر تھا۔ میں یخ سے منجمد پانی کے پاس آیا اور یخ کو اس پتھر سے توڑ دیا اور غسل کیا۔ حال آنکہ لباس کے لحاظ سے میرے پاس ایک پُرانے خرقہ کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا اور اسی طرح

---

[1] خلاصة المناقب [2] ایضاً۔

سے چالیس دن رات تک میں اس پتھّر کو ساتھ لے جاتا، یخ کو توڑتا اور غسل کرتا تھا]

(۴) ہفت سال کُرتہ نپوشیدم و از طعام جز نانِ جو نخوردم، و بعد از ہفت سال، بزرگی کُرتۂ خوبی و طعامِ لذیذی آورد، و التماس نمود کہ این را قبول باید کردن کہ بہ اشارتِ مصطفےٰ (صلّے اللہ علیہ وسلّم) آوردہ ام۔ و جواب گفتم کہ بدین دعویٰ شاہد باید۔ آن بزرگ تبسّم نمود و فرمود کہ چگونہ شاہد باید گفتم ہمچنین کہ مرا نیز اشارت فرماید۔ گفت لاجرم ترا نیز توجہ باید کردن۔ و چون ازان صحبت فراغ حاصل آمد، توجہ کردم و حضرت رسول (صلّے اللہ علیہ وسلّم) را در خواب دیدم تبسّم فرمود کہ التماس بہ اشارتِ من است۔ لاجرم اجابت کردم ...."[1]

[سات سال تک میں نے قمیض نہیں پہنی اور غذا میں جَو کی روٹی کے بغیر کچھ نہیں کھایا۔ سات سال کے بعد کوئی بزرگ ایک اچھی قمیض اور لذید کھانا لے آیا اور التماس کی کہ اسے قبول کیجیے کیونکہ میں ان کو حضرت محمد مصطفےٰ (صلّے اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے لایا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ تمہارے اس دعوے پر کوئی گواہ ہونا چاہیے۔ وہ بزرگ مسکرایا اور فرمایا کہ کیسا گواہ چاہیئے۔ میں نے کہا ویسا ہی جو مجھے بھی حکم دے۔ کہا کہ پھر تو لازمًا آپ کو بھی توجّہ کرنی چاہیئے۔ جب یہ بات چیت ختم ہوئی تو میں نے توجّہ کی اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے تبسّم کیا اور فرمایا کہ بزرگ آدمی کی التماس میرے حکم سے ہے۔ تب میں نے یہ چیزیں قبول کیں ....]

(۵) "در ہمدان خانقاہی بود بہ غایتِ وسیع، امّا بنای آن خانقاہ ہنوز تمام نہ بود لاجرم چون شب در آمدی، برفتمی و خشت مالیدمی تا نزدیک صُبح، و باز بہ خانقاہ می آمدی و بہ جماعت نماز ادا میکردمی۔ بعد از سہ ماہ تمام کردم و فقرا در ایّامِ اربعین در آن خانقاہ جمع می شدند در فصل شتا۔"[2]

[ہمدان میں ایک بہت بڑی خانقاہ تھی لیکن ابھی یہ خانقاہ مکمّل نہیں ہوئی تھی۔ ناچار جب رات ہوجاتی تو میں جاتا اور اینٹیں بناتا تھا صبح کے وقت تک۔ پھر خانقاہ میں لوٹ آتا اور

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] خلاصۃ المناقب۔

جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ تین مہینوں کے بعد میں نے اسے مکمل کر لیا اور چلّوں کے دنوں میں فقراء اس خانقاہ میں جاڑے کے ایّام میں آجاتے]

(۶) "... جناب سیادت وقتی در قریۂ علی شاہ بر اصحاب غضب کرد و فرمود کہ نام اہلِ طلب بر خود نہادہ اید، و بر آنچہ ایشان اہتمام نمودند، شما استقامت ندارید۔ پس شما را شرم نمی آید کہ از ین رنگ و بوی درویشی فرح می طلبید بخوردو خفتن؟ واللہ کہ پنجاہ سال است کہ من بہ اختیار پہلو بر زمین نہادہ خواب نہ رفتہ ام و با آن محنت ہنوز خود را از ہیچ سگی بہتر نمی دانم ...."[1]

[ایک بار جناب حضرت سیدؒ نے قریۂ علی شاہ میں ساتھیوں پر سخت غصّہ کیا اور فرمایا کہ تم نے اپنے آپ کو اہلِ طلب کا نام دیا ہے، اور اہلِ طلب جو کچھ کیا کرتے تھے اس پر تم لوگ استقامت کرتے نہیں ہو۔ کیا آپ لوگوں کو درویشی کے اس طور طریقے سے شرم نہیں آتی کہ کھانے اور سو جانے سے آرام و راحت کے پیچھے پڑے ہو؟ قسم ہے خدا کی کہ پچاس سال سے اپنے ارادے سے میں نے آج تک سونے کے لیے زمین پر پہلو نہیں رکھا ہے، اور اس محنت کے باوجود ابھی میں اپنے آپ کو کسی کتّے سے بھی بہتر نہیں جانتا]

(۷) "... جناب سیادت فرمود کہ وقتی ضرورتی بود۔ و در سفر بیست و چہار فرسنگ راہ رفتم در یک روز بلا طعام و بلا شراب ....."[2]

[جناب سیدؒ نے فرمایا کہ ایک بار کوئی ضروری کام آگیا اور سفر کو نکلنا پڑا اور ایک ہی دن میں بغیر کھائے پیے میں نے چوبیس فرسنگ[3] چل کر طے کیے۔]

(۸) ..... وقتی بتوکّل قدم در بادیہ نہادم بموافقتِ حاجیان، و بیست و ہشت روز بلا طعام و شراب رفتم، کہ نفس ہیچ میل با آن نداشت، و بعدہٗ طالبِ آن گشت، و حال آنکہ با من ہیچ چیز نہ بود از دنیاوی کہ با آن طعام گیرم و

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] ایضاً۔ [3] فرسنگ یا فرسخ تین میل کے برابر ہوتا ہے اور ہر میل چار ہزار گز، گویا فرسنگ بارہ ہزار گز ہوتا ہے ۔۔ فرہنگِ معین جلد دوم صفحہ ۲۵۱۔

نفس را سیر سازم۔ پس کاسہ پارہ گرفتم و بہ چند خیمہ رفتم۔ ناگاہ بہ خیمۂ عزیزی رسیدم کہ التماس رعایت نمودہ بود در اوّل بادیہ، و من آن التماس از وی قبول نہ کردہ بودم۔ لاجرم نفس شرمندہ شد و آن کاسہ پارہ را بر زمین زدم و در گوشہ رفتم و مراقب شدم و غیبت کردم۔ چون ازان باز آمدم قافلہ رفتہ بود و من نیز در عقب قافلہ برفتم و بہ جائی رسیدم و چیزی نداشتم کہ آب از چاہ بیرون آرم۔ لاجرم خود را دران چاہ انداختم و آب بسیار خوردم۔ زمانی در چاہ توقف نمودم بدان سبب کہ چاہ بلند بود و بآسانی بیرون آمدن ممکن نہ بود۔ ناگاہ دیدم کہ شخصی بر سرِ چاہ آمد و مرا دید و تبسّم نمود و دستار را از سر خود برداشت و یک سرِ دستار بطرفِ من فرو گذاشت و من گرفتم و از چاہ بیرون آمدم و چون خواستم کہ از و پُرسم کہ تو کیستی، ناپدید شد۔ و من برفتم و بہ قافلہ رسیدم و اہلِ قافلہ تعجب نمودند کہ چگونہ سلیم آمدی از شرّ اعراب۔ و چون در میان قافلہ معروف شدم بیشتر وقت از قافلہ جُدا می رفتم و شب در میانِ قافلہ نمی بودم، اگرچہ شدّتِ خوف بودی از اعراب.....“[۱]

[ایک بار میں نے توکّل کر کے صحرا میں حاجیوں کی ہمراہی میں قدم رکھا اور بغیر کوئی چیز کھائے پیے اٹھائیس۲۸ روز تک چلتا رہا۔ نفس نے بھی کوئی رغبت نہیں دکھائی۔ لیکن بعد میں اُسے چاہت ہوئی۔ حالانکہ دنیوی متاع میں سے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا جس سے میں کھانے پینے کی کوئی چیز خرید کر اپنے نفس کو سیر کرتا۔ میں نے ٹوٹا ہوا برتن اٹھایا اور چند خیموں کی طرف گیا۔ اتفاق سے میں ایک عزیز کے خیمے میں پہنچا جس نے صحرا میں داخل ہونے کے وقت مجھ سے کچھ چیزیں لینے کی التماس کی تھی، اور میں نے اس کی وہ التماس قبول نہیں کی تھی۔ ناچار میں شرمندہ ہوا اور اس ٹوٹے پھوٹے برتن کو میں نے زمین پر دے مارا اور ایک زاویۂ خلوت میں چلا گیا اور مراقبہ میں رہا اور خود سے غائب ہوا۔ جب اس حالت سے لوٹ آیا تو کاروان جا چکا تھا۔ میں بھی کاروان کے پیچھے ہو لیا اور ایک جگہ پر پہنچا۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز

---

[۱] خلاصۃ المناقب

نہیں تھی جس سے میں کنویں سے پانی نکالتا۔ ناچار میں نے اپنے آپ کو کنویں میں پہنچا دیا اور بہت سا پانی پی لیا۔ کچھ عرصے کے لیے میں کنویں میں پڑا رہا۔ کیونکہ کنواں اونچا تھا اور وہاں سے باہر نکلنا محال تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک شخص کنویں کے اوپر نمودار ہوا، اور اس نے مجھے دیکھا وہ مسکرا دیا اور اپنے سر سے پگڑی اُٹھالی اور پگڑی کا ایک سرا میری طرف سرکا دیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کنویں سے باہر آ گیا۔ جب میں نے اُس سے پوچھنا چاہا کہ آپ کون ہیں وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں چل پڑا اور کاروان کے پاس پہنچا۔ اہلِ کاروان حیران ہو گئے کہ آپ کیسے صحیح سالم پہنچے لوٹنے والوں کے خطرے کے باوجود۔ اور جب میں کاروان میں معروف ہونے لگا تو میں کاروان سے الگ ہو کر چلنے لگا اور راتوں کو تو میں کاروان میں رہتا ہی نہیں تھا اگرچہ لوٹنے والے اعراب کا سخت خطرہ بھی تھا۔۔۔]

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی اس طرح کی تربیت دراصل اگرچہ اُن کے اپنے عہد کے کم نظیر مرشدین کی ذاتی رہنمائی میں ہوئی لیکن قدرتِ الٰہیہ نے آپ سے آئندہ زندگی میں جو معرکۃ الآرا کام لینا تھا اس کے لیے حکمتِ خداوندی نے ان کا خمیر اس طرح کے استعداد میں اُن کی خلقت سے پہلے ہی گوندھ دیا تھا۔ اور یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مرشدین بھی آپکو ایسے ملے جو نہ صرف خود صاحبِ کرامت تھے بلکہ ان میں سے تو ایک مرشد کا نام لے کر خود حضرتِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے انتخاب فرمایا تھا، یعنی حضرت شیخ شرف الدین محمود مزدقانی رحمۃ کا۔ جیسا کہ خود حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نے مولانا نور الدّین جعفر بدخشیؒ سے بیان فرمایا:

"۔۔۔جمال جہان آرائے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) را دیدم بر بام بلندی۔ چون خواستم تا دران مقام بروم، مصطفےٰ (صلّے اللہ علیہ وسلم) فرمود کہ: فرزند [1] تو نتوانی درین مقام آمدن۔ بہ نزدیک شیخ محمود برو تا ترا درین مقام بیارد۔۔۔"

[۔۔۔میں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا حُسنِ جہان آرا دیکھا جو ایک بلند جگہ پر تھے، جب میں نے اُس جگہ تک جانا چاہا تو جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ملاحظہ ہو، خلاصۃ المناقب ۔

"بیٹا! اس جگہ تک تم نہیں آسکو گے۔ شیخ محمود کے پاس جاؤ وہ تمہیں اس جگہ لے آئیں گے..."]

ظاہر ہے حضرت شیخ محمود مزدقانیؒ، جو اُن کے پہلے روحانی اتالیق اور رہبر تھے، کے کمالات و مرتبۂ روحانیت اور ان کی بیشتر مساعی نے جناب میر سیّد علی ہمدانیؒ کو عالم ظاہر و باطن، دونوں جہان میں اُس بلندی پر پہنچا دیا جس پر آپ نے عالم رُؤیا میں اپنے جدّ بزرگوار صلّی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا کا دیدار کیا تھا۔ روحانی تربیت کا بیشتر حصّہ آپ نے شیخ محمود مزدقانیؒ کی خدمت میں ہی گذارا، یعنی چھ سال کا عرصہ۔ اور اس عرصے میں شیخ مزدقانیؒ نے آپ کو اس قابل بنا دیا کہ خود اپنی خواہش سے آپ کو اپنے مرشد شیخ تقی الدین علی دوستیؒ کے پاس سمنان بھیج دیا اور دو سال تک اُن سے روحانی فیض کسب کیا۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ دونوں مرشدین کے روحانی کمالات میں عُلوِ مراتب کے عینی شاہد تھے۔ اگرچہ بدقسمتی سے ان دونوں صاحب کمال شیوخ کے حالات کے بارے میں تسلّی بخش حد تک اطلاعات فراہم نہیں۔ جستہ جستہ آگاہی خلاصۃ المناقب سے ہی ملتی ہے۔ مرشدِ اوّل حضرت شیخ محمود مزدقانیؒ کے بارے میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ فرماتے ہیں:

> "..... خدمتِ شیخ محمود، قدّس سرّہٗ متصرّف عظیم بود در خلق بحق۔ تا روزی گربۂ خانقاہ نصیبِ خود بخورد و بر عادت ہر روزہ صبر نہ کرد و بلکہ نصیب درویشی را نیز بخورد۔ شیخ با او عتاب کرد۔ پس گربہ غایب شد و باز حاضر آمد بچۂ در دہان گرفتہ۔ خدمتِ شیخ فرمود کہ گربہ ہُدہُد وار جواب عتاب گفت و درین حال گربہ بچۂ خود را از دہان انداخت و بزود سر بقدم شیخ نہاد۔ پس از حاضرانِ مجلس فریاد برخاست بسی فریاد۔ و در صحبتِ شیخ بسی صاحبدلان پدید آمدند کہ در ہر کس کہ نظر می کردند صفای عظیم حاصل می آمد..."[۱]

["... شیخ محمود، قدس سرّہٗ کی ذات لوگوں میں حق کے ساتھ تصرّف رکھتی تھی۔ چنانچہ ایک دن خانقاہ کی بلّی نے اپنا حصّہ کھا لیا اور ہر روز کی غذا کے راتبہ پر صبر نہ کرتے ہوئے اس نے ایک درویش کا بھی حصّہ کھا لیا۔ شیخ نے اُسے ڈانٹا۔ بلّی چلی گئی اور اپنے ایک بچے کو مُنہ میں پکڑے ہوئے لوٹ آئی۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ بلّی نے ہُدہُد کی طرح ڈانٹ کا جواب دیا ہے اسی دوران بلّی نے اپنا بچہ مُنہ

---

[۱] خلاصۃ المناقب۔

سے نیچے ڈال دیا اور اپنا سر حضرت شیخ کے قدموں پر رکھا۔ یہ سُن کر حاضرینِ مجلس سے ستائش و احترام کا شور بلند ہوا، بہت شور! اور شیخ کی صحبت میں رہ کر بہت سے ایسے صاحبِ دل حضرات پیدا ہوئے کہ وہ جس پر نظر ڈال دیتے تھے اُسے عظیم صفائی قلب حاصل ہو جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ “]

مرشدِ اوّل کی خدمت و صحبت اور راہنمائی میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے اُن سے کیا راز و نیاز رہے، اور اسرارِ الٰہی و عرفان و سلوک کے کیا کیا انکشافات ظہور میں آگئے، اس کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں لیکن عملی دُنیا میں حسبِ ضروریات وقتاً فوقتاً جو کرامتیں اُن سے ظاہر ہوئیں اور جن کا انھوں نے خود نور الدّین جعفر بدخشیؒ سے ذکر کیا ہے، اُن سے روشن ہو جاتا ہے کہ مرشدِ اوّل کی راہنمائی کس قدر عرفان آمیز تھی۔ بلکہ مُرشد نے اپنے صاحبِ استعداد خلیفہ کے عرفان کو معراج کی بلندیوں تک پہنچانے کے مقصد سے خود اپنی خواہش سے اُن کو اپنے پیرِ طریقت حضرت شیخ تقی الدّین علی دوستیؒ کی صحبت شریف میں دو سال تک رہنے کے لیے بھیج دیا۔ شیخ علی دوستیؒ کے کمالاتِ عالیہ کے بارے میں حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و خدمتِ شیخ علی دوستی قدس اللہ سرّہٗ چنان صافی بود کہ طاقتِ جز یک ذکر نداشت زیراک در آخر اثبات از یکدیگر غیبت کردی، و خدمتش بحرِ موّاج در اسرار دائم البسط بود۔ تا روزی از حضرت شیخ علاؤالدّولہ سوال کردہ شد کہ خدمت اخی دائم البسط چرا است؟ فرمود کہ از برای آنک حق تعالیٰ او را از لطف آفریدہ است۔ در اوان دیگر سوال کردہ شد کہ در حق اخی محبت بلا غایت است و حال آنکہ اخی را در اربعین کہ بگذرد چند واقعہ می باشد و شیخ محمد دیہستانی را در ہر روز چندین واقعہ دست می داد۔ جواب فرمود کہ علی دوستیؒ را ہر مقامی توقف می بخشند تا تحقیق مقامات کند و سالکان را ارشاد نماید۔ محمد دیہستانی از برای خود می دود (و حضرت شیخ بزرگ او را دوندہ می خواندی)۔ و در وقتِ دیگر فرمود کہ علی دوستی از محبوبان است

تا اگر ہر روز او ہزار نفس را قتل کند در روز محشر مسئول نہ باشد۔ محمد دہستانی از محبان است تا اگر ادبی را ترک کند مسئول باشد....."[1]

[..... اور حضرت شیخ علی دوستی قدس اللہ سرہٗ کی ذات اس قدر صاف اور خالص تھی کہ ایک ذکر کی تکمیل کی بھی اُن میں طاقت نہیں رہی تھی کیونکہ اثبات کے آخر میں وہ ایک دوسرے سے غیب ہو جاتے تھے۔ آپکی ذات طُغیان آمیز سمندر تھی اور اسرارِ الٰہی آپ پر ہمیشہ کُھلے رہتے تھے، چنانچہ ایک دن حضرت شیخ علاؤالدولہ[2] سے پوچھا گیا کہ اخی (علی دوستی) کی ذات پر کیونکر اسرارِ الٰہی ہمیشہ کھلے رہتے ہیں؟ فرمایا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو لُطف (صفتِ جمالِ الٰہی) سے پیدا کیا ہے۔ ایک اور موقع پر پوچھا گیا کہ آپ کی محبت اخی (علی دوستی) کے حق میں بے حد ہے حالانکہ جو چِلّے وہ کاٹتے ہیں اُن میں صرف چند ہی واقعات ان پر گذرتے ہیں جب کہ شیخ محمد دیہستانی پر[3] اس طرح کے واقعات بڑی تعداد میں ہر روز ہی گذرتے ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ علی دوستی کو ہر مقام پر ٹھہرا دیا جاتا ہے تا کہ مقامات کی تحقیقات کرے اور پھر سالکوں کی رُشد و ہدایت کرے۔ محمد دیہستانی تو اپنے لیے دوڑتا رہتا ہے (اور حضرت شیخ بزرگ اسے دوڑنے والا کہا کرتے)۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ علی دوستی محبوبوں میں سے ہے چنانچہ اگر وہ ہر روز ہزار نفوس کو بھی قتل کرے تو بھی قیامت کے دن اس سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں ہوگی۔ محمد دیہستانی محبّوں میں سے ہے اگر وہ ایک بھی قاعدے کو چھوڑ دے گا تو اُسے جواب دینا ہوگا ....]

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] شیخ ابوالمکارم رُکن الدین احمد بن محمد بن احمد بیابانکی سمنانی رح مشہور بہ علاءُ الدّولہ، حضرت تقی الدّین علی دوستی رح کے پیرِ طریقت تھے۔ حضرت علاءالدولہ رح سمنان کے بیابانک نامی گاؤں میں سال ۶۵۹ھ کے ذی الحجہ مہینے میں پیدا ہوئے، ۷۳۶ھ میں وفات پائی اور سمنان میں صوفی آباد میں مدفون ہوئے۔ [3] اخی شیخ محمد دیہستانی رح، حضرت علاالدولہ سمنانی رح کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ مولانا جامی رح نے نفحات میں آپ کا ذکر بہت ذوق و شوق سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو نفحات الانس صفحہ ۴۶۶ – ۴۴۵۔

مولانا نورالدین جعفر بدخشی رح نے لکھا ہے کہ:

"..... وبین الاصحاب مشہور است کہ شیخ علاء الدّولہ، قدس سرّہٗ باکمال مقام افرادی آستانۂ خلوت اخی تقبیل داد۔ خادم سوال کرد کہ: "شیخا! درین تواضع سرّی باشد۔ التماس آنست کہ مرا محرم بگردانی۔" حضرت شیخ جواب داد کہ: علی دوستی ما را مُریدی و شاگردیست کہ صد ہزار شیخ و استاد را شیخ و استاد است وبین الصوفیہ، کثّرہم اللہ تعالیٰ، معروف است کہ حضرت قطب، قدس سرّہ، در ہر سالی یکبار بہ زیارت اخی علی دوستی آمدی و وقت بودی کہ شیخ علاء الدولہ را دران صحبت اجازت نبودی ....."[1]

["..... اور اصحاب میں مشہور ہے کہ شیخ علاء الدّولہ، قدس سرّہٗ باوجود اپنے انفرادی مقام کمال پر فائض ہونے کے اخی (علی دوستی) کے آستانۂ خلوت کو چُومتے تھے خادم نے آپ سے پوچھا کہ: "مرشد! ایسی تواضع اور ایسی عاجزی؟ اس میں تو کوئی راز ہوگا۔ میری التماس ہے کہ مجھے اس راز سے واقف کر دیجیے۔" حضرت شیخ نے جواب دیا کہ علی دوستی ہمارا ایک ایسا مرید و شاگرد ہے جو لاکھ مرشدوں اور استادوں کا مرشد اور اُستاد ہے۔ اور صوفیاء حضرات اللہ تعالیٰ ان میں روز افزوں اضافہ کرے، کے یہاں مشہور ہے کہ حضرت قطب قدس اللہ سرّہٗ ہر سال ایک بار اخی علی دوستی سے ملاقات کے لیے آتے اور ایسا بھی وقت آتا جبکہ شیخ علاء الدّولہ کو بھی ان کی باہمی صحبت و مجلس میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی .....][2]

حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح نے بیان فرمایا:

"..... حضرت اخی ہر سال ہزار پالیز کردی بدستِ مبارکِ خود، و ہر سال خوب شدی و چون خربزہ رسیدی، بدستِ خود بمردم دادی ....."[3]

[حضرت اخی (علی دوستی) ہر سال اپنے مبارک ہاتھوں سے ایک ہزار خربوزوں کی کاشت کرتے اور ہر سال بہت اچھے نکل آتے اور جب خربوزے پختہ ہو جاتے تو خود اپنے ہاتھوں سے لوگوں میں بانٹ دیتے .....][4]

---

[1] خلاصۃ المناقب [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔ [4] ایضاً۔

دونوں پیرانِ طریقت کی دُنیاوی اور روحانی تربیّت، حضرت میر سیّد علی ہمدانی کے حق میں بیشک مستقبل کے لیے ایک بنیاد بن گئی اور جو رُوحانی پیشوائی، بالخصوص اِن کے لیے مہیّا رہی، وہ اس لحاظ سے بھی خاص تھی کہ دونوں پیرانِ طریقت اس حقیقت سے واقف اور آشنا تھے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نہ صرف یہ کہ صحیح النّسب سیّد اور فرزندِ رسولؐ تھے بلکہ تربیت کرنے کے ضمن میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں پیرانِ طریقت کو مامور فرمایا تھا۔ اس ضمن میں نظم المناقب کا مؤلّف کہتا ہے کہ، جب حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح مرشدِ اوّل شیخ محمود مزدقانی رح کی خدمت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے امرِ مبارک سے اپنے اُستاد کو ساتھ لے کر پہنچے تو مرشد نے دیگر باتوں کے علاوہ آپ سے یہ حقیقت بھی بیان کی کہ آپ کے میرے پاس طلبِ حقیقت کی خاطر آنے کی خبر مجھے آپ کے جدِّ بزرگوار حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے آج ہی رات کو دی۔ [1]

بُردم اُستاد با خودم ہمراہ
پیشِ آن رہنمایِ عزّت وجاہ
(اُستاد مجھے اپنے ساتھ لے گیا
اُس صاحبِ عزّت وحشمت راہنما کے پاس)

شیخ چون دید عزّتم فرمود
شرف سیّد از چہ این جا بود؟
(مرشد نے جب مجھے دیکھا تو میری عزّت کی۔ اور فرمایا کہ سیّد کی تشریف آوری یہاں کیونکر ہوئی؟)

عرض کردم بخدمت آمدہ ام
نے بہ نظّارہ در رہت شُدہ ام
(میں نے عرض کیا کہ آپکی خدمت میں آگیا ہوں۔ آپکی راہ کا صرف نظّارہ کرنیکے لیے نہیں آیا ہوں)

باز گفت آن مشافہہ دیدہ
شیخ ہم در مشاہدہ دیدہ
(پھر بیان فرمایا جو میں نے مشافہہ میں دیکھا تھا۔ اور جو شیخ نے بھی مشاہدہ میں خود ملاحظہ کیا تھا)

عرض کردم مرا مشاہدہ گو
چہ بُد ای پیر و رہبر نکو
(میں نے عرض کیا مجھے اپنا مشاہدہ سنا دیجیے
وہ کیا بات تھی اے میرے بہتر پیر و رہبر!)

گفت کامشب جدّت رسول اللہؐ
از قدومت مرا نمود آگاہ
(فرمایا کہ آج رات ہی آپکے جدّ رسول اللہؐ نے
مجھے آپ کے آنے کی اطلاع دی)

---

[1] نظم المناقب مؤلفہ غلام محمد ترالی۔

صاحبِ نظم المناقب، دوسرے پیرِ طریقت تقی الدّین علی دوستی رح کے بارے میں بھی لکھتا ہے کہ شیخ علاء الدّولہ نے اُن کو رسولِ اکرم صلّے اللہ علیہ وسلم کے امرِ مبارک سے حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت و رہنمائی فرمانے کی تلقین کی تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کو مؤلف یوں بیان کرتا ہے، کہ ایک دن تقی الدّین علی دوستی رح "سیادت ہمدان رح" (حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح) کے پاس تشریف لائے تو حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح نے آپ سے پوچھا کہ حضرت آپ کی تشریف آوری کی یہ عنایت کس وجہ سے ہے؟ تو شیخ تقی الدین علی دوستی رح نے جواب میں فرمایا:

گفت: ای سیّدِ ہدایت یاب　　　شیخِ دین آفتابِ عالمتاب
(کہا: اے ہدایت یافتہ سیّد!　　　آفتابِ عالم تاب، شیخِ دین)
ہادیِ دولتِ خدا دانی　　　شیخ علاء الدّولہ سمنانی
(عرفانِ الٰہی کی سعادت کے رہبر　　　یعنی شیخ علاء الدّولہ سمنانی)
بُود روزی بہ مجمعِ اصحاب　　　حاضرِ خدمتش ہمہ احباب
(ایک دن اپنے اصحاب کی مجلس میں تھے　　　اور سبھی احباب بھی انکی خدمت میں حاضر تھے)
سوی احقر یکی اشارت کرد　　　زان اشارت ہمی بشارت کرد
(تو انھوں نے اِس حقیر کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔　　　اور اس توجّہ و خطاب میں بشارت دی)
کہ شما را وصیّتی است زمن　　　گفتہ را از شما عمل کردن
(کہ آپ کے لیے میری ایک وصیّت ہے　　　۔ اور میرے اس کہنے پر آپ کو عمل کرنا ہوگا)
امر فرمود شیخ سمنانی　　　چونکہ سیّد علی ہمدانی
(شیخ سمنانی رح نے امر کیا　　　کہ جب سیّد علی ہمدانی رح)
می شود با شما دوچارہ زمن　　　بایدش ساختن اشارہ زمن
(آپ سے میری توجّہ سے ملاقات کریں گے　　　تو میرے حکم کے مطابق اُنکی تربیت کروگے)
چار ضرب از زبانِ من تعلیم　　　شد شما را برای او تسلیم
(ذکرِ چار ضرب کی تعلیم میری زبان سے　　　آپ کو اُن کی ہی خاطر ہوئی ہے)

عرض کردمش ای ہدایت جُو!   کیست سیّد علی ہمدان بگو؟
(میں نے عرض کیا اے پیرِ طریقت - یہ فرمائیے کہ سیّد علی ہمدانی کون ہیں؟)
گفت دانم کہ بعدِ من باشد   در شہی شہرۂ زمن باشد
(کہا: میں جانتا ہوں کہ وہ میرے بعد - شہنشاہی میں شہرۂ زمان ہوں گے)
با شما می بود ملاقاتش   در جہان نیک باشد اوقاتش
(آپ کے ساتھ اُنکی ملاقات ہوگی - اور دنیا میں اُن کا حال بہت اچھا ہوگا)
زان شما را نمودم این تلقین   کہ بدانید این سخن بہ یقین
(یہ تاکید و تلقین میں آپ کو اس لیے کر رہا ہوں۔ کہ یقین کے ساتھ تجھے اسکی خبر ہونی چاہیئے)
کامشب آمد مرا رسول اللہؐ   کرد از حالِ او مرا آگاہ
(کہ آج رات میرے پاس رسولِ اکرمؐ تشریف لائے۔ اور اُن کے حال سے مجھے آگاہ کر دیا)
کای علا آنچہ بہرہ خواہی داشت   بہرِ فرزند ما چہ خواہی داشت؟
(کہ اے علاؔ! جو کچھ تیرے حصّے میں آنیوالا ہے۔ اسمیں سے ہمارے فرزند کے لیے کیا رکھا ہے؟)
عرض کردم کہ: یا رسول اللہؐ!   کیست اولادِ تو نما آگاہ[لہ]
(میں نے عرض کیا: اے رسولِ خداؐ   آپ کے فرزند کون ہیں؟ مجھے آگاہی دیجیے)
داشتن بہرِ او چہ خواہم من   ہم بفرمای اے گزینِ زمن
(اور اِن کے لیے میں کیا رکھوں - یہ بھی فرما دیجئے اے زمانوں کے لیے چُنے گئے رسولِ خداؐ)
در زمان حضرت رسولِ خداؐ   سوی من یا ولد بدا دندا
(فوراً حضرت رسولِ خداؐ   نے اے فرزند کہہ کر مجھے آواز دی)
گفت، سیّد کہ چون بگوشم شد   بسوی استخارہ گوشم شد
(سیّد کا فرمانا ہے جونہی میرے کانوں میں یہ آواز پہنچی۔ تو میرے کان طلبِ عافیت کے لیے آمادہ تھے)

[لہ] اس سے ہماری اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ علاؤ الدولہ سمنانی رح نہ صرف یہ کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں تھے ہی نہیں بلکہ اپنے نامور خلیفہ تقی الدین علی دوستی رح کے حلقۂ ارادت میں آنے سے پہلے اُن سے واقف بھی نہیں تھے۔

باشما زان نمایم این تسلیم کہ کنیدش بذکر من تعلیم
(میں اسے آپ کے حوالے کر دیتا ہوں ۔ کہ اسے میرا بتایا ہوا ذکر سکھا دیجیے)

گویا دونوں پیرانِ طریقت کا انتخاب خود حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں پیرانِ طریقت اپنی ہدایت و رہنمائی کے علاوہ اس بنیادی اور اہم صداقت سے باخبر تھے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی حقیقی تربیت آغوشِ رسولؐ میں ہو رہی تھی جو ہر حال میں میر سیّد علی ہمدانیؒ کے حال سے باخبر رہ کر بوقتِ ضرورت خود اُن کے پاس تشریف لے جاتے، اور جب بھی حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ توجّہ فرماتے تو اپنے جدِّ بزرگوار کو حاضر پاتے، اُنؐ سے الہام لیتے، اُنؐ کی مدد چاہتے، اُنؐ سے ہدایات پاتے اور اُنؐ ہی کے زیرِ سایہ اپنے رُوحانی بلکہ ظاہری سفر تک کا بھی آغاز کرتے تھے۔ احمد غزالیؒ نے اپنے عظیم المرتبت برادر امام ابو حامد محمد غزالیؒ سے ایک بار کہا کہ جو شخص حضرت رسولؐ[1] کو جب بھی چاہے نہ دیکھ سکے وہ شخص حقیقت و عرفان سے خالی ہے۔ اس بارے میں جواہر الاسرار میں آیا ہے کہ ایک دن امام غزالیؒ نے اپنے بھائی شیخ احمدؒ سے کہا: اگر طریقِ شریعت میں اس سے اور زیادہ کوشش کرتے تو اچھے درویش بن جاتے۔ شیخ احمدؒ نے جواب دیا: اگر معرفتِ حق میں آپ زیادہ کوشاں رہتے تو بہتر عالم و دانشمند بن جاتے۔ امام نے کہا: میرا تو یہ خیال ہے کہ اس میدان میں سب سے آگے میں ہی ہوں۔ شیخ نے کہا کہ اسرارِ الٰہی کے بازار میں بھلا وہم و خیال کی وقعت ہی کیا؟ طے پایا کہ یہ مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ شیخ نے کہا کہ بہترین قاضی تو رسولِ خداؐ ہیں۔ امام غزالیؒ نے کہا ان کو کیسے دیکھا جائے؟ احمد غزالیؒ نے جواب دیا کہ جو شخص حضرت رسولِ خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جب بھی چاہے نہ دیکھ سکے وہ شخص حقیقت و عرفان سے خالی ہے۔ بہر حال رات کے وقت امام خلوت میں چلے گئے۔ اور عمیق توجّہ اور بے انتہا عجز و زاری کے ساتھ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] جواہر الاسرار مؤلفہ حسین ابن حسن سبزواری ۔ چھاپ لکھنؤ سال ۱۳۱۲ھ ص ۴۰ ۔ ۴۲ ۔

تشریف فرما ہونے کی سماجت کی۔ امام غزالیؒ پر نیند طاری ہوگئی اور خواب میں دیکھا کہ حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے ساتھ اُن کے کمرے میں تشریف لے آئے اور امام غزالیؒ کو حقیقت سے آشنا ہو جانے کی بشارت دی، جو آدمی حضرت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہمراہ تھا، اس کے ہاتھ میں ڈھکا ہوا ایک برتن تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے اس بشقاب میں سے کھجور کے چند دانے اٹھا کر امام غزالیؒ کو دیدیئے، امام جب بیدار ہوئے تو اُن کے ہاتھ میں یہ کھجور کے دانے تھے۔ جوش و خروش کے ساتھ اپنے بھائیؒ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے احمد غزالیؒ کی آواز آئی کہ برادر! کھجور کے دو تین دانوں پر اس قدر نہیں اترانا چاہیئے، جب دروازہ کھول دیا تو شیخ احمدؒ نے وہی برتن جس میں سے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے دانے اُٹھا کر امام غزالیؒ کو دیئے تھے، امام کو دکھاتے ہوئے کہا کہ جب تک حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے میری مرضی نہ پوچھی انہوں نے کھجور کے یہ چند دانے آپ کو نہیں دیئے۔

حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح النّسب فرزندِ رسول ہونے کی سعادت نصیب تھی اور اس پر مزید یہ کہ جیسا خلاصۃ المناقب سے روشن ہو جاتا ہے حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے اس فرزند والا مرتبت کو، جن سے آیندہ زندگی میں دینِ اسلام کے حق میں خلفائے راشدین کے کاموں کے مشابہ اُن سے مبلّغانہ اور مجاہدانہ نیز درویشانہ کام لینے تھے، قدم قدم پر سہارا دیتے، زندگی کے اصل مقاصد دینی نکتۂ نظر سے سمجھا دیتے اور اصلاحی، معاشی اور اخلاقی فرائض سے آگاہ فرماتے۔

حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ و بالمعاینہ دیداروں کا ذکر خلاصۃ المناقب میں یوں آیا ہے:-

"...... حضرت سیادت، قدس سرہ، فرمودند...... تا گاہ مرا غیبتی بحصول موصول گشت و جمالِ جہان آرای مصطفےؐ را بدیدم بر بام بلندی و چون خواستم تا دران مقام بروم مصطفےؐ فرمودند! کہ فرزند! تو نتوانی درین مقام آمدن۔ یہ نزدیک شیخ محمود برو تا ترا درین مقام بیارد....."[1]

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

[... حضرت سیّد نے فرمایا، قدّس سرّہٗ، ..... اچانک مجھ پر غیبت طاری ہوگئی اور میں نے ایک بلند جگہ پر رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا دنیا کو زیب و زینت عطا کرنے والا حُسن و جمال دیکھا اور جب میں نے اُس جگہ تک جانا چاہا تو رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے بیٹے! تم اس جگہ تک نہیں آسکتے۔ شیخ محمود کے پاس جاؤ کہ وہی تمہیں اِس جگہ پر لے آئیں گے ...]

"..... چون به بیت المقدس رسیدم، شبی حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم در واقعہ دیدہ شد کہ از آستین مبارک، رسول علیہ السّلام، جزوی بر آورد و بمن داد، و نظر کردم، دیدم کہ ہمین اوراد است کہ از الفاظ مشائخ گرفتہ ام و جمع کردہ ....."[1]

[جب میں بیت المقدس پہنچا تو ایک رات میں نے حضرتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو واقعہ میں دیکھا کہ حضرت رسول علیہ السّلام نے اپنی آستین مبارک سے ایک کتابچہ نکالا اور مجھے عطا فرمایا۔ میں نے اسے دیکھا کہ یہ وہی 'اَوْرَاد' ہے جسے میں نے مشائخ کی زبان سے سُنا اور جمع کیا ہے ....]

"..... حضرتِ سیادت .... . فرمود اگر چہ ما را غضبی می باشد اما غضبِ ما رحمت است بر مغضوب علیہ، زیرا کہ در اوائلِ سلوک در ہر دوشنبہ ما را بہ حضرت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلّم صحبت خاصّہ می بود و از غضب خود ملالتی در خاطر می آمد۔ لاجرم حضرت مصطفےٰؐ فرمود کہ ملول مشو کہ غضبِ تو رحمت است۔ پس غضبِ ما موجب رحمت و ترقی باشد...."[2]

(حضرت سیّد نے فرمایا ..... اگرچہ ہمیں غصّہ آتا ہے لیکن ہمارا غصّہ باعثِ رحمت ہے اُس آدمی پر جس پر ہمیں غصّہ آتا ہے، کیونکہ سلوک کی تربیت کے ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر سوموار کے دن میری خاص ملاقات ہوتی تھی اور میں اپنے غصّے ہو جانے پر غمگین رہا کرتا تھا۔ رسولِ خدا صلّے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غمگین نہ ہو کیونکہ تمہارا غصّہ رحمت ہے۔ اس لیے میرا غصّہ رحمت اور ترقی کا باعث ہے ....)

---

[1] حضرت امیر سید علی ہمدانی رح کا بیان خلاصۃ المناقب میں۔ [2] خلاصۃ المناقب

"..... جناب سیادت فرمود کہ ہفت سال کُرتہ نپوشیدم و از طعام جز نانِ جَو نخوردم و بعد از ہفت سال بزرگی کُرتہ خوبی و طعام لذیذی آورد و التماس نمود این را قبول باید کردن کہ باشارت مصطفےٰؐ آوردم۔ جواب گفتم کہ بدین دعویٰ شاہد باید آن بزرگ تبسّم نمود و فرمود کہ چگونہ شاہد باید؟ گفتم ہمچنین کہ مرا نیز اشارت فرماید۔ گفت: لاجرم ترا نیز توجّہ باید کردن۔ چون از ان صحبت فراغ حاصل آمد توجّہ کردم، حضرت رسول را در خواب دیدم۔ تبسّم نمود و فرمود کہ التماس باشارت من است۔ لاجرم اجابت کردم ....."[1]

[..... جناب سیّد نے فرمایا کہ سات سال تک میں نے قمیض نہیں پہنی اور غذا میں سوائے جَو کی روٹی کے اور کچھ نہ کھایا، سات سال کے بعد ایک بزرگ ایک عمدہ قمیض اور لذیذ خوراک لے آیا اور التماس کی کہ اسے قبول کیجئے کیونکہ اسے میں رسُولِ خدا صلّے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کے اس دعوے کے حق میں گواہ چاہیئے۔ وہ بزرگ مسکرا دیا اور فرمایا کہ کس طرح کا گواہ چاہیے؟ میں نے کہا وہی جو مجھے بھی حکم دے۔ کہا پھر تو لازماً آپ بھی توجّہ کریں۔ جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو میں نے توجّہ کی اور حضرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے تبسّم فرمایا اور فرمایا کہ بزرگ کی التماس میری رضا سے تھی۔ میں نے اُس بزرگ کی لائی ہوئی چیزوں کو قبول کیا ....."]

"جنابِ سیادت فرمود کہ وقتی در سفر بودم و میرفتم۔ ناگاہ چند سواری ملاقات نمودند و یکی از ان سواران فرود آمد و سر بر قدم این درویش نہاد و بسیار بگریست۔ پس از و سوال کردم کہ تو کیستی؟ گفت۔ من فلان تُرکم بندۂ شما کہ حضرت امیر شہاب الدّین مرا بہ فلان امیر بخشیدہ بود و دو بیست دینار آورد و التماس نمود کہ باید قبول کردن۔ لاجرم مقبول آمد و صد دینار را یک دعوتِ ساختہ شد از بہر فقرا کہ ماندہ شدہ بودند از تعب راہ، و من نیز از ان دعوت تناول کردم۔ بعدہٗ در واقعہ دیدم کہ حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

فرمود کہ بعد از ریاصتِ سالہا حرام نہ باید خوردن۔ چون بیدار شدم بہ تکلیف قی آوردم ...“ [1]

[جناب حضرت سید نے فرمایا کہ ایک بار میں سفر میں تھا اور چل رہا تھا۔ اچانک چند سواروں سے ملافات ہوئی اور ان میں سے ایک نیچے انترا اور مجھ درویش کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے بہت رویا۔ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ میں فلاں تُرک ہوں آپ کا ملازم جسے حضرت امیر شہاب الدینؒ نے فلاں امیر کو بخش دیا تھا اور اس نے دو سو دینار نکالے اور استدعا کی کہ انہیں قبول کیجئے۔ ناچار میں نے قبول کیے اور ایک سو دینار میں فقراء کے لیے دعوت کا اہتمام کیا کیونکہ وہ راستے کی دشواریوں کے سبب تھک گئے تھے اور میں نے بھی اس دعوت میں کھانا کھایا۔ بعد میں میں نے واقعہ میں دیکھا کہ حضرت رسولؐ نے مجھ سے فرمایا کہ سالہا سال کی ریاضت کے بعد حرام نہیں کھانا چاہیئے۔ جب میں جاگا تو سخت کوشش سے میں نے قے کی ......]

”... و دیگر بار حضرت مصطفےٰ را صلے اللہ علیہ وسلم در واقعہ دیدم۔ فرمود کہ از کسب خود باید خوردن۔ گفتم کدام کسب؟ گفت: کلاہ دوزی ...“ [2]

[اور پھر ایک بار حضرتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلّم کو واقعہ میں دیکھا اور فرمایا کہ خود کسب کر کے کھانا چاہیئے۔ میں نے کہا کون سا کسب؟ فرمایا: ٹوپیاں سینے کا .....]

”... جناب سیادت فرمود کہ از حضرت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلّم پرسیدم کہ ما معنی الفصوص؟ جواب فرمود: الفصوص ہُوَ اللہ ...“ [3]

[جناب حضرت سیّدؒ نے فرمایا کہ میں نے حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ فصوص کے معنی کیا ہیں؟ جواب میں فرمایا: فصوص کے معنی ہیں ہُوَ اللہ!]

”... جنابِ سیادت فرمود کہ چون از قریۂ علی شاہ بہ نیّتِ حج بیرون آمدم و آنچ بُود از خرجی، بہ مستحقان صرف میکردم۔ تا بہ نزدیک رسیدم خرجی اندک ماندہ بود۔

---

[1] خلاصۃ المناقب [2] حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کا بیان بہ حوالۂ خلاصۃ المناقب [3] خلاصۃ المناقب۔

ناگاہ صالحی آمد در آن منزل کہ من نزول کردہ بودم، و دوازدہ ہزار دینار از نقرہ آورد، والتماسِ قبول نمود و گفت کہ این بہ اشارتِ حضرتِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلّم است۔ لاجرم قبول کردم۔ بعدہٗ ازان صالح پرسیدم کہ آن اشارت چگونہ بود؟ گفت: این دِرمہا بہ نیّتِ حج نگاہ داشتہ بودم، و در استعدادِ آن بودم کہ حضرتِ مصطفےٰ را صلے اللہ علیہ وسلم بخواب دیدم و مرا فرمود کہ این دِرمہا را نگاہ دار تا بہ فرزندی از فرزندانِ ما کہ بہ حج رود و درین منزل نزول کُند، بدہی۔ من سؤال کردم کہ آن فرزند را چہ نام باشد؟ فرمود کہ علی ہمدانی رح۔ و ازان خواب تا اکنون یک سال تمام است و درین یکسال، دائمؔ ازین منزل باخبر بودہ ام و از احوالِ مسافران تفتیش کردہ ام تا اکنون بہ لقایِ مبارکِ سیادت مشرّف شدم ....“ [1]

[....جناب حضرت سیّد رح نے فرمایا کہ جب میں قریۂ علی شاہ سے حج کرنے کی نیت سے نکلا تو خرچ سفر کی صورت میں جو کچھ میرے پاس تھا میں اسے حاجتمندوں میں خرچ کرتا رہا۔ جب میں قریب پہنچنے لگا تو میرے پاس خرچ کم رہ گیا تھا۔ اچانک ایک صالح آدمی اس جگہ آیا جہاں میں ٹھہرا تھا اور چاندی کے بارہ ہزار دینار نکال کر مجھ سے قبول کرنے کی استدعا کی اور کہا کہ یہ رقم میں حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کو دے رہا ہوں۔ لازمی طور پر مجھے یہ رقم قبول کرنا پڑی۔ پھر میں نے اس صالح آدمی سے پوچھا کہ یہ حکم حضرت رسول صلّی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو کیسے ملا۔؟ اُس نے کہا کہ میں نے یہ پیسے اپنے لیے حج کرنے کی نیّت سے رکھ لیے تھے اور میں تیاری میں مصروف تھا کہ میں نے حضرتِ رسول صلّے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور مجھ سے فرمایا کہ اِن پیسوں کو محفوظ رکھو جب تک ہمارے فرزندوں میں سے ایک فرزند جو حج کے لیے آئے گا اور اس جگہ ٹھہرے گا تو یہ رقم اُس کو دیدینا۔ میں نے عرض کیا اُس فرزندِ رسول ص کا نام کیا ہوگا؟ فرمایا، علی ہمدانی رح۔ اُس خواب سے آج تک پورا ایک سال گزر چکا ہے اور اس ایک سال میں ہمیشہ میں اِس جگہ کے بارے میں خبردار رہا اور مسافروں کے حال احوال سے متعلق پوچھتا رہا جب کہ اب آپ سیّدِ بزرگوار کے روئے مبارک کے دیدار کی سعادت مجھے نصیب ہوئی....]

[1] (خلاصۃ المناقب

جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان بیانات اور ملفوظاتِ مبارکہ سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ آپ کی باطنی تربیت، ظاہری مرشدین کی رہنمائی کے علاوہ، خود اُن کے جدِّ بزرگوار حضرتِ صاحب المعراج، مالک سدرۃ المنتہیٰ، صاحب قاب قوسین، جناب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم، فرماتے تھے۔ سلوک کے اوائل میں، جبکہ شیخ محمود مزدقانی رح کی خانقاہ میں آپ محوِ ریاضت ہوتے، ہر سوموار کو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپکی خاص ملاقات اور مجلس ہوا کرتی اور ظاہر ہے اپنے فرزند رح کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی توجّہ و تعلیم اور دونوں مُرشدین، شیخ محمود مزدقانیؒ اور شیخ علی دوستیؒ کی وساطت سے تعلیم و تدریسِ روحانیت کا اہل اور مستعد بنایا، اور نکاتِ عرفان اور علم لدنی، نیز دینی اور دُنیاوی تعلیمات، جن کے نتیجے میں میر سیّد علی ہمدانی رح ایک حقیقت شناس اور صاحبِ عمل مجاہد، صوفی، درویش، جہان بین، زاہد، عالم کم نظیر، بے مثال ادیب اور عظیم الشان دینی مبلّغ کی حیثیت سے دُنیا میں آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہوکر ابھرے، کے حقایق جو اُنہیں رسولِ برحق صلّے اللہ علیہ وسلم نے سکھائے اُن کی تفصیل اگرچہ ہم پر مکشوف نہیں، لیکن اس ایک اہم اور با معنی مختصر جملے سے جو اُن کے مرشدِ اول شیخ شرف الدّین مزدقانی رح نے ان کے خانقاہ میں داخل ہونے کے روز ہی ان سے کہا تھا، اُن کے حال و مستقبل کے صاحبِ کمال مردِ مومن ہونے پر بیّن دلیل ہے۔ شیخ مزدقانیؒ نے اس فرزندِ رسولؐ سے کہا تھا:

"یا سیّد! اگر برای مخدومی در خانقاه آمدی، من در خدمتِ شما از سرقدم سازم، که مریدان نه باید که در خدمت تقصیر کنند...."

[اے سیّد! اگر آپ سردار اور مخدوم کی حیثیت سے خانقاہ میں آئے ہیں تو میں اپنے سر کے بل آپکی خدمت کروں گا۔ کیونکہ مُریدوں کو خدمت کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے...]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرشد کو خود اپنے کمالِ روحانیت سے یہ بصیرت حاصل تھی کہ حضرت میر سید علی ہمدانی رح رسولِ کریمؐ کے صرف فرزند ہی نہیں بلکہ تربیت یافتہ بھی ہیں۔ اور اسی تربیتِ نبویؐ کی بدولت اور برکت سے میر سیّد علی ہمدانی رح دونوں مرشدوں کی خانقاہ میں پہلے سے

ہی ایک صاحبِ استعداد شاگرد و سالک کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ظاہر ہے جب ایک سالک میں استعداد اور مایۂ قلب موجود ہو تو اس کی جان پر احوال طاری ہوتے رہتے ہیں جو بعد میں کسب و مجاہدے کے پابند بھی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک موہبتِ الٰہی ہوتی ہے، ایک کیفیت، جو غیب سے اُس کے قلب میں داخل ہو جاتی ہے اور برق کی مانند اس کے دل کو ایک طرح کی روشنی عطا کرتی ہے۔ ان کیفیات کی توصیف و تعریف نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہر صورت ان کی غایت خدائے برحق کے ساتھ اتّصال ہے۔ یہ اتّصال حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کو نورِ محمدیؐ، راہِ محمدیؐ، براہِ راست تربیت و ہدایت محمدیؐ، یعنی وجودِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے توسط سے حاصل ہوا۔ اس سعادت کے لحاظ سے دُنیائے تصوّف، عالمِ طریقت اور شریعت میں جناب میر سیّد علی ہمدانیؒ یکتا ہیں اور اُن کا کوئی ثانی نہیں۔

سمنان میں اخی شیخ تقی الدّین علی دوستی سمنانیؒ کی خانقاہ میں پُر مشقت اور پُر فیض و اشارت اور رُشد و ہدایت کے دو سال کی مدّت گذرنے کے بعد، جہاں وہ اپنے اوّلین پیرِ طریقت شیخ شرف الدّین محمود مزدقانیؒ کے امر سے داخل ہوئے تھے شیخ علی دوستیؒ نے میر سید علی ہمدانیؒ کو سرمایہ پانے کے بعد واپس شیخ مزدقانیؒ کے پاس بھیجدیا۔ روضات الجنات میں اس بارے میں بیان ہوا ہے:

> "..... بعد از مدّتی کہ حضرت امیر سیّد علی ہمدانی، قدس اللہ سرّہٗ، در ملازمتِ اخی علی دوستی بودہ اند، و فوائد عظیم از ملازمتِ آن بزرگوار بہ وی رسیدہ، فرمودہ اند کہ: یا سیّد! شما را باز بہ صحبتِ برادرم شیخ محمود مزدقانیؒ باید رفتن۔ روزی چند توقف می افتد۔ حضرت اخی در وقت معتاد کہ چاشت بودہ باشد از خلوتِ بیرون نمی آیند۔ درویشان از حضرت امیر التماس می نمایند کہ شما را بہ خلوت اخی در می باید آمدن۔ التماس اجابت نمودہ چون در می آیند می بینند کہ حضرت اخی بہ جانب اثبات سر بہ زانوی مبارک نہادہ ودیعت جان بہ قابضِ ارواح سپردہ ہوای فضای ملکوت را مسکن ساختہ اند۔ حضرت میر استرجاع گویان از خلوت بیرون می آیند و این خبرِ جانسوز دلگداز را بہ درویشان

میگویند۔ مخلصان، طریقِ تقریب بجای آوردہ و بہ تجہیز و تکفین مشغول نمودہ و در صوفیا باد (صوفی آباد) سمنان مدفون می گردند۔ بعد از سہ روز حضرتِ میر، عزیزان را بدرود نمودہ باز بخدمتِ شیخ محمود مزدقانی مشرّف می گردند۔۔"[1]

[اُس مدّت کے بعد، جس میں حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح قدس سرّہٗ اخی علی دوستی کی خدمت میں رہے اور اُس شیخِ بزرگوار سے اُن کو عظیم فیوض حاصل ہوئے، اُن سے فرمایا کہ: اے سیّد، اب آپ کو پھر برادرم شیخ محمود مزدقانی رح کی خدمت میں لوٹ جانا چاہیئے۔ چند دنوں کے لیے آپ ٹھہر گئے۔ معمول کے وقت پر، جو دن چڑھے کا ہوا کرتا تھا، وہ خلوت سے باہر نہیں آئے۔ درویش حضرات، حضرتِ امیر رح سے التماس کرتے ہیں کہ آپ اخی کی خلوت میں داخل ہو کر دیکھ لیں۔ التماس قبول کرنے کے بعد جب وہ اندر داخل ہوئے تو دیکھتے ہیں کہ حضرت اخی اثباتِ ذکر کی طرف سر گھٹنے پر رکھے اپنی روح کو جانوں کے قبض کرنے والے کے سپرد کر کے عالمِ ملکوت میں سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔ حضرت میر اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون پڑھتے ہوئے خلوت سے باہر آجاتے ہیں اور یہ جان سوز دلگداز خبر درویشوں کو سناتے ہیں یاران و درویشانِ مخلص، تقریب کی رسم بجا لاکر تجہیز و تکفین میں مشغول ہو جاتے ہیں اور حضرت اخی سمنان کے صوفیا باد (صوفی آباد) میں مدفون ہو جاتے ہیں۔ تین دن کے بعد حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح عزیزان و احباب کو الوداع کر کے واپس شیخ محمود مزدقانی رح کی خدمت میں آ کر مشرف ہو جاتے ہیں.....]

مرشدِ اوّلین کی خدمت میں حاضر ہو کر بالآخر انھوں نے آپ کو رُبعِ مسکون[2] کے سفر کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔ گویا روحانی سفر کی تکمیل کے بعد دُنیاوی سفر کے تجربوں سے گذارہ دیئے جانے کی تربیت بھی آپ کے مجموعی سفروں میں شامل کر دی گئی تھی، اور اِن سفروں میں ہی آپ کے اُن مقاصد اور مُرادوں کی تکمیل ہو گئی جن کے لیے آپ کی پرورشِ آغوشِ

---

[1] روضات الجنّات و جنات الجنان تألیف حافظ حسین کربلائی تبریزی جلد دوم صفحہ ۲۸۲۔ نیز ملاحظہ ہو: خمخانہ وحدت بہ کوشش عبدالرفیع حقیقت۔ تہران۔ [2] ربع مسکون، یعنی تمام دنیا کا وہ ایک چوتھائی حصّہ جو معمور اور آباد ہے باقی تین حصّوں پر پانی حاوی ہے اور پوری دنیا صرف ایک حصّے پر غالب ہے۔

رسولؐ میں اور تربیت و راہنمائی پیرانِ طریقت کی خانقاہوں میں ہوئی تھی۔ اور ان تمام سفروں میں بدستور آپکی بیشتر نگرانی خود آپکے جدِّ بزرگوار صلے اللہ علیہ وسلم کی ہی تھی۔ ان طویل سفروں میں اگرچہ آپ محسودِ علماء و امراء بھی رہے اور کڑی آزمایشوں سے بھی گزرے، لیکن ایک مدینۂ فاضلہ اور توحیدِ الٰہی اور عقائدِ دین اور اسلامی تعلیمات کی بنیادوں پر ابنائے آدم کے درمیان اخوّت و محبّت کے قیام کے لیے تبلیغ و تلقین، رہنمائی اور وعظ و نصیحت اور جدّ و جہد کے اپنے منتہائے مقصد کو قایم کرکے ہی رہے اور اس کی تکمیل و تحصیل کے لیے سفر و حضر میں آپ کو جن جسمانی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا اُن کو آپ نے لذّت تلاش و جستجو میں تحمل کرکے فراموش کر دیا۔

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ آپ پیرِ مزدقانؒ کی خانقاہ سے اُن کے ارشاد کے مطابق کس سال سفر پر روانہ ہوئے لیکن قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ بیس یا یقیناً بائیس سال کی عمر میں آپ ربعِ مسکون کے سفر پر روانہ ہوئے ہوں گے اور یہ سال سنہ ۶۳۴ھ / سنہ ۱۲۳۶ء یا سال سنہ ۶۳۶ھ / سنہ ۱۲۳۸ء کا واقعہ ہے۔

خلاصۃ المناقب میں جن جگہوں پر آپ کے اسفار کا ذکر ہوا ہے ان میں بدخشاں، ختلان، خطا (چین) ماوراء النہر، سراندیپ (لنکا) مکّہ، بغداد، شام اور روم شامل ہیں۔ نیز ختلان میں یا باہر کی جن جگہوں یا دیہات یا قریوں کا ذکر آیا ہے، ان میں قریہ علی شاہ، قیچغای، توزقرغان، پل بندک (اندراب) روستا، طالقان، مشہد، دشت کولک اور ردنت جوبک[1] بھی آپ کے سفر میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ لطائف اشرفی میں جن واقعات کا حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی ہمرکابی میں آپ کے ایک ہمعصر عارف باللہ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے ذکر کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سفروں کے دوران حضرت سیّد اشرفؒ آپ کے ہمراہ تھے۔ ذیل میں ہم لطائف اشرفی سے اس بارے میں بعض واقعات کا حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی زبانِ مبارک سے ہی ذکر کرتے ہیں:۔

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

"... امیر سیّد علی بن شہاب بن محمد الہمدانیؒ جامع بودند میان علوم ظاہری و باطنی۔ مصنّفاتِ وی مشہور اند چون، کتاب اسرار النقط، و شرح اسماء اللہ، و شرحِ فصوص الحکم، و شرحِ قصیدۂ خمریۂ فارضیہ، وی مرید شیخ شرف الدین محمود بن عبداللہ المزدقانی است و وی مرید شیخ علاؤ الدولہ سمنانی است و وی مُرید شیخ نور الدین عبد الرحمٰن و وی مرید شیخ احمد جوزجانی و وی مرید شیخ علی لالا ...." [1]

[.... امیر سیّد علی بن شہاب بن محمد الہمدانیؒ ظاہری اور باطنی علوم میں تمام اور کامل تھے۔ ان کی تصانیف مشہور ہیں جیسے اسرار النقط، شرح اسماء اللہ، شرح فصوص الحکم اور شرحِ قصیدہ خمریۂ فارضیہ۔ وہ شیخ شرف الدین محمود بن عبداللہ المزدقانی کے مرید ہیں اور وہ مرید ہیں شیخ علاؤ الدولہ سمنانی کے، اور وہ شیخ نور الدین عبد الرحمٰن کے مرید ہیں اور وہ مرید ہیں شیخ احمد جوزجانی کے اور وہ مرید ہیں شیخ علی لالا کے ....]

"..... این درویش در روی زمینِ رُبعِ مسکون، و در صحرای رُبع مشجون بسیار سیر کرده، بلکہ در ملازمت علی الثانی حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ یک مرتبہ ہر چہار گوشۂ روی زمین، و مآثر و اکابر یمین و یسار دیده و از ہر باغی گُلی چیده ...." [2]

[... اس درویش نے رُبع مسکون کے رُوی زمین اور اس عظیم صحرا کے حصّے پر بہت سیر کی بلکہ ایک بار تو علی الثانی حضرت امیر سیّد علی ہمدانیؒ کی ہمراہی میں رُوئے زمین کے تمام چہار اطراف میں گھوم کر عمدہ یادگاریں دیکھیں اور دائیں بائیں کی جگہوں میں اکابرین سے ملاقات اور ہر باغ سے گُل چینی کی ...]

---

[1] لطائف اشرفی۔ پندھواں لطیفہ۔ [2] مکتوباتِ اشرفی، سُبحان اللہ مجموعہ، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نسخۂ خطی، چھیاسٹھواں باب۔

"....حضرت قدوۃ الکبریٰ میفرمودند کہ سیّد علی ہمدانی رح جامع بودہ است در علم ظاہری و باطنی۔ بہ شیخ شرف الدین محمود گفت: فرمان چیست؟ وی توجہ کرد و گفت کہ فرمان آنست کہ اقصای عالم بگردی۔ سہ نوبت رُبعِ مسکون را سیر کردہ۔ یکبار چون آفتاب گرد گیتی گشت۔ این فقیر کہ اشرف است برکاب او چون ذرّہ می گردید و بسی از فوائد سلوک و موائد صعلوک و مواجید و اذواق کہ از حضرت سیّد یافتم، اگر ہر سر موی لسان گردد شکر او از ہزار یکی نتوانم گردید....."[1]

[حضرت قدوۃ الکبریٰ (برگزیدہ پیشوا) [یعنی سیّد اشرف جہانگیر سمنانی رح] فرمایا کرتے تھے کہ سیّد علی ہمدانی رح ظاہری اور باطنی علوم میں کامل تھے۔ انھوں نے (اپنے پیرِ طریقت) شیخ شرف الدین محمود سے کہا کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ انھوں نے (یعنی پیرِ طریقت نے) مراقبہ کیا اور فرمایا کہ حکم یہ ہے کہ دنیا کا سفر کیجئے۔ تین بار آپ نے رُبعِ مسکون کی سیر کی اور ایک بار تو آفتاب کی طرح زمین کے گرد گھومے۔ یہ فقیر جو اشرف ہے انکی رکاب میں ذرّے کی مانند گھومتا رہا، اور سلوک کے بہت سے فوائد اور درویشی اور وجد و حال کے بہت سارے بھرے ہوئے خوان جو مجھے اُن سے عطا ہوئے، ان کی شکر گذاری میں اگر میرے بدن کا ہر ایک بال ایک زبان بن جائے تب بھی میں انکے ہزاروں احسانات میں سے ایک کا بھی شکریہ ادا نہیں کر سکتا....]

"..... حضرت سیّد علی ہمدانی رح میفرمودند کہ صحبت ہزار و چہار صد ولی را دریافتہ ام و از ہر یکی اکابر بسوی من فائدہ رسید و از آن فوائد، فرزند اشرف! ترا ہم نصیبی رسیدہ است۔ روزی کہ حضرت سیّد در مدینۃ الاولیاء بہ چہار صد ولی در یک مجلس رسیدہ اند این فقیر کہ اشرف است حاضر بود۔ ذوقی کہ از دیدارِ متبرکہ و حظی کہ از عذارِ منوّرہ ایشان در آن روز یافتم ہرگز از یاد نمی رود...."[2]

---

[1] لطائف اشرفی۔ دوسرا لطیفہ۔ [2] لطائف اشرفی۔ سترھواں لطیفہ۔

[. . . . حضرت سید علی ہمدانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک ہزار چار سو[۱۴۰۰] اولیاء اللہ کی صحبت پائی ہے[1] اور ان اکابرین میں سے ہر ایک ولی سے مجھے فائدہ پہنچا، اور ان فوائد میں سے، اے فرزند اشرف! تجھے بھی حصّہ پہنچا ہے۔ ایک دن جبکہ مدینۃ الاولیاء میں حضرت سید ایک ہی مجلس میں چار سو اولیاء اللہ کی صحبت میں تھے[2] یہ فقیر جو اشرف ہے حاضر تھا۔ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے دیدارِ مبارک سے جو ذوق اور اُن کے پُرنور چہرۂ مقدّس کو دیکھ کر جو لذّت مجھے اُس روز ملی، وہ ہرگز میں بھول نہیں پاتا. . .]

لطائفِ اشرفی میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کاشان میں یہ دونوں حضرات مختلف علمی مجلسوں میں باہم شریک تھے۔ کاشان میں ہی دونوں اس علمی مجلس میں شریک تھے جبکہ وہاں لفظ تصوّف پر گفتگو ہو رہی تھی۔ حج کا فریضہ ادا کرنے کے بعد جب حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ لوٹے، تو روم کی بندرگاہ میں آپ کی ملاقات حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ سے ہوئی جہاں دونوں کے درمیان حقایق و معارف الٰہی کی باتیں ہوئیں[3] حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ یمن میں بھی تھے جہاں آپ نے امام عبداللہ یافعیؒ کے ساتھ ایک مجلس میں وحدت الوجود اور شیخ محی الدین ابن العربی کے بارے میں گفتگو کی۔ اس مجلس میں حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ بھی شامل تھے۔[4]

---

[1] اس مجلس کا ذکر خلاصۃ المناقب کے حوالے سے میر سید علی ہمدانیؒ کی زبانِ مبارک سے گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔

[2] اس کا بھی ذکر اس سے پہلے اوراق میں ہو چکا ہے۔ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے اس مجلس کے بارے میں فرمایا "... این مجموع چہار صد در یک مجلس دیدہ شدہ است، در مجمع سلطان ابو سعید علیہ الرحمۃ" [چار سو اولیاء اللہ کا یہ مجمع میں نے ایک ہی مجلس میں سلطان ابو سعید علیہ الرحمۃ کے مجمع میں دیکھا. . .] سلطان ابو سعید سال ۷۱۷ھ میں تخت نشین ہوا اور سال ۷۳۶ھ میں وفات پائی۔ گویا انیس[۱۹] سال کے اسی عرصے میں کسی سال حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے یہ ملاقات سلطانیہ میں کی تھی۔

[3-4] لطائف اشرفی۔ چوتھا لطیفہ (کاشان کی مجلس کے سلسلے میں) اور سولھواں لطیفہ (حقایق و معارف کے بارے میں) اور مقدمہ (وحدت الوجود کے بارے میں یمن میں)۔

خلاصۃ المناقب میں جو جگہیں حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے سفر میں شامل ہیں وہ نا تمام ہیں اور لطائفِ اشرفی اور مکتوباتِ اشرفی کے حوالے سے ان جگہوں میں مزید اضافہ ہوا ہے جیسے مدینۃ الاولیاء (سلطانیہ) کا شان اور یمن ۔ نظم المناقب کے مؤلف نے بھی بلخ، بخارا، اردبیل اور آخر میں کشمیر کا اضافہ کیا ہے ۔[1]

جیسا کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رح نے فرمایا ہے کہ اس سوال کے جواب میں کہ میرے لیے کیا حکم ہے، مرشدِ طریقت حضرت شرف الدین محمود مزدقانی رح نے اپنے مُرید صادق حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے لیے مراقبہ کیا اور جواب دیا کہ حکم یہی ہے کہ دُنیا کا سفر اختیار کیجیے ۔ صاف ظاہر ہے کہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، یہ مراقبہ دراصل باطنی ارشاد تھا جو حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ مبارک سے تھا ورنہ بظاہر مراقبہ میں جانے کی چنداں حاجت نہیں تھی ۔ ان تمام ممالک کا سفر ظاہر کرتا ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک میں ہوئے تھے لیکن نظم المناقب اور مستورات کے مؤلفین نے فرنگ اور چین کے علاقے میں بھی سفر کا ذکر کیا ہے ۔[2] ذیل میں مندرجہ بالا حوالوں سے ان ممالک کے اسفار کا ذکر کیا جا رہا ہے جن میں پیش آنے والے واقعات کا بھی خود جناب حضرت میر سید علی ہمدانی رح نے تذکرہ فرمایا ہے ۔ نیز ان رفقاء اور طالبانِ صادق نے بھی عینی شاہدوں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے جو آپ کے ہمرکاب تھے ۔

بدخشان میں ایک مسجد میں جسے حضرت شاہ بہاء الدین کی ہمشیرہ محترمہ تاج الملکات زبیدہ ترکان نے برگزیدہ حضرات سادات کے لیے بنایا تھا حضرت میر سید علی ہمدانی رح نے یہ حکایت اپنے رفقاء اور طلاب کو سنائی تھی:

"..... و خدمتِ شیخ سعید حبشی کہ صوفیان آن بزرگوار ابوسعید گویند،

---

[1] رسالہ مستورات میں بھی ان جگہوں کا ذکر ہے ۔ [2] تمام عالم کی سیر جناب غوثِ صمدانی حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے طی مکان کی کرامت سے کی ہے جیسا کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رح نے فرمایا کہ ایک بار: "چوں آفتاب گرد گیتی گشت" (سورج کی طرح سارے عالم کے گرد گھومے) ۔

در ہر زمان، بصورتِ دیگر دیدہ شدی، و با ہر زائری یکبار صحبت داشتی... و اگر خادم در یک روز بکرات در آمدی، شیخ را در ہر کرت، بصورتِ دیگر دیدی، تا در بعضی از اسفار با خادمی از خدّام شیخ ملاقات حاصل آمد از من پرسید کہ: شیخ را در کدام صورت دیدہ شد؟ گفتم: تو باختلاف صُوَرِ شیخ اطّلاع داری؟ گفت: آری! مدّتی شیخ را خدمت کردہ ام و بصورِ مختلفہ دیدہ.... و در آوانِ صحبت از شیخ شنودہ شد کہ فرمود: "یا سید! کہ آمنہ را بہ عبداللہ می دادند من در مکہ بودم۔ و چون از صحبتِ شیخ بیرون آمدم از اکابرِ دیار پرسیدم کہ: سنِ شیخ چند باشد؟ فرمودند کہ: از آباء و اجداد خویش شنیدیم کہ شیخ سعید حبشی عمر طویل دارد اما نمی دانیم چند سال بود.... پس خدمتِ خواجہ بزرگوار، از حضرتِ سیادت التماس نمود کہ، حساب باید کردن کہ از زمانِ ولادتِ حضرتِ مصطفےٰ صلّے اللہ علیہ وسلم تا اکنون چند سال است، و بعد از التفاتِ خاطر، حضرتِ سیادت فرمود کہ باید ششصد و سی سال باشد از زمانِ ولادتِ حضرتِ مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلم تا اکنون۔ و این حکایت در بیدِ ختنان بود در حجرۂ مسجدی کہ تاج الملکات زبیدہ ترکان کہ خواہرِ حضرتِ شاہ بہاء الدّین بودہ، از برای زبیدۂ سادات بنا کردہ است...."[1]

[.... اور شیخ سعید حبشی جسے حضراتِ صوفیا ابوسعید کہا کرتے ہیں، کو ہر لحظہ ایک اور ہی شکل میں دیکھا جاتا، اور وہ ہر زائر سے ایک بار ملتا تھا..... اور اگر اس کا ملازم دن میں چند بار اُس کے پاس جاتا تو وہ شیخ کو ہر بار ایک دوسری ہی شکل میں پاتا۔ چنانچہ بعض اسفار میں شیخ کے خادموں میں سے ایک خادم کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اُس نے

---

[1] خلاصۃ المناقب نیز:- نظم المناقب از غلام محمد ترالی قلمی نسخہ، عنوان "ذکرِ بیتِ علی ثانی رح از شیخ ابی سعید معمر حبشی رضی اللہ عنہ و باعثِ آن می گوید،" ملاحظہ ہو۔

مجھ سے پوچھا: شیخ کو کس شکل میں پایا؟ میں نے کہا: کیا تجھے شیخ کی مختلف صورتوں کے بارے میں خبر ہے؟ کہا: ہاں! میں نے ایک مدّت تک شیخ کی خدمت کی ہے اور ان کو مختلف صورتوں میں دیکھا ہے ..... اور گفتگو کے دوران شیخ سے سُنا کہ فرمایا:

اے سیّد! جب حضرتِ آمنہ کا حضرت عبداللہ کے ساتھ عقد ہوا میں اس وقت مکّہ میں تھا۔ جب شیخ کے ساتھ گفتگو سے فارغ ہو کر میں باہر آیا تو میں نے اُس جگہ کے بزرگوں سے پوچھا کہ: شیخ کی عمر کیا ہوگی؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے سُنا ہے کہ شیخ سعید حبشی کی عمر لمبی ہے لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کتنے سال کا ہے.... اس کے بعد خواجۂ بزرگوار نے حضرت سیّدؒ سے گزارش کی کہ حساب کیا جائے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلّے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ ولادت سے آج تک کتنے سال ہوئے ہیں۔ توجّہ خاطر کے بعد جناب حضرتِ سیّدؒ نے فرمایا کہ حضرت مصطفیٰ صلّے اللہ علیہ وسلم کے زمانِ ولادت سے آج تک چھ سو تئیس سال گزر چکے ہیں۔ اور یہ حکایت بدخشان میں بیان ہوئی۔ اُس مسجد شریف کے حجرے میں، جسے حضرت شاہ بہاءالدّین کی ہمشیرہ تاج الملکات زبیدہ ترکان نے برگزیدہ حضرات سادات کے لیے بنایا ہے ...]

بے جا نہ ہوگا کہ یہاں پر نظم المناقب میں راوی سعید معمر حبشیؒ کے یا ابوسعید حبشی کے بارے میں جو داستان درج ہے اُسے بیان کیا جائے، کیونکہ اس داستان کا براہِ راست تعلق حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ نظم المناقب کا مؤلف لکھتا ہے کہ "یارانِ راز نے جناب علی ثانیؒ سے عرض کیا ابوسعید حبشی، جس کا لقب معمّر ہے، کی اجازت سے آپ کو شاہ ہمدان کیوں کہا جاتا ہے، حضرتؒ نے فرمایا، میں بالیقین بائیس سال کا تھا جب اُس بزرگ سعید سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اُس سے پوچھا، آپ کو معمّر کیوں کہتے ہیں؟ تو انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: کہ میں حضرتِ عیسیٰؑ کے عہد میں بھی تھا اور ان کے اصحاب میں شامل تھا اور معروف آدمی تھا۔ میں نے توراۃ اور انجیل میں پڑھا کہ چند صدیاں گزر جانے کے بعد ایک رسولِ خاص

حضرت احمدؐ کے نام سے مبعوث ہوں گے، اور ان کی تعریفیں ہر کتاب اور ہر ورق پر ثبت ہوں گی۔ حضرت عیسیٰؑ نے بھی اُس بلند مرتبہ پیغمبرؐ کی بڑی توصیف و تعریف فرمائی، مجھے اُن کے نور و ظہور کو دیکھنے کی سخت تمنا ہوئی اور میں نے حضرت عیسیٰ روح اللہ سے التجا کی کہ کاش! میں اُس رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ پاتا۔ حضرت عیسیٰؑ نے میرے حق میں دعا کی اور اس دعا کی برکت سے میرا مدعا پورا ہوا، اور خدائے قادر نے مجھے سرورِ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں پہنچا دیا اور میں نے اُس شفیعِ امم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے نیز اُنکے جود و کرم سے فیض پایا اور اُس سرخیلِ انبیاء و پیشوائے رُسل، فخرِ زمان و مقصدِ کونین اور ہادیِ دینِ خلق اور مہدیِ کُل صلعم سے فضل و کمال حاصل کیا۔ ایک روز وہ گزیدۂ عالم، آدم کے رازہائے پنہانی کے دانا، نورِ یزدانی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کی مجلس میں جلوہ فرما تھے کہ چند پرندے ہوا سے اُڑ کر نیچے آگئے اور ان کو دیکھ کر شادمانی حاصل ہوگئی۔ سیّدِ عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "مرحبا! میرے فرزند کی خوشی سے لبریز روح!" میں نے حضرت شہ لولاک، ارض و افلاک کی زینت قریشی لقب، رسولِ عرب، اور فخرِ آفاق اور خانوادۂ ہاشمی کے مقصود و مراد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا کہ یہ خوش رفتار پرندے جو یہاں آکر اُترے ہیں کیا ہیں؟ حضرت رسولِ مختار (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے لعلِ گہربار سے دُرافشاں ہوئے کہ "اے ابوسعید! یہ چند پرندے میری امت کے چراغوں کی روحیں ہیں۔ میں نے عرض کیا: اے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں آگاہ فرمائیں کہ آپ نے کس فرزند کی روح کو مرحبا کہا۔ اُس فرزندِ رسولؐ کی رُوح پُرفتوح کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔

رسولِ مختار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ان پرندوں میں میرے فرزندوں میں سے ایک فرزند کی روح ہے جس نے میرا دل خوش کر دیا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! یہ جاہ و حشمت والا ستارہ کب ضوفنشاں ہوگا؟ تو رازہائے پنہانی کے واقف و کاشف رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تبسّم اور اپنے عقیق لبوں سے شکر افشانی کرتے ہوئے فرمایا، جان لو کہ ہجرت کے سات سو تیرہ سال بعد ان کا ظہور دنیا میں ہوگا۔[1]

---

[1] خلاصۃ المناقب کے مصنف مولانا نورالدین جعفر بدخشی رح نے آپکی تاریخ وفات (باقی اگلے صفحہ پر)

اِن کا شہر ہمدان ہوگا، ملکِ عراق میں، اور اس نورِ دیدۂ آفاق کا وطن وہی ہوگا۔ میں نے حضرتِ حبیبِ ربّانی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے اس فرزند کا نام پوچھا تو فرمایا: علی ہمدانی؟ میں نے رسولِ اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) سے استدعا کی کہ میرے حق میں دُعا فرمائیں کہ میں میر سیّد علی ہمدانی (رحمۃ اللہ علیہ) کے رُوئے پُرنور کو دیکھ پاؤں۔ میری التجا پر فوراً ہی رسول اللہ (صلّے اللہ علیہ وسلم) نے غور فرماکر میرے حق میں دُعا کی جو خالقِ اکبر نے قبول فرمائی۔ آج تک میں آپ کے دیدار کا منتظر رہا ہوں۔ آپ کے جدِّ بزرگوار (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کارہائے خلوت کے آداب جو میرے سپرد کیے تھے انہیں میں آپ کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اسرار و علوم و دانش کی راہ سے آپ کو اہلِ دنیا پر ممتاز بنا دوں گا۔"

جب میں نے ان کی یہ شان دیکھی تو دل و جان سے میں نے ان کی خدمت و صحبت کو قبول کیا۔ اگرچہ وہ میری خدمت کرنے سے رنجیدہ ہوجاتے تھے، لیکن میں نے انکی خدمت بجالانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ بہرحال، اس برگزیدہ شخصیت کی صحبت ہر حال میں میرے حق میں پسندیدہ تھی۔ ایک بار میں نے اُن کے پائے مبارک پر سر رکھتے ہوئے عرض کیا کہ اے حضرت! میرا دل اِس بارے میں سخت چون و چرا میں ہے کہ آپ کی یہ عمرِ دراز کتنے سالوں پر حاوی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سال ۷۸۶ھ (سہ ۱۳۸۴ء) ۷۳ سال کی عمر میں لکھی ہے جس سے تاریخ پیدائش سال ۷۱۳ھ (۱۳۸۳ء) ہوتا ہے۔ اور اس تذکرے میں رسولِ اکرمؐ کی پیشگوئی بھی ابوسعید حبشی رح کے سامنے سال ۷۱۳ھ کی ہوئی ہے اور یہ سارا واقعہ خود جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کی زبانِ مبارک سے بیان ہوا ہے۔ اگر ۷۳ویں سال کو حساب میں لایا جائے تو سال تولّد ۷۱۴ھ ہے۔ ورنہ معتبر ترین سند خلاصۃ المناقب کے بیان کے مطابق سال ۷۱۳ھ صحیح ہے۔

ویسے جو تاریخ گوئی کے سلسلے میں کلمات مرتّب ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں ان میں اگر ایک آدھ سال کا فرق رہ بھی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ رحمۃ اللہ میں ہمیں سال ۷۱۴ھ دستیاب ہوتا ہے اگر سال ۷۱۳ھ کے عوض رحمۃ اللہ جیسا بابرکت و متقدّس جملہ جس سے سال ۷۱۴ھ ایک سال کے اضافے کے ساتھ دستیاب ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ؛

ہے ؟ تو جواب دیا کہ : اے سیّد! خود ہی قیاس کیجئے۔ میں بتائے دیتا ہوں آپ گن لیجئے حضرت سیّد عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں میری عمر سات سو بائیس سال تھی۔ میں نے حساب لگایا تو اس وقت اُن کی عمر ایک ہزار چار سو پینتیس سال تھی۔

عمر کے برسوں کی یہ درازی دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی اور میں نے اُن سے کہا کہ حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے کسی کو اتنی عمر حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کہ اس زمانے میں آپ کو اُمت میں سے اتنی طویل عمر عطا ہوئی ہے ؟ انھوں نے جواب دیا کہ: صرف آپ کا پُر سرور اور مسرت بخش دیدار حاصل کرنے کے لیے جبکہ خاص کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی بلند و بالا علامتیں ظاہر کی تھیں جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر علی نہ ہوتے تو ان کی جگہ آپ ہوتے!"[1]

ختلان کے خطۂ مبارک میں قریۂ علی شاہ میں سال ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء) میں حضرت میر سید علی ہمدانی" نے بقول خلاصۃ المناقب گویا مستقل طور پر نزول فرمایا، اس تاریخ سے پہلے اس قریۂ شریف[2] میں ان کے مستقل طور پر اترنے کی کہیں سے کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔ اگرچہ اسی جگہ سے آپ دوسری جگہوں پر تشریف لے جایا کرتے تھے، چنانچہ سفرِ چین پر بھی آپکی روانگی اسی قریۂ شریف سے ہوئی تھی اور لوٹ کر اسی جگہ پر رہا کرتے تھے۔ گویا اسی گاؤں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ یہ وہی قریہ ہے جسے آپ نے بہت پہلے بارہ ہزار دینار میں خریدا تھا۔ اگرچہ نصف ہی گاؤں خریدا تھا اور یہ نصف گاؤں جسے آپ نے خریدا چند شریکوں کی ملکیت تھا جب آپ نے اس خریداری کی اطلاع اپنے پیر طریقت حضرت شیخ شرف الدین محمود مزدقانی" کو دی تو وہ غضب میں آ گئے۔ اور فرمایا کہ خریدنے سے پہلے مجھ سے کیوں نہ کہا، تاکہ اس قریہ کو نفع بخش کام کے لیے مصرف میں لایا جاتا۔ اور میری غیر حاضری میں آپ نے

---

[1] اسی وجہ سے آپ علیِ ثانی کے لقب سے مشہور ہیں۔

[2] مولانا نورالدین جعفرؒ نے خلاصۃ المناقب میں جہاں قریۂ علی شاہ لکھا ہے وہاں اس کے ساتھ رحمہ اللہ (اللہ اس گاؤں پر اپنی رحمت برسائے) لکھا ہے۔

فرمایا کہ "الحمد للہ! سیّد نے میرے دل سے رنج و ملال، اُس باقی نصف گاؤں کو خرید کر وقف کر دینے سے دور کر دیا۔"[1]

مولانا نور الدین جعفر بدخشی قریۂ علی شاہ میں آپ کے اس پہلے سفر کے نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: "سال ٧٧٣ھ میں میں نے قریہ علی شاہ میں کوچ کیا اور اس گاؤں میں جب ٹھہرے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہوا تو ایک دن میرا برادر حق گوی رحمۃ اللہ میرے پاس آیا اور کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ایک کہنے والا کہہ رہا تھا کہ جب ایک سال بیت جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے دوستوں میں سے ایک دوست آئے گا اور زمستان میں علی شاہ گاؤں میں اس کا نزول ہوگا۔ خبردار ہو جائیے اور اُن کی صحبت کو غنیمت جان لیجیے۔ آج کے دن ایک سال مکمل ہو گیا ہے، اس لیے مجھے ان کے پاس اُس جگہ پر جانا چاہیئے جہاں وہ ٹھہرے ہیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچا اور اخی حاجی کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک پُر نور درویشِ عالی نے سیاہ رنگ کا دلکش عمامہ پہنے ہوئے نزول فرمایا ہے، اور اس دوستِ خدا تعالیٰ کو جس کے بارے میں کسی غیبی خبر دینے والے نے خبر دی تھی، پہچان لیا کہ سیاہ رنگ کا عمامہ پہنے ہوئے یہی وہ حضرت ہیں جنہیں سیّد علی ہمدانی کہتے ہیں قدس اللہ سرّہٗ العزیز۔ پھر بیعت کی اور مرید ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد حق گوی اور اخی حاجی حضرت سیّدؒ کے رفیع و برتر اور نور افشاں رکاب کی ہمراہی میں مجھ حقیر کے حجرے میں تشریف فرما ہوئے، مجھ علیل فقیرِ حقیر نے اپنے قلبِ علیل کی شفا کے لیے اس جلیل المرتبت پیشوا سے سوال کیا جس کے جواب میں فصیح و بلیغ عباراتِ شریف میں آپ نے کتنے ہی معانیٔ لطیف ارشاد فرمائے جیسے کہ مجھ حقیر کا دل خواہاں تھا، چنانچہ میری روح اور میرے قلب کے تمام تر جذبات حلاوت و شیرینی اور خوشی و نشاط سے لبریز ہو گئے۔ اور سوال یہ تھا کہ: "یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ"[2] کے کیا معنی ہیں آپ نے جواب میں فرمایا: یَمْحُوا اللّٰہُ الْاَسْبَابَ

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

[2] اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم کر دیتا ہے۔ (قرآن مجید)

وَيُثْبِتُ الْقُدْرَةَ فِي قُلُوْبِ الْعَارِفِيْنَ وَيَمْحُو اللّٰهُ الْقُدْرَةَ وَيُثْبِتُ الْاَسْبَابَ فِي قُلُوْبِ الْغَافِلِيْنَ ۔ [1] اچانک اس پُر حلاوت و شیریں کیفیت و حال میں حضرت مولانا حاجی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوئے اور انھوں نے جناب حضرت سیدؒ سے سوال پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم ابھی مسلمان نہیں ہوئے تو اس سوال کے معانی تک کیسے پہنچیں گے اور اُٹھے اور گنبدِ علی شاہ میں داخل ہوئے اور دن چڑھے کے وقت سے شام تک اس گنبد میں رہتے، حالانکہ ہوا سخت سرد تھی اور لباس کے طور پر سوائے کرتہ و مرقّع کے جو مجھ فقیر کو ملا ہے کچھ بھی نہیں پہنا تھا۔" [2]

اخی حاجی نے قیچغائی نامی گاؤں میں (جو ختلان میں ہے) ایک نیا گھر تعمیر کیا تھا اور تین مہینوں تک آپ نے وہاں قیام فرمایا۔ اس سفر کے واقعہ کو منجملہ اور باتوں کے مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ : [3]

"میرے التماس پر جناب حضرت سیدؒ شام کی نماز ادا کرنے کے بعد اس گنبد سے مجھ فقیر کے حُجرے میں تشریف لائے۔ حضرت سیدؒ نے اخی حاجی سے فرمایا کہ ایک موزہ خریدا جانا چاہیئے، جناب اخی ایک اچھا موزہ لے آئے۔ حضرت سید نے فرمایا کہ ہمیں ایک درویشانہ موزہ چاہیئے۔ ناچار اسی قیمت کا ایک موزہ لے کر اقبال مندی کے ساتھ سوار ہوئے اور جناب اخی حاجی کے جدید اور نئے تعمیر شدہ مکان، جو انھوں نے قیچغائی میں بنایا تھا، کی طرف روانہ ہوئے اور اخی حاجی جناب حضرت سیدؒ کی ہمرکابی کی سعادت کے ساتھ وہاں پہنچے۔ جناب حضرت سیدؒ نے جاڑے کے تین مہینے اسی مکان میں گزارے اور میں ان تین ماہ کی مدت میں کئی بار آپ کے دیدار کے لیے گیا۔ لیکن مجھے اندر آنے کی

---

[1] حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے نورالدین جعفر کو اسکی توضیح یوں فرمائی کہ عارفوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت قائم کر کے رکھ دیتا ہے اور اسباب کو مٹا دیتا ہے اور اس کے برعکس جاہلوں کے دلوں میں اسباب قائم کر دیتا ہے اور قدرت مٹا دیتا ہے۔

[2] خلاصۃ المناقب ۔ [3] ایضاً ۔

اجازت نہیں ملی اور میں رنجیدہ خاطر ہوکر لوٹ آتا تھا۔ ایک روز تعلقِ خاطر رکھنے والے ایک صاحب نے مجھ سے کہا: آزردہ اور ملول نہیں ہونا چاہیے۔ اور کوئی دوری پیدا کرنے والی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ خداوندِ کبریا کے پاس بہت سے علم ہیں اور اس کے دوست بیشمار ہیں اور ہوسکتا ہے اُن علوم میں سے اس نے جنابِ حضرت سیدؒ کو بعض عنایت کیے ہوں، اور یہ خود ان دوستانِ الٰہی میں سے ہوں۔" لازمی طور پر یہ بات کارگر ثابت ہوئی اور مجھ فقیر کا دل ملال و آزردگی کی تنگی سے نکل کر راحت وسکون کی فراخی ووسعت میں آگیا اور میں نے اپنا روئے نیاز جناب حضرت سیّدؒ کے آستانے کی خاک پر پھر سے رکھ دیا۔ لیکن میرے خاطر میں اب بھی تھوڑی سی بے چینی اور اضطراب تھا اور اسکی وجہ یہ تھی کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ جناب حضرت سیدؒ مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد حق گوئی آگیا اور یہ خواب میں نے اس کو سنا دیا اور اُس نے جنابِ حضرتِ سیّدؒ کی خدمت میں آکر بیان کر دیا کہ اس طرح کا خواب دیکھا گیا ہے۔

جناب حضرت سیّدؒ نے فرمایا کہ ہماری نیّت ہے کہ ہم بدخشاں اور ختنا (چین) کے سفر پر جائیں گے، اس لیے خواب دیکھنے والے نے ہماری نیّت کو خواب میں دیکھا ہے۔ حق گوئی لوٹ آیا اور مجھے خواب کی تعبیر وتاویل کی بشارت دی۔ اور دوسرا خواب میں نے دیکھا کہ ایک بڑا ٹیلہ ہے اور اس پر درمیانی اندازے کی روٹیاں جو نہ چھوٹی ہیں اور نہ بڑی، حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ بانٹ رہے ہیں۔ میں بڑی منّت سماجت کر رہا ہوں کہ مجھے بھی ان روٹیوں میں سے دیدیں لیکن وہ نہیں دیتے۔ میں آزردہ خاطر ہو جاتا ہوں، اور آزردگی وملالِ خاطر کی اسی کیفیت میں تھا کہ اچانک حق گوئی نمودار ہوا اور اس نے حضرت امیر المومنینؓ سے التجا کی۔ انھوں نے مان لیا اور مجھے روٹی دیدی۔ یہ خواب بھی میں نے حق گوئی کو سنا دیا۔ اس نے کہا کچھ دن ہوئے میں جناب حضرت سیّد کی خدمت میں عرض کرتا آیا ہوں کہ تجھ عزیز کو وہ قبول کریں اور صحبت شریف میں حاضر ہونے کی درخواست قبول فرمائیں۔ انھوں نے قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے۔

نیز حق گوی نے یہ دوسرا خواب حضرت سیّدؒ کی خدمت میں بیان کرنے کے بعد جامہ چاک کیا اور رُو دیا کہ التماس قبول کیا جائے۔ جناب حضرتِ سیّد نے فرمایا کہ رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ عزیز (نورالدّین جعفر) ہماری خدمت میں حاضر ہو جائے۔ حق گوئی شادماں ہو کر مجھ فقیر کے پاس آگیا اور جو کچھ گزرا تھا وہ سب سنا دیا، اور مجھ فقیر کی بے چینی اور اضطراب ختم ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ جناب حضرت سیّدؒ اللہ کے دوست ہیں تبارک و تعالی۔[1] اور اب میری یہ تمنا تھی کہ مجھ فقیر کو قبول کر کے میں سعادت مند ہو جاؤں گا۔ جب میں جناب حضرت سیّد کی درگاہ میں پہنچا اور انکی صحبت شریف سے مشرّف ہوا تو میں نے علمی استقامت کے سلسلے میں جسے میں خیر کثیر جانتا تھا استفادہ کرنا چاہا اور گذشتہ کے لیے میں نے معافی چاہی۔ جنابِ حضرتِ سیّدؒ نے فرمایا کہ رجب کا چلّہ قریب ہے، چلّہ ختم ہوتے ہی آجاؤ۔ اگر مصلحت ہوئی تو گفتگو کا شغل رہے گا۔

جب رجب کا چلّہ ختم ہوا یہ فقیر جناب حضرت سیّدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کی حالت میں میں نے جناب حضرتِ سیّدؒ کی ذاتِ ذی جود کو سراسر نور روشن و درخشاں پایا اور انکی ظاہری صورت نہیں پائی۔ میں مدہوش ہو گیا اور میں حیران تھا کہ کہاں بیٹھوں۔ ناچار میں پیچھے کی طرف بیٹھا اور جب دہشت مٹ گئی تو جناب حضرتِ سیّدؒ نے فرمایا کہ آکر رُوبرو بیٹھو پیچھے کی طرف نہیں۔ اس کے بعد اُٹھے اور اپنے روبرو اپنا مصلّٰے شریف بچھا دیا اور فرمایا کہ اس مصلّے پر بیٹھو۔ جب میں نے مصلّے پر بیٹھنے میں قدرے ہچکچاہٹ محسوس کی تو ادب کی رعایت کے بموجب جناب حضرتِ سیّدؒ نے فرمایا کہ، ادب یہی ہے کہ کہنا مان لینا چاہیئے۔ ناچار میں نے قبول کر لیا۔

---

[1] یہ حکایت مولانا جعفرؒ اپنی بیعت کے سلسلے میں سناتے ہیں کہ جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کو اپنا پیرِ طریقت بنانے کے لیے ان کی طرف سے ایک مُریدِ صادق کو بیعت دینا کس قدر محالات میں سے تھا۔ گویا اسی سال ۷۷۳ھ میں مولانا نورالدّین جعفر نے بیعت کی تھی۔

اور مصلّے پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسی عرصے میں حاجی صفی مجنون نمودار ہوا اور خدمت میں آکر بیٹھ گیا۔ اُس نے داڑھی مُنڈوالی تھی۔ میں نے جناب حضرت سیّد سے پوچھا کہ، کیا اس جماعت کے پاس کوئی دلیل و حجّت ہے؟ فرمایا کہ: "ہے لیکن مفید نہیں ہے کیونکہ خفیہ جذبہ سے یہ بعض کم علم عوام پر عتاب کرتے ہیں۔ اور انھوں نے جب ہر حجاب اور ظلمت کو ایک نور اور ایک رحمت کی صورت میں اپنے باطن میں پایا تو انھوں نے ظاہر کو بھی بدل دینا چاہا، تاکہ ان کا ظاہر بھی باطن کے مطابق تبدیل ہو جائے۔ لیکن ان کے پاس علمِ شریعت نہیں کہ شرع کے مطابق تبدیلی کو وجود میں لائیں اس لیے ناچار بدعتوں میں مبتلا ہو گئے اور بعضوں نے داڑھی منڈوالی اور بعضوں نے بھنوئیں۔ بعضوں نے ناک میں چھید کر دیا اور بعضوں نے شرمگاہوں میں سوراخ کر دیا اور بعضوں نے بالوں کے سر پر فتیلے بنادیئے رسّیوں کی طرح آویزاں۔ اور دوسرے جاہلوں نے ان بدعتوں کو اپنا شعار بنا لیا۔ لیکن وہ ماخوذ نہیں ہوں گے۔ البتہ جاہل لوگ ماخوذ ہوں گے کیونکہ انھوں تے خود اپنے اختیار سے اس بدعت کو قبول کر کے اپنے اندر سرایت کر لیا۔ . . . "

اس مجلسِ فیض بخش کے آخر میں جناب حضرت سیّدؒ تے فرمایا کہ بہتر یہی ہے کہ رمضان کی عید کے بعد علمی گفتگو کے مشاغل کو اختیار کیا جائے۔ اگر اللہ نے چاہا، کیونکہ ہم نے ایک اور چلّہ کاٹنے کا ارادہ کیا ہے، انشاء اللہ! اور جب یہ فقیر رمضان کی عید کے دن جمالِ مبارک کے دیدار سے مسرور و مشرّف ہوا تو بیعت کی استدعا کی۔ فرمایا کہ تم ابھی علیل ہو، فقر کو اختیار نہیں کر سکتے ہو! لیکن چونکہ یہ فقیر التماس پر مُصر اور اپنے ارادے میں مخلص تھا اس لیے قبول فرمایا اور بیعت کا وعدہ ہوا۔ یہاں تک کہ جناب حضرت سیدؒ جاڑا گزارنے کی اُس جگہ سے لوٹ آئے جہاں وہ اخی حاجی کی درخواست پر تشریف لے گئے تھے اور ضمناً لوٹنے کے دوران چند روز پھر اخی حاجی کے نئے مکان میں رُکے۔ بہرحال ایک رات اس فقیر نے بیعت کی۔ بیعت کی حالت میں اس فقیر کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور آپ کے دونوں عظیم الشان ہاتھوں کے بیچ میں سے جنابِ حضرت سیدؒ کا

نورِ ولایت تاباں ہو کر دیکھنے میں آیا جس سے سارا کمرہ بھر گیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی اُس عجیب نور و روشنی کا مشاہدہ کرنے سے۔ میں نے سر سے پگڑی اُتار لی جس کا نہ مجھے علم تھا اور نہ خبر اور قینچی بھی ساتھ رکھ لی۔ جب حیرت مٹ گئی تو پگڑی کا ایک حصّہ کاٹ دیا، اور اس حصّے کو جناب حضرتِ سیّدؒ کی خدمت میں پیش کر دیا تاکہ اس کا پاتابہ بنا دیں۔ فرمایا کہ رومال کے لیے شائستہ ہے نہ کہ پاتابہ کے لیے۔ میں نے دوسرے وقت اپنے برادر حق گوئی سے پوچھا کہ قینچی کو استعمال کیا یا نہیں؟ وہ مسکرایا اور کہا۔ ہاں! ۔ پیشانی سے بالوں کے چند تار کاٹ لیے۔[1] پھر میں نے اپنے برادر حق گوئی سے پوچھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں میں جناب سیادت کا جو نورِ ولایت دیکھا کیا تم نے بھی دیکھا؟ کہا۔ نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔ اور اس بیعت کی رات دوسرے دن کو دن چڑھتے ہی بدخشاں کا سفر اختیار کیا اور فرمایا کہ جب اس سفر سے ختلان کے خطۂ مبارک میں لوٹ آؤں گا تو علمی مباحث ہوں گے۔ انشاء اللہ اللطیف! میں جب تھوڑی دور تک ساتھ رہا تو فرمایا، گاؤں میں ہی ٹھہرنا۔ میں نے جلد ہی اجازت چاہی اور لوٹ آیا۔ حالانکہ میرے دل میں تھا کہ جناب حضرت سیّدؒ سے پوچھ لوں کہ کیا دعائے سیفی حضرت رسول اللہؐ سے بیان ہوا ہے کہ نہیں۔؟ میں نے یہ بات دل میں رکھ لی، اگرچہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ میں نے دل میں کہا، میری بات کا جواب درست ہی ہوگا۔ دوسرے دن برہان الدین جو الٰہی کے ماموں تھے، آ گئے، اور کہا کہ کل رات توزقرغان کے گاؤں میں جناب حضرت سیّدؒ سے میری ملاقات ہوئی اور فرمایا کہ آج رات ہمارے ساتھ رہو۔ ناچار میں نے قبول کیا اور رات قریہ توزقرغان میں حضرت سید کی خدمت میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی اور آج جب کہ رخصت کی درخواست قبول ہوئی تو فرمایا کہ، نور الدین سے کہہ دینا کہ حرزِ یمانی جیسے

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت کے بعد مرید اپنے پیر طریقت کے قدموں پر اپنی پگڑی مع مقراض کے رکھ دیتا اور پیر طریقت اسمیں سے تھوڑا سا حصّہ کاٹ دیتا اپنے ذاتی استعمال کیلئے یعنی اس ٹکڑے کو اپنے پاس رکھ لیتا یا رومال کے طور پر استعمال کرتا اور پیر طریقت مرید کے سر پر سے بالوں کے چند تار بھی کاٹ دیتا اس طرح اخلاص و ایثار کا مظاہرہ مقصود ہوتا

دعایِ سیفی بھی کہتے ہیں حضرت رسولؐ سے منقول ہے اور اسے پڑھنا چاہیئے کیونکہ اس کے پڑھنے میں بہت خاصیتیں ہیں[1] پھر میں نے دعائے سیفی حاصل کی اور اس کو پڑھتا رہا لیکن دعائے سیفی کو حفظ کرنے کا خیال موقوف کر دیا جب تک پھر میں جناب حضرت سیّدؒ کی خدمت میں پہنچا اور ان کی زبان مبارک سے سنا۔ تب میں نے اسے یاد کر لیا۔ ایک اور وقت انھوں نے فرمایا کہ اگر ہر وقت اس دعا کو پڑھا جائے تو اس کی بہت خاصیتیں ہیں اور اس میں پڑھنے والا گویا عطر و خوشبو کی لپٹوں میں گھر جاتا ہے لیکن دونوں صبحوں کے درمیان (یعنی صبحِ صادق اور صبحِ کاذب) اس کا پڑھنا سب سے بہتر ہے کیونکہ ان اوقات میں اس کی تاثیر زیادہ قوی ہے"[2]

بدخشان کے سفر کے قیام کے دوران کے واقعات کے بارے میں خلاصۃ المناقب سے ہمیں یہ اطلاعات ملتی ہیں:

بدخشان میں جناب شیخ محمد عرب رحمۃ اللہ علیہ نے جناب حضرت سیّدؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ: یا امیر! میں نے سنا ہے کہ جو آدمی حرزِ یمانی کو ہزار بار پڑھے، بشرطیکہ اوّل اور آخر میں صدقہ دے، تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام دینی اور دُنیاوی حاجات کو پورا کرنے کا کفیل ہوگا۔ حضرت سیدؒ نے فرمایا کہ اگر چالیس بار ہی پڑھے پھر بھی کفیل ہوگا۔ لیکن خلوص کے ساتھ پڑھا جانا چاہیئے۔[3]

اندراب میں، ایک واقعہ کے پیش آنے کی بابت، میں نے اُنکی طرف رجوع کیا (یعنی صاحبِ خلاصۃ المناقب مولانا نورالدین جعفرؒ نے) حالانکہ اُن کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے اندراب میں پوچھنا پڑا کہ دیکھیں کیا فرمائیں گے۔ اس وقت خواجہ عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اور میرے بھائی قوام الدین اور مولانا محمد سرائی الحسینی جناب سیّدؒ کی خدمت میں حاضر تھے اور وہ قاضی حسن کے گھر سے جو پُل بندگ کے پاس تنہا نکلے تھے اور رات کو قاضی

---

[1] دعائے سیفی یا حرزِ یمانی چند دُعائیں ہیں جو کہا جاتا ہے کہ حضرتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کے سفر پر جاتے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سکھائی اور تلقین فرمائی تھیں۔

[2] خلاصۃ المناقب۔ [3] ایضاً۔

حسن کے کبوتر خانہ کے قریب رُکے تھے۔ جناب امیر کوطلی بھی وہاں سے جناب حضرت سیدؒ کی خدمت میں آئے، انھوں نے چند کبوتر اٹھا لیے اور حضرت سیّدؒ کو پیش کیے۔ جناب حضرت سیّدؒ نے فرمایا کہ عبادت کرنا مت چھوڑو اور اس نے قبول کیا کہ میں بھی جناب حضرت سیّدؒ کے استقبال کے لیے گیا تھا اور اس واقعہ کو دیکھا۔ میں نے جب استفسار کیا تو مجھے اشارے سے ڈانٹا، لیکن اپنے احمقانہ پن کے حجاب کی وجہ سے میں متنبّہ نہیں ہوا اور میں پھر سے جناب حضرت سیّدؒ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ غصّے میں آگئے اور فرمایا: "نکل جاؤ اِس کمرے سے، ورنہ میں اس عصا سے تمہارا سر توڑ دوں گا۔" اور جب جناب خواجہ (عبداللہ) نے آپ کا یہ سخت غصّہ دیکھا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکال دیا اور باہر آکر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ تم تو کوئی بات زبان پر نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ تمہارے دل میں کیا بات تھی؟ جب میں اُس کو جواب دینے ہی والا تھا تو جناب حضرت سیّدؒ نے اندر سے آواز دی کہ کمرے میں لوٹ آؤ۔ جب ہم کمرے میں داخل ہو کر بیٹھ گئے، تو فرمایا کہ ہم تو کبھی کبھی اس کے احمقانہ پن سے تشویش میں رہتے ہیں۔ خواجہ نے کہا کہ: حضرت! یہ قصّہ کیا تھا ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ فرمایا کہ اسے صفوتِ نفس (نفس کی صفائی۔ قلب کی پاکیزگی) کے مقام کا واقعہ حاصل ہو گیا ہے لیکن خیال کرتا ہے کہ چونکہ اس نے کوئی کام نہیں کیا ہے اس لیے یہ اس کے لیے ایک عظیم بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ کے عجائبات نہیں دیکھنا۔ اللہ تعالیٰ ہو سکتا ہے اس کی مدد فرمائے گا تا کہ راستے کے عجائبات کا بھی مشاہدہ کرے۔ کیونکہ اس میں اس چیز کی سخت آرزو ہے لیکن ابھی علیل ہے، جناب خواجہ نے جس کا وجودِ مبارک اہلِ اخلاص کے نتائج وثمرات کا خلاصہ و انتخاب ہے فرمایا کہ ہم کو یقین ہے کہ جناب حضرت سیّدؒ کی دُعا قبول ہو گی۔[1]

بدخشان کے ضمن میں ہی جب حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ وہاں قیام پذیر تھے، مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ لکھتے ہیں کہ:

ایک دن جناب خواجہ نے مجھ سے کہا کہ جناب حضرت امیرؒ سے پوچھا جانا چاہیئے کہ باوجود

---

[1] خلاصۃ المناقب

اس کے کہ وہ اہلِ طریقت میں نہایت کامل و مکمّل ہیں، ان کو غصّہ کیوں آتا ہے؟ جب خفتن کی نماز ادا ہوئی اور عادتِ مبارک کے مطابق ہر رات کی طرح جناب حضرت سیّدؒ نے محمد فقیر کو طلب فرمایا تو مجھے جناب خواجہ کا سوال یاد آگیا۔ اور مسجد شریف کے حجرے میں جب میں اُن کی صحبتِ شریف میں حاضر ہوا اور دو زانوے ادب تہ کر کے بیٹھا، تو میرے سوال کرنے سے پہلے ہی جناب حضرت سیّدؒ نے تبسّم کرتے ہوئے فرمایا کہ: اگرچہ ہمیں غصّہ آتا ہے لیکن ہمارا غصّہ رحمت ہے اس پر جس پر ہمیں غصّہ آتا ہے، کیونکہ ہمارے ابتدائی سلوک کے زمانے میں ہر سوموار کے دن ہماری ایک خاص مجلس حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا کرتی تھی اور میں اپنے اس غصّہ آجانے کے بارے میں آزردہ خاطر رہا کرتا تھا۔ حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ رنجیدہ مت ہو کیونکہ تمہارا غصّہ رحمت ہے اس لیے ہمارا غصّہ ترقی اور رحمت کا موجب ہے۔ جب میں نے یہ ہدیہ جناب خواجہ کی خدمت میں پہنچا دیا تو خواجہ نے فرمایا کہ اب مجھے یہ سن کر ایک ایسی شادمانی حاصل ہوئی جس کی قیمت دو دنیاؤں سے بھی بڑھ کر ہے۔[1]

تین ماہ کے بدخشاں کے اوّلین سفر کے بعد آپ ختلان کے خطّۂ مبارک میں لوٹ آئے اور تشریف فرمائی کے وعدے کی تکمیل میں، اہلِ طریقت کی کتابوں سے (مریدوں کو) فیض پہنچانے اور صحبتِ شریف کی برکت سے انوار و روشنی عطا[2] کرنے کی غرض سے تین ماہ تک قیام فرمایا۔ پھر اس کے بعد آپ ملک ختا یا خطا (چین) کے سفر پر روانہ ہوئے[3]۔ مولانا نور الدین بدخشیؒ کا بیان ہے کہ مجھے صوفیا کی بعض کتابوں اور بعض رسالوں کے بارے میں اپنی کم فہمی کے سبب تردّد تھا اور یہ عرضداشت میں نے جناب حضرت سیّدؒ کی خدمت میں کی تو آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ مشکلات حل ہوں گی اور جو کچھ تم نے مجھ سے پڑھا اور مجھ سے سنا اور سمجھا ہے اس سے دوگنا تجھ پر روشن

---

[1] خلاصتہ المناقب

[2] گویا جناب عالمِ ربّانی حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ دو طرح سے اپنے طلاب و خلفاء کی تربیت فرماتے تھے، درس و تدریسِ کتبِ صوفیاء، اور خود اپنے نفس مبارک کی بزرگی اور بخشش کی راہ سے جس سے خلفاء کے قلب روشن ہو جاتے تھے۔

[3] خلاصتہ المناقب۔

ہو جائے گا کیونکہ میرا خیال تمہاری طرف ہمیشہ مبذول رہتا ہے۔ یہ سن کر میں نے اپنا سر اُن کے قدموں پر ڈال دیا اور خلوص و خیر خواہی کے ساتھ میں نے انکو الوداع کیا۔[1]

خطا (چین) کے سفر سے جب آپ ختلان کے خطۂ مبارک میں لوٹ آئے تو مجھ فقیر نے اس وقت روستا[2] کے شہر میں کوچ کیا تھا[3] اس اثنا میں جناب حضرت سیدؒ کی ذاتِ مبارک کا آفتاب شہر روستا کے مشرق سے طلوع ہوا، اور حضرت رفعت مکان شیخ محمدؒ ان کو اللہ تعالیٰ عافیت نصیب کرے، کی رفاقت میں تشریف لائے اور شیخ محمد نے شرفِ توبہ کے نور اور حضرت سیدؒ کی نورانی صحبت سے مزید سعادت حاصل کر لی۔ شیخ محمد نے حضرت سیدؒ کے حق میں بے انتہا شاہانہ اکرام و احترام اور بذل و انعام کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر عطا کرے۔ اور جناب شاہ کے ساتھ حضرتِ سیدؒ کی پے درپے گفتگو کے بعد آپ نے فرمایا کہ شاہ کے پاس کبھی کبھی جاتے رہو۔ لازمی طور پر آج تک میں ان کے اس امر پر کاربند ہوں اور اس بادشاہ کی خدمت میں جایا کرتا ہوں۔ اور حضرت سیدؒ نے فرمایا کہ شیخ محمدؒ دنیا اور آخرت میں بادشاہ ہیں۔ اور ایک موقع پر فرمایا کہ جلد ہی بدخشان کے ممالک شیخ محمد کو واپس مل جائیں گے اور بہرام شاہ کشمیری کی حج بیت اللہ کی راہ میں وفات کے بعد اُس بادشاہ کو، اتنی مدت میں جتنی کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تھا، بدخشان کی سلطنت واپس مل گئی۔[4]

قریۂ علی شاہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک بار اپنے اصحاب پر غصے کا اظہار فرمایا

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] روستا، بدخشان میں ایک گاؤں کا نام تھا۔ جو مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ کا زادگاہ اور وطن تھا۔ اس کا پورا نام روستا بازار تھا۔ اور اسی مناسبت سے مولانا کو نورالدین جعفر روستا بازاری اور بدخشی کہتے ہیں۔ [3] خلاصۃ المناقب۔ [4] اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاہ شیخ محمد جو جناب حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے مرید و طالبِ صادق تھے بدخشان کے بادشاہ تھے جو کسی وجہ سے (غالباً دشمن کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں) بدخشان کی سلطنت سے محروم ہو گئے تھے اور بعد میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی دعا سے پھر اسکے بادشاہ بن گئے۔

کہ خود کو آپ لوگوں نے اہلِ طلب نام دیا ہے اور اہلِ طلب جو امور انجام دیا کرتے تھے اس پر قائم نہیں ہو۔ اس لیے تمہیں کیا شرم نہیں آتی کہ درویشی کے اس رنگ و بو میں تم کھانے اور سو جانے سے آرام و راحت کے طلبگار بن گئے ہو؟ خدا کی قسم پچاس سال سے میں نے اپنے ارادے سے کبھی بھی زمین پر پہلو رکھ کر نیند نہیں کی ہے اور اس قدر مشقّت کے باوجود میں ابھی ابھی اپنے آپ کو کسی کتّے سے بہتر نہیں جانتا۔[1]

بدخشاں میں جناب حضرت سیّدؒ نے خواجہ عبداللہ سے پوچھا کہ شیخ تمیمی سے تم نے کیا کرامت دیکھی؟ خواجہ نے فرمایا کہ ایک بار خوارزم میں میرے والد حضرت شیخ، شیخ تمیمی سے ملنے گئے تھے۔ حال یہ تھا کہ شیخ تمیمی ایک مسجد میں رہتے تھے اور ساری رات سر کے بل کھڑے رہ کر قرآن مجید پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت خوارزم کے علماء و فقراء بھی ان کی زیارت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے اور بیٹھے تھے، اسی اثناء میں بادشاہ کی دلہن بھی زیارت کے لیے آگئی اور شیخ تمیمی نے بادشاہ کی دُلہن پر عتاب کیا اور کہا کہ میری مُرید کیوں نہ ہوئی؟ دوسروں کی مُرید ہوگئی اور اب مجھ سے ملنے کو آئی ہو؟ دُلہن تھر تھر کانپنے لگی اور ایسی لرز گئی کہ منہ کے بل گر گئی۔

جناب سیّد جلال الدّین نے میرے والد سے گزارش کی کہ بادشاہ کی دُلہن کو رہا کر دیا جانا چاہیئے۔ میرے والد وہاں گئے اور انہوں نے سفارش کر دی۔ حضرت شیخ تمیمی نے دلہن کی کمر پر ہاتھ مارا اور وہ اُٹھ بیٹھی۔ محترمہ کا چہرہ اس عتاب کی وجہ سے بے حد متغیّر ہو چکا تھا۔ جناب حضرت سیّدؒ نے فرمایا کہ شیخ تمیمی نے سنّت کے مطابق سلوک طے نہیں کیا تھا بلکہ اس کا طریقہ جوگیوں کا طریقہ تھا اور بڑھاپے میں تصرّف کا یہ طریقہ جو شیخ تمیمی کو حاصل ہو گیا تھا مجھے پہلے پندرھویں چلّے میں حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے کبھی بھی تصرّف نہیں کیا.....[2]

بدخشاں میں قیام کے دوران ایک بار مولانا نور الدّین جعفر بدخشیؒ نے خواجہ عبداللہ سے سنا کہ جب جناب حضرت سیّدؒ بدخشاں سے ختلان کو اپنے اصحاب کے پاس

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] ایضاً۔

لوٹ جانے کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے تو میں اُس حُجرے میں داخل ہوا جہاں جناب حضرتِ سیّدؒ قیام پذیر تھے۔ میں نے دیکھا کہ جناب حضرت امیرؒ بیٹھے ہوئے ہیں میں نے دل میں سوچا کہ سلام کر دوں پھر پوچھ لوں کہ ختلاآن کے سفر کی روانگی پر کیوں اصرار ہے؟ اور میں نے بات کرنا ہی چاہی تھی کہ حضرت امیرؒ کی صورت مبارک میری نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں حیرت میں ڈوب گیا کہ یہ کیا کیفیّت ہوگئی جو ظاہر ہوئی اور پھر جلد ہی رفع ہوگئی ....."[1]

خلاصۃ المناقب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ قریۂ علی شاہ سے ہی حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اگرچہ آپ نے کئی بار یہ دینی فریضہ ادا کیا جیسا کہ خود فرمایا ہے کہ: "کرّات بہ حج رفتہ ام بہر کیفیتی کہ قضا وقدر بردہ است....."[2] (میں نے کئی بار حج کیا ہے جیسے کہ قضا و قدر مجھے لے گیا...] لیکن ہر بار قریۂ علی شاہ سے ہی آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف نہیں لے گئے تھے۔

قریۂ علی شاہ[3] سے ایک بار حج کی نیت سے روانہ ہوئے اور زادِ راہ محتاجوں میں بانٹتے گئے، جو مکّہ قریب آنے تک ختم ہوا۔ اچانک ایک صالح آدمی آپکی خدمت میں بارہ ہزار دینار لے کر اس جگہ پر حاضر ہوا جہاں آپ رُکے تھے اور کہا کہ حضرتِ رسول صلّے اللہ علیہ وسلم کے امرِ مبارک پر میں یہ رقم آپ کے پاس لایا ہوں، اسے قبول فرمائیں، اسکی تفصیل پچھلے اوراق میں آچکی ہے[4] قریۂ علی شاہ میں ہی ایک بار مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ جب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے حج سے لوٹ آنے پر ان سے ملاقات کے لیے حاضرِ خدمت ہوئے تو جناب حضرت میر سیّد علیؒ نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ دس ماہ میں جہاں کہیں بھی میں رہا، حضرتِ حکیمِ مطلق نے حکم دیا کہ: جاؤ اور لوگوں کو راہِ حق دکھاؤ، آج کی رات جو اس گاؤں

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] قریۂ علی شاہ ہی کولاآب کے نام سے مشہور ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں پر آپ کا روضۂ مقدّس ہے۔ اس جگہ کا انتخاب بھی آپ نے اپنے جدِّ بزرگوار حضرت محمد مصطفٰے صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فرمایش پر ہی کیا تھا جس کا ذکر اگلے اوراق میں آئے گا۔

[3] ملاحظہ ہو خلاصۃ المناقب۔ [4] ایضاً۔

میں پہنچا ہوں ایک فتنہ عالم واقعہ میں دیکھا، اس جگہ کے لوگوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب فتنہ واقع ہوا تو فرمایا دس مہینوں تک ہمیں ایک ہی جگہ قرار میسّر نہیں اور جب ہدایت و ارشاد میں ہم قلیل عرصے میں متوجّہ ہوئے تو فتنہ برپا کر دیا گیا... [1]

قریۂ علی شاہ میں ہی بعض واقعات کا مزید ذکر نظم المناقب کے مؤلّف نے یوں کیا ہے کہ جب حضرت سیّد علی ہمدانی رح نے قریۂ علی شاہ میں نزول فرمایا تو ایک شخص انکی تشریف آوری کے لیے ہمیشہ سے چشم براہ اور عقیدت و احترام میں ڈوبا منتظر رہتا تھا۔ یہ خبر سُن کر وہ انتہائی شادمانی کے ساتھ آپ کے حضور میں پہنچا اور آپ کے روئے مقدّس کا دیدار کر کے التجا کی کہ: اے نکو گوہر! اس حقیر ارادت مند کے گھر پر تشریف لا کر اور تناول ماحضر فرما کر مجھے مشرّف فرمائیں۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح نے اس ارادت مند اور اسکے ہمراہیوں اور اصحاب حضرت کے اصرار پر دعوت قبول فرمائی اور حسبِ وعدہ وقت مقرّرہ پر اُس داعی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے، آپکی تشریف آوری سے پہلے ہی رہزنوں کی ایک جماعت نے دعوت کے اہتمام کو تحس نہس کر کے دعوت لوٹ لی اور بیچارہ مُرید صادق سر پیٹ کے رہ گیا اور گھر میں ماتم کا سا سماں بندھ گیا۔ شرمساری کی وجہ سے مُرید نے خود کو چھپا دیا لیکن افرادِ خانہ نے آپ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح نے فرمایا: "تو اس میں فکر مند اور غمگین ہونے کی کیا بات ہے۔ ہمارے نصیب میں جو ہوگا وہ خود بخود مل جائے گا۔ صاحبِ خانہ کہاں ہے؟ اُسے بُلا لیجئے میرے پاس!" صاحبِ خانہ حاضرِ خدمت ہو کر حالتِ شرمندگی میں بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ناگہاں دُور سے رہزنوں کی وہی جماعت آتی دکھائی دی، اور جو کچھ بھی وہ غارت کر کے لے گئے تھے وہ سب کچھ اپنے ہمراہ لے آئے۔ حضرت پیر فیض مآب رح کے قدمہائے مبارک پر اپنے سر جھکا کر رونے لگے اور اُن کے سردار نے گڑگڑاتے ہوئے عرض کیا کہ: "آپ کے اس مُرید صادق اور غلام درگاہ سے جو کچھ ہم لوٹ کے لے گئے وہ اپنے ٹھکانے پر ہم نے پہنچا دیا، لیکن اسی وقت بھیڑیئے صورت والی ایک جماعت نے ہمارے مکان کو گھیر لیا۔ ان کی ہیبت سے تو ہماری جان ہی نکل گئی۔

---

[1] خلاصۃ المناقب: غالباً یہ بھی قریۂ مذکور کے بعض علماء کی فتنہ انگیزی کی طرف صریح اشارہ ہے۔

اور ہم نے اُن سے سخت عاجزی کی اور کہا کہ جو کچھ آپ حکم دیں گے ہم اس پر فوراً عمل کریں گے۔ اُن کو ہم پر ترس آگیا اور کہا کہ: کم بختو! یہ جو تم چھین کر لائے ہو فلاں آدمی کے گھر سے، یہ تو جناب حضرت میر سیّد علی شاہ ہمدان قطبِ یزدانی سے تعلق رکھتا ہے اور اگر ابھی اسی وقت اس طعامِ پاک کا ایک ایک دانہ، سلامتی و حفاظت کے ساتھ تم اس مُریدِ صادق کے گھر، جہاں وہ اس وقت تشریف فرما ہیں۔ نہیں پہنچاؤ گے تو ہم تمھارے اہلِ خانوادہ کو گھر بار سمیت نیست و نابود کریں گے۔ یا حضرت سیّدؒ! ہم آئے ہیں اور آپ کا دامن مبارک پکڑ لیا ہے۔ ہم پر رحم فرمائیے۔ ہمارا جُرم بخش دیجیے ہم نے توبہ کی۔ اب ہم بدکاری کی طرف کبھی رجوع نہیں کریں گے۔ ہماری خطا کو معاف فرما دیجیے ہم استغفار کرتے ہیں، ورنہ اگر آپ ہماری عقوبت کریں گے تو یہ رہی ہماری گردن!" انکی سخت عاجزی اور گناہوں کے عُذر میں اُن کی منّت سماجت اور انکساری کو دیکھ کر جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نے ان کو معاف کر دیا اور انھوں نے آپکی دریا دلی سے خوش ہو کر آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی اور عنایاتِ حضرت امیرؒ کی وساطت سے بامراد ہو کر لوٹے اور یہ روشن حقیقت سارے قریہ میں مشہور ہو گئی۔۔۔۔[1]

قریۂ علی شاہ (کُولاب) میں جیسا کہ بیان ہوا آپ کا نزول سال ۷۷۳ھ میں ہوا اور اس سال سے یہ آپ کا بنیادی جائے رہائش رہا اور یہاں سے آپ نے حج کیا اور شام و بغداد[2] بھی گئے۔ کشمیر بھی آئے اور کشمیر سے آپ آخری سفر میں قریۂ علی شاہ کی جانب ہی لوٹ رہے تھے کہ راہ ہی میں آپ رحمتِ حق سے پیوست ہو گئے۔ قرائن سے، اور قیام کی مدت کو خیال میں رکھتے ہوئے نظم المناقب میں جو دو اور واقعات مذکور ہیں، اگرچہ ان کے جائے ظہور کا صریحاً کوئی اشارہ نہیں، لیکن ان کا وقوع غالباً قریۂ علی شاہ میں ہی ہوا ہے۔ اس کا امکان اس لحاظ سے بھی قوی ہے کہ یہ واقعات خانقاہ جناب حضرت سید امیرؒ (جو

---

[1] ملاحظہ ہو نظم المناقب۔ عنوان: "ذکرِ باز آوردن دُزدان مالِ بہ غارت بُردہ در قریۂ علی شاہ۔۔۔"

[2] قریۂ علی شاہ سے ہی آپ سفرِ چین اور مکہ شریف میں حج ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔

ان کی قیامگاہ تھی) سے وابستہ ہیں جس میں آپ خود فراغت کے ساتھ قیام پذیر تھے[1] صاحبِ نظم المناقب کا بیان ہے کہ:

"جنابِ حضرت سیّد کے نامی مُریدوں میں سے ایک مُرید محمد شامی بیان کرتے ہیں کہ میں جنگل سے لکڑیاں لانے پر مامور تھا اور یہ لکڑی خانقاہ کے مطبخ میں کام میں لائی جاتی تھی۔ لکڑی لانے کے لیے میرا راستہ ہمیشہ جنگل ہی میں تھا۔ ایک دن جبکہ میں لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے سر پہ لاد کر خانقاہ کی طرف جانے لگا تو میری راہ میں ایک ریچھ آیا اور میرا راستہ روک لیا۔ میں گھبرایا اور سخت مضطرب ہوا۔ میں نے اُسے حضرت سلیمانؑ کی قسم دی، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ میں غم سے نڈھال ہوا کہ آخر میں کیسے لوٹوں، کیا کروں؟۔ اسی دوران ایک شیر بھی نمودار ہوا۔ اس نے ریچھ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا اور خود چلا گیا۔ اس ہیبت (ناک نظّارے) سے میرے ہوش اُڑ گئے۔ میرے ہوش جب ٹھکانے آئے اور لکڑی کے گٹھے کی طرف میں متوجّہ ہوا، (اسے اُٹھا کر) میں شہر کی طرف چل پڑا۔ مطبخ میں آکر میں نے لکڑی نیچے رکھ دی اور نماز پڑھنے کے لیے خانقاہ میں آگیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد میں نے اپنا رُوئے نیاز حضرتِ پیر کی طرف کیا اور اُنکی درگاہِ عالی میں متوجہ ہونے کے لیے رُخ کیا، اور خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی جنابِ حضرتِ سیّدؒ نے دُرّ افشانی کرتے ہوئے فرمایا: "محمد شامی! ریچھ نے جب تمہارا راستہ روک لیا، تو تم نے میرا نام کیوں بُھلا دیا؟ میرے حکم سے اگر شیر تیری مدد کو نہ آتا تو ریچھ نے تجھے مار ڈالا ہوتا۔ اگر اب کبھی کسی وقت کوئی ریچھ یا شیر تیری راہ روک لے، یا کوئی بھوت پریت تیرے سامنے آجائے تو دل میں ان کے خوف کو جگہ مت دینا، بلکہ تجھے اُنکو میری قسم دینا چاہیئے اور خوشی سے راہ طے کرنا چاہیئے۔ ہاں اگر وہ راستے سے نہ ہٹ جائیں اور میری سُنی

---

[1] ہمدان میں بھی آپ نے ایک خانقاہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا لیکن وہاں قیام پذیر نہیں تھے، بلکہ اُسے نمازیوں کی سہولت کے لیے خود اینٹیں ڈھالکر مکمل کیا تھا۔ کُولاب کی ہی ایسی خانقاہ ہے جہاں آپ نے نسبتاً لمبی مدت تک رُشد و ہدایت کے لیے قیام فرمایا تھا۔

اَن سُنی کر دیں، تو پھر میں جان لوں گا اور وہ . . ."[1]

دوسرا واقعہ نظم المناقب کے حوالے سے یوں ہے کہ: "جناب سیّد السادات، منبعِ جود و حسنات، وارثِ ملکِ سرمدِ طاہا، نائبِ رازدارِ ما اوحی، مہرِ گردونِ اوجِ جاہ و کمال، ماہِ بُرجِ سیادت و اجلال، قطب الاقطاب، غوثِ صمدانی، حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز خانقاہ شریف میں تشریف فرما تھے اور آپ کے سبھی اصحاب حاضرِ خدمت تھے کہ اچانک شہر کا بادشاہ[2] اس ملکِ ہدایت کے شہنشاہ کی خدمت میں آیا، بوسہ دیا اور بیٹھا اور آپکے دستِ مبارک کو ہاتھ میں لیکر التماسِ دُعا کی۔ جنابِ سیّدؒ نے بادشاہ کے حق میں دعائے خیر کی۔ کافی دیر تک بیٹھنے کے بعد بادشاہ نے جانے کی اجازت چاہی۔ جناب حضرت سیّد نے فرمایا: "کھانا تیّار ہے اس لیے بیٹھ جاؤ۔ چونکہ مطبخ میں بادشاہ کے اُس روز کھانا کھانے کی کوئی اطّلاع نہیں تھی۔ اس لیے جب جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نے بادشاہ کو کھانا کھانے کی دعوت دی تو اصحاب مضطرب ہو گئے اور سوچنے لگے کہ کھانا ہے کہاں؟ اور اگر وقت پر کھانا نہ آیا تو بادشاہ کا حضرت سیّدؒ کی نسبت یقین و اعتقاد میں فرق آئے گا۔ بادشاہ منتظر بیٹھا رہا۔ اور خادم کو جنابِ حضرتِ سیّدؒ کی طرف سے حکم ملا کہ جا کر کھانا لے آئے، خادم حیران و پریشان اور اصحاب حیرت زدہ۔ جنابِ حضرتِ سیّدؒ نے خادم کی طرف تہدید آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ خادم ان نگاہوں کی تاب نہ لاکر فوراً ہی باہر چلا گیا۔ باہر آکر اس نے دیکھا کہ سروں پر خوان لادے ہوئے ایک جماعت کھڑی ہے۔ خوان مطبخ میں اتارے گئے۔ اور وہاں سے خادموں نے دسترخوان

---

[1] نظم المناقب۔ عنوان: "ذکرِ شیخ محمد شامی در ترسیدن جنگل و تسکین دادن . . . بر درندگان" نیز ملاحظہ ہو۔ منقبت الجواہر مؤلفہ حیدر بدخشی۔

[2] اگرچہ شہر کا نام نہیں لیا گیا ہے لیکن قرینِ قیاس ہے کہ یہ بادشاہ ختلان کا ہی بادشاہ تھا۔

بچھا کر بادشاہ، مہمانوں، اصحاب اور تمام خدّام کو کھانا کھلایا۔ ضیافت شاہانہ تھی اور لانیوالے بھی سیر ہو کر اُٹھ کر چلے گئے۔ کھانا کھا کر بادشاہ سوچنے لگا کہ کیا اس طرح کی ضیافت کا اہتمام یہاں ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ یا خالص میری خاطر ایسی ضیافت تیار کر دی گئی تھی؟ ایسی صورت میں میرا یہاں آنا ان کے لیے باعثِ زحمت ہی ہوا، کیونکہ اس پر کافی خرچہ آیا ہوگا اور کتنی محنت سے یہ ضیافت تیار ہوئی ہوگی۔ ضیافت سے فراغت کے بعد جناب حضرت سیّدؒ نے الحمدللہ پڑھی اور ہاتھ بلند کر کے صاحبِ ضیافت کے حق میں دعائے خیر کی۔

بادشاہ نے عرض کیا: حضرت! مجھے آگاہ فرمائیں کہ اس قدر دل پسند، جانفزا اور نظر نواز، اور لذیذ و دلکش ضیافت، کہ اس سے بڑھ کر اچھی ضیافت میں نے کہیں نہ دیکھی ہے، کس نے تیار کی تھی؟ جناب حضرت سیدؒ نے فرمایا: جو چیز کسب سے حاصل ہوئی ہو وہ اچھی ہوتی ہے، کسب کی غذا کھانے والے کے منہ میں ہمیشہ مرغوب ہوتی ہے۔ بادشاہ نے کہا: میں سننے کے لیے بیتاب ہوں کہ اس نعمت کا بھیجنے والا کون تھا؟ اصحاب و یاران بھی جناب حضرتِ سیدؒ کی طرف بادشاہ کی طرح متوجّہ تھے۔ آپ نے دُرافشانی کرتے ہوئے بادشاہ کو جواب میں فرمایا کہ: طوس میں میرا ایک بیحد عقیدتمند مرید ہے جس نے خود کو میری ارادت و عقیدت میں بڑا معروف کر رکھا ہے۔ سات سال سے یہ شخص یہاں نذر و نیاز خانقاہ کے درویشوں کے لیے بھیجنے پر مُصر تھا۔ ضیافت کے علاوہ خود باربردار اونٹوں کی اُجرت دینے پر خوشدلی کے ساتھ بار بندھوا رہا تھا کہ بادشاہِ طوس کے حکم پر اسے روک دیا گیا۔ اور ساری ضیافت کی چیزیں بادشاہ کے مطبخ میں اُتروا دی گئیں اور مریدِ صادق کو قید و بند میں رکھ دیا گیا۔ ہمیں جب اس کی خبر ہوئی تو ہم نے مؤکّلوں کو حکم دیا کہ وہ سارے خوان اور تمام ضیافت وہاں سے لے آئیں۔ بادشاہِ طوس نے حیرت زدگی کے عالم میں نیز اس افواہ کے نتیجے میں کہ بادشاہ طوس نے جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے نذر و نیاز کو خود اپنے مطبخ میں پکوا کر اپنے درباریوں کو کھلایا اور خود بھی کھایا، شہر چھوڑ کر جناب سیدؒ کے دربارِ عالی میں حاضری دی اور اپنے قصور کی معافی مانگ لی اور عرض کیا کہ میں نادان تھا، قصوروار ہوں مجھے آپ کی قدر و منزلت اور عظمت و جلال کی خبر نہ تھی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ رات کو خواب میں جناب خواجۂ زمان، سرورِ بطحا صلی اللہ

علیہ وسلم مجھے جلوہ فرما ہوئے اور میرے ہاتھ باندھنے کا حکم دیا اور مجھے قتل گاہ میں بھیجدیا گیا۔ اے حضرت علی ثانی رح! آپ کی عنایت نے میری حمایت فرمائی اور مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں بیدار ہوا اور خدمت میں حاضر ہوا، جب تک نہ میں اپنے پلکوں سے آپ کے راستے کی گرد جھاڑ لوں، تب تک لمحہ بھر کے لیے بھی میں چین سے نہیں سو سکوں گا۔ میں حاضر ہوں۔ میں نے بدی کی، آپ عفو فرمائیں۔ میں سراپا معذرت ہوں، خدا کے لیے مجھ پر رحم فرمائیں۔ میں آپ کا ارادت مند ہوں اور بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے یہ باعثِ افتخار ہے اگر آپ مجھے اپنی مریدی میں لینے کی سعادت بخشیں گے، یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا اور بس آپکی نگاہِ کرم! اس کے بعد بادشاہِ طوس نے اُٹھ کر عذر خواہی میں اپنا سر جناب حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے قدموں میں ڈال دیا۔ جناب حضرت سیّد رح نے اسے عفو کر دیا، بیعت عطا کی اور اس کی توبہ قبول فرما لی۔ خانقاہ کے مصرف کے لیے بادشاہِ طوس نے خود اپنی آنکھوں سے اُن خوانہای ضیافت کا مشاہدہ کیا اور ان کو دیکھ کر نادم ہوا اور اُن خادموں کو بھی نوازا جنہوں نے بار برداری کے ضمن میں محنت و مشقت کی تھی۔ شاہ نے جو وہاں پہلے ہی سے بیٹھا تھا اور جناب حضرت سیّد رح کی دعوت پر ضیافت کھا چکا تھا، اپنے سوالات کا جواب پایا بلکہ خود آنکھوں سے معائنہ بھی کیا تو سخت حیرت میں پڑ گیا اور جناب حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے حق میں اس کی ارادت و عقیدت اور اعتقاد حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ بادشاہِ طوس اپنی مراد پا کر اور اجازت لیکر طوس کی طرف روانہ ہو گیا۔۔[1]

یہاں پر قریۂ علی شاہ (کُولاب) کے بارے میں، جس کا ذکر اگلے اوراق میں کئی بار آئے گا اور جو جناب حضرت میر سید علی ہمدانی رح کی جائے رہائش کے علاوہ بالآخر جائے مدفن بھی ہے۔ نظم المناقب کے بیان کا تذکرہ ضروری ہے کہ اس جگہ کا انتخاب حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح نے کیونکر فرمایا، صاحب نظم المناقب کا بیان ہے کہ جب حضرت امیر سیّد علی ہمدانی رح اپنے احباب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ کُولاب[2] میں آرام فرما رہے تھے تو ایک روز جب سب

---

[1] نظم المناقب؛ عنوان ''ذکر آمدن پادشاہ درخدمت ۔ ۔ ۔ ۔ از مرید طوس''۔ نیز ملاحظہ ہو: منقبت الجواہر

[2] نظم المناقب میں گُلاب لکھا ہے جو غالباً وزن شعر کے مراعات کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے، ورنہ (اگلے صفحہ پر)

طعام تناول کر چکے اور سبھی اصحاب آرام کے لیے جلدی کرنے لگے تاکہ دوسرے دن کے سفر کے اہتمام کی طرف متوجہ ہوں، جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ بھی قبلہ رُو ہوکر بیٹھے اور دل و دیدگان کو حسبِ معمول مصروفِ عمل رکھا اور اپنے کام میں مشغول ہوگئے تو

دید در واقعہ رسولِ خداؐ   امر فرمای، خود بہ سوی ہُدٰی
(آپ نے واقعہ میں رسول اللہؐ کو دیکھا   جو آپ کو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرما رہے تھے)
کای ولد گر مرا بلادِ عرب   جای آرام می نبود و طرب
(کہ اے فرزند، اگر عرب کا ملک   میرے لیے آرام وراحت کا مُلک نہ ہوتا)
پس دریں جایگہ قرارم بود   مرقد خود دریں مزارم بود
(تو پھر یہی جگہ میری جائے قیام ہوتی   اور اسی جگہ پر میرا روضہ ہوتا)
ہست لازم ترا کہ ای فرزند   آوری بر خود این مقام پسند
(تمھارے لیے اے فرزند لازم ہے   کہ تم اسی جگہ کو اپنے لیے پسند کرو)

دوسرے دن جب حضرت سیّدؒ اُٹھے تو اس جگہ کی طرف جہاں جنگل تھا روانہ ہوکر وہاں پہنچے جہاں پر ان کی قرارگاہ مقرّر تھی۔ شکرانے کی دو رکعت نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد مزید دو رکعتیں پڑھیں۔ اصحاب نے اضافی دو رکعتوں کے بارے میں استفسار کیا تو فرمایا کہ کل رات میرے جدِّ امجدؐ خوش بختی سے مجھے خواب میں جلوہ فرما ہوئے اور انھوں نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا کہ غم سے معمور اس رہگذر (دنیا) میں منزلِ عقبیٰ کی طرف جانے سے پہلے تمھاری جگہ، یہاں ہوگی اور اسی جگہ کی طرف اتھوں نے اپنی خوش بیانی سے اشارہ فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جگہ سے اس وقت ہمارا گذر ہوا اور یہی ہے وہ جگہ جو میری جائے قرار ہے اور جہاں میرا مزار ہوگا اور قیامت تک یہیں پر میرا مستقل قیام رہے گا۔ اصحاب رونے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کُولاب صحیح ہے۔ کُول کے معنی ہیں حوض، تالاب، پانی جمع ہونے کا گڑھا، اور کُولاب کے معنی ہیں، تالابِ آب یعنی پانی کا تالاب یا حوض۔ اسکی وجہ تسمیہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی بڑے تالاب کی موجودگی یا تالاب کی مانند یا حوض کی مانند ہونے کی وجہ سے یہ گاؤں قریۂ علی شاہ سے نام بدل کر کولاب کہلایا۔ کولاب کی تفصیل اسی مقدمے کے آخر میں دیکھیے۔

لگے اور عرض کیا کہ وہ ہمارے لیے جان سوز دن ہوگا۔ انھوں نے فرمایا تین سال اور ایک دن اور ایک رات کے بعد قربِ ذات کا وہ دن آئے گا.....،،[1]

قریۂ علی شاہ میں ایک اور واقعہ کا نظم المناقب میں ذکر ہے اور وہ یوں ہے کہ:

،، خلیفۂ علی ثانی رح، شیخ طالقانی کا بیان ہے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح قریۂ علی شاہ کے آباد گاؤں میں تشریف فرما تھے کہ ایک دن شام کے وقت کچھ ملول سے تھے اور یکایک اُٹھ کر روانہ ہوئے۔ ہم میں سے چند آدمی آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور جنگل میں پہنچے۔ ہم نے حضرت شاہؒ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی۔ کچھ وقفے بعد فرمایا،، اب سونے کے لیے یہیں پر استراحت کریں گے،،۔ ہم سب کو تعجب ہوا کیونکہ جنگل کا یہ علاقہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لیکن کسی کو پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی اور لرزتے کانپتے بموجب فرمان سب نے حکم کی تعمیل کی۔ رات کا ایک پہر گزر گیا کہ ایک پُر وقار و باہیبت شیر آ گیا۔ آتے ہی وہ حضرت کے سامنے گویا اطمینانِ خاطر کے ساتھ زمین بوسی کر کے بیٹھ گیا۔ حضرت سیّد عالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے توبہ یاد دلائی اور اپنی عنایت سے اُسے خالی نہیں رکھا اور فرمایا: دیکھو جو کوئی میرا مرید ہو اور میری ارادت رکھتا ہو اُسے تم تکلیف نہ دینا، کیونکہ وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہاں اگر کوئی منافق ہو تو اس بدبخت کو بے شک تم سخت سزا دے سکتے ہو، یہ فرمان سن کر شیر چل دیا۔ نصف رات کے قریب ایک اور جماعت آدمیوں کی صورت میں دکھائی دی اور انھوں نے بھی خدمتِ عالی میں احترام و تعظیم بجا لا کر عذر و معذرت پیش کی اور عرض کیا کہ حضرت ہمارے لیے کوئی وصیّت فرمائیں ہم اسے دن رات بجا لاتے رہیں گے۔ جناب حضرتِ سیّد نے انہیں بھی توبہ یاد دلائی اور ان کے دستخط سے ایک نوشتہ ان سے لے لیا کہ وہ کسی کو اذیّت نہیں پہنچائیں گے۔ انہوں نے یہ کہہ کر اجازت چاہی کہ جب بھی کبھی خاص خدمت کے لیے ہماری ضرورت ہو تو ہم انتہائی عقیدت اور اخلاص مندی کے ساتھ حاضر ہو جائیں گے۔ جب صبح ہوئی ہم سب نے نماز ادا کی اور پھر جناب حضرت سید رح سے استفسار کیا۔ آپ نے فرمایا، وہ شیر جو تھا وہ شیروں کا بادشاہ تھا

---

[1] دیکھیے نظم المناقب اور منقبۃ الجواہر۔ یہ واقعہ غالباً ۷۸۳ھ کا ہوگا۔ ۱۲

اور یہ جماعت جو تھی جنوں کی تھی۔ اس سے پہلے اس علاقے میں ان کے خوف سے کوئی اس راستے پر چل نہیں سکتا تھا۔ اب یہ دائرۂ اسلام میں آکر ہدایت کا راستہ پا چکے ہیں ...."[1]

خطا یا ختا (چین) کے بارے میں حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے سفر کے صرف اس قدر اشارے ملتے ہیں کہ آپ نے: "برادر حق گوی کے اس خواب کی تعبیر میں کہ حق گوی نے حضرت امیر رح کو مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔

"فرمود کہ: مارا نیّت بدخشان و ملک خطا است؛ پس آن نایم صورت نیّت مارا دیدہ است"[2]

(فرمایا کہ "ہمیں بدخشان اور ختا جانے کی نیّت ہے، اور اسی لیے خواب دیکھنے والے نے ہماری نیّت کی صورت کو دیکھ لیا ہے۔"

ایک دوسری جگہ ذکر ہوا ہے کہ:

"بعد از سہ ماہ از سفر اوّل بدخشان بہ خطّۂ مبارک ختلان رجوع نمود و سہ ماہ دیگر در ختلان بشرف وفای آن وعدۂ تشریفات فرمود بحسب افاضۂ اسرار از کتب اہل طریقت و انوار از صحبت برحمت۔ آنگاہ متوجہ سفر ملک خطا گشت ...."[3]

[بدخشان کے اوّلین تین ماہ کے سفر کے بعد آپ ختلان کے خطّۂ مبارک میں لوٹ آئے اور مزید تین ماہ، حسب وعدہ اہل طریقت کی کتابوں سے فیض پہنچانے اور صحبت مبارک کی روشنیوں سے مستفید فرمانے کی خاطر ختلان میں قیام کیا۔ اس کے بعد ختا کے سفر پر روانہ ہوئے ...]

ایک اور جگہ بیان کیا ہے کہ:

"....چون از سفر ملک خطا باز آمد بہ خطّۂ مبارک ختلان، این فقیر کوچ بہ ولایت روستا آوردہ بود ...."[4]

---

[1] نظم المناقب۔ زیر عنوان: ذکر رفتن حضرت علی ثانی رض از قریۂ علی شاہ بہ جنگل، و اسلام آوردن درندگان از آنجناب"۔ نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر مؤلفہ حیدر بدخشی۔ [2] خلاصۃ المناقب۔
[3] خلاصۃ المناقب۔ [4] خلاصۃ المناقب۔

[جب آپ سفر ختا سے لوٹ آئے ختلان کے خطۂ مبارک میں، تو یہ فقیر روستا شہر کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ ۔ ۔]

اِن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ میر سید علی ہمدانیؒ بدخشان کے سفرِ اوّل میں اپنے تین ماہ کے قیام کے بعد واپس ختلان آ گئے تھے اور ختلان میں حسبِ وعدہ تین ماہ کے قیام اور اصحاب کو مستفید فرمانے کے بعد، وہیں سے ختا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ تو پہلے ہی مولانا نورالدّین جعفر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ ختلان میں پہلی بار سال "ثلث وسبعین وسبعمایۃ" (۷۷۳ھ) میں تشریف لائے اور اگر ہم پہلی بار ختلان میں ہی اخی حاجی کے نئے گھر میں تین ماہ کی اقامت کے عرصے کے بعد[١] واپس قریۂ علی شاہ میں آنے پر، پھر تین ماہ کے عرصے کے بعد، پہلی بار بدخشان کے سفر کی تین ماہ مدت کو ختم کرکے[٢] پھر تین ماہ کے عرصے کو ختلان میں گذارنے[٣] کی مجموعی مدت کا حساب لگائیں تو یہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اس لحاظ سے حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ سال ۷۷۴ھ میں یا (۷۷۳ھ کے اواخر میں) ختلان سے روانہ ہوئے لیکن آپ ختلان سے براہِ راست ختا کے لیے روانہ نہیں ہوئے بلکہ اول حجِ بیت اللہ کے لیے گئے۔ پھر لوٹ کر ایک رفیق سیّد محمد طالقانی کے ہمراہ ختا کے لیے روانہ ہو گئے، اس لیے سال ۷۷۴ھ کے ذی الحجہ ماہ میں مراسمِ حج گذارنے کے بعد یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ آپ نے سال ۷۷۵ھ میں ختا کا سفر اختیار کیا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بقول صاحب خلاصۃ المناقب:

> "خدمتِ برادری حاجی علی قزوینی نقل کرد کہ جنابِ سیادت دوازدہ بار بہ حج رفتہ است۔ ۔ ۔!"

[برادرم حاجی علی قزوینی نے بیان کیا کہ جناب حضرت سیّدؒ نے بارہ مرتبہ حج کیا ہے۔]

یا: "حضرتِ سیادت فرمود کہ کرات بہ حج رفتہ ام۔ ۔ ۔ ۔!"

[جناب حضرت سیّدؒ نے فرمایا کہ بہت بار حج کو گیا ہوں۔ ۔ ۔ ۔]

---

[١] خلاصۃ المناقب [٢] ایضاً [٣] ایضاً۔

لیکن چونکہ مولانا جعفر بدخشیؒ ہی بیان فرماتے ہیں کہ جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ قریۂ علی شاہ سے خطا کے سفر پر روانہ ہوئے، اس لیے جناب حضرت سیّدؒ کی سفرِ چین پر روانگی سال ۷۷۴ھ میں ہی قیاساً صحیح ہے اور یہ سفر بالآخر سال ۷۷۵ھ میں عمل میں آیا تھا۔ (واللہ اعلم بالصواب۔)

سفرِ خطا (چین)، کے بارے میں مولانا نورالدین بدخشیؒ نے کوئی تفصیل خلاصۃ المناقب میں بیان نہیں کی ہے حالانکہ اُن کے بقول جناب میر سیّد علی ہمدانیؒ:

"چون از ملکِ خطا باز آمده بہ خطۂ مبارک ختلان، این فقیر کوچ بہ ولایتِ رُوستا آورده بود۔۔۔"

[جب مُلکِ خطا سے ختلان کے خطۂ مبارک میں لوٹ آئے تو یہ فقیر شہر روستا کی طرف کوچ کر چکا تھا]

اور قریۂ علی شاہ سے حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ نے نورالدین جعفر بدخشی کے وطن بدخشان میں واقع روستا گاؤں کا سفر اختیار فرمایا۔[1] ظاہر ہے چین کے سفر کے متعلق حضرت شاہ ہمدانؒ نے بیشک اپنے اصحاب کے مجمع میں ذکر فرمایا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ ایک معتبر ملفوظات نویس مریدِ صادق اور قوی عقیدت و ارادت مند مولانا جعفر بدخشیؒ کی تالیف خلاصۃ المناقب میں اسکی تفصیل کا مطلق کوئی ذکر نہیں اور اس طرح سے ہم ایک معتبر سند دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نہایت ہی اہم اور دلچسپ سفر کے حالات سے محروم ہو گئے ہیں۔ نظم المناقب اور منقبت الجواہر بھی اس ذکر سے مطلق خالی ہیں۔ لیکن سال ۱۳۳۴ھ شمسی مطابق بہ سال ۱۹۵۵ء (سال ۱۳۷۴ھ) میں استادِ دانشمند، فاضل محقق اور دوست محترم جناب ڈاکٹر ایرج افشار صاحب[2] نے قدریہ نام کے اُس رسالے کو بڑے مفید

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] میرے فاضل دوست، استاد دانش مند اور مشہور محقق جناب ایرج افشار نے تہران میں مجھے اس رسالۂ نادر کے بارے میں اطلاع دی، جب کہ میں ان کے پاس میر سیّد علی ہمدانیؒ کے کمیاب منابع کی نشاندہی کرنے کی غرض سے تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتابخانہ میں جہاں وہ ڈائرکٹر تھے، اکثر جایا کرتا تھا اور اسکے لیے میں ان کا ایک دنیا مشکور ہوں۔ آجکل بھی وہ مجھے فراموش نہیں کر چکے ہیں اور اپنا معروف ادبی رسالہ آیندہ اور دیگر نشریات مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔

یادداشتوں اور تعلیقات و تصحیحات کے ساتھ چھاپ دیا۔ جسے سمرقند میں سال ۱۹۰۹ء میں ملّا عبدالحکیم نے ایک رسالے میں ڈیموروف نامی چھاپہ خانہ سے طبع کیا تھا۔ لیکن اِس مطبوعہ رسالۂ قندیہ کو اس کمیاب مطبوعہ رسالۂ قندیہ سے بھی جناب ایرج افشار نے مقابلہ کر کے شائع کیا ہے جسے اُستادِ دانشمند مرحوم سعید نفیسی اپنے ساتھ افغانستان سے تہران لائے تھے۔ اس کمیاب اور نادر رسالے کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب حضرتِ امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح نے شیخ برہان الدّین ساغرجی رح کے بارے میں ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ شیخ برہان الدّین ساغرجی رح ایک قطبِ زمان ہونے کے علاوہ بڑے عالم بھی تھے لیکن انکے آثار میں سے ہم تک کچھ بھی نہیں پہنچا ہے۔ وہ ایرانی تھے لیکن چین میں آخر عمر تک رہے اور ابن بطوطہ نے چین میں اُن سے ملاقات کی تھی اور خانِ چین نے اُن کو صدرِ جہان مقرر کیا تھا۔

حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کے اس رسالہ کا نام قندیہ میں درج نہیں جو آپ نے شیخ برہان الدّین ساغرجی رح پر لکھا صرف یہ لکھا ہے کہ:

”... اگر کسی را در قطب بودنِ آن ذات شبہ واقع شود، رجوع بہ رسالۂ امیر سیّد علی ہمدانی رح نماید و در آنجا ملاحظہ کند ...“ [1]

[اگر کسی کو اُس ذاتِ شریف کے قطب ہونے میں شک ہو تو وہ امیر سیّد علی ہمدانی رح کے رسالے کی طرف رجوع کرے اور اُسے دیکھے ...]

سفرِ چین کے بارے میں رسالۂ قندیہ نے جو ذی قیمت اور بیش بہا اور نادر اطّلاعات خود جناب حضرت امیر کبیر شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ مبارک سے ہم تک پہنچائی ہیں وہ مؤلّف نے عیناً اُسی رسالہ سے نقل کی ہیں جسے حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح نے شیخ برہان الدّین ساغرجی رح کے بارے میں لکھا تھا۔ ذیل میں اس رُوحانی سفر کی داستان ہم خود حضرت امیر رح کی زبان سے نقل کریں گے۔ رسالۂ ”قندیہ“ کا بیان ہے کہ امیر سیّد علی ہمدانی جو کہ مکّہ مکرمہ میں چند سال رہے، فرماتے ہیں کہ:

” بداعیۂ آن کہ از قطب نشانی یابم و بدولت و ملازمتِ قطب مشرّف شوم

---

[1] رسالہ قندیہ۔ کتابخانہ ظہوری خیابان شاہ آباد۔ طہران سال ۱۳۳۴ شمسی۔

هر صباح شخصی را می دیدم که در مکه امامتی میکرد و چون از نماز فارغ می شدم او را نمی دیدم۔ یک روز به خود گفتم از ایشان سؤال کنم۔ آمدم و از آن عزیز سوال کردم که یا بزرگوار! چونست که بنماز بامداد امامت می کنید و تا صباحِ دیگر شما را کسی نمی بیند؟ ایشان گفته اند که، دیگر بار هرگز مرا نخواهید دیدن، مگر در ولایتِ خطای۔ چون این سخن را بمن گفتند، دیگر آن عزیز را ندیدم۔ امّا در آرزوی آن ذات، عمر بسر می بردم تا که بشارتی یافتم که: یا سیّد علی همدانی رح! بدانکه قطب همان شخصی بود که در مکه امامتی می کرد، او را نیتی حالا میخواهی که آن را دریابی بجانب خطای باید روی۔ و این زمان عهد کردم که بملازمت آن عزیز روم۔ چون می رفتم در راه به ولایتِ طالقان رسیدم و در آنجا امیر سیّد محمد طالقانی را دیدم و باو عرض کردم که داعیهٔ دیدنِ قطب دارم و قطب را در ولایتِ خطای نشان یافتم۔ چون امیر سیّد محمد این سخن را شنیدند آن شخص نیز بر رفتن و دیدنِ قطب رغبت نمودند، و هر دو بولایتِ خطای متوجّه شدیم، و در پای تختِ خطای رسیدیم و از حضرت بزرگوار نشان پرسیدیم۔ و در درونِ حرم نشان دادند۔ و در این حرم، هفت دربند بود، و پادشاه در آن بود، و محل از دحام لشکرِ بسیار بود، و بسعیِ تمام از دربند گذشته بدرون رفتیم، و دیگر زیاده نه توانستیم بر آن راه یافتن، و در همانجا ساکن شدیم، و در گوشهٔ نشستیم، و با یکدیگر گفتیم که احوالِ عالم بر قطب ظاهر است، باید که آمدن مایان بایشان معلوم باشد چون در این گفتگو بودیم که بناگاه یک یساول با هیبت، بر سرش یک طبقِ آش گرفته می آورد و می گفت که سیّد علی همدانی رح کیست که این آش را پادشاه از درون برای او فرستاده است۔ و این کردار آن بود که پادشاه خطای سالی یکبار مردم را می بیند۔ امسال پادشاهِ خطای حضرت شیخ برهان الدین را گفته که شما در تختِ من بر آمده نشینید و بداد و عدل بر احوال

رعایا پردازید۔ ایشان این امر را قبول نموده بودند۔ چون این یساول به نزد من آمده رسید، گفت که سید علی ہمدانی کدامی شماست که دم نمی زنید؟ و بسیار مبالغه نمود۔ گفتم منم سید علی ہمدانی۔ بعده آش را در پیش من نہاد و اندرون برفت، و مایان ازین طعام می خوردیم و در خاطر خود ہامی گذرانیدیم که اگر خوراکِ قطب این بودی بایستی که ازین طعام اندکی دست زده بودندی امّا این طعام را در طبق به نہجی ریخته اند که ہیچ تصرّف دروی واقع نه شده بود۔ و در این فکر و اندیشه بودیم که از تحت طبق یک قرص نان خشک نیم خورده یافتیم۔ جزم کردیم که بدولت دیدار قطب مشرف خواہیم شد۔ چون ساعتی ازین گذشت باز ہمان یساول از درون برآمد۔ بعده حضرتِ قطب از لوازم پادشاہی فارغ گشتند و لباسِ پادشاہی را که برای مصلحت پوشیده بودند برانداخته، و لباسِ درویشی خود را پوشیده به نزد مایان آمدند۔ چون من ایشان را بدیدم شناختم ہمان شخص که در مکه امامتی میکردند این شخص اند۔ در ساعت من روی پای مبارک قطب را بوسیدم و در ملازمتِ ایشان می بودم تا کارِ من تمام شد۔ واقعۂ آن بسیار است، امّا مختصر کرده شد۔"[1]

["اس خواہش میں کہ میں قطب کی کوئی نشانی اور اس کو دیکھنے کی سعادت و اقبال پاؤں اور اسکی خدمت میں رہنے سے مشرّف ہو جاؤں، میں ہر صبح ایک شخص کو دیکھتا تھا جو مکّہ میں امامت کرتا تھا اور جب نماز سے فارغ ہو جاتا تو میں اُسے نہیں دیکھ پاتا تھا۔ ایکدن میں نے اپنے ساتھ ارادہ کیا کہ میں اس سے پوچھوں گا، چنانچہ میں اس کے پاس آیا اور اس عزیز سے سوال کیا کہ: اے حضرت! یہ کیا معاملہ ہے کہ صبح کی نماز کی آپ امامت تو کرتے ہیں لیکن بعد میں آپ کو دوسری صبح تک کوئی دیکھ نہیں پاتا؟ انھوں نے کہا کہ اب مجھے پھر سے ہرگز نہیں دیکھیں گے سوائے خطای کے ملک میں، جب انھوں نے مجھ سے یہ بات کہی، پھر میں نے اُس ذاتِ عزیز کو نہیں دیکھا۔ لیکن اس ذاتِ شریف کو دیکھنے کی آرزو میں میں نے ایک عمر (بہت عرصہ) صرف کی یہاں تک کہ مجھے بشارت ملی کہ اے سیّد علی ہمدانی! جان لو کہ قطب

---

[1] رسالۂ قدریہ، صفحہ ۲۷ تا ۴۷۔ فارسی عبارت چونکہ حضرت امیر کبیرؒ کی ہے اسلئے تبرکاً اسے نقل کیا ہے

وہی شخص تھا جو مکہ میں امامت کیا کرتا تھا اور تم اسے جان نہ پائے، اب اگر چاہتے ہو کہ اس کو پالو تو تجھے خطای کے ملک میں جانا چاہیے۔ اور اس وقت میں نے عہد کر لیا کہ میں اُس ذاتِ عزیز کی خدمت میں ضرور جاؤنگا چنانچہ جب میں سفر پر جا رہا تھا تو راستے میں میں طالقان پہنچا اور وہاں میں نے امیر سیّد محمد طالقانی سے ملاقات کی اور اُن سے عرض کیا کہ مجھے قطب کو دیکھنے کی آرزو ہے اور میں نے قطب کا پتہ ملکِ خطای میں پایا ہے۔ امیر سیّد محمد نے جب یہ بات سنی تو اس حضرت نے بھی چلنے اور قطب کو دیکھنے کی رغبت ظاہر کی اور ہم دونوں خطای کے ملک کی طرف روانہ ہوئے اور خطای کے دارالخلافہ[1] میں پہنچے اور حضرتِ بزرگوار کا پتہ پوچھ لیا۔ بادشاہ کے حرم میں ان کا پتہ دیا گیا۔ اس حرم (شاہی محل) میں سات دروازے تھے[2] اور بادشاہ بھی خود اندر رہتا تھا اس لیے لوگوں کی بھیڑ تھی اور فوج بھی بڑی تعداد میں حاضر تھی، بہت کوشش کے بعد ہم دروازے سے گزر کر اندر چلے گئے۔ لیکن اس سے زیادہ ہم وہاں سے آگے راستہ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے۔ اور اُسی جگہ پر رُکے رہے اور ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ہم ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے کہ قطب پر تو تمام دنیا کے حالات روشن ہیں اس لیے انہیں ہمارے آنے کی خبر معلوم ہو جانی چاہیے۔ ہم اسی گفتگو میں محو تھے کہ اچانک ایک با وفا سپاہی سبزی کے شوربے کا ایک مجمہ (خوانچہ) سر پر لیے آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ سیّد علی ہمدانی کون ہیں؟ کہ اندر سے بادشاہ نے ان کے لیے آش کا یہ خوانچہ بھیجا ہے۔ اور یہ معاملہ یوں تھا کہ بادشاہ خطائی سال میں ایک بار لوگوں سے ملتا تھا، اس سال بادشاہ نے حضرت شیخ برہان الدّین سے کہا کہ آپ تشریف لا کر میرے تخت پر بیٹھ جائیں اور رعایا کے حال و احوال کو عدل و انصاف کے ساتھ نپٹائیں اور انھوں نے بادشاہ کا کہنا مان لیا تھا۔ جب یہ سپاہی میرے پاس پہنچا اور

---

[1] ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ دارالخلافہ کا نام خان بالغ یا چانقو ہے (یہ آج پیکنگ کہلاتا ہے) دیکھیے فارسی ترجمہ رحلہ ابن بطوطہ۔ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ ترجمہ از ڈاکٹر محمد علی موحّد، نشریہ بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب۔ تہران ۱۳۴۸ شمسی صفحہ ۷۵۳، جلد دوم۔

[2] ابن بطوطہ نے بھی شاہی محل کی توصیف کرتے ہوئے سات دروازوں کا ذکر کیا ہے اور تعداد سات ہی لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو سفرنامہ ابن بطوطہ ترجمہ فارسی۔ صفحہ ۷۵۴۔ جلد دوم۔

کہا کہ آپ میں سے کون سید علی ہمدانیؒ ہیں کہ آپ بات ہی نہیں کرتے اور بہت منّت سماجت کی تو میں نے کہا کہ: میں ہوں سیّد علی ہمدانی۔ پھر اس نے شوربہ میرے سامنے رکھ دیا اور اندر چلا گیا ہم یہ غذا کھا رہے تھے اور خود اپنے ساتھ یہ بھی دل میں سوچتے تھے کہ اگر یہ قطب کی غذا ہوتی تو پھر انھوں نے اسے تھوڑا ہاتھ بھی لگایا ہوتا، لیکن اس غذا کو مجمہ میں اس طرح سے رکھا گیا ہے کہ اس پر کسی کی پہنچ ہی نہیں ہوئی ہے۔ ہم اسی فکر و خیال میں تھے کہ ہم نے مجمہ کی تہ پر ایک آدھی کھائی ہوئی سوکھی روٹی دیکھی۔ یقین ہو گیا کہ ہم قطب کے دیدار سے مشرّف ہو جائیں گے۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو پھر وہی سپاہی اندر سے نکلا۔ اس کے بعد حضرتِ قطب لوازم پادشاہی سے فارغ ہو گئے اور جو شاہانہ لباس انھوں نے وقت کی مصلحت کے خیال سے پہن رکھا تھا اُسے اُتار دیا اور اپنی اُسی درویشی کا لباس پہن کر ہمارے پاس آ گئے۔ میں نے جب ان کو دیکھا تو پہچان لیا کہ وہ شخص جو مکہ میں امامت کرتا تھا یہی حضرت ہیں۔ فوراً میں نے حضرتِ قطب کے پاؤں چوم لیے اور اُن کی خدمت میں تب تک رہا جب تک میرا کام ختم ہو گیا۔ اور بھی اس طرح کے ان کے ساتھ کئی واقعات گزرے ہیں لیکن میں نے مختصر طور پر بیان کیا.....‘‘

حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے فرمودات سے آپ کے سفرِ چین کے بارے میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں جن سے مولانا نور الدّین جعفرؒ کے بیان کی بھی مطابقت ہو جاتی ہے۔

اوّل یہ کہ حضرتِ شاہِ ہمدانؒ نے حج کے دوران مکہ شریف میں شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ سے ملاقات کرنے کے بعد کچھ مدت تک اُن سے ملنے کی خواہش کی تکمیل ہونے اور کوئی بشارت غیبی ملنے تک انتظار کیا اور ظاہر ہے یہ ساری انتظار کی مدت انھوں نے اپنے وطن میں ہی سیاحتِ رشد و ہدایت میں گزاری ہو گی اور چین کی طرف روانگی کا اقدام بشارت ملنے کے بعد کیا اور اس وقت آپ قریۂ علی شاہ میں تھے۔ اور بدخشان کی سیاحت سے وہاں لوٹ کر آپ مجموعاً ایک سال گزار چکے تھے، اس لیے جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ سال ۷۷۴ھ کا حج گذار کر آپ نے سال ۷۷۵ھ میں چین کا سفر کیا ہو گا، البتہ وطن لوٹنے کے بعد۔

دوم یہ کہ چند سال تک حضرت امیر کبیرؒ مجاورِ مکہ بھی رہے ہیں قطب کی تلاش و جستجو

میں۔ اور سوم یہ کہ، آپ نے چین میں حضرتِ قطبِ زمان شیخ برہان الدّین ساغرجی کی خدمت میں اتنا عرصہ گزارا ہے جتنے عرصے میں وہ تکمیلِ مراد سے فارغ ہوئے اور چہارم یہ کہ، چین میں آپ کا شیخ برہان الدّینؒ کے ساتھ جو رابطہ تھا وہ طالب و مطلوب یا مرشد و مُرید کا تھا اور ان کی ہی تلاش میں چین جانے کی تحریک ملی جو اس سے روشن ہے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا:

> "در ساعتِ روئ پای مبارک قطب را بوسیدم و در ملازمتِ ایشان می بودم تا کارِ من تمام شد....."[1]

[میں نے فوراً آپ کے قدموں پر بوسہ دیا اور تب تک ان کی خدمت میں رہا جب تک کہ میرا کام ختم نہ ہوگیا۔] ورنہ حضرت علی ثانیؒ کا کسی کے قدموں کو چومنا بعید از امکان ہے۔ نیز حضرت امیر کبیرؒ کا باطنی کام چین میں حضرت شیخ برہان الدّین قطبِ زمان کے ارشاد و ہدایت سے ہی مکمل ہوا۔

نظم المناقب میں حضرت امیر کبیرؒ میر سیّد علی ہمدانی کی تربیت ہونے کے سلسلے میں شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ کا ذکر بھی موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ تفصیل موجود نہیں۔ شیخ برہان الدّین کا نام دوسرے مشایخ کبار کے ساتھ ایک الگ عنوان کے تحت درج ہے۔[2] مؤلف نظم المناقب لکھتا ہے کہ:

عرضِ خدمت رسید از یاران   کہ بہ بخشد وقوفِ با یاران
زان بلندی مکانِ عالی شان   باز در خدمتِ شہ ہمدانؒ
از اجازت شود گہرباران   کہ بدند آن ہمہ صفا کیشان
شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ   شیخ جبرئیل گُویدہ کُردی
شیخ شیخان نظام الدّین غوریؒ   کہ بُد اشگفتہ چون گلِ سوری
شیخ بوبکرِ طوس و خالدِ ری   کز ازل خوردہ در ملاحت می

---

[1] قندیہ صفحہ ۴۷۔ [2] نظم المناقب زیرِ عنوان: "ذکر شیخ نظام الدین غوریؒ۔ و برہان الدّین ساغرجیؒ و شیخ ابوبکر طوسی، و خالد ریستانی و شیخ جبرئیلؒ کردی در تربیتِ حضرت علی ثانیؒ" نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر رسالہ مستورات، از حیدر بدخشی۔

گفت سیّد که آن همه یاران   پیشتر از ولادتم بجهان
دیده بودند رُوحِ من در خواب   خوشنما دلفزا و عالمتاب
از زبانِ شریف آن یاران   مدّتی بُد چُنان گهرباران
بسویِ بارگاهِ لم یزلی   کای خبیر و علیم بی بدلی
این هُمای همم کدامی جای   در زمین می شود جهان آرای؟
گاهِ مولود چون رسید مرا   بظُهور آمدن بدید مرا
شیخِ غوری که بُد نظام الدّین   صاحب کشف و مرتبهٔ یقین
خضر و الیاس را بواقعه دید   در رهی می شدند هر دو سعید
جامهٔ خوش بدستِ شان همراه   هر دو با هم همی شدند به راه
شیخ چون جامه در کفِ شان دید   زان رسولان نشانِ آن پُرسید
جامهٔ خوش که با شماست ز چیست؟   بکجا بُردن است و از پی چیست؟
در جوابش چنین بفرمودند   آگه از حالِ جامه بنمودند
شیخ! کاین جامه که با ما هست   بهر آن اخترست که چون ماه است
نورِ سیّد شهاب الدّین همدان   میر سیّد علی تو نامش دان.
اندرین روزها ولادتِ اوست   قطب آفاق بیشک آن دلجوست
حکم شد جامه را به او بردن   شادیِ مام و بابِ او کردن
شیخ پرسید کی ز قطبیّت   میرسد در جهان و را رفعت؟
خضر و الیاس سوی او فرمود   بیست و دو سال، سال خواهد بود
چند روزی گذشته شیخِ زمن   چونکه بشنید از ولادتِ من
شادمانی فزوده اندر حال   که شد آن واقعه ظهور الحال
لاجرم تاکنون که در خدمت   یافتم در حضورِ شان قربت
هر یکی زان مشایخانِ کبار   خدمتی سوی من نمودِ اشار
تا از آن خدمت آنچه واقعه بُد   در نظرها جمله واقع شد

ہریکی پس نوازشِ ارشاد ساخت از مکرمت مرا امداد
پارۂ رقعہ نیز بسپردند بہ تبرّک عنایتم کردند
حضرتِ خضر نیز اندر حال جلوہ فرمود باہمہ اجلال
رقّعۂ نیز ازو گرفتم ہم پارہ از خرقہ پارہ دوختہ ام
چون زارشادِ این مشایخ دہر یافتم آگہی و دانش بہر
پس بہ سیر جہان گشادم پای
گشتم آفاق را نظارہ تمامی[1]

[اصحاب نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ اے شاہِ ہمدان! بلند مکانِ عالی شان! ہمیں آگاہ کردیں اپنی گہرافشاں زبانِ مبارک سے کہ یہ صفاکیش حضرات یعنی شیخ برہان الدین ساغرجی شیخ جبریل کُردی، شیخ شیخان نظام الدین غوری جو گُلِ سوری[2] کی طرح ہمیشہ کھِلے ہوئے رہتے ہیں۔ شیخ ابوبکر طوسی، ربّی کے حضرت خالد جنہوں نے ازل سے ہی ملاحت پی رکھی ہے (یعنی ازل سے ہی حسن کی نمکینی اُن کے حصّے میں آئی ہے) یہ سارے مشایخ کون تھے؟ جناب حضرت سیّدؒ نے کہا کہ ان تمام حضرات نے دنیا میں میری ولادت سے پہلے خواب میں میری روح کو دیکھ لیا تھا[3] جوان کو خوشنما اور دل فزا اور عالم کو منوّر کرنے والی دکھائی دی تھی، تو یہ سبھی حضرات یک زبان ہوکر خدائے لم یزل کی بارگاہ میں فریاد کیا کرتے تھے۔ کہ اے خدائے علیم و خبیر، آخر یہ صاحبِ ہمت ہمادنیا میں زمین کی کونسی جگہ کو آراستہ کریں گے۔ میری ولادت کا جب وقت آگیا تو یہ میری صورت کو دیکھ چکے[3] شیخ نظام الدین غوری کی

---

[1] نظم المناقب۔ نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر (مستورات) [2] گُلِ سوری ایک سُرخ رنگ کا پھول۔

[3] یہ بیان اس سے اب صحیح ثابت ہوا کہ حضرت شیخ بُرہان الدین ساغرجیؒ پہلے سے ہی جناب حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کو جانتے تھے۔ مکہ میں جب حضرت شاہ ہمدانؒ نے حضرت ساغرجیؒ سے پوچھا کہ صبح کی نماز پڑھا کر آپ دکھائی نہیں دیتے اور اگلے روز کی صبح کی نماز پڑھی۔ آپ نمودار ہوتے ہیں تو جناب حضرت ساغرجی یہ سنکر ان سے فرماتے ہیں کہ اب میں نہیں آؤں گا اور آپ مجھے اب صرف چین ہی میں دیکھیں گے (باقی اگلے صفحہ پر

جو یقیناً ایک صاحبِ کشف و مرتبہ بزرگ تھے، نے اس واقعہ میں خضر اور الیاس کو دیکھا کہ یہ دونوں رسولانِ سعید اکٹھے کہیں جا رہے تھے ان کے ہاتھوں میں عمدہ خوشنما لباس تھا اور راہ پر چل رہے تھے۔ شیخ نے جب یہ لباس اُن کے ہاتھ میں دیکھا تو اِن رسولوں سے پوچھا کہ یہ عمدہ لباس کیوں لیے پھر رہے ہیں، اسے کہاں لے جا رہے ہیں اور کس لیے؟ انھوں نے جواب دیا اور اسکی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ حضرت شیخ! یہ جو لباس آپ ہمارے پاس دیکھ رہے ہیں ایک ایسے ستارے کے لیے ہے جو روشن چاند کی مانند ہے۔ وہ ہے سیّد شہاب الدینؒ کا نورِ دیدہ اور اس کا نام ہے میر سیّد علی۔ ان کی ولادت اِن ہی دنوں ہوئی ہے اور وہ دل پسند و دلجو، قطبِ آفاق ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہمیں حکم ہوا ہے کہ یہ لباس ان تک پہنچا دیا جائے اور ان کو خوش کر دیا جائے۔ شیخ نے پوچھا کہ قطبیت پانے سے وہ اس دنیا میں کب بلندی کا مقام پائیں گے؟ حضرت خضر اور حضرت الیاسؑ نے جواب دیا کہ جب ان کی عمر بائیس سال کی ہوگی[1] مرشدِ زمان نے چند دنوں کے بعد جب میری ولادت کی خبر سُنی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ یہ واقعہ ظہور میں آگیا۔ ان مشائخِ کبار میں سے ہر ایک نے میرے ذمّہ کام رکھا[2] اور جو کچھ ان کی خدمت میں واقع ہوتا رہا وہ ظاہری طور پر بھی میری نظروں میں حقیقت بن کے واقع ہوا۔ ارشاد و ہدایت کے بعد ان مشائخ کبار

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) گویا اس کے بغیر کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی باہمی تعارف ہوا۔ لیکن چین پہنچ کر جناب حضرتِ قطبِ زمان کو جب شاہی محل کے تخت پر قطبیت سے بصیرت ہوئی کہ شاہ ہمدان آگئے ہیں تو شوربہ بھیج دیا اور باہر سپاہی سے کہلوایا کہ حضرت سید علی ہمدانی کون ہیں کہ اس شوربے کو اندر سے ان کے لیے بھیجدیا گیا ہے۔ گویا یہ عالم باطن میں پہلے سے مقرّر تھا کہ یوں ہوگا اور یوں ہوکر رہے گا۔ اس وقت تک حضرت شاہ ہمدانؒ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ جس قطب کی انہیں تلاش ہے وہ بھی شاہی محل والے ہوں گے حضرت قطب کو پہلے سے ہی ان کے نام سے واقفیت تھی جیسا کہ ان ابیات سے اب ثابت ہوگیا۔ (حاشیہ صفحہ ہٰذا): [1] یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ بائیس سال کی عمر میں سیاحت پر روانہ ہوئے۔ دیکھیے اگلے اوراق۔ [2] شاہ ہمدانؒ تب تک چین میں قطبِ زمان کی خدمت میں رہے جب تک اُن کا کام انہوں نے مکمل کر دیا۔

میں سے ہر ایک نے اپنی بزرگیوں کے پیشِ نظر میری مدد فرمائی۔ بعض حضرات نے تو خرقہ بھی بطورِ تبرّک عنایت فرمایا۔ حضرت خضرؑ بڑے اکرام کے ساتھ جلوہ فرما ہوئے اور انہوں نے بھی مجھے خرقہ عطا فرمایا۔ اور میں نے خود اس خرقے کے بعض حصّے سی لیے ہیں — اِن مشائخ زمان سے تربیت پاکر مجھے آگہی اور علم نصیب ہوا اور پھر اس کے بعد میں سیاحتِ عالم پر روانہ ہوا۔]

یہاں پر ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ قطبِ زمان شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ لوگوں کو چین میں دعوتِ اسلام بھی دیتے رہے اور وہاں دینی و مذہبی علوم اور اسلامی تمدّن کو پھیلانے میں انھوں نے بڑی کوششیں کی ہیں۔ جناب قطبِ زمان حضرت شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ چین میں سب کی نظروں میں معزّز اور مکرّم تھے، چنانچہ تمام مسلمان اُن کو صدرِ جہاں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ [1] نشرِ اسلام اور دینی علوم و تمدّن کو چین میں پھیلانے کے منتہائے مقصد کے پیشِ نظر قرینِ قیاس ہے کہ جو کام قطبِ زمانؒ نے حضرتِ شاہِ ہمدانؒ کے ذمّہ کیا تھا، اس میں دینِ اسلام کو پھیلانے کا فریضہ بھی شامل تھا۔ کیونکہ اوّل تو حضرت شاہِ ہمدانؒ تربیتِ باطن کی تکمیل کے بعد ہی "سیاحتِ رُبعِ مسکون" کے اہل قرار دیئے گئے، جس کا انہیں مرشد سے بھی حکم ملا اور عالمِ واقعہ میں اپنے جدِّ بزرگوارؐ سے بھی، دوسرے یہ کہ بیشتر اسفار میں آپ نے دینِ اسلام کا فریضہ ہی انجام دیا، اس لیے حضرتِ قطبِ زمان شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ کے اشارے پر چین میں دینِ اسلام کی تبلیغ، اور دینی و مذہبی علوم، اور تمدّنِ اسلام کی نشر و اشاعت، حضرت شاہ ہمدانؒ کی مساعی سے بھی عمل پذیر ہونے میں نہ کوئی (حاشا و کلّا) مبالغہ ہے اور نہ ہی بعید از قیاس۔

رسالۂ قلندریہ کے مؤلّف نے لکھا ہے کہ بیان کیا گیا ہے کہ "حضرت امیر سیّد علی ہمدانیؒ خطای سے لوٹے [2] جب ہمدان پہنچے اور اسی سال وہاں رُکے تو اچانک، جبکہ

---

[1] ملاحظہ ہو فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہوا رسالہ: اسلام در چین مؤلّفہ ژاک گوسولت (فرانسیسی) اور بدر الدین حیٔ (چینی) فارسی ترجمہ از عبد الحق بدیع، مطبوعہ چاپخانۂ حیدری، تہران سال ۱۹۷۶ء صفحہ ۵۱۔

[2] رسالۂ قلندریہ میں جناب ڈاکٹر ایرج افشار استادِ دانشمند نے توضیحات میں لکھا ہے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی ملاقات شیخ برہان الدّین ساغرجی کے ساتھ (باقی اگلے صفحے پر)

آپ کے سامنے سبھی مُرید حاضر تھے، آپ نے توجّہ فرمائی اور رونے لگے۔ کچھ دیر تک روتے رہے اور جب رونے سے فارغ ہوئے تو مریدوں نے آپ سے پوچھا کہ حضرت امیر! یہ حالت کیونکر آپ پر طاری ہوئی؟ آپ نے فرمایا کہ، کیسے نہ رُوؤں، آج قطبِ عالم شیخ برہان الدّین خطائیؒ کے ملک میں عالم فانی سے عالمِ باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اُسی وقت فرمایا کہ ہم قطبِ عالم کے آستانے پر جائیں گے کہ اب تو ہمارے جانے کا وقت بھی نزدیک ہے۔ اس کے بعد آپ ہمدان سے سمر قند تشریف لے گئے...."[1]

اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ چینؔ سے واپسی پر آپ ہمدانؔ سے سمر قند ہو کر ختلان[2] پہنچے تھے۔

سفرِ چینؔ کے علاوہ جن غیر ممالک میں آپ نے باطنی مأموریت کی تکمیل کے لیے سفر کیے اُن میں رُوم کا بھی ذکر آتا ہے۔ صاحبِ خلاصۃ المناقب نے حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے قیامِ رُوم کے سلسلے میں، جیسا کہ اگلے اوراق میں بیان ہوا ہے، یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ:

"حضرتِ سیادت فرمود کہ: وقتی در دیارِ رُوم در مسجدی نیّتِ اقامت کردہ بودم در فصلِ شتا، و ہوا بہ غایت سرد بود۔ ناگاہ شبی احتلام افتاد و نفس از غسل متکاسل آمد۔ پس غیرت کردم و بر نفس واجب گردانیدم بحسبِ نیّت کہ چہل شب در آبِ یخ بستہ غسل کنم۔ سنگِ گرانی در آنجا بود و بر سرِ آبِ یخ بستہ رفتم و بآن سنگ یخ را بشکستم و غسل آوردم، و حال آن کہ از جامہ جز خرقۂ کہنہ نداشتم و ہم چنین تا چہل روز

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) چینؔ میں سال ۷۷۴ھ اور سال ۷۸۵ھ کے درمیانی برسوں میں ہوئی ہوگی کیونکہ ان برسوں میں حضرت امیر سیّد علی ہمدانی کشمیر اور ترکستان میں سفر کر رہے تھے۔

[1] رسالہ قلندریہ صفحہ ۴، حضرت شیخ برہان الدین کو چین سے انکی وصیت کے مطابق سمر قند لایا گیا اور ان کا مزار سمر قند کے شہر سے باہر قلعۂ ارک کی جنوبی دیوار کے پاس ہے جس کا گنبد امیر تیمور نے تیار کروایا تھا۔

[2] ختلان میں سفر چینؔ سے لوٹ آنے کا سال معلوم نہیں۔ کیونکہ نہ ہی مولانا نور الدین جعفر (باقی اگلے صفحہ پر)

و شب آن سنگ را می بُردم و یخ را می شکستم و غسل می آوردم ....''

[ایک بار روم کے ملک میں ایک مسجد میں میں نے ٹھہرنے کی نیت کی تھی۔ یہ جاڑے کا موسم تھا اور ہوا بے انتہا ٹھنڈی تھی۔ ایک رات اچانک نیند میں انزال ہوا اور میرے نفس نے غسل کرنے میں سستی دکھائی۔ مجھے اپنے نفس پر غصّہ آگیا اور میں نے اس پر واجب ٹھہرایا کہ اب تو یخ سے منجمد پانی میں چالیس رات تک نہائے گا۔ وہاں پر ایک بھاری پتھر تھا۔ میں یخ سے منجمد پانی کے پاس آیا اور اس پتھر سے یخ کو توڑ دیا اور غسل کیا۔ حالانکہ لباس کے لحاظ سے میرے پاس ایک پرانے خرقہ کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا اور اس طرح سے چالیس دن رات تک میں اس پتھر کو ساتھ لے جاتا یخ کو توڑتا اور غسل کیا کرتا تھا[1]۔

اس اطلاع کے بغیر مولانا نورالدّین جعفر اور کوئی اطلاع حضرت شاہ ہمدانؒ کے سفرِ روم کے بارے میں نہیں دیتے۔ حضرت سیّد اشرف جہانگیرؒ نے بھی جب وہ حج سے لوٹ رہے تھے۔ جیسا کہ قبلاً بیان ہو چکا ہے، جناب حضرت امیر سیّد علی ہمدانیؒ کے ساتھ روم کی بندرگاہ میں ملاقات کی تھی اور دونوں کے درمیان وہاں پر حقایق و معارف کی باتیں ہوئیں۔[2] لطائف اشرفی میں اس سے زیادہ

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) نے اس کا ذکر کیا ہے، اور نہ ہی معتبر اسناد کی عدم موجودگی میں تحقیق ہو پائی ہے کہ جناب شاہ ہمدانؒ نے کتنی مدت تک چین میں تبلیغی امور انجام دیئے۔

حاشیہ صفحہ ہذا [1] صاحب نظم المناقب نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ دمشق (شام) کی جامع مسجد میں حضرت شاہِ ہمدانؒ کے قیام کے دوران میں ہوا اور اضافہ کیا ہے کہ چالیس دن کے بعد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہوئے اور منع فرمایا کہ نفس کا اب اتنا سخت امتحان لینا مناسب نہیں، اس کے بعد آپ نے سفر کا اہتمام کیا اور بدخشاں آگئے اور وہاں چار چلّے کاٹے اور پھر سیاحتِ عالم کو جاری رکھا۔ تعجب ہے کہ خلاصۃ المناقب کا اس بارے میں حوالہ دیا گیا ہے جو نادرست اور صحیح نہیں ہے۔ یہ صریحاً اشتباہ ہے۔ ملاحظہ ہو نظم المناقب زیرِ عنوان: ذکر اربعین علی ثانی و محنت کشی بر خود اختیار کردن او رضی اللہ عنہ۔ [2] لطائفِ اشرفی۔ سولھواں لطیفہ۔

اور کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔ صاحبِ نظم المناقب نے قیامِ روم کے دوران ایک واقعہ کا ذکر خواجہ اسحٰق ختلانی رح کی زبانی یوں کیا ہے:

"شاہنشہِ شہدا، ختلان کے خواجہ اسحٰق کا بیان ہے کہ شاہِ آفاق میر سیّد علی ہمدانی رح نے جب سیرِ جہاں کی نیت کی تو شہرِ روم میں بھی پہنچے۔ کچھ عرصے کے لیے آپ نے وہاں قیام فرمایا۔ وہاں کے بادشاہ خندگار[1] نے جو ایک نیک خصلت آدمی تھا، جب سُنا، تو کمالِ محبت کے اظہار کے طور پر اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ خراسان سے ایک صاحبِ کمال بزرگ اور عالم تشریف لائے ہیں۔ رومی لوگ ان کی شان و شوکت اور عُلوِ مرتبہ کو نہیں پہچان پائیں گے اور انکی مناسب قدردانی نہیں کر سکتے اس لیے تم ان کو ہماری طرف سے التماس کرو کہ اگر وہ ہم پر کرم فرمائیں تو ہمارے گھر کو منوّر فرمائیں۔ وزیر نے بادشاہ کا پیغام پہنچایا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا۔ بادشاہ نے وزیر سے پھر کہلوایا کہ اگر ان کی ہمارے یہاں تشریف آوری کی برکت سے ہم محروم ہو رہے ہیں تو ہم خود خدمتِ مقدّس میں پہنچ کر اُن کے قدموں کی خاکروبی کا شرف حاصل کریں گے۔ وزیر نے پھر پیغام گذار دیا لیکن حضرتِ سیادت رح کو سلطانِ روم کا آنا بھی پسند نہیں تھا۔ بالآخر آپ نے وزیر سے کہا کہ ہم خود ہی بادشاہ کے دربار میں آئیں گے۔ وزیر نے بادشاہ کو جب حضرت سیّد رح کی تشریف آوری کی خوش خبری سنائی تو بادشاہ بیحد خوش ہوا اور اس نے دعوت کا اہتمام بھی کیا اور اس دعوت میں شرکت کرنے کے لیے روم کے علماء و صلحاء کو دعوت نامے بھیجدیئے گئے۔ جناب حضرت سیّد رح کو اعزاز و تکریم کے ساتھ شاہی دربار میں لایا گیا اور انتہائی تعظیم و احترام سے صدر کی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ علماء نے جائے صدر پر اور بالانشین ہو کر

---

[1] خندگار یا خوندگار، روم کے بادشاہ کا لقب تھا۔

جو آپ کو دیکھا تو اُن میں اندر ہی اندر حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ بہرحال ضیافت حاضرینِ دربار کے سامنے پیش کی گئی اور جس کو جو کھانا کھا چکا۔ کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا ہوا۔ اس کے بعد سلطانِ روم نے حضرتِ شاہِ ہمدانؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ: "ہمارے دربار میں موسیقی دان سازندے حاضر ہیں، آپ حکم فرمائیں کیا وہ اسرارِ عرفان سے معمور کلام سنا سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ آپ کے امر و نہی پر منحصر ہے۔"

صفا کیش حضرات کے پیشوا، جناب شاہِ ہمدانؒ نے قوّالوں کو گانے کا اشارہ فرمایا۔ دربار میں حاضر ایک عالم کے دل میں خیال گذرا کہ میں حضرت سیّدؒ کو آزماؤں گا۔ اگر سماع و سرود کے دوران حضرت سیّدؒ پر حال و وجد کی کیفیت طاری ہوئی تو میں اُسی حالت میں اِس چھُرے کو جسے میں فی الحال فرش کے نیچے چھپا رہا ہوں، اُن کی کمر میں گھونپ دوں گا اور دیکھ لوں گا کہ حالتِ بیخودی میں اگر اِس جگہ سے خون بہہ نکلا تو یہ محض فریب ہے اور بھرے دربار میں حاضر لوگوں سے اس کا اعلان کر دوں گا اور اگر دورانِ وجد و حال زخم کی جگہ سے خون نہ نکلا تو پھر وہ خود بخود آپ کی حقّانیت کی دلیل ہے۔ جب گویّوں نے گانا شروع کیا اور اس کا اثر صوفیانِ پاک دل پر ہونے لگا اور اس پاکیزہ سماع کا غلبہ ہر طرف چھا گیا تو بے اختیار ہو کر جناب شاہ ہمدانؒ کھڑے ہو گئے اور اُن کی حالت پر وجد و کیفیت ایسی طاری ہو گئی کہ دربار میں حاضر سبھی ان کی اس کیفیتِ بیخودی کی بلائیں لینے لگے اور ان کی اس کیفیت پر فریفتہ ہو گئے۔ اس عالِم نے بیخودی کے اسی عالم میں فرش کے نیچے سے چھُری نکال کر حضرت شاہ ہمدانؒ کی پشت پر دے ماری۔ چھُری ان کی کمر میں پیوست رہی لیکن خون کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ حلقۂ سماع کے اصحاب نے جب یہ دیکھا کہ انکی پشت میں چھُری پیوست ہے تو انہوں نے مصلحت اس میں پائی کہ اس چھُری کو فوراً نکال دیا جائے۔ لیکن جناب قوام الدین[۱] نے منع کیا اور چھری باہر

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نکالنے سے روکا۔ جب حضرت شاہِ ہمدانؒ عالمِ بیخودی اور وجد و حال سے لوٹ آئے اور آپکے جسم مبارک میں معمول کا ہوش آیا تب زخم کی جگہ سے چھری کو باہر نکال دیا گیا اور خون جاری ہوا، اور پشتِ مبارک پر خون ایسے دکھائی دے رہا تھا گویا آسمان پر شفق کی سُرخی۔ آزمائش کرنے والا وہ عالمِ بے انصاف سخت شرمندہ ہوا۔ بادشاہ کو مطلع کر دیا گیا تو اس نے فوراً تحقیقات کروائی۔ حضرت سیدآ گاہ نے جب سنا کہ بادشاہ اس کی تحقیقات کروا رہے ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ ملّا لوگوں کے کام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد یہ ملّا بیمار ہو گیا اور سخت مصیبت و تکلیف میں مبتلا ہوا۔ بیماری و اضطراب کے ان ایّام میں وہ بلحظہ بہ لحظہ حضرت علی ثانیؒ کو واقعہ میں دیکھتا رہتا۔ ملّا نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خواہ مخواہ میں گناہ میں گرفتار ہوا، مجھے آپ لوگ جناب حضرت سیّد علی ہمدانیؒ کے پاس لے جائیں اور وہیں پر میں پہ اپنا ماتھا رگڑتے رہیئے اور اُن کے خاکِ پا کو سر پر ڈالیے جب تک مجھے معاف کر کے وہ میرے گناہوں کو بخش دیں اور اس طرح سے ظلمتوں سے میرا ستارہ باہر نکل کر پھر سے چمکنے لگ جائے گا۔ رات کے وقت بیمار ملّا کو حضرت شاہ ہمدانؒ کی خدمت میں لایا گیا اور اس کا سر آپ کے قدمہائے مبارک پر رکھ دیا گیا۔ وہ پائے مبارک کو چومتا رہا، چہرہ قدمہای مبارک کے ساتھ رگڑتا رہا، عاجزی کی، رویا، گڑگڑایا۔ نالہ و فریاد کی لیکن اس بدبخت اور برگشتہ اقبال ملّا کی عجز و زاری کا کوئی اثر حضرت امیر کبیرؒ کے دل پر نہ ہوا۔ آخر اس دنیا سے ملّا کے بے ایمان اُٹھ جانے کے خوف سے آپ سے دُعائے مغفرت کی درخواست کی گئی اور حضرتِ سیادت کے حضور سے اُسے نکال کر گھر کی طرف روانہ ہوئے، غم و الم اور ناشادی کی حالت میں جونہی ملّا گھر میں

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) لہ شیخ قوام الدّین بدخشیؒ آپکے مریدانِ صادق و ممتاز میں سے تھے اور سفر و حضر میں آپکے ہمراہ رہتے تھے بقول صاحبِ منقبت الجواہر قوام الدّین بدخشی نے ۴۰ برس حضرت شاہ ہمدانؒ کی خدمت میں گزارے تھے۔

داخل ہوا فوراً ہی جان دیدی۔ سلطان روم نے جب سُنا کہ حضرتِ پیرؒ کے تیر سے ملاّ نے جان دیدی تو آپ کے کمالِ ولایت پر اس کا اعتقاد اور بڑھ گیا اور خود حضرتِ شاہ ہمدان سے التماس کیا کہ لوگوں کو فیض پہنچانے کے لیے آپ اسی ملک میں ہمیشہ کے لیے قیام فرمائیں۔ لیکن یہ التجا آپ نے قبول نہیں فرمائی اور آگے سفر کا اہتمام کیا۔ روم سے آپ نے حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے کا عزم فرمایا اور احرام باندھ کر روانہ ہوئے اور وہاں سے اپنے جدِّ بزرگوار صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو مدینہ طیبہ گئے، اور پھر وہاں سے اپنے وطن لوٹ آئے۔۔۔۔[1]

روم کے سفر کی ان مختصر سی اطلاعات کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کس خارجی ملک میں تشریف لے گئے۔ لیکن بہرحال آپ کے سفر نامۂ روحانی میں بغداد، شام، اور سراندیپ بھی اُن بیرونی ممالک میں شامل ہیں جہاں آپ اپنے مقصد و مراد کو عملی جامہ پہنانے کے بعد وطن لوٹے۔

سفرِ سراندیپ کا ذکر آپ نے خود مولانا نورالدّین جعفر کے پاس یوں کیا ہے:

"وقتی بہ زیارتگاہِ قدمگاہِ آدم صفی اللہ علیہ السّلام بہ سراندیپ رفتم۔ سہ روز میانِ آب دیوچہ بایست رفتن، و در ہر اندک مسافتی پای را بہ چوب تراشیدن، و دیوچہ را از پای انداختن۔ و از برای شب باشیدن سیمہا کندہ اند در جایہا کہ اندک خشکی باشد تا بہ قدمگاہِ شریف آدم علیہ السّلام رسیدم، زنجیر درازی از آہن دیدم کہ از قلۂ صخرۂ عالیہ آویختہ است۔ پس از دلیل پرسیدم کہ با این زنجیر بالا می باید بر آمدن؟ گفت آری! لاجرم آن زنجیر را گرفتم و بر آمدم و سہ روز بالای آں صخرہ بودم۔ ولیکن یک قدم بریدہ اند، و بہ دیارِ دیگر بردہ، و آن نیز زیارت کردم۔ و این قدم گاہِ آدم نشانِ کفِ پای اوست کہ دران صخرہ رفتہ است در آن وقت کہ از بہشت بہ دنیا ہبوط نمودہ است و از حق جُدا گشتہ۔۔"[2]

---

[1] منقبت الجواہر زیرِ عنوان: "ذکر رسیدن علی الثانی رضی اللہ عنہ در روم، و آزمون کردن عالمی ہنگام وجد و حالِ آن سید باکمال ...... و کشتہ شدن آن عالم"۔
[2] خلاصۃ المناقب۔

[ایک وقت میں حضرت آدم صفی اللہ کے قدم شریف کی جگہ کی زیارت کے لیے سراندیپ گیا تین دن تک پانی اور جونکوں کے درمیان میں سے گزرنا پڑا اور ہر تھوڑے سے فاصلے پر ٹانگوں کو لکڑی سے کھرچنا اور جونک کو ٹانگوں سے ہٹانا پڑتا تھا۔ راتوں کو ٹھہرنے کے لیے اُن جگہوں پر جو قدرِ خشکی کی جگہیں ہیں تہ خانے کھودے گئے ہیں، جب آدم علیہ السلام کے قدم گاہِ شریف تک آ گیا تو میں نے دیکھا ایک اونچی چٹان (یا ایک بلند پہاڑ) کی چوٹی سے لوہے کی ایک لمبی زنجیر آویزاں ہے۔ میں نے راہنما سے پوچھا کہ کیا اس زنجیر کے سہارے اوپر جانا پڑتا ہے؟ اس نے کہا ہاں، ناچار میں نے زنجیر تھام لی اور اوپر آ گیا۔ تین دن تک میں اُس پہاڑ پر رہا۔ لیکن یہاں سے حضرت آدمؑ کے ایک قدم کو کاٹ کر ایک دوسرے ملک میں لے جایا گیا ہے اور میں نے اس دوسرے ملک میں بھی اس 'قدم شریف' کی زیارت کی ہے۔ حضرت آدمؑ کی قدمگاہ اُن کے پاؤں کا نشان ہے جو اُس وقت دھنس گیا ہے جبکہ جنّت سے اور اللہ تعالیٰ سے جدا ہو کر وہ اس دنیا میں اُترے تھے۔] لہ

لہ ابن بطوطہ (۷۰۳ - ۷۷۹ھ / ۱۳۰۳ - ۱۳۷۷ء) نے بھی سراندیپ میں قدمگاہ آدم کی زیارت کی ہے اور لکھا ہے: "... زالوی پران را دیدم کہ این حیوان را زالو می نامند و آن در میان درختان و علفہای کنار آب زندگی میکند... در ہر کجای بدن بنشیند مقدار زیادی خون از آنجا در می آید... و آنگاہ جای نیشش آن را با کاردی چوبی کہ برای ہمین کار ساختہ شدہ می خراشند..." [میں نے اڑتی جونکوں کو دیکھا جنہیں زالو کہتے ہیں اور درختوں اور پانی میں ہوتی ہیں۔ جہاں بدن پر کہیں بیٹھتی ہیں وہاں سے کافی خون نکلنے لگتا ہے۔ پھر زخم کی جگہ ایک لکڑی کے چاقو سے جو اسی لیے بنائے گئے ہیں ان کو کھرچنا پڑتا ہے] قدمگاہ کے پاس پہنچ کر لکھتا ہے کہ: "... مردمان قدیمی برای کوہ راہی پلہ مانند تراشیدہ و در آن میلہ ہای آہنین کارگذاشتہ و زنجیرہا بر آن بستہ اند کہ ہر کس بخواہد از کوہ بالا رود از آن زنجیرہا بگیرد و بالا میرود..." [قدیم لوگوں نے پہاڑ پر سیڑھیوں کی مانند راستہ کاٹ لیا ہے اور اس میں لوہے کے سلاخ گاڑ دیئے ہیں اور زنجیریں باندھی ہیں تا کہ جو کوئی چاہے ان زنجیروں کو پکڑ کر اوپر جا سکے ....] اوپر قدمگاہ کی زیارت پہاڑ پر کر کے لکھتا ہے کہ..

(باقی اگلے صفحہ پر)

سفرِ سراندیپ کے بارے میں ہمارے پاس بس اسی مقدار تک معتبر ترین اطلاعات پہنچی ہیں اور ابھی تک جناب امیر کبیرؒ کے سراندیپ (سیلون یا لنکا) میں اُن کے قیام کی مدّت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) مردم چین در قدیم الایام محل انگشت ابہام و اطراف آن را بریدہ و باخود بہ معبدی کہ در شہر زیتون (تسوسونگ) واقع شدہ بردہ اند و از نواحی دور دست بزیارت آن می شتابند.....‘‘ [چین کے لوگ قدیم ایام میں انگوٹھے اور اس کے اطراف (یعنی قدم شریف) کو کاٹ کے اپنے ساتھ شہر زیتون (تسوسونگ) کے مندر میں لے گئے اور دُور دُور کے اطراف سے لوگ اسکی زیارت کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں.....] ۔ فارسی ترجمہ الرحلہ بنام سفرنامہ ابن بطوطہ ترجمہ از دکتر محمد علی موحّد از انتشارات بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب ۔ تہران، صفحہ ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ جلد دوم ۔ ابن بطوطہ چین میں بھی تھا اور قطبِ زمان شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ کے گھر میں پیکنگ میں ٹھہرا تھا (دیکھیے سفرنامہ جلد دوم ص ۷۵۳ ۔ رسالہ قندیہ میں حواشی کے صفحات میں محقق فاضل ڈاکٹر ایرج افشار نے لکھا ہے کہ ابن بطوطہ نے قطبِ زمان شیخ برہان الدّین ساغرجیؒ کے ساتھ سال ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں پیکنگ (خان بالغ) میں ملاقات کی تھی، ابن بطوطہ کے بیانات کو درج کرنے سے مقصود اور نتیجہ یہ ہے کہ جناب حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے سفرِ سراندیپ کے ضمن میں قدمگاہِ حضرتِ آدمؑ کا آپ کا تذکرہ اور بیان ابن بطوطہ کے بیان کے عین مطابق ہے ۔ نیز یہ کہ حضرت امیرؒ نے چین میں اقامت کے دوران حضرت آدمؑ کے دوسرے قدم شریف کی بھی اُس مندر (بدھ مندر) میں جا کر زیارت کی تھی جسے ابن بطوطہ اور حضرت امیر کبیرؒ دونوں کے بیان کے مطابق سراندیپ کے پہاڑ سے کاٹ کر لے گئے تھے ۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا: ’’ولیکن ایک قدم بریدہ اند و بہ دیار دیگر بردہ و آن نیز زیارت کردم .....‘‘ [..... لیکن ایک قدم شریف کو کاٹ کے لے گئے ہیں ۔ ایک دوسرے ملک میں، اور اُس دوسرے ملک میں بھی میں نے اس قدم شریف کی زیارت کی.....] میں نے قیاساً بدھ مندر اس لیے لکھا کہ چونکہ ابن بطوطہ نے معبد کا ذکر کیا ہے جس کے معنی عموماً مندر کے ہیں اور چین میں اس زمانے میں بدھ مذہب ہی عام مذہب تھا، اس لیے اس غلط وہم اور گمان سے کہ یہ قدمگاہ، مہاتما گوتم بدھ کا ہوگا، بدھ زائرین نے چوری چھپے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور تبلیغی کارناموں کے بارے میں اسناد کی عدم موجودگی میں یا نادستیابی کے بموجب تحقیق نہیں ہو پاتی ہے۔

سراندیپ کے علاوہ آپ کے غیر ملکی سفر میں بغداد اور شام کا نام بھی آتا ہے۔ سفر بغداد کے بارے میں آپ کے مُرید صادق نے خلاصۃ المناقب میں بیان کیا ہے کہ، جیسا قبلاً بھی بیان ہو چکا ہے۔ "حضرت سیادت ؒ نے فرمایا کہ جب میں قریۂ علی شاہ (کولاب) سے حج کی نیت سے نکلا تو جو کچھ بھی میرے پاس تھا اُسے میں محتاجوں میں بانٹتا گیا اور جب میں نزدیک پہنچنے لگا تو زادِ راہ کم رہ گیا تھا۔ اچانک ایک صالح آدمی میرے پاس آیا جہاں میں ٹھہرا تھا اور چاندی کے بارہ ہزار دینار مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اس رقم کو قبول کیجیے کیونکہ اسے میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لایا ہوں۔ ناچار میں نے اُس سے یہ رقم قبول کر لی اور کہا کہ یہ حکم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیونکر تمہارے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ رقم اپنے حج کی خاطر بچا کے رکھی تھی اور اب میں حج کا اہتمام کر رہا تھا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ ان پیسوں کو بچا کے ہی رکھو تا کہ تم انہیں میرے فرزندوں میں سے ایک فرزند کو، جو حج کے لیے جانے والا ہے اور یہاں پر آ کر رُکے گا، دیدینا میں نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، اس فرزند کا نام کیا ہے؟ فرمایا: علی ہمدانی! اور اُس خواب کے دن سے آج تک پورا ایک سال گزر چکا ہے اور اس ایک سال کے عرصے میں اس جگہ کے بارے میں میں باخبر تھا اور مسافروں کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا، یہاں تک کہ آج آپ حضرتِ سیادت ؒ کی زیارت ہو گئی۔ یہ رقم لے کر میں بغداد پہنچا۔ چونکہ اس سال کے وقفہ میں مکہ جانے میں اب مصلحت نہیں تھی، ناچار بغداد کو چھوڑ کر میں شام کی طرف روانہ ہوا۔ بغداد سے شام کے سفر پر روانہ ہوتے وقت میں نے غذا اور پانی تین اونٹوں پر اور ضروریات کی دوسری چیزیں دو اونٹوں پر لاد کر شام کا رُخ کیا۔ قافلے کے لوگوں کو تعجب ہوا کہ سیّد تو خود کھاتے کم ہیں لیکن توشۂ سفر بہت زیادہ لاد کر سفر کرتے ہیں حالانکہ صرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اسے کاٹ کر اپنے وطن چین میں پہنچا دیا (زنبون کا نام آج چانگ چیو ہے (TCHANG-TCHEOU)

چودہ دنوں کا سفر ہے ہم آبادی میں پہنچ جائیں گے۔ قافلہ جب چند دنوں تک چلتا رہا تو اچانک راستے سے بھٹک کر غلط راہ پر چلنے لگا اور صحیح راستے سے باہر کئی دنوں تک رُکنا پڑا۔ ان کا توشہ ختم ہوگیا اور اب مجھ سے توشہ (خوراک، زادِ راہ) لینے لگے۔ بہرحال ہم قافلے کے لوگ اسی توشہ کی قوت سے آبادی میں پہنچ گئے اور جب شام میں پہنچے تو اُس وقت تنگی کا عالم تھا۔ لازماً اسی رقم کے پیسوں میں سے میں ہر روز غذا لاکر محتاجوں کو کھلاتا۔ یہاں تک کہ ایک اور واقعہ ہوا۔ اب اُن پیسوں میں سے تھوڑے پیسے رہ گئے تھے جن سے میں مکہ پہنچا اور حج کیا اور وہاں سے پھر قضاو قدر کی مرضی کے مطابق میں ختلان واپس آیا۔۔۔" [1]

اس کے علاوہ شام اور بغداد میں جناب حضرت امیر سیّد علی ہمدانیؒ کی کیا مصروفیات رہیں اور کتنی مدت تک آپ کا ان دونوں ممالک میں قیام رہا، خلاصۃ المناقب۔ کوئی اطلاعات دستیاب نہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تذکرہ سے جو خود جناب شاہ ہمدان کی زبان سے بیان ہوا ہے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بغداد میں آپ کچھ دیر ٹھہرے کیونکہ بغداد جب پہنچے ہیں تو وقفہ اتنا کم تھا کہ وقت پر آپ حج کے مراسم پورے نہ کر سکتے تھے۔ گویا قیاساً یہ کم از کم دو ڈھائی بلکہ شاید تین ماہ کا وقفہ رہا ہوگا کیونکہ سفر کٹھن، دُشوار گذار اور خطرناک ہونے کے باعث بغداد سے مکہ تک کا سفر اونٹوں پر ایک ماہ تک تو کم از کم طے ہوتا ہوگا۔ اور وہاں مکہ شریف میں بھی آپ کم از کم ایک ڈیڑھ ماہ پہلے پہنچنا لازمی جانتے تھے اسی وجہ سے آپ کے لیے یہ دو ڈھائی ماہ کا وقفہ مکہ پہنچنے کے لیے ناکافی تھا اور ظاہر ہے یہ مدّت بھی آپ نے بغداد میں گذاری اور اتنی مدّت بھی جتنی مدت آپ نے شام جانے سے پہلے گذارنا چاہی ہوگی یہ صحیح مدت کتنی تھی اور شام میں کتنی مدت گذاری، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ آیا آپ شام پہنچکر بعد میں وہیں سے مکہ میں حج ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے یا کسی اور قریبی ملک میں سفر کر کے وہیں سے مکہ کا رُخ کیا۔ یہ سب حقائق تحقیق طلب ہیں۔ لیکن ملاّ حیدر بدخشی نے اپنی تصنیف منقبت الجواہر میں آپ کے قیام بغداد کے دوران شیخ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ کے

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

روضۂ شریف کی زیارت کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"حضرت علی ثانی رح کے پیرو محمد طالقانی رح بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت میر سید علی ہمدانی رح نے بغداد کے لیے بارِ سفر باندھا تو اُس وقت اصحابِ ظفر پیکر میں خدمت گزاری کے لیے میں بھی شامل تھا حضرت شاہِ ہمدان رح نے وادی بغداد کی طرف روانگی سے پہلے جب رات کو آرام فرما رہے تھے، واقعہ میں حضرت رسول اللہ ﷺ کا دیدار کیا۔ اور انھوں نے آپ سے فرمایا: اے نور دیدہ! بغداد پہنچکر ایک رات روضۂ جنید رح میں بھی گذار دینا۔

صبح ہوتے ہی حضرت سیّد ہمدان رح نے اصحاب سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"ہمیں اس بیابان[1] سے اب کوچ کرنا ہے اور پیرِ بغداد کے روضہ کی طرف سفر کرنا ہے یعنی سرورِ اولیاء واہلِ تقیٰ، رہبرِ اتقیاء شیخ ابوالقاسم جُنید رح کے روضہ پر جانا ہے"۔ جونہی ہم وہاں پہنچے تو اوّل رات ہم نے اسی روضۂ مبارک پر گذار دی۔ روضۂ خاص کا طواف کر چکنے کے بعد جب حضرت سیّد رح تشریف رکھ چکے تو مجھ سے فرمایا کہ، احباب سے کہدو کہ سو جائیں۔ راہ کی خستگی کی وجہ سے ہم پر نیند غالب آ گئی۔ صبح ہوئی تو جناب آفتابِ نورانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمیں اب اردبیل جانے کا حکم ہوا ہے اس لیے سفر کی تیاری کی جائے۔

میرے دل میں خیال آیا کہ ابھی ہماری تھکاوٹ دور نہیں ہوئی ہے کچھ دن اور یہاں ٹھہرتے پھر اس کے بعد روانہ ہو جاتے۔ لیکن فرمانِ مبارک کے مطابق ہم نے تعمیل کی۔ میرا خیال جناب حضرت شاہ ہمدان رح کے ضمیرِ مبارک پر مکشوف تھا تو انہوں نے فرمایا کہ: اے محمد! تمہارا مشورہ مصلحتاً صحیح ہے لیکن شیخ دین (حضرت جُنید) کا خیال کرنا تمام سالکانِ طریقت کے لیے

---

[1] بیابان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس وقت خلاصۃ المناقب کے مؤلف کے بیان کے عین مطابق جناب شاہ ہمدان رح بیابان عرب میں پڑاؤ ڈالے مکّہ کی طرف جا رہے تھے جب کہ آپ نے بغداد جانے کا فیصلہ کر لیا۔

زیادہ عزیز ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اے ضمیروں کے واقف! مجھ سے قصور ہوا ہے مجھے معاف کر دیجئے۔ حضرت امیرؒ نے دُر افشانی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

" بغداد کی روانگی سے پہلے کی رات کو یعنی پرسوں میرے جدِّ بزرگ صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ حضرت جُنیدؒ کی زیارتگاہ پر حاضری دی جائے۔ کل ہم یہاں آ گئے اور کل رات ہی میں نے تم سب کو سو جانے کے لیے کہا۔ تمہارے سو جانے کے بعد جناب حضرت شیخ جنید میرے پاس تشریف لائے اور اُس صاحب فضل وکمال نے مجھے تلقینِ ذکر فرمائی۔ دورانِ گفتگو منصور حلّاج کا بھی ذکر آگیا اور بڑی کارآمد بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے میرے حق میں دُعا فرمائی اور اس طرح اپنی عنایات سے مجھے مسرور کر دیا۔ چنانچہ اس وقت حضرت رسولِ اکرم صلّے اللہ علیہ وسلم بھی جلوہ فرما ہوئے اور پھر دوسری بار حضرت جُنید نے میرے حق میں دُعا کی۔ اس کے بعد انھوں نے ارشاد فرمایا کہ اب آپ یہاں سے جلد ہی روانہ ہو کر شہر اردبیل کی طرف چلے جائیں اور وہاں کے بادشاہ کو اپنا مرید بنا کر اُسے رشد و ہدایت سے سعادت مند بنا لیں۔ وہ عادل ہے، انصاف پسند ہے، راہِ شریعت سے منحرف نہیں ہوتا لیکن اس نے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی ہے کیونکہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ دوزخی ہے یا جنتی ایمان تو اس کو حاصل ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اسکی عاقبت کیا ہوگی۔ آپ اسکی وفات کے پانے سے قبل ہی اسکی بیعت لے کر اس خستہ دل بادشاہ کے قلب کو اطمینان بخشیں۔ آپ کی بیعت اُسے حاصل ہوگی تو وہ دار البقا میں داخل ہوگا اسی لیے میں نے آپ حضرات کو سفر کی تیاری کرنے کے لیے کہہ دیا "۔

جب یہ حقیقت جناب قطب جہانؒ نے بیان فرمائی تو ہم سفر پر روانہ ہو کر شادمانی و اطمینان کے ساتھ اردبیل آ گئے۔ شاہ اردبیل نے بڑی حُرمت و عزّت کے ساتھ استقبال کیا اور جنابِ حضرت سیّدؒ نے بارگاہِ شاہنشاہی میں آفتابِ صبح کی طرح طلوع فرمایا اور بادشاہ نے آپ

قدموں پر اشرفیاں نثار کیں۔ درباری امراء سے بادشاہ نے کہا کہ " دیکھا تم نے کس طرح اللہ تعالیٰ نے آخر مجھ پر کرم فرمایا کہ میرے پیشوا حضرت سیدؒ کو میرے پاس بھیجدیا، تم چاہو تو ان کو آزما سکتے ہو۔"

چنانچہ ایک امیر نے بادشاہ کے پاس سے اُٹھ کر کہا کہ پہلے میں ان کو آزماؤنگا وہ حضرت شاہ ہمدانؒ کے پاس آیا اور کہا: "حضرت! میں غم والم میں مبتلا ہوں میرا بھائی سخت بیمار ہے اور حد سے زیادہ کمزور ہو گیا ہے، چنانچہ مجھے یقین ہے کہ میرے واپس گھر لوٹنے تک ہی وہ مرجائے گا۔"

یہ اس امیر نے جھوٹ بولا تھا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے اس سے کہا: "جلدی چلے جاؤ۔ ایسا ہی ہوگا۔ یہ سن کر امیر بادشاہ کے پاس گیا اور کہا کہ: "اے شاہ! یہ کیسے درویش ہیں۔ میں نے اِن سے اپنے بھائی کی بیماری کی بات کی اور کہا کہ میرا بھائی قریب المرگ ہے، تو انھوں نے کہا۔ ہاں قریب المرگ ہے جلدی گھر جاؤ۔ میں کیوں بھلا گھر جاؤں جبکہ میرا کوئی بھائی ہے ہی نہیں۔

اسی اثنا میں بادشاہ اُٹھ کر جناب شاہ ہمدانؒ کے حضور میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ: اے" حضرت! اے افسرِ سروران! اے رہبر کامل! ساری عمر میں وسواس میں رہا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "کیا وسواس ہے آپ میں؟" عرض کیا: "مجھے یہ فرمائیں کہ کیا میں دوزخی ہوں یا جنّتی؟" حضرت سیّدؒ نے فرمایا: "تمہاری جگہ جنّت میں ہوگی!" بادشاہ نے کہا۔ "کیسے؟ یہ میں جانتا چاہتا ہوں۔" جناب شاہ ہمدانؒ نے فرمایا: "تمہیں یہ جان کر خوش ہونا چاہیے کہ جناب حضرت جنید بغدادیؒ نے مجھے حکم دیا کہ میں اردبیل آکر تمہارا رہبر بن جاؤں اور تم تک یہ خوشخبری پہنچادوں کہ تم اہلِ بہشت میں سے ہوگے تاکہ تمہارا وسوسہ دور ہو جائے۔"

یہ ارشادات سن کر بادشاہ بے حد مسرور ہوا اور شاہ ہمدانؒ سے عرض کیا کہ اب آپ اپنی زبانِ مبارک سے میرے حق میں دُعا فرمائیں۔ بادشاہ

کی تسکینِ خاطر کے لیے شاہ ہمدانؒ نے اس کے حق میں دعا کی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اپنے درباریوں کو بھی یہ خوش خبری سنائی۔

دربار برخاست ہوا، اور وہ امیر بھی جس نے جھوٹ بولا تھا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ملک الموت نے اسکی جان نکال لی۔ بادشاہ نے یہ خبر سنی تو جناب حضرتِ فیض مآبؒ کے حضور میں حاضر ہوا اور اشک آلود آنکھوں سے عاجزی و زاری کرتے ہوئے پیرِ رہنماؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کی اور مرید ہو گیا اور سارا مال و املاک درویشوں میں تقسیم کر دیا، اور صرف ایک لباس اپنے لیے بچا کر، درویشوں میں شامل ہو کر دولت و شاہی کو خیر باد کہا اور درویشوں کے گروہ کے ساتھ چل پڑا۔ اور آخر کار ایک منزل پر شہید ہوا۔۔۔۔" ؎

ملا حیدر بدخشی اور صاحبِ نظم المناقب کے مندرجہ بالا بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جناب حضرت شاہ ہمدانؒ نے بغداد میں حضرت جنید بغدادیؒ کے روضۂ اقدس کی زیارت کی اور وہاں صرف ایک رات رہ کر اردبیل کی طرف روانہ ہوئے۔ مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ نے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر صاحبِ منقبت الجواہر اور صاحبِ نظم المناقب کے بیانات کو درست مان لیا جائے تو پھر قیاساً یہ صحیح ہے کہ شام کی طرف روانگی سے پہلے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جنید بغدادیؒ کی خواہش کی تعمیل میں حضرت شاہ ہمدانؒ نے بغداد سے چند دنوں کے لیے شاہ اردبیل کی رشد و ہدایت کی خاطر یہ سفر عجلت میں طے کیا ہوگا اور ماموریت کی تکمیل ہوتے ہی بغداد واپس آ کر شام جانے کی تیاریوں میں مصروف رہے ہوں گے۔

شام میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی دینی مصروفیات اور تبلیغی مشاغل کے بارے میں کوئی اطلاعات دستیاب نہیں۔ صاحبِ نظم المناقب نے جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر ہوا، دمشق کی جامع مسجد میں حضرت شاہ ہمدانؒ سے وہ قصہ منسوب کیا ہے جس میں آپ نے چالیس

نظم المناقب و منقبت الجواہر۔

راتوں تک اپنے نفس کو تساہل برتنے پر یخ بستہ و منجمد پانی کو ایک پتھر سے توڑنے کی سزا دی تھی۔ لیکن یہ قصّہ خود جناب حضرت امیر کبیرؒ نے مولانا جعفر بدخشیؒ سے بیان فرمایا ہے کہ یہ معاملہ روم کی مسجد میں پیش آیا تھا۔

غیر ملکی سیاحت و سفر میں فرنگ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ لیکن خلاصۃ المناقب میں اس سفر کا بیان مطلق نہیں ہے، البتہ نظم المناقب اور منقبت الجواہر کے مصنفین نے اسکی تفصیل درج کی ہے، لیکن فرنگ کے ملک کا نام نہیں لیا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ ارمنستان کا ملک ہے جو اب بھی نصاروں کی اکثریت پر مشتمل ہے اور اُس زمانے میں ایک الگ مُلک تھا اور اب روس اور ترکی اور ایران کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ ایرانی جغرافیائی حدود میں ارمنستان کا وجود میرے اس قیاس کو درستی کے قریب تر لے آتا ہے۔ صاحبِ نظم المناقب نے اس سفر فرنگ کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ:

> ،، مہرِ بُرجِ سیادت، دورانِ قُطبِ آفاق، حضرتِ شاہ ہمدانؒ ایک بار اپنے رفقاء کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے اور زمینِ فرنگ پر پہنچکر دوری پر وہاں رُک گئے۔ قوام الدّین بدخشیؒ کو جو کہ آپ کے قریبی اصحاب میں سے تھے اور سفر و حضر میں جس نے آپ کے ساتھ چالیس سال گذارے تھے، اکیلے اپنے ساتھ ایک قریہ کی طرف لے گئے۔ اس سرزمین کے تمام لوگ عیسائی تھے خواہ وہ گاؤں میں رہتے تھے یا شہر میں آباد تھے۔ آپ نے قوام الدّین سے کہا کہ آپ رفقاء کے پاس لوٹ جائیں اور ان کو لے آئیں۔ قوام الدّین کو ایسے خیال ہوا جیسے کہ شاہ ہمدانؒ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کریں گے اور اسی لیے آپ نے رفقاء کو طلب فرمایا۔ قطب عالمؒ نے قوام الدّین کو حقیقت امر سے آگاہ کیا اور کہا کہ یہ خیال دل سے نکال دو۔ فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں۔ قوام الدّین جب رفقاء کی طرف لوٹے تو جناب حضرت علی ثانیؒ تنہا رہ گئے۔ قریہ کے لوگوں کی ایک جماعت اس صاحب نیک اندیشؒ کے حضور میں حاضر ہوئی اور آپ سے استفسار کیا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ میں اس وقت بلادِ عرب میں سے ایک جگہ مکّہ سے آیا ہوں[1] عیسائیوں نے جب مکّہ کا نام سنا تو انھوں نے عقل و ہوش سے تعظیماً اس نام کا دل میں اثر لیتے ہوئے حضرت شاہ ہمدان کی خدمت میں ٹھہرنا پسند کیا۔ اسی اثنا میں حضرتؒ کے رفقا بھی آگئے۔ دورانِ گفتگو عیسائیوں نے اپنی ملّت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم سب عیسیٰؑ کے دین کے گرویدہ ہیں۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے فرمایا کہ جب تم قبلاً ہی جیسا کہ تمھارے ساتھ گفتگو سے معلوم ہوا، شہنشاہِ عرب حضرتِ احمدِ مرسل صلّے اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی سے واقف ہو تو پھر اُن کے دین اور ان کے کلمۂ شریف کو کیوں زبان پر نہیں لاتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰؑ قبر سے مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، بھلا اس قوّت و زور سے ان کا کیا مقابلہ۔ ہاں اگر آپ کے رسولؐ کی امت سے کوئی ایسا کر دکھائے کہ مُردہ کو زندہ کر دے تو ہم صدق و یقین اور جان و دل سے دینِ اسلام کے کلمۂ شریف کو پڑھ کر دینِ محمدیؐ قبول کریں گے۔ جب انھوں نے حضرت شاہ ہمدانؒ کے سامنے اس بات کا اقرار کر لیا تو حضرت امیر کبیرؒ نے بارگاہِ ربّ قدیر میں مناجات کی۔ ہاتفی نے آواز دی اللہ تعالیٰ نے آپکی دعا قبول فرمائی اور آپ کی دُعا کی برکت سے مُردے زندہ ہو جائیں گے۔ ہاتفِ اقبال کی اس آواز سے جناب حضرت امیرؒ کو تقویت حاصل ہوئی اور عیسائیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر کسی مُردے کو ہم زندہ کر دیں تو کیا پھر آپ لوگ دینِ محمدیؐ کو قبول کر لیں گے اور جان و دل کی نیّت کے ساتھ اسلام کے عقائد کے گرویدہ ہو جاؤ گے؟ سبھوں نے یک زبان ہو کر اقرار کیا اور اپنی جانوں پر قسم کھا کر کہا کہ ہم سب مسلمان ہو جائیں گے۔ قطبِ آفاق، غوثِ یزدانی، جناب حضرت علی ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ چند معتبر لوگ اہلِ قریہ کے ان کے مقبرے کی طرف روانہ ہوئے، حضرت امیر کبیرؒ نے بارگاہِ خداوند قادرِ متعال کی طرف اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی اور فوراً ہی ستّر آدمی حکمِ الٰہی سے

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تازہ ہی حجِ بیت اللہ سے لوٹ کر رفقا کی جماعت کے ساتھ ارمنستان میں ماموریت کی تکمیل کے لیے تشریف لائے تھے۔

مزار کی قبروں سے اُٹھ کر زندہ ہو گئے۔ اہلِ قریہ کے عیسائیوں نے یہ دیکھ کر صدق دلی سے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ﷺ کی شہادت کا کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور حضرتِ امیر کبیرؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی . . . .“[1]

حضرت شاہ ہمدانؒ، ماوراءالنہر میں بھی اپنی ماموریت کی تکمیل کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔ خلاصۃ المناقب میں مولانا نورالدین جعفر کا بیان ہے کہ ”جناب کاکای شیرازیؒ نے بیان کیا کہ اس جگہ سے جو میرا مقام حضور تھا میں اکثر آواز سنا کرتا تھا کہ گویا مجھے علم سکھایا جا رہا ہے۔ میں نے ایک روز بآواز بلند استفسار کیا، یہ آواز کس کی ہے؟ جواب ملا ”سیّد علی ہمدانیؒ کی“، جب میں ماوراءالنہر میں آیا تو میں نے وہاں حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ کی شہرت سُنی اور انکی زیارت کو گیا۔ ان سے ملاقات کر کے میں نے دیکھا کہ انکے کمالات کی کوئی انتہا ہی نہیں اور جب انھوں نے بات کی تو میں نے آواز پہچان لی کہ یہ وہی آواز ہے جو میں اُس جگہ پر سنتا تھا۔ لازماً میں نے اُن کی صحبت شریف کو اختیار کیا کیونکہ انکی ہمّت عالی کی برکت سے مجھے علم کا ایک بڑا حصّہ میسّر ہوا . . . . .“[2]

ماوراءالنہر کے سلسلے میں ہی مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی کے وطن میں آخری سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

”. . . . و امّا ابتلاء شدید و بلای مدید کہ در دیار ماوراءالنہر بآنجناب رسید تا بحدّی کہ بآن سبب جلاء وطن ورزید و عنان براق سیادت را بہ محشر کشید و اہلِ بیت شریف کہ بودند احباب آنجناب اجاد و اخلا منتظر لقاء مبارک گشتند تا روز حساب، بر ہیچ احدی پوشیدہ نہ باشد . . .“[3]

[. . . لیکن ماوراءالنہر کے ملک میں ایک سخت امتحان اور لمبی مصیبت سے جنابِ والا کو دُچار ہونا پڑا اس حد تک کہ اسکی وجہ سے انھوں نے ترکِ وطن کیا اور براقِ سیادت کی عنان[4] (محشر

---

[1] نظم المناقب: عنوان: ”ذکر رسیدن جناب علی الثانی رضؔ در زمین فرنگ و زندہ کردن ہفتاد مردہ و باسلام آوردن مردمان آنجائی“۔ نیز ملاحظہ ہو: منقبت الجواہر۔

[2] خلاصۃ المناقب۔

[3] خلاصۃ المناقب۔

[4] یعنی ایسے ترکِ وطن کیا کہ پھر اُن سے ملاقات نہیں ہو پائی۔

قیامت کی طرف پھیر دی اور اس طرح سے آپ کے اہلِ بیت شریف اور آپ کے احباب اور محب اور دوست آپ کے روئے مبارک کے دیدار کے روزِ قیامت تک منتظر رہے اور یہ کسی پر چھپا نہیں ......“]

حضرت شاہ ہمدانؒ کی ایک پیشگوئی جس میں انھوں نے اپنے ترکِ وطن کا ذکر کیا ہے ہمدان کے بارے میں ہے نہ کہ ماوراءالنہر سے متعلق، اور اس کا بیان صاحبِ نظم المناقب نے یوں کیا ہے کہ: ”حضرت امیر کبیرؒ ایک روز خانقاہ شریف میں تشریف فرما تھے اور اصحاب بھی حضور میں تھے، آپ نے اصحاب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ: ”بیس سال کے بعد ہمدان میں ایسی حالت ہوگی اور ایسا فتور پیدا ہوگا، اور تباہ حالی وجود میں آئے گی کہ بیحد ظلم و جور کی وجہ سے لوگ نالہ و فریاد کریں گے اور ہر ایک آدمی کی فغان و فریاد آسمان کی طرف ہوگی اور بادشاہ کی بادشاہت بھی نہیں رہے گی اور وہ بھی برباد ہوکے رہ جائے گا، جب یہ بدحالی آجائے گی تو ہم بھی ترکِ وطن کر چکے ہوں گے۔“ حاضرین نے عرض کیا: اس کی وجہ کیا ہوگی؟ جناب امیرؒ نے فرمایا کہ اسکی وجہ یہ ہوگی کہ لوگوں کا اعتقاد دین سے اُٹھ جائے گا۔ ان کے دلوں میں دین کے عوض باطل پرستی کا غلبہ ہوگا اور سب باطل کو جی جان سے چاہتے ہوں گے اور خانقاہوں کی طرف جانے کے عوض باطل کی طرف دوڑتے ہوں گے۔ اصحاب نے عرض کیا کہ یہ کب ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ یہ ہماری عمر کے اواخر میں ہوگا۔ بیس سال تک جو حضرات اصحاب زندہ رہے انھوں نے بیس سال کے انتظار کے بعد اپنی آنکھوں سے یہ کرامت دیکھی۔ ہر کسی کے دل میں فتور و قصور پیدا ہوا اور ملک مع لوگوں کے بیگانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور اولیاء اللہ کی ایک بڑی جماعت بھی شہید ہوگئی ......“[1]

مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ نے حضرت امیر کبیرؒ کے ترکِ وطن کی طرف جو اشارہ کیا ہے اُس کے مطابق حضرت امیر کبیرؒ اس وقت ماوراء النہر میں تھے اور بقول صاحب نظم المناقب آپ نے یہ پیشگوئی خانقاہِ ہمدان میں بیس سال (اپنی عمر شریف کے اواخر سے) پہلے اس واقعہ کے وجود میں آنے کے سلسلے میں کی تھی۔ اوّل تو یہ معلوم ہی نہیں کہ مولانا نورالدین جعفر کس

---

[1] نظم المناقب نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر۔

واقعہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جس سے جناب حضرت امیرؒ کی ذاتِ مبارک کو "ابتلائے شدید اور بلائے مدید"[1] سے دوچار ہونا پڑا، اس حد تک کہ آپ کو جلائے وطن اختیار کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اعلیٰ ترین مناصب پر فائض ایسے لوگوں کی امیر کبیرؒ کی ذاتِ مبارک کے خلاف سازش بھی ہو سکتی ہے جو صاحبِ اقتدار بھی تھے۔ اگر ہم زیادہ معتبر بلکہ معتبر ترین واسطۂ اطلاع یعنی مولانا نورالدین بدخشیؒ کے بیان پر غور کریں تو دو ہی صورتیں ہمارے سامنے اُبھر کر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ماوراءالنہر میں آپ کا قیام مقتدر حکام کے لیے باعثِ اضطراب تھا اور دوسرے یہ کہ علمائے سُوء اپنی بناوٹی ساکھ اور شرافت مصنوعی، جو جناب حضرت امیر کبیرؒ کی غیر معمولی دینی و علمی قوّت کے آگے ہیچ تھے، کا ملمّع اترتے دیکھ کر، اوباشوں کے ساتھ سازش کر کے ان کی جان کے درپے رہے ہوں گے۔ پہلا سبب عام طور پر، جیسا کہ حضرت امیر کبیرؒ کی حیاتِ مبارک کے بارے میں لکھے گئے کتابچوں یا پیش گفتاروں یا سوانح میں دیکھا گیا ہے امیر تیمور بادشاہ سے منسوب کیا گیا ہے اور نظم المناقب میں بھی جلاوطنی کی مندرجہ بالا پیشگوئی "امیر تیمور کے ظہور فتور" سے متعلق بیان ہوئی ہے۔[2] حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود اس پیشگوئی میں جیسا کہ بیان ہوا، کہیں بھی امیر تیمور کا نام نہیں بلکہ ملک (ہمدان) کی تباہی کے اسباب، دینِ اسلام سے لوگوں کی بیزاری اور باطل پرستی بتائے گئے ہیں[3] نہ کہ امیر تیمور کی سفاکی، خونریزی اور اولیاء اللہ سے دشمنی، جو اس بادشاہ سے عموماً منسوب کیے جاتے ہیں۔ مولانا نورالدین جعفر بدخشی کے بیان کے مطابق بھی، جیسا کہ اوپر درج ہوا، جلاوطنی کی وجہ ہم پر روشن نہیں البتہ قیاساً ہمارے سامنے جناب حضرت امیر کبیرؒ کے ماوراءالنہر چھوڑنے کی مجبوری دو ہی وجوہات سے نظروں کے سامنے آجاتی ہے، حکّام اور مقتدر علماءِ سُوء کی سازشیں، نہ کہ خود امیر تیمور کی خواہش۔ اس سے پہلے کہ اس موضوع پر معتبر اسناد و بیانات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ کچھ کہا جائے، یہاں پر امیر تیمور کی دین داری اور اولیا اللہ کے حق میں اس کی ارادت و عقیدت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] نظم المناقب زیرِ عنوان: ذکر کرامتِ ظہور فتور تیمور لنگ پیش از بیست سال از علی ثانیؒ [3] نظم المناقب۔ منقبت الجواہر۔

امیر تیمور (۷۳۶ - ۸۰۷ھ) نے اس میں کوئی شک نہیں کہ کمالِ قدرت و عظمت کے ساتھ سال ۷۷۱ھ سے ۸۰۷ھ تک بیشتر ایشیائی ممالک میں بادشاہی کی اور سال ۷۷۳ھ سے ۷۸۱ھ تک چار بار خوارزم پر حملہ کر کے آخر اُسے ویران کر ڈالا۔ دشتِ قفچاق اور مغولستان کو فتح کیا۔ نیشاپور اور ہرات پر قابض ہوا، اس کے مازندران کو فتح کیا (۷۵۰ھ) اور تین سالہ حملوں میں یعنی ۷۸۸ھ سے ۷۹۰ھ تک آذربائیجان، لرستان، ارمنستان، گرجستان اور شروان، اصفہان اور شیراز فتح کیے۔ سال ۷۹۳ھ میں خوارزم میں قتل عام کیا۔ اور پانچ سال تک یعنی سال ۷۹۴ھ سے ۷۹۸ھ تک حملوں کو جاری رکھا۔ اس کے بعد اُس نے ماسکو کو مسخر کیا[۱] اور سنہ ۸۰۱ھ میں ہندوستان کو فتح کیا اور سمرقند چلا گیا۔ ۸۰۲ھ سے ۸۰۷ھ تک ایران پر متواتر حملے کیے۔ ۸۰۳ھ میں ترکوں سے جنگ کی اور اُن کے چند شہروں پر قابض ہوا۔ مصر پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ حلب اور دمشق اور بغداد پر قابض ہوا۔ سال ۸۰۴ھ میں ترکی سلطان بایزید کو مغلوب کر کے قید کیا اور اس کے بعد چین کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور دریائے سیحون کے کنارے پر پہنچا لیکن اترار (فاریاب) میں بیمار ہوا اور سال ۸۰۷ھ/ ۱۴۰۴ء میں اکہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

اس سے بحث نہیں اور یہ موضوع اس کتاب سے خارج ہے کہ ایک جنگجو اور دلیر فاتح کی حیثیت سے مورخین نے امیر تیمور کے بارے میں کیا رائے قایم کی ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس طرح سے بعض مورخین نے اور جن میں خاص کر ایرانی مورخین پیش پیش ہیں، امیر تیمور کا مکمل طور پر ایک سیاہ نقش پیش کیا ہے وہ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ایرانی مورخین کا تیموری حملوں میں ملّی تعصّب شامل ہے، وہ اس تعصّب میں یہ تک فراموش کر دیتے ہیں کہ بالفرض تیمور نے جنگجوں میں سخت ظلم و جور کیے تو ایرانی لشکر نے اپنے اقتدار کے ادوار میں خاص کر ہخامنشی عہدِ حکومت میں روم کو فتح کرتے وقت کیا مظالم ڈھائے تھے؟ نادر شاہ نے دلّی پر حملہ کر کے تین دن تک قتل عام کیا اور کوہِ نور اور تختِ طاؤس کو بھی علاوہ بھاری رقومات و اجناس اور اسیروں کے لوٹ کر لے گیا۔ یہ واقعات

---

[۱] ماسکو (دارالخلافہ روس) میں وہ جگہ میں نے دیکھی ہے جہاں تک امیر تیمور خود آکر ٹھہرا تھا۔

خالص جنگجوؤں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس میں قوم و ملّت کا کوئی پاس نہیں کیا جاتا ہے۔ معمولی سے بہانوں پر جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے یا ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر جنگ و خونریزی تک کی نوبت آجاتی ہے اور پھر انتقام کی آگ دیر تک ٹھنڈی نہیں ہو پاتی اور اس آگ میں تاریخ گواہ ہے اپنے بیگانے اور ہمسایہ ممالک خاک و خون میں لت پت ہو جاتے ہیں۔ جنگیں ہوئی ہیں، ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ آج کل بھی جنگ ہو رہی ہے۔ مسلمان مسلمان ملک کا گلا کاٹ رہا ہے۔ ایران عراق کا اور عراق ایران کا۔ مغربی ممالک میں بھی یہی حال ہے۔ لیکن اُن جنگوں کو بالآخر تاریخ کی ایک حقیقت سمجھ کر پھر سے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کیا جاتا ہے۔ امیر تیمور نے جنگیں لڑیں، تسخیرات کیں۔ اور وفات پائی۔ نادر شاہ درّانی نے ہندوستان پر حملہ کیا، دلّی کو فتح کیا۔ دِلّی کو لُوٹ لیا۔ ایران لوٹ گیا اور بالآخر مر گیا۔ لیکن ہم نے تاریخ کی حقیقت کو قبول کر لیا اور نادر کے واقعہ کو فراموش کر ڈالا ایرانیوں نے تیمور کو معاف نہیں کیا۔

سکندر نے ایران کی خاص کر تختِ جمشید کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کئی سو سال تک یونانیوں نے ایران پر حکومت کی اور ایران پر مظالم توڑے، لیکن نظامی گنجوی نے اسکے باوجود بھی سکندر نامہ لکھا اور اس میں سکندر کی دلیری کی تعریفیں کیں۔ خود ایرانیوں نے فتوحات کیں اور کئی یوروپی ممالک کو ویران کر دیا۔ لیکن امیر تیمور کے بارے میں محض اس تعصب کی خاطر کہ امیر تیمور نے ایران پر حملہ کیا ایرانی مورّخ حُسنِ ظن کی بات نہیں کرتا بلکہ اُسے سفّاک بادشاہ اور سنّی متعصب[1] کہہ کر اس کی تذلیل کرتا ہے۔ اور خود اپنی تاریخ کے پس منظر میں روم پر مظالم توڑنے کے عمل کو دلیری کا نام دیتا ہے اور اسے قومی افتخار سمجھتا ہے۔ دراصل ایرانی اپنے آپ کو ایک مہذّب ملک و قوم کا فرد سمجھ کر اور خود کو ایک کہنہ تہذیب سے منسلک جاننے کی بنیاد پر برتری کا قائل ہے اور وہ قلب و ذہن میں اس بات کو آنے ہی نہیں دیتا کہ بقول اس کے کوئی اور قوم جو اس کی برابری کر ہی نہیں سکتی اسکے گہوارۂ تہذیب و تمدن کو نہس تہس کر ڈالے یا اس پر حملہ کرے گو کہ ایسا

---

[1] تیمور کے زمانے میں بلکہ صفویوں کے آغاز تک ایران میں اکثریت اہل سنت والجماعت کی تھی۔

سوچنے میں بھی وہ تفریق کر چکا ہے، عربوں نے جس وقت ایران پر حضرت عمر فاروقِ اعظم خلیفۂ دوم (رضی اللہ عنہ) کے عہدِ مبارک میں حملہ کیا تو اس کا بیان درج کرتے وقت ایران کے معروف رزم گو شاعر فردوسی طوسی نے اسی ملّی تعصّب سے کام لیتے ہوئے کہا ہے ؎

زشیر شتر خوردنِ سُوسمار عرب را بجائی رسیداست کار
کہ تخت کیان را کنند آرزو تُفو بر تو، ای چرخِ گردانِ تُفو [1]

اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے فتحِ ایران کا واقعہ ابھی بھی ایرانی کے دل میں خار بن کر رہ گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملّی تعصّب کا ہونا کسی حد تک مستحسن ہے۔ لیکن اس میں افراط اور حد سے زیادہ مبالغہ برتنا دوسروں کے لیے باعثِ تمسخر بن جاتا ہے۔ [2]

امیر تیمور نے واقعات و حالات کے پس منظر میں، ہر ایسے بادشاہ کی طرح جنگیں لڑیں جو واقعات کے فشار کے تحت مجبور رہا۔ لیکن اس سے قطعِ نظر امیر تیمور خود ذاتی طور پر ایک خدا ترس، صاحبِ صلوٰۃ اور بزرگانِ دینِ اسلام کا سخت عقیدتمند تھا۔ تیمور فرداً نیک مسلمان تھا۔ نمازوں کا پابند اور قرآن مجید کا پڑھنے والا اور جنگجوؤں میں قرآن سے فال

---

[1] ملاحظہ ہو "شاہنامۂ فردوسی" یعنی (اونٹنیوں کا دودھ پینے والے اور سوسماروں کا گوشت کھانے والے عربی لوگ اب یہاں تک پہنچے ہیں کہ کَے خاندان کے ایرانی بادشاہوں کے تخت کو چھین گے؟ افسوس ہے تم پر اے آسمان! افسوس ہے تم پر۔!
(تُفو کا لفظ بہت زیادہ سخت ہے اس کے بجائے ترجمہ کیا گیا "افسوس!")

[2] تہران یونیورسٹی میں جو خاتون استاد ہمیں تاریخ پڑھاتی تھیں ان سے جب کلاس میں میں نے یہی حقایق بیان کیے تو مجھ سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا کہ کیا بیل گاڑی کے نیچے آکر مرنا کسی جدید کار کے نیچے آکر مرنے سے بہتر ہے؟ کس قدر مضحکہ خیز اور بے معنی جواب! تاشقند میں، میں نے وہاں کے اساتذہ کی مجلس میں تقریر کے دوران انہیں امیر تیمور پر نئے سرے سے غیر جانبدارانہ تاریخ لکھنے کی ترغیب دی، جس سے تمام اساتذہ نے اتفاق کیا اور غالباً تاریخ کے چند سربرآوردہ اساتذہ اس طرح کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

نکالنے والا بلکہ بزرگانِ دین کی خدمت میں جا کر اُن سے فتح و نُصرت کا چاہنے والا۔ وہ خاصکر اپنے روحانی مرشد حضرت امیر سیّد کُلال رحمۃ اللہ علیہ کا سخت معتقد تھا۔ طرایق الحقایق کا مؤلّف معصوم علی شاہ نایب الصّدر لکھتا ہے:

> " امیر تیمور با فرقۂ محققینِ ہر ولایت و کشور نہایتِ لطف را داشتہ، و پیوستہ بہ صحبتِ علماء و عرفاء راغب و طالب بودہ، و مخصوص بہ امیر سیّد علی ہمدانی و بہ امیر سیّد کلال بخاری و شیخ زین الدین علی تایبادی . . . . "[1]

[امیر تیمور ہر ملک کے اصحابِ حق و یقین کی جماعت کے ساتھ نہایت لطف و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے اور ہمیشہ علماء اور عارفوں کی صحبت کی طرف راغب اور آرزومند رہتے تھے خاص کر امیر سیّد علی ہمدانی اور امیر سیّد کلال بخاری اور شیخ زین الدین ابو بکر (علی) تایبازی کی صحبت کی . . . .]

گویا ان تینوں بزرگانِ دین سے بالخصوص امیر تیمور کی عقیدت و ارادت حد درجہ کی تھی، اور اس طرح حضراتِ سادات اور خاص کر جناب حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کی ذاتِ گرامی سے تیمور کی عداوت و دشمنی کے جو افسانے ہم سینہ بہ سینہ سن کر اور بعض غیر علمی اور غیر تحقیقی کتابچوں میں پڑھتے آئے ہیں وہ صداقت سے دور ہیں اور ان کی کوئی دلیل اور سند موجود نہیں۔ خلاصۃ المناقب میں جو ہمارے ہاتھوں میں معتبر ترین سند ہے کہیں بھی تیمور کی ذات سے جناب امیر کبیرؒ کا کوئی واقعہ منسوب نہیں ہے اور نہ ہی کہیں اس میں تیمور کا نام آیا ہے۔ امیر تیمور نے کئی حضرات سادات کو بعض ظالم حکمرانوں کی قید و اُسارت سے نجات دلانے کی خاطر جنگیں لڑی ہیں اور امیر تیمور کی انسان دوستی اور بالخصوص سیّدوں کی جانی معاونت سے متاثر ہو کر سادات نے تیمور کی فوج میں شامل ہو کر اُس کے دشمنوں کے خلاف جنگیں کی ہیں۔ خود تیمور کے عہد میں بیشمار دینی اکابرین، مشائخ، صوفیا اور عرفاء کا وجود اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ امیر تیمور ان کا ارادت مند ہونے کے علاوہ ان کا حامی و ناصر بھی تھا۔ بزرگانِ دین کے

---

[1] ملاحظہ ہو طرایق الحقایق از معصوم علی شاہ جلد دوم ص ۶۷۸۔

ساتھ ارادت و عقیدت ہونے کے ضمن میں، صاحبِ طرائق الحقایق تیمور کی زبانی لکھتے ہیں: [1]
"میں نے (تیمور نے) خراسان جا کر وہاں تغلق تیمور خان کے ساتھ ملاقات کرنے میں تردد کیا، اور اس بارے میں اپنے مرشدِ روحانی (امیر کلال رح) سے مشورہ کیا۔ ..."

ایک اور جگہ لکھا ہے:

"... مجھے مصلحت یوں نظر آئی کہ سمرقند سے نکل کر پہاڑ پر جا کر ٹھہر جاؤں تاکہ جو کوئی مجھ سے متفق ہو وہ میرے پاس آئے گا اور پھر جب جماعت بن جائیگی تو میں ازبکوں کے خلاف جنگ کروں گا جب میں سمرقند سے نکلا تو اس وقت میرے ساتھ صرف ساٹھ آدمی تھے اور مجھے ایسا خیال ہوا کہ شاید میرا مشورہ صحیح تھا۔ ایک ہفتے تک پہاڑ پر ٹھہرنے کے بعد جب میرے پاس کوئی نہیں آیا تو میں نے خود فیصلہ کیا کہ بدخشان کی طرف جا کر وہاں کے بادشاہوں کو اپنے ساتھ ملا لوں گا۔ سوار ہو کر میں حضرت امیر کلال رح کی خدمت میں پہنچا انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں خوارزم کی طرف اپنی لگام پھیر دوں۔ میں نے نیت کی کہ ایک سال کی آمدنی میں ان کی نذر کر دوں گا اگر میں ازبکوں پر فتح پا لوں گا۔ انھوں نے میرے حق میں دعائے فاتحہ کی اور مجھے رخصت کیا جب میں اُنکی خدمت سے روانہ ہوا تو میرے ساتھ ساٹھ آدمی تھے ..."

تسخیرِ بغداد کے بارے میں خود تیمور نے تزک میں لکھا ہے:

"... عراق عجم اور فارس کو جب میں نے فتح کر لیا تو مجھے اپنے مرشدِ روحانی قطب الاقطاب امیر سید کلال رح کا خط ملا کہ میں نے عراقِ عرب اور عراقِ عجم دونوں تجھ کو بخش دیئے ..." [2]

[3] "سال سات سو بہتر ہجری میں جب صاحبقران (امیر تیمور) نے خراسان کو فتح کرنے کے ارادے سے دریائی آمو یہ کو عبور کیا تو قصبۂ اندخود میں بابا سنکو،

---

[1] طرایق الحقایق از معصوم علی شاہ جلد دوم بہ تصحیح محمد جعفر محجوب۔ کتابخانہ بارانی شاہ آباد تہران صفحہ ۶۷۸۔ [2] ایضاً صفحہ ۶۷۹۔ [3] تاریخ حبیب السیر۔

جو ایک مجذوب فقیر تھے، کے ساتھ ملاقات کی۔ جذبہ و حال کی کیفیت میں مجذوب نے سینے کا گوشت اس کی طرف پھینک دیا۔ امیر تیمور نے اس سے نیک فال لیا۔ اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رُوئے زمین کا سینہ جو خراسان ہے، مجھے عطا کیا اور ایسا ہی ہوا...."[1]

امیر تیمور کو ہرات فتح کرنے کا خیال آیا تو سال سات سو بیاسی (۷۸۲) ہجری میں قصبۂ تایباد میں جناب مولانا زین الدّین ابوبکر تایبادیؒ سے ملاقات کی۔ جناب مولانا زین الدّینؒ نے امیر تیمور کو نصیحت کی اور بڑی مفید باتیں فرمائیں اور تاکیداً فرمایش کی کہ اگر تم بھی اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ عدالت و انصاف کے ساتھ سلوک نہیں کروگے تو کوئی دوسرا تم پر غالب آجائے گا۔ امیر تیمور نے عرض کیا وہ کون ہے جسے مجھ پر غلبہ پانے کی قوّت ہے؟ مولانا نے فرمایا: ملک الموت۔ صاحبقران (امیر تیمور) نے یہ سُن کر اسے ایک نیک فال پر محمول کیا اور کہا کہ گویا سلاطین میں سے کوئی مجھ پر فاتح نہیں ہوگا..[2]

اُستاد ارجمند و محقق فاضل ایرج افشار نے رسالہ قندیہ میں حواشی کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"....مؤلف سمریہ دربارۂ مزار او (یعنی شیخ برہان الدین ساغرجیؒ) در صفحہ ۲۶ می نویسد کہ مزار فیض آثار حضرت روح آباد....مزار ایشان بدرون شہر سمرقند و قریب بہ دیوار جنوبی قلعۂ ارک است....و گنبد بالای ایشان را امیر تیمور گورگان تعمیر کردہ است و زیارت مزار ایشان دلکشا و رُوح افزا است....

امیر تیمور با این خاندان علاقہ و دلبستگی داشت و از فرزندِ شیخ

---

[1] طرایق الحقایق صفحہ ۶۷۹۔ نیز ملاحظہ ہو تزوکات تیموری۔ ابوطالب حسینی (بفارسی با ترجمۂ انگلیسی)، کتاب فروشی اسدی، میدان بہارستان۔ تہران۔ ۱۳۴۲۔

[2] ایضاً۔ نیز ملاحظہ ہو: حبیب السیر جزو سوم از جلد سوم صفحہ ۸۷۔

ہمیشہ طلب مدد دعا کردہ است۔ مؤلف سمریہ نیز باین نکتہ اشارہ می کند و می نویسد: امیر تیمور گورکان از حضرت شیخ ابوسعید ابن حضرت شیخ برہان الدین ساغرجی در کار خود طلب امداد نمودہ است۔ حضرت شیخ امیر تیمور را بہ زیارت شیخ نورالدین قطب چہاردہم) فرمودہ است ۔ ۔ ۔ بنا بر فرمودۂ ایشان امیر تیمور مزار حضرت ایشان را کہ قطب چہاردہم اند بیرون ارگ سمرقند داخل ساختہ عمارت عالی در بالای ایشان تعمیر کردہ، بہ بالای گنبد ایشان قبۂ طلا نہادہ است۔ زیارت مزار ایشان در اجابت دعا و حصول مقاصد تاثیر تمام دارد۔ امیر تیمور در شبہا بہ دور مزار ایشان می گشتہ است ع

کار نہ این گنبد گردان کند   ہر چہ کند ہمتِ مردان کند ۔ ۔ ۔"[1]

[سمریہ کا مولف اُن کے (یعنی شیخ برہان الدین ساغرجیؒ) کے مزار کے بارے میں صفحہ ۲۶ پر لکھتا ہے کہ مزارِ فیض نشانِ حضرتِ روح آبادؒ سمرقند کے شہر کے اندر قلعہ ارک کی جنوبی دیوار کے قریب ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کے اوپر جو گنبد ہے اُسے امیر تیمور گورکانی نے تعمیر کیا ہے اور مزار شریف کی زیارت دلکشا اور رُوح افزا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امیر تیمور کو اس خاندان سے تعلق اور دلبستگی تھی اور اُن کے فرزند سے ہمیشہ دُعائے خیر اور مدد کی التجا کیا کرتا تھا سمریہ کے مؤلف نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر تیمور گورگانی حضرت شیخ برہان الدین ساغرجیؒ کے فرزند حضرت شیخ ابوسعید سے طلب استمداد کرتے تھے۔ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے امیر تیمور کو چودھویں قطب حضرت شیخ نورالدین کی زیارت پر جانے کی تاکید کی اور ان ہی کے فرمانے پر امیر تیمور نے حضرت شیخ نورالدین چودھویں قطب کا ارگ سمرقند میں مزار شریف بنوایا اور اس کے اوپر ایک عالی شان عمارت تعمیر کر کے اس پر سونے کا گنبد بنا دیا۔ ان کے مزار شریف کی زیارت دُعاؤں کے قبول ہونے اور مقاصد کے حصول میں تاثیر کامل رکھتی ہے۔

---

[1] رسالہ قندیہ: حصہ حواشی و تصحیحات صفحہ ۱۲۰ : نیز ملاحظہ ہو، رسالہ سمریہ تالیف ابوطاہر سمرقندی بکوشش ایرج افشار تہران ۱۳۴۳ صفحہ ۶۹ ۔

امیر تیمور راتوں کو ان کے مزار شریف کے گرد طواف کیا کرتا تھا۔

یہ گھومنے والا آسمان کام نہیں کرتا   جو بھی کرتا ہے مردانِ صاحبدل کی ہمت سے اور بس"]

امیر تیمور کی حضرات اولیاء اللہ کے ساتھ عقیدت و ارادت اور صفائیِ قلب کے ساتھ اُن سے استمداد و اعانت طلب کرنے کے ضمن میں رسالہ قندیہ کے مؤلف نے لکھا ہے:

"... نقل است کہ امیر صاحبقران امیر تیمور گورگان، بطرفِ عراق لشکر کشیدہ اند۔ ناگاہ امیر را در آنجا شکست واقع شدہ بودہ است۔ امرا و وزرا گفتہ اند کہ کار مایان دیگر گون شد، باید کہ ازینجا برگردیم۔ امیر بسخنِ آنہا التفات نکردہ اند و متوجہ بہ ارواح طیبّہ اولیاء شدہ اند۔ ناگاہ بعنایتِ حضرتِ اللہ جلّ جلالہٗ و بمدد اہل اللہ فتح شدہ است و بر دشمن غالب شدہ اند و ظفر یافتہ اند۔ چون بجانب سمرقند رجعت کردہ اند خلقِ سمرقند از خاص و عام باستقبال حضرت امیر تیمور بر آمدہ اند و نیز حضرتِ شیخ زادہ کبیر شیخ نظام الدین کہ از نبیرہ ہای حضرتِ قطب چہار دہم، قدس سرہٗ اند باستقبال امیر تیمور آمدند۔ چون نظرِ امیر بہ شیخ زادہ افتادہ است، بہ تعجیلِ تمام روان شدہ، شیخ زادہ را طواف کردہ، و دامنِ ایشان را بر روی خود مالیدہ اند و بسیار چیز ہدیہ نمودہ اند۔ بعد از آن مردم از امیر تیمور پرسیدند کہ یا امیر! ہر دفعہ شیخ زادہ را کمتر تعظیم و تکریم می نمودید، این مرتبہ بیشتر واقع شد، سبب این چہ باشد؟ امیر تیمور گفتہ اند کہ در لشکر شکستی و ہزیمتی واقع شدہ بود، و خواستید کہ بازگشت نمائید، امّا ما بہ ارواح طیبۂ مشائخ متوجہ شدیم، بہ ناگاہ از غیب لشکر عظیمی پیدا شد کہ سرخیل و پیشوای آن، حضرت شیخ زادہ بودند۔ بنا بر آن مایان بر دشمن غالب آمدیم ....."[1]

[بیان کیا گیا ہے کہ امیر صاحبقران امیر تیمور گورگان نے عراق کی طرف لشکر کشی کی، اچانک وہاں امیر کو شکست کا سامنا ہوا۔ امرا اور وزراء نے آپ سے کہا کہ اب تو ہماری حالت اُلٹ گئی ہے، بہتر ہے کہ یہاں سے واپس چلے جائیں۔ امیر تیمور نے ان کی بات کی طرف توجہ نہیں

---

[1] رسالہ قندیہ صفحہ ۸۶۔

کی اور اولیائے کاملین کی ارواحِ مقدّسہ کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اولیاء اللہ کی مدد سے امیر کو فتح ہوئی، غالب آیا اور عراق کو مسخر کیا۔ جب سمرقند لوٹ آئے تو لوگوں میں سے ہر خاص و عام نے حضرت امیر تیمور کا استقبال کیا اور حضرت شیخ زادہ کبیر شیخ نظام الدین جو قطب چہار دہم، قدس سرّہٗ (یعنی حضرت شیخ نورالدین رحؒ) کے پوتوں میں سے تھے، بھی امیر تیمور کے استقبال میں شامل تھے۔ امیر تیمور کی نظر جب حضرت شیخ زادہ پر پڑی تو فوراً اُنکی طرف بڑھے اور شیخ زادہ کا طواف کیا اور اُنکا دامن اپنے چہرے پر بار بار ملتے رہے، اور بہت سی چیزیں ہدیہ میں پیش کیں اس کے بعد امراء نے امیر تیمور سے پوچھا: اے امیر! آپ تو ہر بار شیخ زادہ کی اتنی زیادہ تعظیم و تکریم نہیں کرتے تھے، اس کی کیا وجہ ہے کہ اب کی بار تو آپ نے ان کی بہت عزّت و تعظیم کی ہے۔؟

امیر تیمور نے کہا: فوج کو شکست ہوئی تو آپ لوگ واپس آنا چاہتے تھے۔ لیکن ہم نے مشائخ حضرات کی ارواح مقدسہ کی طرف رجوع کیا۔ اچانک غیب سے ایک عظیم لشکر نمودار ہوئی جس کی کمان شیخ زادہ کے ہاتھوں میں تھی اور یہی اس لشکر کے سردار تھے۔ ان ہی وجہ سے ہمیں نصرت و فتح نصیب ہوئی۔ ۔ ۔"

حضرت خواجہ نقشبند مشکل کشا خواجہ بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رحؒ کی طرح امیر تیمور کے ہمعصر اولیاء میں سے تھے اور جس طرح سے تیمور کو حضرت امیر کبیر رحؒ، حضرت زین الدین ابوبکر تایبادی رحؒ اور حضرت سیّد امیر کلال رحؒ سے ارادت و عقیدت تھی اسی طرح سے خواجۂ نقشبند رحؒ سے بھی تھی اور ان کی خدمت میں بھی پہنچتے تھے۔ نقل ہے کہ "ایک دفعہ امیر تیمور صاحبقران اپنے مرکب پر سوار ہو کر بخارا کے گلی کوچوں میں چکّر لگا رہا تھا۔ حاجب خاص رکاب تھامے ہمراہ تھا اور امیر تیمور گلیوں کے نام پوچھتا جاتا تھا اور محلوں کے بھی۔ حاجب کہتا تھا کہ یہ پشت شکن محلّہ ہے اسی گلی کو سرابوں گلی کہتے ہیں یہ کوچۂ روشن آباد ہے۔ ایک جگہ پہنچے تو دیکھا کہ چند اصحاب فرش کی دری کو پکڑ کر جھاڑ رہے ہیں۔

امیر تیمور کو جب معلوم ہوا کہ یہ حضرت خواجۂ بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبند مشکل کشا رحؒ

کے گھر سے دریاں جھاڑی جا رہی ہیں تو امیر تیمور نے دریوں کی دھول کو اپنے چہرے پر مل لیا اور کہا ھٰذِہٖ غُبَارَۃُ المَدِینَۃِ شِفَاءٌ یہ شہر شفا کی دھول ہے۔ مُریدوں نے جب اسکی اطلاع حضرت خواجہ بزرگؒ کو دی تو فرمایا، امیر تیمور اپنی عاقبت سنوار گیا۔ جس طرح سے اُس نے ہماری گرد و خاک کا ادب کیا اسی طرح اس کے عوض میں اس کا نام شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک روشن کر دیا گیا اور اسکی اولاد کو پشتوں تک بادشاہت بخش دی گئی ....“ [1]

امیر تیمور کی اولیاء اللہ کی نسبت غیر معمولی عقیدت اور سادات و مشائخ کی دامن بوسی وار دات سے متعلق جو اوپر معتبر اسناد سے حکایات درج کی گئی ہیں وہ محض چند ہی ہیں۔ قندیہ سے جو کچھ نقل ہوا ہے وہ اس لیے معتبر ہے کہ یہ رسالہ نویں صدی ہجری میں لکھا گیا جسکے ابتدائی برسوں میں امیر تیمور کی وفات (۸۰۷ھ) واقع ہوئی۔

اسپین کے بادشاہ ہنری سوم نے کلاویخو کو سفیر کی حیثیت سے امیر تیمور کے دربار میں بھیجدیا۔ کلاویخو نے سمرقند میں سال ۱۴۰۵ء (۸۰۸ھ) میں امیر تیمور سے ملاقات کی اور اپنے بادشاہ کی طرف سے اسکی خدمت میں ایک خط اور تحائف و ہدایا پیش کیے۔ کلاویخو نے اسپین سے سمرقند اور واپسی کے تمام حالات اپنے مشہور اور اہم سفرنامے میں درج کیے ہیں۔ اور بالخصوص امیر تیمور کی شخصیت اور اسکے دربار اور شاہی درباریوں اور شہزادوں اور لوگوں کے رہن سہن سے متعلق جو چشم دید واقعات درج کیے ہیں وہ انتہائی اہم اور دل چسپ ہیں۔ امیر تیمور کی سادات کے ساتھ ذاتی عقیدت کے بارے میں اسپین کے سفیر روی گنزالز کلاویخو لکھتا ہے کہ سمرقند کی تجدید اور دکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں جب بعض لوگوں کے مکانات کو ڈھا دیا گیا تو انھوں نے معاوضہ کے لیے براہِ راست امیر تیمور سے حق طلبی نہیں کی کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ہچکچاتے تھے۔ کلاویخو نے لکھا ہے کہ ”... باوجود این جرأت بردن شکایت بہ اعلیحضرت را نداستند سرانجامے کا

---

[1] ملاحظہ ہو، سیرت نقشبند مؤلفہ محمد اسمٰعیل نقشبندی قادری ۔ صابر الیکٹرک پریس میں درج ریلوے روڈ لاہور جولائی ۱۹۱۷ء۔ باہتمام منشی شیر عالم بذریعہ نور محمد تاجر کتب سرینگر [باقی صفحہ آئندہ پر]

باہزاران تردید و دودلی، نزدِ بعضی از سادات رفتند۔ سادات مردمی ہستند کہ در دربارِ تیمور عزّت واحترام وامتیازی دارند، زیرا اینان از بازماندگان پیغمبرند۔ اینان موضوعِ شکایت را بہ اُو گفتند..... گفت کہ اگر معلوم شود کہ بغیرِ حق ستانده اند، بی درنگ تاوان خواہد پرداخت.....“[1]

[..... اس کے باوجود بھی (کہ حق طلبی کا انہیں پورا حق حاصل تھا) براہِ راست اعلیٰحضرت (امیر تیمور) کے پاس شکایت کرنے کی انھوں نے جرأت نہیں کی۔ آخر کافی تردّد اور ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ بعض حضرات سادات کے پاس گئے۔ حضرات سادات وہ لوگ ہیں جنہیں تیمور کے دربار میں عزّت واحترام اور امتیاز حاصل ہے کیونکہ یہ حضرت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندانِ محترم کے لوگ ہیں انہوں نے شکایت کا موضوع اس (تیمور) کے پاس بیان کیا۔ تیمور نے کہا، اگر معلوم ہوجائے کہ ہمارے آدمیوں ناحق ان کی جائداد چھین لی ہے تو فوراً معاوضہ ادا کردیا جائے گا]

یہ ہے معتبرترین بیان جو ایک یورپی سفیر نے تیمور کی حضرات سادات کے ساتھ ذاتی عقیدت واحترام کے بارے میں ہمارے لیے باقی چھوڑا ہے۔

بہرحال یہ بات اب دلائل و براہین سے روشن ہوگئی ہے کہ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح نے ترکِ وطن امیر تیمور کے کہنے پر نہیں کیا۔ چونکہ امیر تیمور حضرت امیر کبیر رح کی حیاتِ مبارکہ کے اواخر میں خوارزم میں جنگوں میں مشغول تھا اور حضرت امیر کبیر رح خود ان ہی برسوں میں کشمیر سے بھی دوبار لوٹ آئے تھے۔[2] جس کی تفصیل آگے آئے گی

---

[1] ملاحظہ ہو سفرنامۂ کلاویخو۔ ترجمۂ فارسی از مسعود رجب نیا۔ مطبوعہ بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب تہران ۱۳۴۴ھ ش۔ ص ۲۷۸-۲۷۷۔

[2] پروفیسر ای جی براؤن نے لکھا ہے کہ: امیر تیمور نے ایران پر تین بار حملہ کیا سنہ ۱۳۸۰ء (۷۸۲ھ) میں سیستان اور مازندران اور خراسان کو پسپا کیا۔ سال ۱۳۸۴ء (۷۸۶ھ) اور ۱۳۸۵ء (۷۸۷ھ) میں آذربائیجان، شیراز، اور عراق وعجم پر حملہ کیا اور شیراز پر حملہ کرکے ۱۳۹۲ء (۷۹۵ھ) میں مظفری خانوادہ کو مٹا ڈالا، اس لیے ظاہر ہے کہ ان برسوں میں تیمور کی حضرت امیر کبیر رح سے ملاقات بعید از قیاس ہے۔ ملاحظہ ہو: لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوم ص ۱۶۰۔

اس لیے ترکِ وطن کا فیصلہ انھوں نے دوسری وجہ کے پیش نظر کیا ہوگا اور وہ دوسری وجہ اُن کھوکھلے فقہاء اور ریاکار علماء کی سازش ہو سکتی ہے جنہوں نے ہمیشہ اولیاء اللہ اور مشائخ عظام کی عظمت اور ان کے مرتبہ و مقام سے خائف ہو کر اور بادشاہوں کے درباروں میں ان کی قدر و منزلت اور غیر معمولی اکرام و عزّت کے پیش نظر اپنی خفّت کے احساس کی وجہ سے ان کو اوباشوں کے توسّط سے اذیتیں پہنچائیں۔ حضرت امیر کبیرؒ نے خود ان ریاکار اور ظاہر ساز اور زہد فروش ظاہر نما عالموں کی مختلف سازشوں کا ذکر کیا ہے اور اذیتوں کو تحمّل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

> "... آنچہ بحضرت زین العابدین دادہ اند، بمن دادہ اند، وصفتِ علیاء زین العابدین از لقبِ شریف معلوم می شود۔ حضرتش دایم از منزلی بمنزلی می رفتہ است از خوف جابران، در صغر سن حضرتش را در چاہ زندان. انداختند و محبّانِ او، از چاہ مناجات ازو می گرفتند ..."[1]

[جو حضرت زین العابدین کو دیا گیا ہے وہ مجھے بھی دیا گیا ہے، زین العابدینؑ کی صفاتِ عالیہ انکے لقب شریف سے ظاہر ہیں۔ ظالموں کی وجہ سے آپ ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہے۔ بچپن میں آپکو چاہِ زندان[2] میں ڈال دیا گیا اور آپ کے محب، چاہ سے ہی اُن سے دُعائیں حاصل کیا کرتے تھے .....]

اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے کہ حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں

---

[1] خلاصۃ المناقب۔ [2] قدیم الایام میں موجودہ قید خانہ کی جگہ کنوئیں میں قیدیوں کو ڈال دیا جاتا تھا اور اس میں بھی ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی جاتی تھیں اور قیدی کا کھانا وغیرہ اوپر سے ڈال دیا جاتا تھا البتہ کنواں متوسط گہرائی کا ہوتا تھا۔ میں نے اس طرح کے چاہِ زندان وسطِ ایشیا میں خود دیکھے ہیں، ویسے حاسدوں کی کینہ پروری اور بغض کی وجہ سے ماوراء النہر کو امیر تیمور کی طرف سے چھوڑنے کا حکم حضرت شاہ نور الدین نعمت اللہ ولی کرمانیؒ کو ملنے کا صریح اشارہ "ترجمۂ احوالِ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی" بتصحیح ژان اوبن ص ۴۱ - ۴۲ میں درج ہے؛ "... امیر فرمودند کہ اولیٰ آن کہ از وطنِ ما کوچ، بہ طرفی دیگر فرمائید" [باقی صفحہ آئندہ پر]

شاہان وملوکِ ایران کے درباروں میں تزک و احتشام اور جاہ جلال کی گرم بازاری کی وجہ سے درباری علماء بیشتر پیشہ ور چاپلوس بن چکے تھے، اور بادشاہ بھی ان سے سوئے استفادہ کر کے عیش وعشرت کی محفلوں کو جاری رکھتے تھے۔ دینی یا شرعی معاملات میں ذاتی تاویلات سے بادشاہ کے کردار کو جو اصولاً خلافِ شرع ہوتا تھا، لائقِ تحسین سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ دین کی طرف مائل اجتماع یا عوام کی دینی اور شرعی رہبری، دین دار اور واقعی خدا ترس اصحاب کے ہاتھوں سے نکل کر ان ہی ابن الوقت، کم علم اور ظاہر دار خود ساختہ عالموں کے ہاتھوں میں آئی تھی، جنہوں نے بادشاہوں اور امراء کو اپنی چاپلوسی اور فرماں بردارانہ کردار کی وجہ سے اپنے آپ کو مقتدر بنا لیا تھا اور ملکی امور اور سیاسی مسائل میں بھی دخیل کر لیا تھا۔ گویا علمِ دین و شریعت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا بلکہ عالم کے نام سے یہ لوگ عوام فریبی کے اعمال میں بہت دور تک جا چکے تھے۔ سادہ لوح لوگ ان کے ناموں سے ہی ان کی "طاعت وعبادت" کے قایل تھے۔ یہی دین فروش، دُنیا دار، عوام فریب دین دار اور درباری ٹکڑوں پر پرورش پانے والے "زاہد" اور ریا کار علماء خود کو دینِ اسلام کے اجارہ دار جانتے تھے۔ ایران کے ملوک اور بادشاہ ان کے لیے تعظیماً اُٹھتے اور ان کی عزت و قدردانی میں کوئی کمی نہیں کرتے، ان علماء کی، جو شاہانہ دربار کی عیاشیوں میں غرق تھے، ریا کاری ایک رائج متاع تھی۔ یعنی ایک طرح کا سکہ تھا جو ہر گھر، ہر جگہ اور ہر بازار میں چلتا تھا ان ہی عالموں نے زُہد ریائی کے لبادے پہن کر اپنے اقتدار کی

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ)

[امیر نے (تیمور نے) فرمایا کہ بہتر یہی ہے کہ ہمارے وطن سے کسی دوسری طرف نکل جائیں ...]

نیز اسی کتاب کے صفحات ۱۲۲-۱۲۳ پر درج ہے کہ: "کہتے ہیں جناب امیر کلالؒ جن سے حضرت بہائیہ نقشبندیہ بھی منسوب ہیں ...... نے فرمایا تھا کہ اُن (شاہ نعمت اللہ ولیؒ) سے بعض اہلِ سلاح نے بیعت کی ہے اگر انکو بادشاہت کی آرزو ہوگی تو مقابلہ کرنیکی طاقت نہیں۔ حضرت صاحبقران (امیر تیمورؒ) نے فرمایا: دو بادشاہوں کا ایک ملک میں رہنا باعثِ فساد ہے اس لیے وہ کسی اور ملک میں چلے جائیں"۔ عین ممکن ہے کہ اشتباہاً یہ داستان حضرت شاہ ہمدانؒ سے منسوب کی گئی ہو جیسے کہ داستانیں بالعموم خلط ملط ہوتی رہتی ہیں۔

ہوس میں بادشاہوں کو شریعتِ دین کو پارہ پارہ کرنے کی بے دریغ اجازت دے رکھی تھی۔ یہی ہیں وہ واعظانِ ریائیؔ اور عالمانِ کذائی، جن کو بادشاہوں، امیروں اور حاکموں نے ہر طرح سے اپنی تکیہ گاہ بنا رکھا تھا۔ شیراز کے بادشاہ شاہ ابواسحٰق اینجو کی ماں تاش خاتون ایک طرف وعظ کی مجلسوں میں جاتی تھی اور دوسری طرف شاہ ابواسحٰق کے وزیر امیر علی یزدی کے ساتھ عشق کرتی تھی اور اس کے ساتھ الگ گل و مل کی محفل سجاتی تھی۔[1]

گویا ظاہری دین داری اور شریعت کے امور کی طرف توجہ، علماءِ سُوء کی موجودگی اور اُن کے کردار سے متاثر ہو جانے کے نتیجے میں فسق و فجور کا ایک پردہ بن چکا تھا جو رفتہ رفتہ لوگوں میں سرایت کر چکا تھا اور اس منفی اثر کی وجہ سے اور پورے طبقے میں اس کے داخل ہو جانے کے خطروں سے بے خبر اور لاپروا ہو کر شریعت کے ان سوداگروں، ریاکاروں اور دجّال صفت عالموں نے دین فروشی کا دام پھیلا دیا تھا اور بادشاہوں، امیروں اور حکّام کی سرپرستی میں بےخوف ہو کر اپنی گرم بازاری کو قائم رکھے ہوئے تھے۔

بادشاہوں نے ان علماء کو اپنی سرپرستی دیکر ان سے علم و دانش خرید لیا تھا اور نان و آب کے عوض انہوں نے کامل طور پر سلیقۂ حکومت کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں ان دُنیادار و ہوس پرست علماء نے بڑے بڑے املاک اور بڑی جاگیریں بنائیں۔ انکے مقابلے میں وہ فقیہہ اور قاضی بھی تھے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے لحاظ سے بلاشبہ ان سے بہتر اور بدرجہا بڑھ کر تھے اور علم و دانش میں بھی انکی برابری کرتے تھے لیکن چونکہ وہ ان آلودگیوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھتے تھے، اور درباری جلوؤں کی چکا چوند سے دور زندگی گزارتے تھے اس لیے نہ ان کو ثروت حاصل تھی اور نہ ہی شہرت۔ وہ خانہ نشین ہو کر گمنامی اور گرسنگی کی حالت میں ایام روزگار بسر کرتے تھے۔

ان ہی ریاکار زاہد نما عالموں اور مفتیوں اور واعظوں پر حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے شہرۂ آفاق ہمعصر شاعر خواجہ شمس الدّین محمد حافظ شیرازیؒ نے طعنہ و تمسخر

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ عصر حافظ از دکتر غنی صفحہ ۸۸ (چاپ تہران ۱۳۲۱ شمسی)

کہ وہ غیر فانی اور لازوال ابیات اپنے دیوان شعر میں خلق کیے ہیں جو اس زمانے کے اسی اخلاق سوز محیط و ماحول کی عکّاسی کرتے ہیں۔ مثالیں بے شمار ہیں لیکن یہاں پر ایک معروف مثال کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔ شیراز کا بادشاہ شاہ شجاع سال ۷۶۶ھ میں کرمان گیا اور وہاں عماد فقیہہ کرمانی کی خانقاہ میں عماؔد سے ملنے گیا کیونکہ بادشاہ نے اسکے علم و زہد کی شہرت سنی تھی۔ عماد کی بظاہر ایک حیرت انگیز "کرامت" دیکھ کر بادشاہ کو اس کی ذات کے ساتھ غیر معمولی عقیدت پیدا ہو گئی۔ اور اس حُسنِ عقیدت کی وجہ یہ تھی کہ عماد فقیہہ نے ایک بلّی پال رکھی تھی۔ عماد فقیہہ جب نماز کے لیے اٹھتا تو یہ بلّی اُس کے پیچھے کھڑی ہو کر مقتدی کی طرح نماز پڑھتی اور رکوع و سجود میں بھی جاتی۔ شاہ شجاع نے اس کی اس فریب کاری کو اُسکی کرامت کی دلیل جان لیا اور وہ ہر روز اس کے حجرے میں جاکر اس کی خدمت میں خاصا وقت گذار دیتا۔ خواجہ حافظ شیرازی نے عماد فقیہہ کی اس ریاکاری اور فریب پروری اور جامعہ میں فتنہ و فساد کا موجب بن جانے کے بارے میں ایک مشہور غزل میں اس کی "گربہ بازی" کو "حقّہ بازی" (یعنی بازی گری، عیاری، مکّاری) کہا ہے۔ غزل کا مطلع اور چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

صُوفی نہاد دام و سرِ حقّہ باز کرد　　　بُنیادِ مکر با فلکِ حقّہ باز کرد
ای کبک خوشخرام، کجا مروی بایست　　　غرّہ مشو کہ، گربۂ عابد نماز کرد
حافظ، مکن ملامتِ رندان، کہ در ازل　　　ما را خدا ز زہد و ریا، بی نیاز کرد[۱]

[صوفی نے جال پھیلا دیا اور عیّاری کے سر سے سرپوش اُٹھا دیا۔ آسمانِ بازی گر سے بھی مکّاری کرنے لگا ہے۔ اے خوش رفتار چکور! کہاں جا رہے ہو، ٹھہرو۔ دھوکا نہ کھانا کہ کسی عابد کی بلّی نماز پڑھنے لگی ہے۔ حافظ! رندوں کی ملامت نہ کرنا کیوں کہ ازل سے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے زہد و ریاکاری سے بچا لیا ہے]

اسی عہد کے ایک اور شیریں کلام اور ایرانی اجتماع کا نقّاد شاعر عبید زاکانی، ریاکاروں کی مخالفت میں خواجہ حافظ کا ہمنوا تھا اور اُس نے بذلہ گوئی اور ہزل و طعن کی راہ سے

---

[۱] دیوانِ حافظ، ردیف دال۔

اِن علماء و واعظین، اور مفتیانِ شرع و زاہدانِ ریاکار کے اسرارِ درون کو انتہائی بے پردگی کے ساتھ فاش کر دیا۔ اس نے عماد فقیہہ کرمانی اور اس کی متقدی بلی کے بارے میں موش و گربہ کی داستان نظم کی ہے جو فارسی ادب کا ایک شاہکار ہونے کے ساتھ ریاکار علماء پر طعن و طنز کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے[1]

اس قسم کے دُنیادار اور جاہ پرست علماء بھلا حضرتِ امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح جیسے حق گو، حق شناس، بلند نظر، عوام دوست، درویش، عارفِ بے بدل، ولی اللہ، پاکباز، پاک نظر، پاک دل، دوستی میں وفادار، مہر و محبت اور عشق الٰہی میں گرم، اخوّت و فتوّت کا علمبردار، عالی قدر نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، اور بنی اسرائیل قوم کے پیغمبر جیسا عالم و صاحبِ کرامت، بندۂ حق کو کیونکر آنکھوں پر بٹھا دیتے۔ کہاں وہ داغ ننگ و رسوائی والے جاہل کم سواد، اور کہاں حضرت امیر کبیر رح جیسے عالم ربانی۔

حضرتِ امیر کبیر رح نے ان ہی دشمنانِ دین اور بے ارادت و یقین اور پست مایہ علما کے خلاف نبرد کیا جنھوں نے اپنے دامِ تزویر میں حکومتِ وقت کے ارکان کو لا کر ایسا اقتدار اور اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر حق پرست و حق گو دینی بزرگ کی اہانت کیا کرتے تھے۔ ان کی بھرے دربار میں تذلیل کرتے، اور اُن کو اپنے ذاتی مصنوعی وقار و حرمت کی بقا کی خاطر مختلف اذیتیں دے کر جان سے مار ڈالتے تھے۔ حضرت امیر کبیر رح سے نہ صرف اس قسم کے خود ساختہ علماء اور مفتیان و واعظانِ کور دل ہی خائف تھے بلکہ امرائے دربار بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔ حضرت امیر کبیر رح جامعہ میں سیاسی فساد کے علاوہ اخلاقی پستی کو بھی اصلاح و تہذیب دین کی وساطت سے مٹا دینا چاہتے تھے اور اس اصلاح میں فسادِ اجتماعی کے تخلیقی عناصر یعنی امراء، وزراء، علماء، ریاکار مفتی اور واعظ کا مٹ جانا بھی لازمی تھا تبلیغِ دین اصلاح اجتماع ہے اس لیے حضرتِ امیر کبیر رح کو اجتماعی آفتوں سے براہِ راست واسطہ تھا یعنی وہ جامعہ کے درد کو، فساد کو اور اس کی کمزوریوں کو جو امراء کی عیاشیوں اور فریب کار درباری علماء و مفتیوں کی محراب و منبر پر جلوہ نمائی کے بعد اُن کے خلوت میں

---

[1] ملاحظہ ہو: دیوانِ عبید زاکانی اور داستانِ موش و گربہ، مطبوعہ، کتاب فروشی ابن سینا۔ تہران۔

جا کر "کارہائے دیگر" سے سرایت کر چکی تھیں، ان کی گہرائیوں تک پہچان چکے تھے، ان پر وہ مہربانی کے ساتھ اصلاح نفس کا مرہم رکھنا چاہتے تھے اور قرآن و شریعت و اوامر نبوی ؐ کے آئینے میں ایک پاک اجتماع کی تشکیل کے خواہاں تھے۔

جو حضرت شاہ ہمدانؒ سے شناسائی رکھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس مردم آزاری کا جواب دینے سے وہ چین سے نہیں رہیں گے۔ ناممکن تھا کہ غیر حق کے آگے حضرت امام حسین علیہ السّلام کے خانوادۂ مقدّس کا یہ چراغ مدھم پڑ جاتا اور باطل کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہونے والے دلیر اور شجاع رسولِ خدا صلّے اللہ علیہ وسلم کا یہ قابلِ افتخار فرزند رحمۃ اللہ علیہ ظلم و جور اور اخلاقی پستی اور بے دینی و بے راہ روی کے آگے چشم پوشی سے کام لیتے، بلکہ انہوں نے اپنے جسم و جان کو اُن مصائب و اذیتوں کا سپر بنا دیا جن سے عوام النّاس، جو بندگانِ خدا ہیں، دوچار تھے۔ شاہ ہمدانؒ نے مقتدر علماء و امراء، اور صاحبانِ رسوخ و اثر سے زہر کی تلخ کامی بھی چکھی لیکن اجتماع کے ذوق کو تلخ نہیں بنایا بلکہ اپنے کردارِ حق، اپنی حقّانیت اور حق جوئی و حق گوئی اور بے نظیر قوّتِ برہان، جسکی اساس قرآنی علوم پر تھی، سے حریفوں کو توڑ دیا اور یوں شکست دی کہ اُن کی طرف سے زہر خورانی اور طرح طرح کی تعجّب انگیز آزمائشیں بھی آپکو نگوں نہ کر سکیں۔ آپ کی ان کامرانیوں سے بندگانِ خدا کو بہتر مستقبل کی امید و بشارت ملتی تھی۔ ظاہر ہے ان ہی وجوہات کی بنا پر جن میں بادشاہوں کی ذاتی دعوت کے بغیر شاہی درباروں سے کنارہ کشی بھی شامل تھی آپ کو اذیّت و آزار کا سامنا کرنا پڑا، رنج و الم سے دوچار ہونا پڑا، طرح طرح کی آزمائشوں سے جن میں حرام حیوانات کی گوشت خوری کی دعوتیں اور زہر کھلایا جانا بھی شامل تھا، اور بالآخر ماوراء النّہر سے ترکِ وطن کی آزمائش سے بھی گزرنا پڑا۔

اس سے پہلے کہ ہم معتبر اسناد سے ان آزمائشوں اور امتحانوں کا ذکر کریں ایک حقیقت کا ذکر کرنا لازمی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ خوف و ہراس سے مبرّا ہوتے ہیں[1] اور اور دُنیوی امتحانوں اور آزمائشوں میں سے گزرنے کا اُن کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ حضرت

---

[1] اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ سورۂ البقرۃ (قرآن مجید)

امیر کبیرؒ کی ساری زندگی اسی بے خوفی اور بے حُزن و ملال عنصر سے مرکّب ہے۔ سفر اور حضر میں وہ ہر چیز سے اور ہر خارجی اور اندرونی اثر سے بے نیاز ہو کر اجتماعی انصاف، اخلاقی بلندی، شریعت و قرآن کی حکم فرمائی اور بندگیٔ حق کی ندا اور تبلیغ میں سرگرم عمل رہے اور اس دور کے مطلق العنان بادشاہوں کے ملکوں میں جا کر وہاں کے ظلم و شقاوت کے خلاف بلا خوف کوئی حرف حق کہدینا محسوس کرنے والی بات ہے، خالص سننے والی نہیں۔ حق و حقیقت کا یہ منادی اور آسمانِ معرفت کا یہ آفتابؒ بھلا دُنیوی استدلال اور ناپائیدار دلیل کے آگے کیا تسلیم ہونا۔ انکے آگے سب مصنوعی چراغ بجھ گئے۔ اور انکی حقّانیت غالب آگئی۔ ایسے ممالک میں جا کر جہاں ان کی شناسائی نہ تھی۔ دعوتِ حق دینا اور دینِ حق کی طرف بُلانا بے خوفی اور حق نگری کی کرامت ہے اس لیے جیسا کہ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کے خوف سے حضرت امیر کبیرؒ نے ترکِ وطن کیا، قابلِ قبول نہیں۔ خاص کر ہمارے کشمیر میں بغیر کسی برہان و دلیل کے یہ بات باور کرادی گئی ہے کہ آپ امیر تیمور کے خوف سے کشمیر آئے۔ امیر تیمور کی خود حضرت امیرؒ کی ذاتِ گرامی سے عقیدت و ارادت کا حوالہ ہم اگلے اوراق میں دے چکے لیکن جیسا کہ تفصیل کے ساتھ کشمیر میں آپ کی آمد کے باب میں بیان ہوگا، آپ کی کشمیر میں تشریف آوری نہ کسی کے خوف کے نتیجے میں تھی اور نہ ہی کسی دُنیوی مصلحت کے لیے تھی۔ اور بالفرض اگر آپ کسی کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے بھی تھے، تو پھر تین بار کشمیر میں آکر آپ ہر بار کچھ عرصہ کشمیر میں قیام فرمانے کے بعد واپس کیوں چلے جاتے؟ ایک بار آکر پھر لوٹ جانے کا نام نہ لیتے۔ حضرت امیر کبیرؒ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ولی تھے جن پر نہ کسی کا ڈر طاری تھا (نعوذ باللہ) اور نہ ہی کوئی غم و الم۔ بادشاہ پکھلی، سلطان غیاث الدین کے نام جو خط آپ نے پکھلی میں لکھ کر سلطان موصوف کو بھیجا اس کے مندرجہ ذیل اقتباس کو پڑھ کر روشن ہو جاتا ہے کہ حضرت امیر کبیرؒ "لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" کی ایک مجسّم مثال تھے۔[۱]

---

[۱] دیکھیے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کا ادبی رسالہ دانش، شاہ ہمدان کے خطوط کے عنوان سے مکتوب بنام سلطان غیاث الدین۔ اردو ترجمہ، صفحہ ۱۵، از ڈاکٹر شمس الدین احمد (دانش شمارہ ششم)

سلطان غیاث الدین پکھلی نے حضرت شاہ ہمدانؒ کو بڑی منت سماجت سے راضی کر لیا کہ حضرت کچھ عرصے کے لیے پکھلی میں تشریف فرما رہیں اور وہاں کے لوگوں پر دینِ حق واضح کر کے ان کو راہِ راست پر لائیں۔ آپ نے بادشاہ کو راضی کرنے اور اس نیک کام کو انجام دینے کی غرض سے نیکی کو رائج کرنے اور پکھلی والوں کی اصلاحِ نفس کی مساعی کیں۔ لیکن بادشاہ ہی کے ایماء پر، اور ظاہر ہے وہاں کے ریاکار اور ظاہردار چاپلوس علماء کی خواہش پر، اوباشوں کی ایک جماعت کو آپ کے پاس بُری نیت سے گیا جن سے آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہوا۔ لیکن اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اور بغیر کسی خوف و ہراس کے حضرت امیرِ کبیرؒ نے حق کا ساتھ نہ چھوڑا اور بادشاہ کو لکھا:

"... اس عاجز (میں) نے اگرچہ کوشش کی کہ اس سے پہلے کہ اس ملک کے لوگ بدبختی ہی میں پڑے رہیں، یہاں سے چلا جائے۔ لیکن تم عزیز اس میں مانع ہوئے اگرچہ اللہ کا یہی ارادہ تھا۔ کیونکہ اللہ ہر کام پر غالب ہے تم نے اس عاجز کو (مجھ کو) اس شرط پر یہاں ٹھہرنے کا پابند بنایا کہ بھلائی کے جو بھی کام ہیں انہیں بھی انجام دوں اور جو حق ہے وہ تم پر اور دوسروں پر ظاہر کر دوں۔ اور تم نے کہا تھا کہ شریعت کے احکام کے سامنے جو شخص سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا اس کی میں شمشیر اور ہاتھ کی طاقت سے تنبیہہ کروں، اور اس بارے میں شہر اور بازاروں میں ڈھنڈورہ بھی پٹوایا گیا۔ تجھ عزیز کی بات پر بھروسہ کرتے ہوئے اس عاجز (میں) نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور تجھ عزیز کی نیک نامی کے حصول کی خاطر حق کو جاری کرنے اور نیکی کو رواج دینے کی سخت کوشش کی۔ لیکن آج فسادیوں اور فتنہ انگیز جاہلوں کی ایک جماعت جن کے اعمال و حالات سے سبھی واقف ہیں، بے شرمی و بے حیائی کے ساتھ جنگ و جدل کے لیے جمع ہو گئی ہے، ایسا کرنے کی جرأت ان میں کیونکر ہو سکتی ہے اگر انہیں تجھ عزیز کی اجازت کی قبولیت کی قوّت حاصل نہیں۔

اگر تجھ عزیز کا دل یہ چاہتا ہے کہ اس مُلک کے لوگ اس عاجز کے ساتھ

(میرے ساتھ) وہی کریں جو میرے جدّ حضرت حسین، اللہ اس پر راضی ہو، کے ساتھ یزید نے کیا تھا تو یہ ایک آسان بات ہے۔ ہم ان جفاؤں کو برداشت کریں گے اور اسے اپنی خوش قسمتی جانیں گے۔ اللہ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ جو کوئی سچ بولتا ہے اور سچ کو ظاہر کرنے میں کوشاں رہتا ہے، بہت سارے لوگ اُس کے دشمن ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے عُلمائے زمان کی بے احترامی کیے جانے کے ضمن میں فرمایا ہے:

"ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں ایک حیوانِ مُردار کی مکروہ لاش کو لوگ زیادہ عزیز رکھیں گے اُس مردِ مومن سے جو اُنھیں اچھے اور نیک کاموں کو اختیار کرنے کو کہے گا اور بُرے کاموں سے روکے گا۔"

اِس عاجز (میں) نے اس حقیقت کا کافی تجربہ کیا ہے اور اس وجہ سے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ لیکن رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے میرا پختہ وعدہ ہے کہ اگر ساری زمین میں آگ لگ جائے اور آسمان سے تلواروں کی بارش ہو، جو حق ہے میں اُسے کبھی نہیں چھپاؤں گا اور فانی مصلحتوں کے لیے میں دین کو کبھی بھی دنیا کے عوض نہیں بیچ ڈالوں گا۔ اب تم عزیز جانو اور تمھارا کام۔ سلامتی ہو ان پر جو راہِ راست کی پیروی کرتے ہیں۔"

آیئے، اِس صاحبِ اعجاز و کرامت، مردِ حق، اور مومنِ کامل، برگزیدہ ولی اور شریعت کے امر و نہی کو قائم کرنے والے قطب الاقطاب اور عالمِ بے بدل کی زبانِ مبارک سے ہم اُن حکایات کو سُن لیں جو ریاکار عالموں اور فسق و فجور میں غرق بادشاہوں، امیروں اور وزیروں، خلوت میں "کارِ دیگر" میں مصروف قاضیوں مفتیوں اور واعظوں نے آپ سے لرزہ براندام ہو کر آپ کو جان سے مار ڈالنے، زہر کھلانے، حرام حیوانوں کی گوشت خوری کرانے اور طرح طرح کی آزمائشوں کے مناظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ:

"... بسی ابتلا بہ ما رسید در سفر و حضر، کہ بعضی ازان ابتلا، بہ سببِ فقہاء رسید و علماء، و بعضی بہ سببِ ملوک و امرا، و بعضی، شاید کہ بود، بہ شُرورِ نفسِ ما۔ و آن

بلاہا از حضرتِ حق تعالیٰ باشد بر ما محضِ عطا، اگرچہ بصورت آن نمود بلا..."[1]

[سفر و حضر میں ہمیں بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔ یہ تکلیفیں بعض ایسی تھیں جو فقیہوں نے دیں اور بعض علماء نے، اور بعض بادشاہوں اور امراء سے اٹھانا پڑیں اور بعض خود ہمارے اپنے نفس کے شر کی وجہ سے۔ اور یہ مصائب ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایتِ محض تھے، اگرچہ بظاہر یہ مصیبتیں دکھائی دیتی تھیں...]

مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ، جناب حضرت شاہ ہمدانؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں:

"فتنۂ علماء را اگرچہ بسیار است اما یکی ازان فتنہ ہا این بود کہ وقتی مرا زہر دادند و حق تعالیٰ از ہلاکت نگاہ داشت ولیکن اثر آن در تن باقی است۔ در سالی یکبار ورمی پیدا می شود، و زرد آب بیرون میرود، و باز خشک می شود۔ و قضیہ آن بود کہ، در بعضی دیار، با علماء در مجلسی نشستہ بودم، و چند کلمۂ از حق گفتہ۔ علماء را ازان سخت ناخوش آمد و با ہمدگر گفتند کہ:

"اگر این نوع سخنان را بارِ دیگر عوام از سیّد بشنوند، از علماء عقیدہ بردارند۔ پس تدبیری باید کرد تا سیّد دفع شود و از حیات بہ ممات رسد۔" و بعد از مشورت اتفاق کردند کہ: "سیّد را زہر باید دادن کہ میراندش"۔ لاجرم دعوتِ شگرف ساختند و مرا طلب داشتند و التماس نمودند کہ البتہ خدمتِ سیّد باید کہ حاضر شود، در مجلسِ جماعت، تا برکتِ صحبتِ سیّد بہ اہلِ مجلس برسد۔ پس اجابت نمودم و برفتم۔ در راہ با ولی ملاقات افتاد، و آن ولی چند حبّ الملوک در دہان نہاد و گفت: "بخور از برای خدا"۔ و من نیز بخوردم و گفتم کہ موافقت باید کردن، اجابت نہ کرد۔ چون بآن مجلس رسیدم، اہلِ مجلس بہ غایت تعظیم نمودند، و قدحی شربت آوردند، و بہ عزّتِ تمام تشرّب عرضہ داشتند، و من نیز تشرّب نمودم ازان قدح۔ و بعدہ معلوم شد کہ، دران شربت زہر بودہ است۔ لاجرم، زود از آن مجلس برخاستم، و اہلِ مجلس، ہرچہ تمام تر بود، التماسِ

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

توقّف نمودند امّا اجابت نکردم بلکہ مسارعت نمودم تا بہ حجرۂ خود قُی و اسہال قوی پدید آمد و زہر از من دفع شد و بعد از ادائے شکرانہ خوش شدم۔ فلا جرم بعد از ان از صحبتِ علماء احتراز کردم، اگرچہ ایشان در غیبت و تہمت کوشیدند ...“[1]

[اگرچہ علماء کے فتنے بہت رہے لیکن اُن میں سے ایک فتنہ یہ تھا کہ ایک بار انھوں نے مجھے زہر دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ لیکن اس کا اثر جسم میں باقی ہے ہر سال میں ایک دفعہ ورم پیدا ہوتا ہے اور زرد آب (زرد پانی۔ پیپ، صفرا) باہر آتا ہے اور پھر خشک ہو جاتا ہے۔ یہ قصّہ یوں ہے کہ بعض جگہوں (ملکوں) میں سے ایک جگہ (ملک) میں ایک مجلس میں علماء کے ساتھ بیٹھا تھا اور میں نے کچھ حق کی باتیں کہیں۔ یہ باتیں علماء کو سخت ناگوار ہوئیں اور انھوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ اگر اس طرح کی باتیں دوسری بار عام لوگوں تک حضرت سیّدؒ کی زبانی پہنچ جائیں گی تو لوگوں کا عقیدہ ہم علماء سے اٹھ جائے گا۔ اس لیے کوئی ایسی تدبیر سوچی جائے کہ سیّد ہٹ جائے اور زندگی سے موت کی منزل پر پہنچ جائے۔ باہمی مشورے کے بعد انھوں نے آپس میں اتفاق کیا کہ سیّد کو زہر دے دیا جائے جس سے اس کی موت واقع ہو جائے۔ ناچار انھوں نے ایک دعوتِ عظیم کا اہتمام کیا۔ مجھے بُلایا اور التماس کیا کہ البتہ آپ حضرت تشریف لائیں گے دعوت پر، اور آپ کی مجلس میں تشریف آوری سے اہلِ مجلس کو برکت حاصل ہوگی۔ میں نے دعوت قبول کی اور روانہ ہوا۔ راستے میں ایک خدا دوست ولی سے ملاقات ہوئی اور اس نے حبُّ الملوک کے چند دانے میرے مُنھ میں ڈال دیئے اور کہا کہ خدا کے لئے ان کو کھا لیجئے۔ میں نے ان دانوں کو کھا لیا اور اسے دعوت پر ساتھ آنے کو کہا۔ لیکن اس نے قبول نہیں کیا۔ جب میں اس مجلس میں پہنچا تو اہلِ مجلس نے میری بیحد تعظیم کی اور شربت کا ایک بڑا پیالہ لے آئے اور بڑے احترام کے ساتھ شربت پیش کیا، اور میں نے اس پیالی سے شربت پی لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شربت میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ میں فوراً مجلس سے کھڑا ہوا۔ اہلِ مجلس نے اگرچہ حتّی المقدور مجھے رُک جانے کی بیحد منّت سماجت کی، لیکن میں نہیں مانا بلکہ وہاں سے جانے میں جلدی کی اور اپنے حجرے میں پہنچکر سخت قَے اور اسہال ہوا اور اس طرح سے زہر مجھ سے زائل ہوا۔ اور نمازِ شکرانہ ادا کرنے کے بعد مجھے مسرّت حاصل ہوئی۔

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

لا محالہ میں نے اس کے بعد علمار کی صحبت سے پرہیز کیا اگرچہ وہ برابر میری غیبت کرتے رہے اور مجھ پر تہمتیں لگائیں ۔۔۔۔!

صاحبِ نظم المناقب نے یہ حکایت ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے اور خلاصۃ المناقب[1] کے علاوہ نظم المناقب کے مولّف نے شیخ ابراہیم حقّانی ملّقب بہ مبارک خان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"ایک روز آفتابِ نورانی جناب میر سیّد علی ہمدانی رح بادشاہ[2] کی مجلس میں تشریف فرما تھے اور اُن کی وہاں دعوت تھی ۔ دربار شاہی میں علمار اور صلحار بھی موجود تھے ۔ بحث اکل حلال کے بارے میں ہو رہی تھی اور پھر علم کے بارے میں گفتگو ہوئی ۔ بادشاہ نے جناب حضرتِ سیّدِ دوران رح سے عرض کیا کہ آدمی اگر علم میں کمال بھی حاصل کرے تو بالآخر اس کا منتہای مقصد کیا ہے اور جو بھی کوئی علم پڑھے گا آخر اسے حاصل کیا ہوگا ؟ حضرت سیّد رح نے بادشاہ کو جواب دیا کہ اس شخص کو معرفت حاصل ہوگی ۔ علم خوان کو بھی اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور معرفت کے نتیجے میں ہی وہ صبح و شام اللہ کی بندگی کرنے کی طرف متوجہ رہے گا ۔ عبادت اس نیت سے کرے گا کہ اسے معرفت حاصل ہو کیونکہ اگر کوئی علم پڑھے گا اور معرفت سے بے بہرہ رہے گا تو پھر وہ کیسے واصل بحق ہوگا ۔ ؟ شاہی دربار کے علمار نے جب یہ کلام سنا تو انھوں نے کہا کہ حضرت سیّد کے یہ فرمودات صوفیوں کی باتیں ہیں لیکن اہلِ دانش و ہنر کے نزدیک علم کے معنی کچھ اور ہیں ۔ حضرت سیّد نے فرمایا اگر علم کے معنی کچھ اور ہیں تو ہمیں بھی بتا دیجیے ۔ ورنہ خواہ مخواہ کے مباحث جن کی بنیاد گمراہی پر ہے شاہی مجلس میں لانا بے معنی ہے ۔ بے معنی اور فضول مباحث ، کور دل والے لوگوں کی دروغ گوئی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے ۔ ان میں راست گوئی

---

[1] ملاحظہ ہو : نظم المناقب اور منقبت الجواہر ۔ [2] مولّف نے اس حکایت کے بارے میں بادشاہ کا نام نہیں لکھا ہے ۔ ملاحظہ ہو نظم المناقب زیرِ عنوان : "ذکر پرسیدن پادشاہ معنی علم از جناب میر سیّد علی ہمدانی رضی اللہ عنہ و حسد ورزی عالمان و زہر دادن ایشان بہ حضرت علی ثانی رح "

کا شائبہ تک نہیں ہوتا، بات اور بحث وہ ہو جس کی بنیاد شریعت پر ہو جیسے درخت حقیقت ہے اور اس کی ٹہنیاں شریعت۔ جب آپ لوگوں کی باتیں مطابق شریعت ہیں ہی نہیں تو آپ حقیقت کو کیسے پائیں گے؟

بادشاہ نے جناب حضرت سیدؒ کی باتیں بڑی ہوشیاری سے سن لیں اور ان پر بادشاہ کا اعتقاد اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس کے بعد دعوت کا اہتمام ہوا اور چار ہزار اشرفیاں بادشاہ نے خانقاہ کے لیے ہدیہ کے طور پر پیش کیں۔ بادشاہ نے آپ سے دُعا کی درخواست کی اور دعائیں لے کر بادشاہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے دل میں ابھی تک ان اہلِ کمال علماء پر اعتماد تھا لیکن فضل و ہنر اور علم کے بارے میں آپ کی توضیحات جو میرے لیے اب اظہر من الشّمس ہیں میرے لیے اس سے پہلے روشن نہیں تھیں۔ اب آپ نے ان کے اسرار سے مجھے واقف کر دیا ہے۔ آپ بیشک مردِ آگاہ ہیں۔ آپ میں ظاہری علم بھی ہے اور باطنی معرفت بھی۔ بادشاہ نے جناب حضرت سیدؒ کی بھرے دربار میں جب یہ توصیف و تعریف کی تو علماء دم بخود ہو گئے اور انھیں شرمندگی اٹھانا پڑی۔ ندامت کی حالت میں وہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن کینۂ و حسد کی آگ کو ساتھ لیکر۔ بالآخر آپس میں انھوں نے مشورہ کیا اور کہا کہ اگر کوئی تدبیر نہ کی جائے اور سوچ سمجھ کر اسے راہ سے ہٹا نہ دیا جائے تو اس علم کی بدولت جو اس میں ہے اور جسے وہ ہم سے بہتر جانتا ہے ہم بے عزّت اور بے قدر ہو کر رہ جائیں گے۔ انھوں نے بالاتفاق فیصلہ کر لیا کہ اسے زہر دیدیا جائے تاکہ وہ جنّت کو سدھارے اور ہمارا کام مکمل ہو جائے۔ لیکن یہ راز راز ہی رہے گا اور کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد انھوں نے چند دنوں کے لیے توقف کیا اور پھر اس کے بعد انھوں نے ایک بہت ہی عمدہ دعوت کا اہتمام کیا۔ اور طرح طرح کی ضیافتیں بنوائیں۔ اور جناب سیّد کی خدمت میں حاضر ہو کر زہر آلود اندرون لیکن بظاہر شکر ریز لبوں سے عرض گذار ہوئے

اور منّت سماجت کے ساتھ عاجزی کی کہ: "اے سیادت پیشہ شاہنشہِ آفاق! آپ خوب کردار والے ہیں۔ نیک اخلاق والے ہیں! ہمارے گھروں کو اپنی تشریف آوری اور شرف مندی سے آراستہ فرمائیں۔ اپنی بزرگی و عظمت کے قدمِ مبارک ہماری طرف بھی بڑھائیں، اور ہمارے یہاں دعوت قبول فرمائیں تا کہ ہماری دل رضائی ہو جائے۔ آپ کے قدمہائے مبارک سے ہمارے سر افلاک پر پہنچ جائیں گے۔ آپ ہمارے سرور ہیں اور ہم آپکی خاکِ پا۔ آپ جیسے سروِ سہی کی تشریف آوری سے ہمارے چمن پر طوبیٰ بھی رشک کرے گا۔"

سراپا عاجزی و انکساری کے ساتھ کی گئی یہ عرضداشت جب حضرتِ سیّدؒ نے سُنی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی اور میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ اپنے احباب کی جماعت کے ساتھ میں روانہ ہوا۔ راستے میں میری ملاقات اچانک حضرتِ خضر[1] علیہ السّلام کے ساتھ ہوئی اور انکی وجہ سے ہم لوٹ آئے۔ لیکن انھوں نے پھر خانقاہ میں آکر عجز و زاری کی اور میں نے ذرا ٹھہر کر آنے کا وعدہ کیا۔ جب میں پھر روانہ ہوا تو خضر علیہ السّلام نے کھانے کے لیے چند دانے (قُرص) دیدیئے اور کھانے کی تاکید کی۔ میں نے اُن ہی کے سامنے یہ دانے کھائے اور ہر چند مجھے جانے سے روکا لیکن چونکہ وعدہ کر چکا تھا اس لیے ناچار جانا پڑا۔ میں اُن کی محفل میں پہنچا اور بیٹھ گیا۔ لیکن وہ خود تعظیماً کھڑے رہے۔ گرمی کا موسم تھا اور ہوا بہت گرم تھی۔ بدن جھلس رہا تھا اور وہ ٹھنڈا شربت لے آئے۔ اس شربت میں زہرِ ہلاہل ملا تھا اور انھوں نے مجھے بھی شربت پلایا اور کہا کہ راستے کی گرمی کو مٹانے کے لیے یہ شربت عمدہ ہے۔ یہ شربتِ زہر اسی خیال سے انھوں نے مجھے پلا دیا کہ جونہی یہ اندر دل میں اترے گا تو فوراً اس کا اثر ہو گا اور اس کے بعد اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکے گا۔ اُن کے ہاتھ سے

---

[1] مولانا نور الدین جعفر بدخشی نے لکھا ہے کہ راستے میں آپ کی ملاقات ایک خدا دوست (ولی) درویش کے ساتھ ہوئی جسے آپ نے دعوت پر ساتھ آنے کے لیے بھی کہا تھا۔

شربت لے کر جب میں نے اسے پی لیا اور میرے تن بدن میں اس کا اثر ظاہر ہونے لگا تو میں فوراً ہی وہاں سے اُٹھا۔ ہر چند انھوں نے مجھے جانے سے روکا لیکن میں نے ان کی ایک نہیں مانی اور میں خلوت میں پہنچا اور پہنچتے ہی مجھے قَے اور اسہال ہوا اور اس طرح سے زہر کا اثر جاتا رہا۔ لیکن ابھی بھی کچھ اثرات باقی ہیں اس زہر ہلاہل کے کبھی کبھی پاؤں ورم کر جاتے ہیں اور اعضا میں درد ہو جاتا ہے۔ تب سے میں نے علماء کے پاس جانا چھوڑ دیا اور اُن سے دُور رہتا ہوں لیکن بہر حال اُن کے دل میں میرے خلاف کینہ و حسد بدستور باقی ہے اور وہ مجھ پر تہمتیں لگانے اور میری چغلخوری کرنے سے باز نہیں آتے ...''

صاحبِ خلاصۃ المناقب، حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کی زبانی لکھتے ہیں کہ :-

''... و فتنۂ ملوک و امراء نیز اگرچہ بسیار است امّا یکی از فتنہ ہا این بود کہ در بعضی دیار رسیدم و سلطانِ آن دیار طالب صحبت آمد بہ اکرام و اعزاز و اجلالِ تمام بہ نزدیکِ خود طلب نمود، و من اجابت نہ کردم۔ آن سلطان را غضب آمد و لہبی از آہن ساختن فرمود۔ چون اسپ تمام شد بر آتش نہادند تا آتش گشت۔ و آن سلطان تہدید می فرستاد و می فرمود کہ در شہر ندا کنید کہ سیّد را باید بہ صحبت سلطان آمدن و الّا بر اسپ آتش سوار سازند او را۔ ہمچنین تا چہل روز اسپ را گرم می ساختند و باز خنک می شد۔ بعد از تہدید و ندار او، من در صحبت آن سلطان نہ رسیدم و بعد از چہل روز آن سلطان در صحبتِ من آمد و با ادبِ تمام قیام نمود و عذرِ ماضی خواست ....''[ل]

[اور یہ بادشاہوں اور امیروں سے بھی اگرچہ بہت سے فتنے سرزد ہوئے ہیں لیکن اُن فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی تھا کہ میں بعض ممالک میں پہنچا تو ان میں سے ایک ملک میں وہاں کے بادشاہوں نے میری صحبت کی خواہش کی اور بہت عزّت و اکرام اور تعظیم کے ساتھ مجھے اپنے پاس بُلایا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ غضب میں آگیا اور اس نے لوہے کا ایک گھوڑا

خلاصۃ المناقب۔

بنانے کا حکم دیا۔ جب گھوڑا بن کے تیار ہوا تو اُسے آگ میں ڈال دیا گیا یہاں تک کہ یہ بھی آگ کی طرح ہوگیا۔ بادشاہ مجھے ڈرانے دھمکانے کے پیغامات بھیجتا رہا اور شہر میں ڈھنڈورا پیٹنے کا حکم دیا کہ سید سے کہا جائے کہ وہ میرے حضور میں حاضر ہوجائے ورنہ اُسے آگ کے گھوڑے پر بٹھا دیا جائے گا۔ چالیس دنوں تک گھوڑے کو آگ میں گرم کرتے رہے اور یہ ٹھنڈا ہوتا رہا۔ بادشاہ کے ڈرانے دھمکانے اور ڈھنڈورہ پٹوانے کے باوجود بھی میں اُس کے پاس نہیں گیا اور چالیس روز کے بعد بالآخر بادشاہ خود ہی چل کر میرے پاس آیا اور بکمال ادب واحترام کے ساتھ میرے پاس بیٹھا اور جو کچھ گذرا تھا، اسکی معافی مانگ لی ....]

اس حکایت کو صاحبِ نظم المناقب نے بلخ کے بادشاہ کے ساتھ منسوب کیا ہے اور اگرچہ خلاصۃ المناقب کا ہی حوالہ دیا ہے لیکن بھاری اختلاف کے ساتھ یہ حکایت اوپر کی حکایت کے مطابق ہے۔ دراصل اختلافات بیان نسخوں کی نقل اور کاتبوں کے ذاتی تخیّل کا نتیجہ ہوتے ہیں مثلاً اس حکایت میں نظم المناقب میں آہن کی جگہ مس ہے اور خلاصۃ المناقب میں کسی بادشاہ کے ملک کا نام لیے بغیر نظم المناقب کے مؤلّف نے اس واقعہ کو بادشاہ بلخ سے منسلک کیا ہے۔

نیز اس حکایت میں صاحب نظم المناقب نے حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے آتشی گھوڑے پر سوار ہوجانے کی تصدیق کی ہے جبکہ خود حضرت امیر کبیرؒ نے بڑی صراحت کے ساتھ خود بیان فرمایا ہے کہ وہ اُس بادشاہ کے دربار میں نہیں گئے اور نہ ہی گھوڑے پر سوار ہوئے۔ یہ بات واقعی تعجب انگیز ہے کہ نظم المناقب کے مؤلّف نے مولانا نورالدّین جعفر بدخشی کا حوالہ دیکر ایسی بات لکھی ہے[1] صاحبِ نظم المناقب نے لکھا ہے کہ:

" نورالدّین جعفر جو ایک باکمال راہبر تھے، بیان کرتے ہیں کہ حضرت میر سیّد علی

---

[1] اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خلاصۃ المناقب کا جو قلمی نسخہ مؤلّف نظم المناقب کے زیر مطالعہ تھا اس میں اس حکایت کا واقعہ اُسی طرح درج تھا جس طرح نظم المناقب میں درج ہے، ویسے سخت عقیدتمند کاتبوں نے بزرگانِ دین کی کرامات کو بعض معتبر نسخوں سے نقل کرتے وقت فرطِ ارادت اور جوشِ عقیدت میں اکثر اپنے ذاتی اعتقادات کا اضافہ کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اختلافاتِ نسخ محققین کے لیے باعث زحمت و سرگردانی بن جاتا ہے۔ زیرِ نظر واقعہ بھی اسی اختلاف کا نتیجہ ہے۔

ہمدانی غوثِ صمدانی رح نے فرمایا کہ بلخ میں ایک سخت خو بادشاہ تھا۔ اس کا مہر قہر اور اس کا شہد زہر کے مصداق تھا۔ اُس تلخ مزاج بادشاہ نے ایک دن مُہر کیا ہوا ایک خط مجھے بھیجا کہ آپ کی صحبت کا محتاج ہوں اور آپ کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے کا راغب ۔ آپ تشریف لاکر مجھے دینی علوم سے بہرہ ور فرمائیں۔

خط پڑھ کر میں نے بادشاہ کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ حسد و کینہ کی وجہ سے بادشاہ غضب میں آگیا اور اُس کا حسد آگ کی طرح بھڑکنے لگا۔ خشمناک ہو کر اس نے مِس (تانبے) کا ایک گھوڑا بنانے کا حکم دیا۔ کاریگروں کو بلایا اور کافی مقدار میں تانبہ لایا گیا۔ کاریگروں نے کئی دنوں میں تانبے کا گھوڑا بنایا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ آگ جلا کر گھوڑے کو اس میں ڈال دیا جائے۔ چالیس دنوں تک گھوڑے کے اندر آگ پھونکتے رہے اور گھوڑا ایک آتشی گھوڑے میں تبدیل ہو گیا۔ چالیس دن کے بعد لوگ اور لشکر کے آدمی اس گھوڑے کو دیکھنے کے لیے آگئے اور اس کے بعد بادشاہ نے لشکر کے چند آدمی میرے پاس بھیج دیے بادشاہ نے ان کو مجھے لے جانے کے لیے انعامات دینے کا وعدہ کیا، اور بصورتِ دیگر اُن کو آگ میں ڈال دیئے جانے کی تنبیہہ کی۔ یہ لوگ میرے پاس آئے تو کہا، بادشاہ نے ہمارے ذمّے کر دیا ہے کہ حضرت سیّد ضرور تشریف لائیں ۔ یہ آپکی عین نوازش ہوگی اگر آپ ہمارے ساتھ بادشاہ کے یہاں تشریف لے چلیں گے۔ ورنہ بادشاہ ہمیں آگ میں جلا کر راکھ کر دے گا۔

جب یہ بات میں نے سنی کہ ان سب کو بادشاہ آگ میں ڈال دے گا تو میں ان کے ساتھ ہو لیا۔

بادشاہ کے پاس پہنچکر پہلی بات میرے ساتھ اسکی یہ تھی کہ میری ایک بڑی مشکل دور ہو جائے گی اگر آپ اس گھوڑے پر سوار ہو کر چلیں گے، میں آپ کی بیعت قبول کر لوں گا اور آپ کا خدمت گار رہوں گا۔

بس فوراً آگ کے مقام پر پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے میرے اس جگہ تک

پہنچنے کے عرصے میں آگ اسی طرح ٹھنڈی اور گلزار ہوگئی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی۔

بسم اللہ کر کے میں گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ ہنہناتے ہوئے گھوڑا چل پڑا۔ لوگ حیران و ششدر رہ کر رہ گئے۔ بادشاہ پشیمان ہوگیا اور ندامت کے ساتھ سر جھکا کر معافی چاہی اور توبہ کر کے نئے سرے سے مسلمان ہوگیا اور کلمۂ شہادت کو یقین دل کے ساتھ پڑھا۔ میرے ہاتھ پر بیعت کی اور بادشاہ ہو کر غلام درگاہ بن گیا....." [۱]

حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی ذاتِ شریف محسودِ علماء و امراء تھی بلکہ جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے بادشاہوں نے بھی آپ کو سخت آزمائشوں کا ہدف بنالیا تھا۔ اگرچہ بادشاہوں کی مراد اپنے دربار میں ان کو بلا کر محض دنیوی دبدبے اور شاہی رعب و جلال کی جلوہ گری ہوتی تھی لیکن چونکہ حضرت امیرؒ نہ دنیاوی ہوس کے پابند تھے اور نہ ہی شاہی درباروں کے طمطراق آپ کی آنکھوں کو خیرہ کر سکتے تھے اس لیے وہ اکثر و بیشتر بادشاہوں کے بلاوے کو ٹھکرا دیتے اور آپ کا یہ انکار اُن کی غیرتِ شاہی کو ٹھیس پہنچاتا تھا اور وہ غضب میں آکر آپ کو اذیتوں میں ڈال دیتے تھے اور کسی دینی بہانے سے آپ کو پسپا کرنے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ اس فقہی یا علمی یا دینی مسئلے کے حیلے کے پیچھے بیشتر درباری علماء کا مشورہ بادشاہ کو اُکساتا تھا۔ لیکن حضرت میر سید علی ہمدانیؒ دینی مسائل میں شک و شبہ کو رفع کرنے کے لیے کہیں بھی جانے سے گریز نہیں فرماتے تھے اور ایسا کرنا وہ ایک دینی فریضہ جانتے تھے۔

چنانچہ جس کسی بادشاہ کے دربار میں آپ دعوت پر گئے وہاں یا تو کسی فقہی مسئلے کی توضیح تھی، یا حاضرینِ دربار کی آگہی میں اضافہ کرنا مقصود تھا یا بیشتر بادشاہ کی طرف سے آزمائش مقصود ہوا کرتی تھی۔ گویا یہ بھی ایک غیبی ماموریت ہی تھی جس میں سرخ روئی ہمیشہ آپ کے

---

[۱] ملاحظہ ہو نظم المناقب زیر عنوان: "ذکر آزمودن کردن شاہ بلخ حضرت علیؒ ثانی از اسپ مسِ آتشی و بیعت یافتن و مرید شدن او"۔ نیز ملاحظہ ہو، منقبت الجواہر۔

شاملِ حال رہی اور اس فتح و کامرانی کے نتیجے میں حریفوں کے باطن روشن کر دیئے اور یہ خود ایک فتحِ مبین ہوتی تھی دینِ اسلام اور آپ کی اپنی ذات کے حق میں!

صاحبِ نظم المناقب نے حرام و حلال کے سلسلے میں آپ سے یہ واقعہ بیان کیا ہے:[1]

"..... بعض مواعظ میں حضرت علی ثانی نے دُر افشانی کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اپنی عمر میں کبھی حرام کا لقمہ نہیں کھایا ہے اور رازقِ ذوالمنن نے مجھے ہمیشہ حلال رزق دیا اور میرے دل میں ذرّہ برابر دُنیا کی محبت نہیں ڈالی۔ ایک شہر یار تھا ایک ملک میں جو بڑا جاہل تھا اور حرام خور، بے انصاف بھی تھا اور راہِ راست سے دور پڑا تھا۔[2]

ایک دن اُس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ حضرت سیّد ہمدانؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ حرام کا لقمہ کبھی اُن کے مُنہ میں نہیں گیا ہے۔ اس سے ہماری غیرت جوش میں آئی ہے کیونکہ انہوں نے دراصل ہم کو یہ طعنہ دیا ہے[3]

اس مغرور نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ جا کر حرام کی کوئی چیز چھین کر کسی سے لے آؤ تا کہ اس کو پکا کر حضرتِ سیّد کو کھلایا جائے۔ اور ایک بار جب ہماری حرام غذا ان کے

---

[1] نظم المناقب زیرِ عنوان: " در آزمودن پادشاہی علی ثانیؒ را بگفتارِ حلال وحرام وضیافت پختن او از غارت پیرہ زن برای سید شاہ ہمدان رح۔ نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر۔

[2] مؤلف نے نہ تو ملک کا نام لکھا ہے اور نہ ہی بادشاہ کا۔ ویسے خلاصۃ المناقب میں بھی ملک اور بادشاہ کے نام سے گریز کیا گیا ہے۔

[3] اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ امیر شہر یار یا ہمدان کا تھا اور یا ختلان کا۔ کیونکہ حضرت امیرِ کبیرؒ کے اس دعوے کو اُس نے اس جگہ کے بادشاہ عیش پرور ہونے کے پس منظر میں ایک طرح کا طعنہ سمجھ لیا تھا اور حضرت امیرؒ طعنہ زنی سے کوسوں دور تھے یہ دراصل دعویٰ بھی نہیں تھا بلکہ ایک دینی وعظ تھا، جسے وہ اپنے اصحاب کی مجلس میں فرما رہے تھے اور خود اپنی مثال پیش کر رہے تھے۔ اپنے مثالی کردار کا نمونہ پیش کرنے سے سننے والوں کے شکوک رفع ہو جاتے ہیں اور یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

حلق سے اتر جائے گی تو پھر آیندہ وہ ایسا دعویٰ نہیں کر پائیں گے۔ چند بدکردار ظالم افراد کے ذمّہ کر دیا اور وہ دندنا کر شہر میں اُتر آئے اور سامنے سے انہوں نے ایک بڑھیا کو آتے ہوتے دیکھا۔ تھوڑے سے چاول اور تھوڑا سا آٹا اور آگے آگے ایک بھیڑ کو ہانکتی ہوئی بڑھیا راہ چل رہی تھی اور یہ چیزیں وہ جناب حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح کے حضور میں پیش کرنے کی نیت سے اپنے ہمراہ لے جا رہی تھی۔ یہ ساری چیزیں یعنی چاول، آٹا اور بھیڑ اس سے چھین کر یہ ظالم بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے اور اُسے ظلم و جور سے یہ چیزیں لوٹ کر لانے کی اطلاع دی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ لُوٹا ہوا یہ مال باورچی کے حوالے کر دو اور اُس سے کہو کہ اِس سے ایک لذیذ کھانا پکائے جو واقعاً حضرت سیّد رح کی شان کے لایق ہو۔ کھانا تیار ہوا، اور حضرت سیّد رح سے دعوت پر تشریف لانے کی التجا ہوئی۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح اپنے احباب کے ہمراہ بادشاہ کے گھر آگئے۔ جب دعوت منعقد ہوئی اور کھانا کھا چکے تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ بادشاہ نے حاضرین پر نگاہ ڈالتے ہوئے، حضرت سیّد رح سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ درویشانِ الٰہی شُبہ اور حرام کا کھانا تناول نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کے مسلک میں ناجائز ہے اور ویسے بھی شریعت کے حکم کے مطابق حرام کا کھانا پینا کلّی طور پر ممنوع ہے۔ بادشاہوں کے ہاں محض حرام کھانے کی رغبت کرنا سالکوں کے لیے کہاں جائز ہو سکتا ہے؟ جناب حضرت سیّد رح نے فرمایا کہ خدا نہ کرے کہ وہ مجھے کبھی بھی حلال خوری سے دُور رکھے مسلمان کا دھن اکل حرام سے ہمیشہ دُور رہنا چاہیئے۔ بادشاہ نے تبسّم کیا اور کہا کہ خدا نہ کرے دوستانِ خدا دروغ گوئی سے آلودہ ہوں۔ بادشاہ نے اپنی کج بحثی ابھی شروع ہی کی تھی کہ ایک بڑھیا فریاد و فغان اور چیخ و پکار کرتی ہوئی دربار کے قریب آ پہنچی اور عدل و انصاف کا تقاضا کرنے لگی۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح نے بادشاہ سے، جو اس وقت بحث کرنے کی طرف راغب تھا، کہا کہ بحث کو جاری رکھنے سے

پہلے آپ اس فریادی بڑھیا کے ساتھ انصاف کریں جس کے لیے یہ فریاد کرنے آئی ہے کیونکہ ایک ساعت کا انصاف کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے بادشاہ نے بڑھیا کو اپنے پاس بلاکر پوچھا:

کس نے تمھارے ساتھ ظلم کیا ہے اور کیا ظلم کیا ہے؟

اُس صالح بُڑھیا نے جواب دیا کہ "اے بادشاہ! میں ایک ضعیف بوڑھی عورت ہر سال روزہ رکھتی ہوں اور اختتامِ سال پر ایک نذر حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کے حضور میں بھیجتی ہوں۔ اِس نذر کو میں ایامِ روزہ میں انتہائی عقیدت کے ساتھ اُس قطبِ ربّانی کے پاس بھیجنے کے بعد ہی افطار کرتی ہوں۔ آج بھی میں اسی نذر کو لے کر اُن کی خدمت میں جا رہی تھی کہ آپ کے ملازمین نے اس نذر و نیاز کی (اشیاء) کو مجھ سے زبردستی (چھین کر) لوٹ لیا۔"

قطبِ دوران حضرت سیّد ہمدان رح یہ سن کر بڑھیا سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: "اے صالحہ بی بی! کوئی فکر کی بات نہیں دل ملول نہ کر۔ میر سیّد علی ہمدانی میں ہی ہوں۔ جو کچھ تم میرے لیے لے جا رہی تھیں وہ رزقِ حلال درویشوں نے صرف کیا۔ خوش ہو جاؤ"۔ بڑھیا خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ آگے بڑھ کر اپنا سر حضرت سیّد کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور اپنے گناہوں کے لیے معافی کی خواستگار ہوئی۔ بادشاہ نے جب یہ کرامت خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لی تو سخت پشیمان ہوا اور تختِ شاہی سے نیچے آکر حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کے آگے زمین خدمت چوم کر اپنا سر اُن کے قدموں پر رکھ دیا اور قرآن مجید کا سہارا لے کر عرض کیا کہ اگر میں دُنیا میں بھی اندھا رہتا تو آخرت میں بھی رہتا۔ مجھ جیسا گمراہ ترین کوئی نہیں ہوتا، اور میرے نصیب میں ذلالت اور بدبختی ہوتی۔۔۔"[1]

صاحبِ نظم المناقب نے حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح کی زبانی ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں شاہ بخارا کی طرف سے دعوت نامہ اُس وقت آتا ہے جب کہ حضرت شاہ ہمدان رح

---

[1] ملاحظہ ہو: نظم المناقب۔ منقبت الجواہر۔ معمولی سے اختلاف کے ساتھ

(باقی اگلے صفحہ پر

اپنے احباب و اصحاب کی مجلسِ خطابت میں خواجہ اسحٰق ختلانی رح کی صفات بیان فرما رہے تھے۔ ان صفات کے بیان فرمانے کی تصدیق مولانا نورالدین جعفر رح نے بھی اپنی تصنیف خلاصۃ المناقب میں کی ہے۔ مولانا نورالدّین جعفر کے عین الفاظ یہ ہیں:[1]

"....حضرتِ سیادت در خانقاہِ امیر سُرخ برین فقیر معلول غضب نمود و فرمود که آنچ گفتم چرا چنین نه کنی تا ساعته فساعته برمزید باشی۔ شمس الدّین و اسحٰق را نظر کن که چگونه ممتثل فرمان اند فلا جرم چنان پیش راهِ شما را گرفته اند که پنجاه سال ریاضت کنید با ایشان برسید و وقتی دیگر فرمود که شمس الدّین سالک بقوّت است فامّا اسحٰق نیز پہلوان است....."

[حضرتِ سیادت (جناب میر سیّد علی ہمدانی رح) نے خانقاہِ امیر سُرخ میں اس فقیر علیل پر خشم فرمایا اور کہا "جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ کرتے کیوں نہیں تاکہ لمحہ بعد لمحہ تمہاری روحانی قوتوں میں اضافہ ہو جائے۔ شمس الدین اور اسحٰق[2] کو دیکھ لو کس طرح میرے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں اور لا محالہ تم سے اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ پچاس سال تک مسلسل ریاضت کے بعد ہی تم اُن تک پہنچ سکو گے"..... اور ایک اور موقع پر فرمایا کہ "شمس الدین اپنی قوت و طاقت سے سالک بن گیا ہے لیکن اسحٰق بھی پہلوان ہے....."]

اب ہم اُس واقعہ کی طرف آتے ہیں جسے صاحبِ نظم المناقب نے حضرت میر سیّد علی ہمدانی رح

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) علیناً یہی داستان حضرت شاہ نورالدین نعمت اللہ ولی کرمانی (۷۳۱-۸۳۴ھ) کے ساتھ منسوب ہے جسے تیمور کے بیٹے شاہ رُخ میرزا نے آزمایا تھا اور بعضوں کے بقول خود تیمور نے۔ ملاحظہ ہو: ترجمۂ احوال شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی۔ بتصحیح ژان روبن۔ تہران ۱۳۳۵ ش۔ صفحہ ۴۲ - ۴۳ - ۲۸۰ - ۲۸۱۔ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی باہتمام ایڈورڈ براؤن۔ چھاپ لیدن۔ ۱۳۱۸ھ صفحہ ۳۳۵ - ۳۳۶۔ مجالس المومنین از نوراللہ شوستری۔ جلد دوم تہران۔ چھاپ ۱۳۷۶ھ۔]

[2] خواجہ اسحٰق (ختلانی) اور شمس الدّین کا ذکر آگے آئے گا (معاصرین کے ذیل میں)

کی آزمائش کیے جانے کے سلسلے میں بیان کیا ہے، مؤلف نظم المناقب لکھتا ہے:

” شیخ محمود کامل شیرازی نے جو ایک ممتاز صاحبِ کمال بزرگ تھے، رہبرِ آفاق حضرت شاہ ہمدانؒ کے خلیفوں میں سے ایک خلیفہ، مرشدِ راہ خواجہ اسحٰق سے روایت کی کہ انہوں نے (خواجہ اسحٰق نے) فرمایا کہ میں فقیر، ہیچمدان ایک دن حضرت سیادتِ ہمدانؒ کے حضور میں بیٹھا تھا اور آپ احباب و اصحاب سے محوِ کلام تھے دورانِ خطاب حضرت شاہ ہمدانؒ نے دُر افشانی کرتے ہوئے اس حقیقتِ راز کا انکشاف کیا کہ اگر اسحٰق ایک سو قتل بھی کرے تو اُس سے باز پُرس نہیں ہوگی کیونکہ اس کا نام محبوبوں میں شامل ہے اور اس سے جو بھی عمل ہوگا وہ اچھا ہی ہوگا۔ اگر اس نے کبھی چھوٹے گناہ کیے تو اُسے درد میں مبتلا کر دیا گیا۔ کیونکہ ہماری طرف سے درد کی یہ سزا اُس کے لیے بہتر تھی۔ چونکہ وہ عاشقِ صادق ہے اس لیے اس کے سہو و خطا کی گرفت نہیں۔ حاضرین نے حضرت شاہ ہمدانؒ سے عرض کیا کہ کیا کوئی اور بھی ایسا ہے؟ شاہ ہمدان نے فرمایا، ہاں شمس الدین بھی ایسا ہی ہوگا۔

دوست سے نزدیکی کے معنی وہی جان پاتا ہے جو خود دوست کے نزدیک ہو۔ عاشقِ صادق خدائے تعالیٰ کے امر سے دُور نہیں رہتا جو بھی فرمان اُسے مل جاتا ہے اس پر مامور ہو جاتا ہے۔ عشقِ خداوندی میں جس نے قدم رکھا اُسے ہر لحظہ اسی راہ پر چلنا چاہیئے اور جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست بنا لیا وہ خوبی اور نیکوئی کے سوا اور کسی چیز کو اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ جو بھی کام وہ کرے گا وہ خوب ہی خوب ہوگا اس لیے کہ وہ خود مرغوبِ خلق بن چکا ہوتا ہے۔ اور یہ سارے کرشمے حق تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے نتیجے ہیں ہم حضرت امیر کبیرؒ کے حضور میں اسی گفتگو میں محو تھے کہ دُور راہ سے ایک شخص خانقاہ کے دروازے پر کھڑا دکھائی دیا۔ یہ آدمی خانقاہ میں داخل ہو کر براہِ راست حضرت شاہ ہمدانؒ کے آگے زمین بوس ہوا حضرت امیرؒ نے فرمایا کہ

اس شخص سے اس کے حال واحوال پوچھ لو کہ کہاں سے آیا ہے اور یہاں کیا کام ہے ؟

ہم میں سے محمد شامی نے اُٹھ کر اس شخص سے پوچھا کہ کہاں سے آنا ہوا اور کام کیا ہے ؟

مردِ مسافر نے کہا کہ : میں بخارا سے آرہا ہوں ۔ امیرِ بخارا (بادشاہ بخارا) کا ملازم ہوں اور ان کی طرف سے حضرتِ شاہِ ہمدانؒ کے حضور میں ایک نامہ بر کی حیثیت سے آیا ہوں اور یہ شاہی خط لایا ہوں ۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے جب اُس شخص سے یہ بیان سُن لیا تو فرمایا کہ افسوس ہے اُن لوگوں کے حال پر ۔ کس بلا میں گرفتار ہو گئے ہیں اور راہِ حق کو گم کر دیا ہے ۔ بہر حال اُس نامہ بر سے خط لے لیا گیا اور خط کا مضمون پڑھا گیا ۔ خط میں لکھا تھا :

" اے آفتابِ جہان حضرتِ شاہِ ہمدانؒ ! اپنے تمام احباب کے ہمراہ اس فقیر کے سوال اور التجا پر میرے یہاں تشریف لائیں ۔ اے مہ جوزا ![1] پہلے روز اس احقر کے برج میں ہی خیام فرمائیں اور مجھ حقیر کا سوال رد نہ کریں اور آیتہ فلا تنہر[2] کا خیال فرمائیں کہ ملکِ ہدایت کے شہنشاہ حضرتِ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کبھی بھی سوال کو ردّ نہ فرماتے تھے خواہ سوالی بادشاہ ہوتا تھا

---

[1] مہ جوزا ۔ جوزا ، آسمان کی برجوں میں سے ایک برج کا نام ہے ۔ اصل میں اس لفظ کے معنی ہیں کالے رنگ کا بھیڑ جس کی ساری کمر سفید رنگ کی ہو اور چونکہ اس طرح کا بھیڑ سارے ریوڑ میں دور سے سفیدی کی وجہ سے نظر آتا ہے اسی طرح سے جوزا بھی تمام ستاروں میں اپنی سخت روشنی کی وجہ سے نمایاں ہوتا ہے ۔ تو یہاں پر مہ جوزا سے مراد ہے سخت روشنی پھیلانے والا چاند یا سخت روشن چاند ۔ شاہِ بخارا نے حضرت امیر کبیرؒ کو جو مہ جوزا سے مشابہ کیا ہے بہت مناسب اور درست ہے ۔

[2] یہ سورۂ وَالضُّحیٰ کی دسویں آیت کا ایک ٹکڑا ہے پوری آیتِ کریمہ یہ ہے : وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ (اور سائل کو مت جھڑکیے)

یا گدا۔"

اس طرح کی استدعا کو حضرت شاہِ ہمدان رح رد نہیں کر پائے اور دعوت قبول کرلی گئی۔ نامہ بر کو کھانا کھلایا اور وہ قبولیت نامہ لے کر بخارا کی طرف روانہ ہوا۔ امیر بخارا کے حضور میں قبولیت نامہ پیش ہوا اور بادشاہ نے شاہانہ ضیافت پکوانے کا حکم دیا لیکن بدبخت نے ساتھ ہی بعض امیروں سے کہا کہ ایک خنزیر بھی مہیا کر دیا جائے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے وعدہ کے دن اپنے احباب کو یاد دلایا کہ آج ہم بادشاہ کے مہمان ہیں، وہاں پہنچ کر تب تک کوئی کچھ نہیں کھائے گا جب تک ہم خود پہل نہیں کریں گے۔

خادم محمد شامی امیر بخارا کے دربار میں خبر لے کر گیا کہ حضرت شاہِ ہمدانؒ تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ بادشاہ ننگے پاؤں باہر دوڑ کر نکلا اور اس گمان سے کہ محمد شامی ہی شاہ ہمدانؒ ہیں، اُس کے پاؤں پر گر پڑا۔ لیکن محمد شامی نے بادشاہ کی غلط فہمی دُور کر کے اُس سے کہا کہ جناب امیر کبیرؒ میر سید علی ہمدانی نے خانقاہ سید جلال الدین میں نزول فرمایا ہے۔ بادشاہ ویسے ہی ننگے پاؤں وہاں پہنچا اور آپ کی خاکِ پا کو بوسہ دیا اور بڑی انکساری و خاکساری کا اظہار کیا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی، جسے آپ کے احباب و اصحاب نے دیکھ لیا۔

حضرت شاہ ہمدانؒ بادشاہ کے ہمراہ اپنے احباب و خلفاء کے ساتھ بادشاہ کے محل میں آگئے۔ ضیافت سے پہلے احباب نے حضرت شاہ ہمدانؒ سے استفسار کیا کہ حضرت! بادشاہ کو دیکھ کر آپ کے لبوں پر جو مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ اس میں کیا راز تھا؟

حضرت شاہ ہمدانؒ نے فرمایا: دیکھ لو گے! یہ ہمارا امتحان کرنا چاہتا ہے۔ امیر بخارا نے وکیلِ دربار سے کہہ دیا تھا کہ وہ شاہی باورچی خانے سے

دُور اپنے گھر کے باورچی خانے سے خنزیر کو پکا کر الگ خوان میں شاہ ہمدانؒ کے سامنے رکھے۔ ضیافت کے پے درپے خوان حاضر اور پیش کیے جا رہے تھے۔ ایک طبق میں خنزیر کا گوشت بھی سامنے رکھ دیا گیا۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے اس طبق پر نگاہ ڈالی اور امیر بخارا پر لرزہ سا طاری ہوا، قرآن پاک کی آیت آپ نے قرأت فرمائی جسے سُن کر امیر بخارا اپنے درباری امرا سمیت ششدر ہو کر رہ گئے۔

آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں حرام کی ہیں، مُردے کا گوشت، خون، اور خنزیر کا گوشت۔ جس طبق میں خنزیر کا گوشت، جو اب قدرے ٹھنڈا ہو چکا تھا، اور سامنے پڑا تھا، اس کی طرف نگاہ کر کے گوشت جوش مارنے لگا اور اس کی آواز دیگ کی طرح اونچی ہو گئی۔ اصحابِ حضرتِ امیرؒ میں سے ایک خلیفہ زین العابدین نے محسوس کیا کہ اس طبق میں سور کا گوشت ہے اور اُسے کشف سے یہ حقیقت روشن ہوئی اور حضرت شاہ ہمدانؒ کے اظہار فرمانے سے پہلے ہی اُس نے چاہا کہ بھری مجلس میں اس بات کو آشکار کرے لیکن حضرت امیر کبیرؒ نے اسے منع فرمایا۔ بادشاہ کی طرف سے ضیافت کے خوان سامنے رکھے جانے کے بعد، جب کہ ابھی کسی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا گیا تھا، جناب شاہ ہمدانؒ تے زین العابدین سے کہا کہ خادم دربار سے کہہ دو کہ یہ کیا لایا ہے؟۔ کیا ہم پاک مردوں کے لیے یہ ناپاک اور حرام گوشت کھانے کو لائے ہو؟ آخر اس خنزیر نے کیا قصور کیا تھا کہ وکیلِ دربار تے اسے ذبح کر کے اپنے گھر کے باورچی خانے سے پکا کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے؟

حاضرینِ مجلس نے جب یہ باتیں سنیں تو سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ سبھوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر غرقِ حیرت ہو گئے۔ بادشاہ اس قدر نادم ہوا کہ فرطِ ندامت سے وہ سانس بھی نہیں لے سکا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔ شیطانی فعل سے شرمندہ ہو کر سر جھکائے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہاتے ہوئے اور لباس و جگر کو چاک کرتے

ہوئے اس نے آپ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور گناہوں کی معافی چاہی۔ دیر تک اُس نے سر نہیں اُٹھایا اور روتا رہا۔ بالآخر حضرت قطبِ عالم شاہِ ہمدانؒ نے اس کی پیٹھ کو تین بار سہلایا اور اُس کے سوئے ہوئے بخت کو جگایا۔

دربار میں حاضر تین سو چوبیس^{۳۲۴} امراء و وزراء نے حضرت امیر کبیرؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ اور دل و جان سے مُرید ہو گئے۔ اس کے بعد نئی ضیافت تیار کروائی گئی جسے یارانِ درویشانِ حضرتِ امیرؒ نے تناول فرمایا۔

بخارا میں آپ نے چار ماہ قیام فرمایا، اور امیرِ بخارا نے آپ کے درویشوں کے لیے ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی۔ اس کے بعد آپ بخارا سے بغداد کی طرف روانہ ہوئے ....“ [1]

صاحب نظم المناقب نے ایک اور بادشاہ کی طرف سے حضرت امیر کبیرؒ کی آزمائش و امتحان کا قصّہ بیان کیا ہے۔ ان کے نقل کیے جانے سے مقصود ہے کہ بعض ملوک و امراء کے فتنے کس قدر صبر آزما تھے۔ اور یہ بھی مراد ہے کہ خود اصحاب و یارانِ حضرتِ امیر کبیرؒ کے ان بیانات کی بھی تصدیق ہو جائے، جن کے مطابق حضرت امیر کبیرؒ کی علماء کی طرف سے اور بعض شاہی درباروں میں آزمائش کی گئی تھی، صاحب نظم المناقب کے معتبر اور اسناد و دلیل و برہان پر مبنی بیان کے بموجب زیرِ نظرِ امتحان و آزمائش[2] کا واقعہ یوں ہے کہ:

> اخترِ برجِ دین جناب قوام الدینؒ جو راہِ ہدایت کے ایک اور سالک تھے قدس اللہ سرہٗ نے بیان کیا، نیز اس واقعہ کو کتابوں میں بھی درج کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کے اطراف میں ایک بادشاہ[3] درویشوں اور عارفانِ الٰہی کا امتحان

---

[1] ملاحظہ ہو منقبت الجواہر، اور نظم المناقب زیرِ عنوان: ”ذکرِ آزمود کردن شاہ بخارا بدعوت بہ علی ثانیؒ وسختہ کردنِ خوک و مرید شدن با سیصد و بیست و چہار کس۔“

[2] ملاحظہ ہو نظم المناقب زیرِ عنوان: ”قصۂ تیمور شاہ در امتحان حضرت سید علی ہمدانی قدس سرہٗ“ نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر۔

[3] مؤلف نے ہندوستان کے اطراف کے اس بادشاہ کا نام عنوان میں تیمور شاہ لکھا ہے اور اشتباہاً جو آزمائشیں امیر تیمور گورگانی (بادشاہِ سمرقند) سے حضرتِ شاہ ہمدانؒ سے متعلق (باقی اگلے صفحے پر)

لیا کرتا تھا۔ اُن سے سوال و جواب کرتا تھا اور جو اُس کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیتا، بادشاہ اُس سے خوش ہوجاتا اور جس عارف کا کشفِ ولایت اس کا ساتھ نہ دیتا تو بادشاہ اُسے قتل کر دیتا تھا۔

اُس بد طینت ظالم حیلہ گر جفا پیشہ بادشاہ کی خبر سُن کر دین کے صفا کیش مردانِ حق اور صالح و درویش لوگ دیہاتوں اور شہروں سے خوفِ جان کی وجہ سے دوسری جگھوں میں مہاجرت کرنے لگے۔ کچھ لوگ مغرب میں چلے گئے کچھ کابل کی طرف نکل گئے اور کچھ سواد گبر میں چلے گئے۔ بلخ کی حدُود تک اُس شاہِ بدکردار اور ظلم و جور کرنے والے امیر کا دبدبہ تھا۔ چنانچہ ایک جنگ میں اس نے بلخ کے بادشاہ کو قتل کر دیا۔

بادشاہ موصوف نے بدخشان، بخارا اور ماوراء النہر کے امیروں کو قاصد اور جاسوس بھیجے اور خطوط لکھے کہ اگر کوئی درویش و زاہد اور عابد اُن کے ملک میں ہو تو اُسے اُس کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ کئی صالح و عابد لوگ اس کی شمشیر کا نشانہ بنے اور وہ خود لعنت و نفرت میں گرفتار ہوتا رہا۔ ایک رات واقعہ میں حضرتِ غوثِ آفاق قُطبِ ربّانی میر سیّد علی ہمدانی رح نے اپنے جدِّ بزرگوار حضرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور انھوں صلعم نے آپ سے فرمایا کہ: اے نُورِ حسین کی روشنی میں اضافہ کرنے والے فرزندِ حبیب ہمارے حکم سے تم اُس ظاہری بادشاہ کے پاس سے گذر کروگے تو اُس کے حق میں بد دعا نہ کرنا اور نہ ہی نیکی کی راہ سے تم اس کی کوئی مدد کرنا۔ حضرت شاہ ہمدان رح جب خواب سے بیداری کی حالت میں آئے تو غور و فکر میں غوطہ زن ہوئے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ سرورِ دین صلے اللہ علیہ وسلّم نے مجھے تلقین فرمائی کہ بادشاہ کے پاس پہنچکر نہ میں اُس کے حق میں دُعائے بد کروں اور نہ ہی دعائے خیر۔ اسی حال میں حضرت خضر علیہ السّلام حاضر ہوئے اور حضرت امیر رح کی تسکین خاطر کے لیے اُن سے کہا کہ "! اے حمیدہ صفات سیّدِ والا مقام! اس کی عمر باقی ہے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) منسوب ہیں وہ اسی تیمور شاہ نے کی ہونگی۔ اس تیمور شاہ کے بارے میں اطلاعات تحقیق طلب ہیں

ابھی ۔ ابھی جو آب و دانہ اس کے لیے مقرر ہے وہ تو اس کو ملتا رہے گا۔ اس کے لیے خیر و شر یکساں بات ہے اور یہ صفت اس سے زائل نہیں ہوگی، خواہ اس کے لیے بد دُعا کی جائے خواہ نیک دُعا۔"

کچھ عرصے بعد اُس جفا پیشہ بادشاہ نے سُن لیا کہ اس کے نواح ہی میں ایک دین پرور بزرگ ہیں جو نسلاً صحیح النّسب سیّد ہیں اور ان کا نام ہے میر سیّد علی ہمدانی رح۔ وہ کشورِ ولایت کے بادشاہ ہیں اور لوگوں کے مُرشد و رہبر۔ بہتر ہے کہ ان کی حقیقت دیکھی جائے، اور ان کی طریقت سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ان کا طریقِ کار کیا ہے اور وہ اس قدر معروف کیوں ہیں اس سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔

بادشاہ نے ایک خط لکھوا کر چند لوگوں کی وساطت سے حضرت شاہِ ہمدان رح کی خدمت میں بھیجدیا، اور کہلوایا کہ حضرت سیادت پناہ جناب شاہ ہمدان رح ہمارے حکم کی تعمیل میں ہمارے دربار میں تشریف لائیں اور اپنے دیدارِ مبارک سے ہمیں مشرّف فرمائیں۔ ملازمانِ دربار سے بھی بادشاہ نے تاکید کی کہ حضرت شاہ ہمدان رح کو حاضر ہو جانے پر اصرار کیا جائے۔ جب ملازموں نے خط پہنچایا اور زبانی تاکید کی اطلاع بھی دی تو نامہ پڑھ کر جناب حضرت امیر رح نے فرمایا کہ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔

شہر کے لوگوں نے جب سنا کہ بادشاہ نے حضرت کو طلب کیا ہے تو وہ جوق در جوق حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "اے مسکینوں کے ہدایت پناہ! ہم ان کے ساتھ لڑیں گے۔ ان سب کی گردنوں میں زنجیریں ڈالدیں گے ان کے سر کاٹ کے رکھ دیں گے۔ یہاں سے جاکر ہم ان کے سربراہ پر حملہ کردینگے اور راہِ دین میں ہم بھی اپنے سروں کو قربان کردیں گے۔ آپ ہمارے سردار ہیں ہم آپ کی سلامتی کے خواہاں ہیں۔ آپ کے بدلے میں ہم جائیں گے یہی مناسب ہے۔"

حضرت میر سید علی ہمدانی رح نے گوہر افشانی کرتے ہوئے ان سے فرمایا: "حق تعالیٰ نے جو کچھ ہمارے نصیب میں لکھا ہوگا وہ تو بہر حال ہوگا اس میں ذرہ برابر ٹلنے کی گنجائش نہیں۔ اس لیے آپ بے فکر رہیں انشاءاللہ جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا۔"

دوسرے دن سورج چڑھنے کے بعد حضرت امیر رح نے اپنے رفقاء سے بادشاہ کے دربار کی طرف روانگی کا اہتمام کرنے کو کہا اور چل پڑے۔ جب آپ بادشاہ کی لشکرگاہ کے نزدیک پہنچے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ حضرت میر سید علی رح عزت وجاہ کے ساتھ آگئے ہیں، بادشاہ نے کہلوا بھیجا کہ کوئی خاص مقام ان کے لیے متعین کیا جائے تاکہ وہاں نزول فرمائیں۔ دوسرے دن بادشاہ نے اپنی ایک خاص مجلس بلائی اور اس میں غور وخوض کیا گیا کہ حضرت سید رح کو کس طرح آزمایا جائے اور شعبدہ بازی کا کون سا مہرہ ان کے خلاف چلایا جائے۔ ہر ایک نے اپنی رائے پیش کی جو بادشاہ کو پسند نہ آئی۔ بادشاہ خود غور وفکر میں ڈوب گیا، اور آخر اس بدبخت لعین کو اسی میں مصلحت نظر آئی کہ ضیافت میں کتے کا گوشت بھی حاضر کیا جائے۔ ہم آزمائیں گے کہ کیا آپ کتے کے گوشت کو پہچان سکیں گے یا نہیں اگر نہیں پہچان پائے تو ظاہر ہے کہ تناول کرنا پڑے گا (نعوذ باللہ!) اور پھر عالموں سے حلال وحرام پر فتویٰ لے کر اسی کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے گا۔

بادشاہ کی اس تدبیر پر عمل ہوا۔ ایک کتیا چار بچوں سے حاملہ تھی اسے مار ڈالا گیا اور پوشیدہ طور پر اسے باورچی خانہ میں پکا کر ضیافت کے لیے ایک خوان میں رکھ دیا گیا۔ بادشاہ نے غذا کا خوان لانے کا حکم دیا اور خادم سے کہا کہ خاص حرام گوشت کا طبق حضرت سید رح کے سامنے پیش کر دیا جائے اور خود پردہ کے پیچھے کھڑا رہا۔ خادم نے دست شوئی کے لیے پانی سے ہاتھ دھلوائے لیکن حضرت شاہ ہمدان رح نے اپنا ہاتھ دھونے سے روکا۔ اگرچہ حاضرین نے روٹی کھانے کی نیت سے ہاتھ دھوئے۔ حضرت شاہ ہمدان رح نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے بادشاہ! پردے سے باہر آجاؤ اور ہر ایک طبق کے اوپر سے طبق پوش ہٹا دو۔ بادشاہ نے سنا تو فوراً پردے سے باہر آگیا اور طبق ہٹانے لگا حضرت شاہ ہمدانؒ نے بادشاہ سے کہا:

"پانچ جانوں کو آخر تم نے کس گناہ کی پاداش میں قتل کر دیا؟"

بادشاہ اس سے بے خبر تھا کہ اس مردار کُتیا کے پیٹ میں چار بچے تھے بادشاہ نے کہا:

"کون سی پانچ جانیں؟"

حضرت شاہ ہمدانؒ نے فرمایا: "یہی پانچ جانیں جو اس سر پوش کے نیچے طبق پر حرکت میں ہیں۔"

طباق کے اوپر سے سر پوش ہٹایا گیا تو حاضرین پر عیاں ہو گیا انھوں نے دیکھا کہ بچوں کا گوشت متحرک تھا۔ بادشاہ کی خجالت و پشیمانی کی کوئی حد نہ تھی۔ ملازموں اور خادموں پر عتاب کیا کہ یہ کس بدکردار ذلیل آدمی کا کام ہے؟ کیا تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ولی اللہ کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ نہیں؟ شرمندہ ہو کر واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور حکم دیا کہ اس کتیا کو قتل کرنے والے کو قتل کر دیا جائے۔

بادشاہ کے امرائے خاص نے عرض کیا کہ مارنے والے کا کوئی قصور نہیں۔ بادشاہ نے اقرار کیا کہ ہاں، پوشیدہ طور پر تو میں نے ہی کُتیا کو مارنے کا حکم دیا تھا، اس کا کوئی قصور نہیں۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی فتح مُبین کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اُس سنگدل بادشاہ نے آپکی ولایت کا یقین نہیں کیا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کو دربار میں دعوت دیئے جانے سے بہت پہلے اس بادشاہ نے شہر میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا جو اب تکمیل تک پہنچ رہی تھی اور اس میں اس نے آزمائش کے لیے مشرق کی طرف محراب اور مغرب کی طرف دروازہ

بنوا لیا تھا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کے قیام کے ایام میں ہی اس کا افتتاح ہوا اور بادشاہ نے آپ سے پہلی افتتاحیہ نماز کی امامت کرنے کی استدعا کی۔ مسجد میں بادشاہ معہ تمام امراء و وزراء کے حاضر ہوا اور یہ دن خاص اس لیے چُنا گیا تھا کہ سورج اس روز بادلوں کے نیچے چھپا تھا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ مسجد میں تشریف لے آئے اور بسم اللہ پڑھ کے داخل ہوئے اور فرمایا، انشاء اللہ حق تعالیٰ سب کچھ ٹھیک کر دے گا، جو چیز جہاں ہونی چاہیئے اُسے وہاں پر لا کے رکھ دے گا دو رکعت نماز آپ نے امام کی حیثیت سے پڑھائی اور سلام و درود کے بعد فراغت حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے کہا کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھوائی گئی ہے، حالانکہ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جنگلوں میں بھی آپ کو قبلہ کی شناخت ہوتی تھی، حضرت شاہ ہمدانؒ خشمگین ہوئے اور بادشاہ سے کہا:

"کیا تمہیں اب بھی یقین اور صفائیٔ قلب حاصل نہیں ہوا؟ کیا مجھے آزمانے اور میرا امتحان کرنے کے بعد بھی تم ابھی تک کور دل ہو؟۔ جاؤ مسجد کے باہر چلے جاؤ اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ سورج کس طرف جا رہا ہے؟" بادشاہ مسجد کے باہر آگیا اور دیکھا کہ واقعی حضرت شاہ ہمدانؒ نے صحیح قبلہ کی طرف ہی نماز پڑھائی ہے۔[1] پھر شرمندہ و نادم ہو کر حضرت کی خدمت میں آ کر اپنے گناہوں کی معافی چاہی اور دُعائے خیر کی استدعا کی۔ اور قدموں پر گر کر عاجزی و انکساری کا اظہار کیا۔ حضرت سیدؒ نے بادشاہ سے کہا کہ دُعائے خیر سے تم بہت دور ہو تمہیں

---

[1] عام کتابچوں میں یہ واقعہ امیر تیمور گورگانی سے منسوب ہے جبکہ معتبر سند سے یہ واقعہ تیمور شاہ سے منسلک ہے۔ حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کو عام طور پر حرام غذاؤں سے آزمائے جانے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُن کا مشہور دعویٰ تھا کہ زندگی بھر اُن کے حلق سے حرام کی کوئی شے نہیں اُتری ہے اور درباری علماء جو لذیذ شاہی غذاؤں پر پلتے تھے آپکے اس دعویٰ پر یقین نہ کرتے ہوئے شاہی درباروں میں سازش سے آپکی آزمائشیں کرواتے تھے۔

اس سے کیا کام؟ جاؤ تم بادشاہی کرتے رہو۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی یہی ملاقات اس بادشاہ سے آخری تھی اور دوسرے دن وہاں سے روانہ ہوئے۔ احباب و اصحاب سے روانگی کے دوران آپ نے فرمایا کہ: جہاں کہیں بھی ہم رُخ کرتے ہیں مصائب ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یہ مصائب اور فتنے کبھی ہمیں ملوک و امرار کے ہاتھوں دیکھنے پڑتے ہیں جو ظالم اور بے انصاف ہوتے ہیں اور لوگوں اور رعایا کے ساتھ انصاف و عدل سے پیش نہیں آتے، اور کبھی بے عمل علمار کے ہاتھوں جن کے یقین و عقیدت میں خلل ہوتا ہے اور کبھی ایسے لوگوں سے جو جہالت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بظاہر تو یہ تکالیف جسم و جان پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہی آزمائشیں اور اُسی کی عنایات ہوتی ہیں جس پر ہمیں ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے . . !!

جیسا کہ قبلاً بیان ہو چکا ہے، آزمائشوں اور امتحانوں کی ایک ایسی ہی مجلس میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے ایک قریبی ہم جلیس اور رفیق صادق اور معروف عارف سیّد اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کے ہمراہ تھے جنہوں نے اپنی تالیف لطائف اشرفی (سولھویں لطیفہ) میں بڑھیا کے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ گویا حضرت امیر کبیرؒ کے مختلف طریقوں سے آزمائے جانے کی جو حکایات معتبر ترین اسناد و مآخذ سے نقل ہوئی ہیں، ان سب کی تصدیق ہو چکی ہے۔

اندرونِ ملک اور ملک سے باہر حضرتِ امیر کبیرؒ میر سیّد علی ہمدانی کے سفر، جیسا کہ ہم نے دیکھا، بیشتر شریعتِ اسلامی اور اوامرِ ربّانی کے پس منظر میں اجتماعی عدالت و انصاف اور مثالی اسلامی حکومتیں قایم کرنے کے لیے ایک طرح کا جہاد تھے، اور اس منتہائے مراد و مقصد کو پانے اور اسی نظامِ فاضلہ کو اپنی نظروں کے سامنے بارور ہوتے دیکھنے کی آرزو میں آپ کو روح فرسا اور نفسیاتی طور پر سخت جانکاہ آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن جیسا ہم نے دیکھا، آپ نے قرونِ اولیٰ کے مجاہدین و مبلّغین کے عین مشابہ، اللہ کے دین اور شریعتِ محمدیؐ کے دائرے میں حکومتِ الٰہیہ کے قایم

کیے جانے کے لیے نہ فقط ترکِ وطن کرکے دُور دراز اور اجنبی ممالک کا سفر کیا، بلکہ بلا خوف وہراس، حق اور حقّانیت کو باطل اور موہوم و خود ساختہ اور بے بنیاد توہمّات پر دینی علوم کے زبردست دلائل و براہین کی قوّت سے غالب رکھا، اور اس طرح سے آپ نے عوام و خواص کو اُن کجرویوں اور گمراہیوں سے روک دیا، جو عیش پرست ملوک و امراء، اور جاہل و کم سواد علماء کی بے راہ رویوں سے وجود میں آچکی تھیں۔ گویا حضرت امیر کبیر رح جیسے روحانی انقلابی پیشوا نے، شاہی درباروں اور کم علم و کوردل عالموں کے دارالعلوم کے بظاہر پر وقار مگر بباطن دروغ و فریب کاری سے مملو ماحول کو تحمّل نہیں کیا اور نہ ہی ظلم و جور کے ناقابلِ برداشت بوجھ کے تلے مظلوموں کی فریاد اَن سُنی کردی۔

وہ دراصل اپنے عہد میں پیدا ہی اسی لیے گئے تھے کہ اُس عہد کی گمراہیوں، بے راہ رویوں، بدکرداریوں کو دور کرکے گمراہوں، بدکرداروں اور راہِ راست سے دور پڑے ہوئے شریعت کے دعویٰ داروں، حاکموں، امیروں اور نشۂ بادشاہی میں مست و مغرور بادشاہوں کی اصلاح کریں۔ اور اُن متعیّن اجنبی ممالک میں حق اور حقّانیت کی روشنی سے ظلمت کو دُور کریں جن میں آپ کو اس کی تبلیغ اور اس کے قیام کے لیے مامور کردیا گیا تھا۔ ایسا کرنا خود اُن کے اندرونِ وجدان کی آواز بھی تھی اور یہ بلند آواز ان کی معرکۃ الآراء کتاب 'ذخیرۃ الملوک' کے ورق ورق سے سُنائی دیتی ہے۔

وجدان کی یہ اندرونی آواز دراصل آپ کو خود صغر سنی میں ہی سُنائی دیتی تھی اور اس کی بیّن اور واضح دلیل یہ ہے کہ بارہ سال کی قلیل ترین مدّت میں ہی آپ نے مروّجہ علوم کی تکمیل کی اور پھر کبھی مکتب کا رُخ نہیں کیا اور پھر چھ یا حد اکثر آٹھ سال کی مختصر فرصت میں روحانی مراحل طے کیے۔ یہ دراصل اُن کی اندرونی جذب و کشش اور اضطراب و بے چینی تھی اور ایک روحانی کرب و درد تھا، جو ان کو دلدلوں، خارزاروں، ریگستانوں، بیابانوں اور گھنے جنگلوں، ویرانوں اور آبادیوں اور خوف و وحشت سے معمور غیر آباد علاقوں اور اجنبی ممالک کو عبور کراکے اپنی ماموریت کی تکمیل کرنے پر اُکساتا تھا۔ آپ کا یہ روحانی اور دینی عمل ابراہیم ادھم رح کی یاد دلاتا ہے جبکہ بلخ کے اس شہزادے نے جذبۂ دل اور

صدائے باطن سے سب کچھ چھوڑ دیا۔ زن و فرزند چھوڑ دیئے۔ تخت و تاج کو حقیر ترین متاع جان کر رہا کر دیا اور اللہ کی راہ میں فقط اللہ ہی کے زندہ رہا اور اللہ ہی کے لیے مرا۔

امیر کبیرؒ بھی ایک امیر گھرانے سے متعلق ہونے کے علاوہ ایک مقتدر اور صاحبِ رسوخ شاہی اور حکومتی فرد کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن آپ نے صغر سنی میں ہی خاندانی جاہ و حشمت کو ترک کر کے درویشی اختیار کر لی اور غیبی اور رُویائی احوال، اور ذاتی ریاضت و عمل کے نتیجے میں، اوامرِ الٰہی، احکامِ نبویؐ اور اپنی صدائے باطن کے جوش و خروش کی تعمیل میں میدانِ عمل میں آکر ماموریت کی تکمیل میں وہ مبارزہ اور جہاد کیا جس کی مثال اوّلین صحابۂ کرامؓ کے عہدِ مبارک میں ہی ملتی ہے۔

حضرتِ شاہِ ہمدانؒ کی ماموریت کے تمام سفر، جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے، اُن کی مختلف الجہات شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ آزمائشوں سے گزر کر وہ ایک پُر وقار و متین اور سخت عزم و ارادہ والی شخصیت کی حیثیت میں دکھائی دینے ہیں۔ دشمنوں، حریفوں اور دوستوں سے ہمکلام ہوتے ہیں تو ریشم کی طرح نرم اور ملائم ہیں۔ باطل اور ریاکاری کے آگے فولاد کی طرح سخت اور آگ کی طرح پُر حرارت اور شعلہ زن، حق تلفی اور گمراہی و بے راہ روی کے سامنے خشمگین۔ محتاجوں اور مساکین اور ابن السّبیل کے لیے ثروت مند اور دستگیر! دُنیا پرستوں کے لیے غضبناک اور طالب علموں اور درویشوں کے لیے پناہ گاہ! اس مردِ مومن کے یہ سفر اس دنیا میں ایک راہِ عمل تھے نہ کہ دنیا سے گریز۔ اپنی عمر شریف کا بیشتر حصہ دینی مبارزات و مجاہدات میں گزار کر ایمانی قوّت کے کارگر اسلحہ سے اپنی کمالِ آرزو تک رسائی حاصل کی اور ہر فوزِ عظیم و فتح مُبین کے بعد شکر و ثنا کی ادائیگی کے لیے بارہا خانۂ خدا کی آستان بوسی کی۔

سفروں میں عملی جہاد میں مشغول رہنے اور تبلیغِ دین اور اصلاح و معرفت کے کاموں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ ہمدانؒ عجائباتِ عالم کا بھی مشاہدہ کرنے رہے، فطرت کی آرائش و زیبائش کو بھی دیکھا، بر سرِ زبان ممالک سے مربوط پیغمبروں کے مقابر و آثار بھی دیکھے اور غالباً اُن ممالک مقدّسہ کو بھی دیکھا جن کا

ذکر تذکروں میں نہیں[1] لیکن اس کے باوجود بھی آپ خلوت وجلوت میں ذاتی ریاضتوں اور مشاغل سے دور نہیں رہے۔ ان تمام دور دراز اسفار میں آپ کا مسکن یا مسجدیں تھیں یا اللہ کی پیدا کی ہوئی کُھلی زمین۔ مسجد میں یا کُھلی زمین پر، خواہ جھلستی ہوئی گرمی ہوتی یا پانی کو منجمد کرنے والی سردی، حضرتِ شاہ ہمدانؒ یادِ الٰہی سے کبھی غافل نہ رہے اور جیسا کہ آپ کی مصروف ترین زندگی کے متعیّن ومقرّر دینی مشاغل سے معلوم ہوجاتا ہے۔ آپ نے اپنے اکثر وبیشتر تالیفات جن کی تعداد ایک سو، پچاس سے زائد ہے، دورانِ سفر ہی لکھے یا ان کو مکمل کر لیا۔ اس بیک وقت نابغۂ عالم، مبلّغِ دین، اور کم نظیر عالمِ اسلام اور ممتاز عارفِ الٰہی، فارسی اور عربی کے باکمال و معرفت ادیب اور شاعر، درویش خدامست، مجاہد ومبارز، اور سیّاحِ عالم کی مصروفیاتِ عمل کو دیکھ کر آدمی غرقِ حیرت ہوجاتا ہے کہ بیشتر اسفار میں رہ کر بھی آپ نے کس طرح سے اُن تمام آمال و آرزوؤں کی تکمیل کی جن کو وہ مکمل کرنا چاہتے تھے اور جن کی تکمیل نہ ہر کسی صاحبِ عمل سے ہو پائی۔

تعجّب انگیز ہے یہ بات کہ زندگی بھر اپنے نفس کے ساتھ بھی مبارزہ کرتے رہے اور نفس سے باہر نکل کر باطل سے بھی جہاد کیا۔ اور یہ کام، باوجود اس کے آپ (نعوذ باللہ) پیغمبر نہیں تھے، پیغمبروں کا سا ہے، لیکن یقیناً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حدیثِ مقدّس کی رو سے کہ: عُلَمَآءِ اُمَّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل" آپ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے برابر تھے۔ اِس دعویٰ کی دلیل میں اُن کی حیاتِ مبارکہ کی وہ کامیابیاں اور کارنامے، کرامات اور تحصیلات ہمارے سامنے ہیں جن کی تکمیل آپ نے عمل کر کے دکھائی اور جو خالصتاً اللہ اور اس کے رسولؐ کی غیبی حمایت سے قطع نظر، اُن کی ذاتی ریاضتوں، مشقتوں، زحمتوں، اور آزمائشوں اور صبر آزما مصائب کو تحمّل کرنے کا براہِ راست نتیجہ تھے۔

---

[1] بغداد اور شام پہنچ کر قرینِ قیاس ہے کہ شاہِ ہمدانؒ نے یقیناً اُردن جا کر اصحاب کہف کے غار کی زیارت شہر اَفِی سُسس (افسوس) میں کی ہوگی۔ فلسطین میں بیت المقدس بھی گئے ہوں گے اور مصر کا بھی دورہ کیا ہوگا۔ افسوس ہے کہ اس قدر پُر نویس ادیب عالی قدر نے ہمارے لیے اپنا سفرنامہ نہیں چھوڑا جو اگر موجود ہوتا تو محققین کے لیے مشکلات کا یقینی حل ہوتا۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے شریعت و عدالت کا ہمیشہ لحاظ کرنے، بندگانِ خدا، نیز کمزور رعایا کے ساتھ عدالت و انصاف برتنے کی تلقین نہ صرف خود شاہی درباروں میں جا کر کی ہے، بلکہ اُن مکتوبات میں بھی کی، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کو لکھے۔ اور اپنی شاہکار تصنیف "ذخیرۃ الملوک" جسے کسی بادشاہِ وقت کے لیے لکھا اس میں بھی آپ نے مظلوموں سے ظلم کو دُور رکھنے اور امرِ معروف اور نہی منکر کو قایم کرنے، اور بندگانِ الٰہی کے امور و حقوق کو ادا کرنے کے فرائض کی طرف بادشاہوں کی توجّہ مبذول کی ہے۔

بادشاہ ان کے خطوط کی تکریم اور احترام کیا کرتے تھے اور ان کے متوُن سے جو قرآن و شریعت کے احکام کی روشنی میں بیم و بشارت کے حقایق پر مشتمل تھے، یہ مقتدر اور مطلق العنان ملوک و امراء متاثر ہوتے تھے۔ ان مکتوبات میں آپ نے اُن حدود کی نشان دہی کی ہے جو قرآن و حدیث اور شریعت محمدیؐ نے حکّام و رعایا کے لیے متعیّن کی ہیں۔ ان میں آپ نے مسلمان سلاطین کو عدالت و امنیّت کے قیام کی خاطر گزشتہ اُمتوں اور پیغمبروں کی یاد دلائی ہے۔ نیز خلفائے راشدین رضؓ، اقوالِ صحابہ اور صلحاء و عرفاء اور سلاطینِ نیکوکار کے احوال سے سبق حاصل کرنے سے بے نیاز نہ رہنے کی بھی ان کو تلقین کی ہے۔

گویا حضرتِ شاہ ہمدانؒ بیمار سلطنتوں کے سلاطین کے لیے شفابخش اور سودمند نسخے لکھ کر بھیجا کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ حکّام و ملوک کے خواطر، نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مشغول نہ رہیں۔ بلکہ جہاں تک اُن سے ممکن ہو عدالتِ اسلامی کی راہیں رعایا پر کھول دیں۔

جس طرح عام مصلحت کے پیشِ نظر سلطان کی اطاعت کرنا لازمی ہے، اُسی طرح سلطان بھی انصاف و امنیّت کو قایم کر دینے کا ذمّہ دار ہے، اور حقیقی امن و سلامتی اور عدل و انصاف کا قیام تب تک امکان پذیر نہیں، جب تک سلطنت ایک مدینۂ فاضلہ — قرآن اور اسلام کا مدینۂ الٰہی — کی صورت میں سلطان کے ہاتھوں میں نہ ہو۔ شاہ ہمدانؒ نے اسی لیے بادشاہوں کو تلقین کی ہے کہ وہ قرآن پاک اور سنّتِ رسولؐ سے مدد طلب کریں، شاہ ہمدانؒ کا براہِ راست ملوک و امراء اور بادشاہوں کے نام ذاتی خطوط بھیجنے۔ اور وہ بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر — کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ سلاطین اور مقتدر حکّام خود قرآن و سنّت کا مطالعہ کریں اور اُن خطرات سے باخبر رہیں جو شاہی اقتدار و جبروت کا لازمہ ہوتے ہیں اور اُن میں یہ

احساس بھی سرایت کر جائے، کہ دنیائے دون اور گردشِ فلک نے کبھی بھی کسی سے وفا نہیں کی، اس لیے زوال سے پہلے وہ ایسے نیک کام لوگوں کے حق میں انجام دیں جن سے وہ دنیا سے بھی سُرخرو ہو کر نکلیں اور عقبیٰ بھی اُن کے حق میں محمود بن جائے۔ حضرتِ شاہِ ہمدانؒ اس حقیقت سے اپنے تجربات و مشاہدات کی وجہ سے باخبر تھے کہ وقت کے کم سواد علماء اپنی جاہ طلبی اور خوشگذرانی کی خاطر سلاطین کو نصیحت و ارشاد سے محروم اور ان کو اُن کے نفسانی شہوتوں میں مشغول رکھ کر دین و دنیا کے فرائض لازمہ سے دُور رکھتے ہیں۔ شاہ ہمدانؒ انہیں اس حقیقت سے بھی آشنا کرتے ہیں کہ سلاطین کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ خود ظلم و جور سے باز رہیں بلکہ انہیں ہوشیار رہنا چاہیے کہ اس کے اطراف کے عمّال و حکّام اور فوج کے مقتدر حاکم بھی ظلم و زیادتی نہ کریں اور اگر کسی کو نا انصافی و ظلم کا مرتکب پائیں تو اُسے سزا دی جائے۔ اور چونکہ آخر میں سوائے نام کے اور کچھ باقی نہیں رہتا، اس لیے سلاطین و ملوک اور صاحبِ اقتدار امراء و وزراء اور حکّام مقتدر کو چاہیئے کہ نیکنامی اور ایک حیاتِ جاودانی اپنے لیے حاصل کریں۔ ظاہر ہے اس طرح کے خطوط جو ہمیشہ قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ سے دلائل و براہین اخذ کر کے شاہی درباروں میں بھیجے جاتے تھے، کس قدر بادشاہوں کو اور ان کے حواریوں کو متاثر کیا کرتے تھے۔

مکتوبات کی روشنی میں جو شاہ ہمدانؒ نے ملوک و حکّام بلکہ خود اپنے مُریدوں کے نام لکھے، آپ کی شخصیت اور آپ کی زندگی کے منتہائے مراد و مقصد کے ادراک میں بڑی مدد ملتی ہے۔ آپ کی دینی اور روحانی مامُوریت کا مطالعہ آپ کے مکتوبات عالیہ کے مطالعہ سے علیحدہ نہیں، بلکہ اگر فقط آپ سے ہم تک آپ کے مکتوبات ہی پہنچے ہوتے جب بھی آپکی زندگی اور روحانی برتری اور آپ کی اعلیٰ ترین دینی ماموریت ہم پر روشن ہو جاتی۔ ذیل میں ہم آپ کے بعض مکتوبات[1] سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ تبرّکاً اور عیناً ان ہی الفاظ میں جن میں یہ مکتوبات دُنیا کی معروف دانشگاہوں، کتاب خانوں اور ادبی اداروں میں موجود ہیں:۔

پاکھلی سے کشمیر کے بادشاہ سلطان قطب الدین کشمیری کے نام لکھا:۔

"... چون بموجبِ اشارتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم "اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃٌ" است از راہِ محبّت نصیحت لازم است۔ تُرا نصیحت می شود کہ در دولتِ دُنیوی نعمتِ ابدی را فراموش نہ کنی۔ نعمتِ دنیا چون باد در گذر و خواب مانند و سخت ناپایدار است کسی را عاقل نتوان گفت کہ بہ خواب فریفتہ ماند و از انجام غافلان مثبوُر عبرت نگیرد و یقین دان کہ ہر کہ از احوالِ دیگران عبرت نگیرد، او را عبرتِ دیگران گردانند ...."

[چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بموجب دین نصیحت ہے اس لیے محبت کی وجہ سے نصیحت کرنا لازمی ہے، تجھے نصیحت کر رہا ہوں کہ دُنیوی دولت میں رہ کر ابدی نعمت کو نہ بھُلانا۔ دنیوی نعمت ہوا کی طرح گذر جانے والی اور خواب کی طرح ہے اور سخت ناپائیدار ہوتی ہے، اس شخص کو عقلمند نہیں کہا جاسکتا جو خواب سے دھوکا کھائے اور جو ہلاک ہوئے غافل لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل نہ کرے اور یقین کرو کہ جو کوئی دوسروں کی حالت سے عبرت حاصل نہ کرے اسے دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا جاتا ہے ....]

ایک اور خط میں اسی بادشاہ کو لکھا :-

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ)

[۱] یہ مکتوبات میں نے ایران میں اپنے بیشتر اسفار میں نقل کیے ہیں۔ مرکزی کتاب خانہ دانشگاہ تہران نسخہ نمبر ۶۷۲/۵ جو سال ۸۱۴ھ میں لکھے گئے نسخہ کی نقل اور استنبول (ترکی) کے ایا صوفیا کتابخانے میں محفوظ ہے۔ کتاب خانۂ ملک تہران کا نسخہ جو سن ۹۰۷ھ میں لکھا گیا ہے اور زیر نمبر ۴۲۷۴ موجود ہے۔ پیرس (فرانس) کے قومی کتابخانہ میں موجود نسخہ کی نقل جو مرکزی کتاب خانہ دانشگاہ تہران میں نمبر ۱۶۶۶ کے تحت محفوظ ہے، اسکے علاوہ ملاحظہ ہوں، مکتوباتِ میر سید علی ہمدانیؒ نسخۂ قلمی زیر نمبر ۳۱۲۱ ریسرچ اینڈ پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر سری نگر۔ ان خطوط میں سے میں نے چار خط شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی سرینگر کے ادبی مجلّہ دانش میں مع اُردو ترجمہ کے شایع کیے ہیں۔ دیکھیے دانش شاہ ہمدان نمبر۔

[۲] سلطان قطب الدین شہمیری (۷۷۵ھ ـ ۷۹۶) کے عہد میں حضرت شاہ ہمدانؒ کشمیر آئے اور سُلطان اُنکا مُرید ہو گیا۔

”..... پس اے عزیز! بر حاکم واجب است کہ خطرِ عہدۂ وظیفۂ حکومت را بیندیشد، و ادای حقوق و گزاردنِ امورِ بندگانِ حق را آسان نشمارد و آثارِ نتائجِ مرضی یا نامرضی مولی را خوار و برابر ندارد، و در سیرتہای خلفای راشدین و سلاطینِ نیکوکار علیہم الرّحمۃ تأمل کند۔ حاکم را باید کہ از حلیۂ آداب خود را عاری نگرداند، و انعام دنیا را باعثِ خسرانِ عقبیٰ نسازد، و از شفقت و ترحّم بر ضعیفان دریغ ندارد، و بر دولتِ فانی دنیا اعتمادی نکند، و از رسوائی و گرفتاریِ قیامت یاد آرد، و ایّامِ فرصتِ زندگانی را غنیمت شمارد۔ اے عزیز! تو ہم از جملہ پادشاہان و حاکمان و امیران ہستی.....“

[..... لہٰذا اے عزیز! حاکم پر لازم ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ذمّہ داری کے خطرات پر غور کرے، اور بندگانِ خدا کے امور کی تکمیل اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے کام کو آسان نہ جانے، اور اللہ کی مرضی اور نامرضی کے نتائج کے اثرات کو حقیر اور مساوی خیال نہ کرے، اور خلفای راشدین اور نیکوکار سلاطین، اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ان پر! کی سیرتوں پر غور و خوض کرے۔ حاکم کو چاہیئے کہ آدابِ دین کے لوازمات سے اپنے آپ کو محروم نہ رکھے، اور دنیوی نعمتوں کو عقبیٰ کے نقصان و زیان کا باعث نہ بنائے اور کمزوروں پر رحم و شفقت کرنے سے باز نہ رہے، اور دنیا کی فانی دولت پر اعتماد نہ کرے، اور قیامت کے دن کی گرفتاری اور رسوائی کو یاد کرے، اور زندگی کے ایّامِ مہلت کو غنیمت جانے۔ اے عزیز! تم بھی تو بادشاہوں اور حاکموں اور امیروں میں سے ہو.....]

سلطان طغان شاہ[1] کے نام لکھا:

”..... بدان کہ حضرتِ عزّت، جلّ و علا، آن عزیز را بہ اختیارات زیاد برگزید،

---

[1] سلطان طغان شاہ کو کشمیری بادشاہوں کی حمایت حاصل تھی اور وہ ان ہی مقتدر بادشاہانِ کشمیر کے سائے میں حکومت کرتا تھا۔ طغان شاہ کونار (کنار یا کنٹر) کا بادشاہ تھا جو افغانستان کی سرحد کے نزدیک موجودہ پاکستان کی سرحد کے قریب ایک الگ ملک تھا۔

و بانفاذِ احکام و نہیہ امورِ بندگانِ خود مامور کردہ تا کارہا را برای مصالح مردم انجام بدہی، و میزانِ مستقیم عقل و شرع را کہ بر السنۂ انبیاءؑ و علماء فرستادہ شد، بکار بندی، و بر صراطِ راست روی، و باداہای حقوق بندگانِ قیام نمائی، و از روزی کہ حاکم و محکوم از سطوتِ قہرِ خداوندی مدہوش باشند، بخاطر داری، و برای مجمعِ یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِرُ[1] زادِ راہ جمع آوری۔ اے عزیز! عاقل آنکہ از فضیحتِ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ[2] بیندیشد، بر رعیّتِ ضعیف رحم کند تا از طرفِ خداوندِ خود در موقف رحم باشد، باستغنارِ عیالُ اللہ قہرِ حضرتِ جبّاری را دعوت ندہد، و نعمتِ قوت و غنا را باعثِ سعادتِ ابدی سازد نہ وجہِ خسارت و حرمان۔ اگر کارہا را نیکو انجام دادی روزِ قیامت در زمرۂ سالکانِ مسالک عالی محشور می شوی، و اگر خلاف کردی، از نکال و وبالِ سرمدی تشویر خوری۔ ایزد تعالیٰ منبعِ ارادتِ آن عزیز را از ظلماتِ ہویٰ و وساوس و ضلالِ اہلِ زیغ و اہواء در پناہِ عصمتِ خود مصئون و محفوظ دارد بمنہ و کرمہ ....“

[.... جان لو کہ حضرتِ حق تعالیٰ جلّ و علا نے تجھ عزیز کو بہت سارے اختیارات کے ساتھ منتخب کیا، اور اُس کے احکام کو نافذ کرنے اور اُس کے بندوں کے امور کو انجام دینے کی خاطر مامور کیا، تاکہ تم لوگوں کی بھلائی کے لیے امور کی تکمیل کرو، اور عقل و شریعت، جسے انبیاء اور علماء کی زبانوں پر اُتارا گیا، کی درست میزانِ عمل پر کاربند رہو، اور سیدھی راہ پر چلو، اور بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی پر قائم رہو، اور اُس دن کو یاد کرو جبکہ حاکم اور محکوم قہرِ الٰہی کے دبدبہ سے بیخود ہوں گے، اور اُس روز کے لیے زادِ راہ جمع کرلو جس روز سب کی قلعی

---

[1] یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِرُ۔ جس روز سب کی قلعی کھل جاویگی یعنی سب مخفی باتیں از قبیلِ عقائدِ باطلہ و نیاتِ فاسدہ ظاہر ہو جائیں گی اور دنیا میں جس طرح موقع پر جرم سے مکر جاتے ہیں اور اسکو چھپا لیتے ہیں یہ بات وہاں ممکن نہوگی۔ قرآن مجید سورہ ۸۷ آیت ۹ (معنی و شرح: مولانا اشرف علی تھانویؒ) [2] قرآن سورہ ۲۶ آیت ۸۸۔

کھل جائے گی۔ اے عزیز! عاقل وہ ہے جو اُس روز کی رسوائی کے بارے میں سوچ لے جس روز نجات کیلئے نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ کمزور رعایا پر رحم کرے تاکہ اپنے حق تعالیٰ کی طرف سے رحم کیے جانے کی جگہ پر رہو۔ اللہ تعالیٰ کے عیال (یعنی بندگانِ الٰہی) کو ستا کر حضرتِ جبّار کے قہر وغضب کو دعوت نہ دے، اور طاقت و تونگری کو اپنی ابدی سعادت کا باعث بنائے نہ کہ زیان و حسرت کا موجب۔ اگر تم نے کام اچھی طرح سے انجام دیئے تو قیامت کے دن بلند ترین مقامات پانے والے سالکوں کے گروہ کے ساتھ تمہارا حشر ہوگا، اور اگر اس کے خلاف کیا تو ہمیشہ کے عذاب کی سختی سے پشیمانی میں رہو گے۔ اللہ تعالیٰ تجھ عزیز کی ارادت کے خزانے کو خواہشات اور وسوسوں کی ظلمتوں، اور نفس پرست و کج نظر لوگوں کی گمراہی سے اپنی پاکیزگی کی پناہ میں، اپنے فضل وکرم سے، محفوظ رکھے.....]

شیخ محمد بہرام شاہ ابن سلطان خان[1] کے نام لکھا:

"... اے عزیز! بر تو باد کہ اُمورِ مسلمانان و رعایای عامہ را برای حفظِ نفسِ خود تفقّد نہ کنی بلکہ برای بہبود آنان۔ امری کہ بر تو واجب گردانیدہ اند، اوّل خود انجام بدہ و تعلیم دیگران بکن۔ با ضعیفان با مدارا سخن گوی، رعایا را امرِ معروف کن و برای اشاعۂ امور دین کسان خود را مأمورِ ناحیاتِ ولایت ساز تا فرزندان مردم را تعلیم کنند در اقامتِ دین و امورِ اسلام۔ بدین طریق ظلمتِ بے دینی و بے عملی و بدعت دور گردد۔ زنہار! امور اقامتِ دین را سہل نگیری و بدانی کہ امری را کہ سہل بگیری، ثمرہ ای ندہد۔

.... ہر روز باید کاری کند از کارہای نیکی و احسان کہ غیر حق را بر آن اطلاعی نباشد و این وسیلت خوشنودی حضرتِ لایزال باشد.... ہمچنانکہ در حرم خود توقعِ عصمت و صلاح داری عصمت و صلاح حرمہای جملہ مسلمانان را نیز توقع دارد یا نان کمک کن کہ کسی در منطقہ اقتدار تو جرأت خیانت و نظر بد نداشتہ باشد و عمل تو زیاد از قول تو در مردم اثر خواہد

---

[1] بلخ اور بدخشان کا حاکم تھا۔

گذاشت۔ اے عزیز! حرام مخور و حرام مکن۔ ضعیفان را محروم مگردان کہ بحقیقت، خود را محروم خواہی گردانید۔ یقین دان کہ بعد ہر مرادِ نامرادی خواہد بود و در عقب ہر فراخی تنگی و محنتی۔ پس نعمت ہر چہ کہ زیاد داری اسراف نکن و بقدرِ حاجت کفایت نمای، در نعمت و آسائش از حالِ محنت زدگان بیندیش، در فراخی از محتاجان یاد آر و بہ ایشان یاری کُن تا مکافات یابی ..... اگر در ولایت تو یک نفر ہم گرسنہ یا برہنہ یا ستم رسیدہ باشد و تو از حال وی بی خبر و برای بہبودی وی چارہ گر نباشی، از مراتبِ اہلِ تقوی النصیبی نہ بری۔ ای عزیز! خرجِ مال باندازۂ دخل است، ہر طور کہ باشد بہ اندازہ خرج نمای، ولی فکر کن کہ در کاری خرج نکنی کہ موجبِ روسیاہی دُنیا و رسوائی عقبیٰ گردد۔ مال را اگر از طریق حلال بدست خواہی آورد بکارہای پسندیدہ خرج می شود و نیکنامی آرد و مالِ حرام در کارہای حرام رود۔ طوری کن کہ اگر با یکی نیکی و شفقت کنی با دیگری بدی و مروّتی نہ کنی کہ آن بہ ہدر رود....."

["..... اے عزیز! تم پر ذمّہ ہے کہ مسلمانوں کے امور اور عام رعایا کے معاملوں کو اپنی نفسانی لذّتوں پر نہیں بلکہ اُن کی بہبودی پر ترجیح دو۔ جس کام کو تجھ پر فرض کیا گیا ہے اُسے پہلے تم خود انجام دو پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دو۔ کمزوروں کے ساتھ نرمی سے بولو، رعایا کو نیکی کا حکم دو، اور دین کے امور کی اشاعت کے لیے اپنے آدمیوں کو ملک کے مختلف علاقوں میں مامور کرو۔ تا کہ لوگوں کی اولاد کو وہ دین اور اسلامی امور کے قیام کے بارے میں تعلیم دیں" اس طرح سے بے دینی اور بے عملی اور بدعت دور ہو پائے گی۔

خبردار! دین کے امور کو قایم کرنے کے عمل کو آسان نہ سمجھ۔ اور جان لو کہ جس چیز کو تم آسان جانوگے اس سے کوئی نفع نہیں ملتا..... ہر روز تجھے نیکی اور احسان کا کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیئے جو غیرِ حق سے دور ہو اور یہ خداوندِ لایزال کی خوشنودی کا وسیلہ ہوگا... جس طرح تم اپنے حرم سرا کی بیگمات سے پاکی اور نیک معاشی کی امید رکھتے ہو، اسی طرح سے تمام مسلمانوں کے حرم سراؤں سے بھی تجھے نیک معاشی اور پاکی کی توقع رکھنی چاہیئے، ان کی مدد کیا کرو تا کہ تمہارے اقتدار و حکومت کے نواحی میں کسی کو ان کی نسبت خیانت کرنے کی جرأت نہ ہو اور

ان کو بُری نظر سے نہ دیکھے اور تمہارا عمل تمہارے قول سے زیادہ لوگوں پر اثر انداز ہوگا۔ اے عزیز! حرام نہ کھا اور حرام کام مت کر۔ کمزوروں کو محروم نہ رکھ۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دراصل تم اپنے آپ کو محروم رکھو گے۔ یقین کرو کہ ہر کامیابی کے بعد ناکامی کا سامنا ہوتا ہے اور ہر آسودگی کے بعد تشنگی اور مصیبت۔ اس لیے اگرچہ تیرے پاس نعمتوں کی فراوانی ہے تو اسراف نہ کر اور ضرورت کے مطابق خرچ کر۔ تونگری و آسائش میں مصیبت زدوں کے حال پر غور و فکر کر۔ آسودگی میں محتاجوں کو یاد کر اور ان کی دستگیری کر، تاکہ تو جزا کا مستحق ہوجائے.... اگر تیرے ملک میں ایک بھی آدمی بھوکا یا ننگا یا مظلوم ہوگا اور تم اُس کے حال سے بے خبر ہوکر اس کی بہبودی کے لیے علاج نہیں کرتے تو اہلِ تقویٰ کے مراتب سے کچھ بھی تمہارے نصیب میں نہیں آئے گا۔ اے عزیز! مال خرچ کرنا آمدنی کے مطابق ہوا کرتا ہے، جیسے بھی ہو اندازے کے مطابق خرچ کر۔ لیکن خیال رہے کہ ایسے کاموں میں خرچ نہیں کرو گے جو دنیا میں تمہاری روسیاہی اور آخرت میں تمہاری رسوائی کا موجب بن جائے، اگر تم مال و دولت کو حلال راہ سے حاصل کرو گے تو وہ پسندیدہ کاموں میں خرچ ہوتا ہے اور نیک نامی کا باعث، اور حرام مال حرام کاموں پر خرچ ہوتا ہے، ایسا رویہ اختیار کرو کہ اگر ایک کے ساتھ نیکی اور شفقت سے پیش آئے، تو ہرگز دوسرے سے بدی اور بے مروّتی نہ برتنا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ نیکی اور شفقت ضایع ہوجاتی ہے....]

سُلطان غیاث[1] الدّین کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھا:

"....اگر بدیدۂ تحملِ عقل و ہدایت درگشتی، و در کارہای خود تامّل کنی، می بینی کہ،

---

[1] کونار (کنار) کے قریب واقع پکھلی یا پاخلی کا بادشاہ جو کشمیری بادشاہوں کی حمایت اور سایے میں حکومت کرتا تھا یہ وہی بادشاہ ہے جس نے حضرت شاہ ہمدانؒ کو تبلیغ شریعت کی دعوت دی تھی اور بعد میں چند اوباشوں کو آپ کے مکان پر آپ کو شہید کرنے کی نیت سے بھیجا تھا اور پھر حضرت شاہ ہمدانؒ نے وہیں اپنے مکان سے ہی اس بادشاہ کو خط لکھا تھا کہ میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور حق کی تبلیغ کر کے ہی دم لوں گا۔ اس کا ذکر اگلے اوراق میں ہوچکا ہے، خط سے عیاں ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ اس بادشاہ سے اس کے شرکِ خفی اور بُرے کردار سے ناراض تھے اور اسی لیے اُسے تنبیہ کی ہے۔

زشتیہای حقد وحسد وعناد وکبر وشرکِ خفی، پردۂ غفلتِ تو گردیدہ، واین روش، موجبِ عذابِ جاودانی تو خواہد بود، مگر این کہ توبہ کنی، ودر ازالۂ بدی ہا جدّ کنی، تا از بادیۂ ضلالت برہی، ودر روزِ قیامت، جای خود را از منافقِ تیرہ کار دُور سازی ....“

[... اگر تم اپنے آنکھوں میں عقل وہدایت کا سُرمہ لگا دو گے، اور اپنے کردار پر غور کرو گے، تو سمجھ پاؤ گے کہ دشمنی اور حسد اور عداوت اور تکبّر اور پوشیدہ طور کے شرک کی بُری عادتیں تمھارے لیے غفلت کا پردہ بن چکی ہیں، اور یہ طریقہ تمھارے لیے ایک جاویدان عذاب کا موجب بن جائے گا مگر یہ کہ تم توبہ کر لو، اور بُرے کاموں کو مٹانے کی کوشش کرو، تاکہ گمراہی کے بیابان سے رہائی پاؤ گے، اور قیامت کے روز سیاہ کار منافقوں سے دُور رہو گے...]

سلطان شرف[1] الدّین خضر شاہ کے نام لکھا:۔

”..... وصیّت کردہ شد آن عزیز را بہ تقویٰ کہ آن شرفِ دنیا و زادِ آخرت ماست، و برای امتثال اوامرِ حق وعمارتِ دل، بمداومت بہ ذکر وملازمتِ طاعات واجتناب از نواہی، وصبر بر شدائد ومصائب، وتوقّف در حالتِ ظہورِ شبہات، وتوزیعِ اوقات در انواعِ خدمات وطاعات، وامر معروف ونہی منکر وتعظیم فرمانِ حق و شفقت بہ خلق، کہ عیال اللہ اند، وصدق در اقوال واعمال وانصاف در افعال، و بداند کہ مجموعِ ایّام واوقاتِ عمر را کہ ایّام فرصت وا وانِ مہلت است، بجہت

---

[1] یہ بادشاہ سلطان غیاث الدّین کا جانشین تھا۔ اسی بادشاہ کی حکومت میں حضرت شاہِ ہمدان رح نے پاکھلی میں وفات پائی اور اسی کے حکم سے آپ کا جنازہ ختلان لے جایا گیا۔ یہ بادشاہ حضرت امیر کبیر رح کا مُریدِ صادق تھا اور جو خط حضرت شاہ ہمدان رح نے اسے لکھا جس کا اقتباس اوپر درج ہے، اس میں ایک جگہ آپ نے ”وصیّت کردہ شد آن عزیز را“ لکھا ہے جس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ گویا یہ خط وصیّت نامہ تھا، اور اس خط کے آخر میں آپ نے بادشاہ کو اپنے بارے میں خرقۂ درویشی کا پورا سلسلہ بتایا ہے۔

کسبِ سعاداتِ اُخروی مراعات کُند و غافل نماند تا در ہر نفس معاملۂ او با حق بموافقت بُوَد و با نفس بمحاسبت و با تن بمجاہدہ و با دوست بمجاملت و با ہمسایہ بمعاونت و با خویش بمواصلت و با آشنا بمرافقت و با بیگانہ بملاطفت و با ضعفاء بمساعدت و با فاسقان بمخاصمت و با زیرِ دستان برحمت و با یتیمان بشفقت و با مسکینان بمودّت و با درویشان بمروّت و در دین بحمیّت و با دنیا بقناعت و در طاعت بغیرت و در نظر بعبرت و در سکوت بفکرت و در سخن بامانت و در حرکت بصیانت و در عہد بوفا و با اہلِ حق بالفت و رضا و در نعمت شاکر و در بلا صابر و در خیر سابق و مانند طالب مجد صادق، صفات حمیدۂ مذکور را در خود سازد و جمالِ طلعتِ روحِ قدسی را بہ زیور این خصال پسندیدہ مزیّن گرداند و نسیم روائح طیب این صفات را در شہر بدن منتشر سازد تا حقایق اینگونہ آثار سبب ترقی سالک گردد.....''

[.... تجھ عزیز کو وصیت کر رہا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرو کہ یہی دنیا میں سربلندی اور توشۂ آخرت ہے، اور احکامِ الٰہی کی تعمیل کرو اور دل کی عمارت کی تعمیر کرو ہمیشہ ذکرِ الٰہی سے، اور اس کی اطاعت پابندی کے ساتھ کرنے سے، اور منع کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنے سے اور سختیوں اور مصیبتوں پر صبر کرنے، اور شکوک و شبہات کی حالت ظاہر ہو جانے پر توقف سے کام لینے، طرح طرح کے کاموں اور امور کو انجام دینے کی خاطر وقت کو تقسیم کرنے، نیکی کا حکم دینے اور ممنوعات سے روکنے، اور فرمانِ حق تعالےٰ کی تعظیم کرنے، اور لوگوں پر جو اللہ کی مخلوق ہیں، شفقت کرنے، اور قول و عمل کی سچائی اور فعل میں انصاف برتنے سے۔

جان لو کہ عمر کے تمام ایّام اور اوقات، جو فرصت اور مہلت کے ایّام ہیں، اُخروی سعادت کے حاصل کرنے کی خاطر صرف کیے جانے چاہئیں اور غفلت نہیں برتنی چاہیئے تا کہ ہر ایک سانس میں تمہارا معاملہ حق کے مطابق ہو اور اپنے نفس کے ساتھ محاسبہ، جسم کے ساتھ مجاہدہ، دوست کے ساتھ میل جول، ہمسایہ کے ساتھ یاری، اپنوں کے ساتھ تعاون، آشنا کے ساتھ رفاقت، بیگانوں کے ساتھ احسان، کمزوروں کے ساتھ دستگیری، بدکاروں کے ساتھ دشمنی، ماتحتوں

کے ساتھ رحم، یتیموں کے ساتھ شفقت، مسکینوں کے ساتھ محبت، درویشوں کے ساتھ مروّت دین میں غیرت، اور دنیا کے ساتھ قناعت، اور اطاعتِ الٰہی میں پائیداری، اور نظر میں عبرت، اور خاموشی میں غور و فکر، اور بولنے میں امانت داری، اور حرکت میں نگہبانی، وعدہ میں وفا، اہلِ حق کے ساتھ الفت اور رضا، اور تونگری میں شکر کرنے والا، مصیبتوں میں صبر کرنیوالا نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے والا اور بلند کردار طالب کی طرح سچائی برتنے والا ہو۔ ان مذکورہ پسندیدہ صفات کو اپنی عادت بنانا چاہیئے اور ان خوش کردار خصلتوں کے زیور سے اپنی پاکیزہ روح کے حسن و جمال کو آراستہ کرنا چاہیئے اور ان صفتوں کی خوشبو کی ٹھنڈی ہواؤں کو اپنے جسم کے شہر میں پھیلا دینا چاہیئے تاکہ ان حقایق کے نتایج سالک کی ترقی کا سبب بن جائیں....]

اپنے مریدِ صادق مولانا نورالدین جعفر[1] بدخشیؒ کے نام لکھا:۔

”..... اگر آن عزیز بقیامِ ادایِ حقوق مشغول است، ہر کجا کہ ہست، مقبول است، و از خواطرِ طایفۂ اہلِ دل متمتّع و محظوظ۔ و اگر سرمایۂ حیات را.... در ظلماتِ بطالت گذاشتہ، و پردۂ غفلت را بر رہگذرِ نسیمِ نفحاتِ ربّانی فرو گذاردہ، دوچارِ مصیبت شدہ و بماند کہ، بعد از تمنّایِ قرب و صحبتِ اہلِ حق، راہِ تسویل و نفس را پیمودن، نتیجہ حماقت و شقاوت بُوَد....“

[.... اگر تم عزیز! حقوقِ الٰہی کو ادا کرنے پر قائم اور مشغول ہو، تو جہاں کہیں بھی ہوگے مقبول ہوگے، اور صاحبِ دل لوگوں کے قلوب سے فائدہ و لذّت حاصل کرتے رہوگے۔ اور اگر تم نے سرمایۂ زندگی کو بیکاری کی ظلمتوں میں دھکیل دیا ہوگا، اور اگر ربّانی خوشبوؤں کے سانسوں کی رہگذر پر تم نے غفلت کا پردہ ڈال دیا ہوگا تو مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور جان لو

---

[1] صاحبِ خلاصۃ المناقب جو حضرت شاہ ہمدانؒ کی خدمت میں مرید و طالب صادق کی حیثیت سے سن ۷۷۳ھ سے خود اپنے بقول ان کے دامن گیر ہوئے تھے۔ ایک خط سے جو شاہ ہمدانؒ نے انکو لکھا تھا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بدخشیؒ طبیب بھی تھے

کہ اہلِ حق حضرات کی صحبت اور اُن کی قربت کی تمنّا کرنے کے بعد جھوٹی سخن آرائی اور نفس پرستی سے کام لینا، حماقت اور بدبختی ہے . . .]

مکتوبات کے مطالعہ سے، جو علمِ دین، معرفت اور شریعت کے عناوین پر مشتمل ہیں، جیسے: اوامرِ الٰہی، اسلام کے اساسی ارکان کی شرح، بندگیِ خدا، توبہ، ترکِ دُنیا، عقل و دانش، معرفتِ الٰہی، دنیا کی ناپائیداری اور بیوفائی، فتوّت و مردانگی، شریعت، حقیقت، صبر، توکّل، رضائے الٰہی، صفائیِ قلب، وصلِ محبوب، اخوّت، شفقت، نیک نیتی، فرائضِ عوام و علماء، بادشاہوں کے فرائض وغیرہ وغیرہ]

ایک اہم بات جو ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ نے ایک عام مسلمان عالم کی طرح خالص اپنے عہد کے حالات و عقاید سے صحیح طور سے خبردار ہو کر ہی ان مکتوبات کو نہیں لکھا، بلکہ ان کے ذہن میں مستقبل کا عالمِ اسلام بھی تھا اور مکتوبات کے صدقِ کلام اور خلوص سے بھی اس کی تائید ہو جاتی ہے، اور جب ہم اُن کے مکتوبات کو پڑھتے ہیں تو حقیقتِ دین اور یقین و عمل کے پس منظر میں شدّت سے احساس ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ جدید دور کے مسلمانوں سے ہمکلام ہیں اور جوں جوں ہم ان مکتوبات کے لحنِ بیان کی مضبوطی، دلائل و براہین کی استواری، اور عظمت و شوکتِ الفاظ کی اساس پر، دینِ اسلام، علومِ اسلامی، اور حق و حقیقت کا مطالعہ کرتے ہیں، بے یقینی، مادّہ پرستی، اور لااُبالیانہ تخیّلات کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور دنیائے اسلام اور دینِ اسلام اور حقیقتِ اسلام کی سادہ و روشن اُفق نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ دراصل حضرتِ شاہِ ہمدانؒ اپنے مجموعی آثار اور بالخصوص اپنی معروف فارسی تصنیف "ذخیرۃ الملوک" اور مکتوبات میں قرآن مجید کی بات کرتے ہیں، قرآنی آیات کی مدد سے اپنی دلیل و برہان کو پیش کرتے ہیں اور قرآن و سنّت کی روشنی میں ہی ہمیں حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خدائی اور آسمانی کتاب اللہ کے پس منظر میں نیز اپنے سنجیدہ و پُرخلوص بیان و آہنگِ کلام سے، آپ کے یہ مکتوب ہر قسم کے شک و شبہ اور بدبینی اور نا امیدی کو دور کرتے ہیں اور آپ کے دل کش اور رُوح افزا قوّتِ بیان سے مسلمانوں کے ذہن میں

ایک مخلص ترین اور زبردست اسلامی عالم کی تصویر نقش پذیر ہو جاتی ہے۔ آج تک حضرت شاہ ہمدانؒ کے آثار میں سے کسی ایک پر بھی و نبائے اسلام کے مفکرین و علماء نے نہ کوئی تنقید کی ہے اور نہ ہی ان کے افکار کو نشانۂ طعن بنایا، بلکہ خود ان کے افکار و آثار سے استفادہ کیا اور عالمِ اسلام پر دینی اور علمی لحاظ سے آپ کے احسان کا اعتراف کیا ہے۔[1]

* * *

حضرت شاہ ہمدانؒ رحمۃ اللہ علیہ نے، جیسا کہ اگلے اوراق میں بیان ہوا ہے، جن ملوک و امراء کے درباروں میں جا کر اُن کی دعوت پر دینی مباحث کیے اور ان کی آزمائشوں سے بھی گزرے اُن بادشاہوں کے ناموں اور اُن کے ملکوں کا تذکرہ مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ یا احباب و اصحاب کے سامنے نہیں کیا۔

مولانا نورالدین جعفرؒ نے خود حضرت شاہ ہمدانؒ کی زبانی خلاصۃ المناقب میں "در بعضی از دیار" (یعنی، بعض ممالک میں) یا "بعضی ملوک و امراء" (یعنی بعض بادشاہ اور امیر) "در بعضی دیار با علماء" (یعنی بعض ممالک میں علماء کے ساتھ) کا ذکر کیا ہے اگرچہ بعد میں منقبت الجواہر اور نظم المناقب کے مؤلفین نے حضرت شاہ ہمدانؒ کے دورانِ سفر کے بعض واقعات کو اُن کے چند برگزیدہ اصحاب و احباب کے حوالے سے معمولی اختلافات کے ساتھ بلخ و بدخشان اور بخارا کے ملوک و امراء کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بعد کی بات ہے اس لیے یہ انتساب تحقیق طلب ہے، اگرچہ واقعات خود شاہ ہمدانؒ کے فرمودات کے عین مطابق ہیں۔ شاہ ہمدانؒ نے ان ملوک و اُمراء کے نام اور ممالک کی جو کھُل کر نشان دہی نہیں کی، وہ دراصل آپ کے اعلیٰ انسانی کردار، اور جوان مردی و مردانگی کا ایک برتر نمونہ ہے۔ حضرت شاہ ہمدانؒ دراصل اپنے مرشدِ طریقت شرف الدین اخی علی دوستیؒ کی رہبری و تربیت میں، اخوّت و جوانمردی کے مخصوص حلقۂ ریاضت و تدریس میں بھی رہ چکے تھے، اور رائج سلسلۂ کبرویہ میں اس

---

[1] ملاحظہ ہو: طرائق الحقائق، خمخانۂ وحدت اور بزرگان و سخن سرایان ہمدان۔ تألیف ڈاکٹر مہدی رخشان مطبوعہ نیکپور (۱۳۴۱ ش) تہران۔

طریق سے بہرہ ور ہو کر اسے اپنی زندگی کا ایک لازمی حصّہ قرار دینا ضروری تھا۔ اخی کے لقب سے عیاں ہو جاتا ہے کہ سلسلہ کبرویہ کے سبھی اخلاص مند بزرگ ایک دوسرے کو صحیح معنوں میں اپنا بھائی جانتے تھے اور ایک دوسرے کو خطاب کرتے وقت برادر یا اخی[۱] کہکر پکارتے تھے۔

چنانچہ خلاصۃ المناقب میں اکثر ہم اس طرح کے القاب کا مشاہدہ کرتے ہیں اور خود حضرت شاہ ہمدانؒ اپنے مرشد کو شیخ اخی علی یا اخی کہہ کر یاد کیا کرتے تھے[۲] یا خود مولانا نور الدّین جعفر بدخشیؒ حق گوئی کو برادرِ من اور قوام الدّینؒ کو برادرم، یا مولانا حاجی کو اخی حاجی کہہ کر یاد کیا ہے۔[۳]

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کبروی سلسلۂ مکاتب، یا ریاضت کے حلقوں میں داخل اصحاب ایک دوسرے کے ساتھ اخوّت و برادری کے بندھنوں اور روابط میں بندھ جاتے تھے، اور برادری و اخوّت کی شرائط جوانمردی و مردانگی اور محبّت و الفت سے عہدہ برآ ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو برادر کہہ کر پکارتے تھے۔ شاہ ہمدانؒ نے "بعضی از ملوک و امراء" یا "در بعضی دیار" یا "در بعضی دیار با علماء" پر اکتفا کر کے ارادتاً جو اُن ملوک و امراء و علماء کے ناموں اور شہروں کی نشاندہی نہ کر کے اسے پردۂ اخفا میں رکھا ہے، دراصل اسی مروّت و اخوت و جوانمردی کا حصّہ ہے جو اُن کے جسم و جان میں سرایت کر چکی تھی۔ جن علماء اور ملوک و امراء نے آپ کو اذیت جسمانی پہنچائی اُن کے ناموں بلکہ اُن کے شہروں تک کو فراموش کر کے قیامت تک کی بدنامی اور رسوائی سے اُن کو محفوظ رکھا۔ اور ایسا کرنا اُن کے ذاتی اعلیٰ اقدار کے علاوہ اُن کے کبروی سلسلہ کے فرائض میں بھی شامل تھا۔ جوان مردی و مروّت کے اس مکتبِ فکر کو فتوّت کہتے ہیں اور حضرت شاہ ہمدانؒ چونکہ اس مکتبِ فکر کے ایک باعمل اور متحرّک اور فعّال پیشوا تھے اس لیے انہوں نے فتوتیّہ کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا۔ دراصل فتوت کا سرچشمہ رحمۃ اللعالمین ﷺ ہیں، جنہوں نے سراپا رحمت کا عملی ثبوت دے کر اپنے ذاتی دشمنوں کو

---

[۱] [۲] [۳] خلاصۃ المناقب۔

معاف کر دیا اور بعد میں خلفائے راشدینؓ بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلے اور یہ صفت تصوّف کا ایک لازمی جُز ہو گئی۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے رسالۂ فتوتیہ، میں اخی (یعنی اخوّت) اور فتیٰ (یعنی جوان مردی — فتوّت) کے شرائط و آداب کے بارے میں لکھا ہے کہ:[1]

”... اے عزیز! اخی باید کہ بمکارم اخلاق موصوف بود و بہ خصائل پسندیدہ آراستہ باشد۔ با پیران بحرمت باشد، با جوانان بنصیحت، با طفلان، بشفقت با ضعیفان برحمت، با درویشان بہ بذل و سخاوت، با علماء بتوقیر و حشمت، با ظالمان بعداوت، با فاجران باہانت، با خلق باحسان و مروّت، با حق بتضرّع و استکانت، با نفس بجنگ، با خلق بصلح، با ہوا بمخالفت، با شیطان بمحاربت بر جفائے خلق متحمل، در مقابلِ اعداء حلیم، در وقتِ مصائب صابر، در حالت رجا شاکر، بعیوبِ نفسِ خود عارف، از ذکرِ عیوبِ خلق ساکت، اندوہ و مصیبتِ خلق را کارہ، بتقدیراتِ قضائے ازلی راضی، از بدعت و ہوا دور، قدم در شریعت راسخ، نفس در طریقت ثابت، از مواضعِ تہمت محترز، بر علم نجات حریص، از اہلِ غفلت متنفّر، در سفر مصاحبان را بطاعت معاون، بر جماعت مواظب، زیر دستان را ناصح، باندک دنیا قانع، در احوال و اہوالِ آخرت متفکّر، از افعال و اقوالِ خود خائف، از فضیحت و رسوائی قیامت ترسان، و بفضل و عنایتِ دیان امیدوار...“[2]

---

[1] رسالہ فتوتیہ۔ نقل از رسالہ فتوتیہ سالِ کتابت ۹۰۷ھ، کتاب خانۂ ملّی ملک (تہران) نمبر ۱۹/ ۴۲۵۰ اس رسالہ کا آخری حصہ مفقود ہے۔ نیز عکس رسالہ فتوتیہ نمبر ۱۸/ ۶۷۲ جو فلم نمبر ۲۸۷۳ سے لیا گیا ہے۔ اصل نسخہ جسے نویں صدی ہجری میں لکھا گیا ہے اور مرحوم استاد مجتبیٰ مینوی جنہوں نے استنبول کے ایا صوفیہ کتابخانے کے بہت سے نادر فارسی نسخوں کی فلم برداری کی تھی، نے اس اصل نسخہ کی فلم لی تھی اور جو تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتاب خانے میں موجود ہے۔ میں نے ان میں سے اقتباسات نقل کیے تھے۔ نیز ملاحظہ ہو مجموعۂ رسائل میر سیّد علی ہمدانی۔

[2] رسالہ فتوتیہ۔ میر سیّد علی ہمدانی رح (قلمی نسخہ)

[.... اے عزیز! اخی کو چاہیئے کہ وہ بلند اخلاق کا حامل ہو اور پسندیدہ خصلتوں سے آراستہ بزرگوں کی تعظیم کرے، بچّوں کو نصیحت کرے۔ کمزوروں پر رحم کرے، درویشوں کے ساتھ فیّاضی و سخاوت سے پیش آئے، عالموں کی عزّت اور اُن کے وقار کا احترام کرے، ظالموں سے عداوت رکھے۔ بدکاروں کو ذلیل جانے، لوگوں کے ساتھ مروّت و احسان برتے حق کے ساتھ عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کرے، نفس کے ساتھ جنگ کرے، عوام کے ساتھ صُلح و صفا سے رہے، نفسانی خواہشوں کی مخالفت کرے، شیطان کے ساتھ لڑے، لوگوں کے مظالم پر صبر کرے، دشمنوں کی اذیّتوں پر بُردبار رہے، مصیبتوں کو صبر سے برداشت کرے، امید و بیم کی حالت میں شکرگزاری سے کام لے، اپنے آپ کے عیوب کو پہچانے اور لوگوں کے عیبوں پر خاموش رہے، لوگوں کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا خواہاں نہ رہے، قضائے ازلی کی مرضی پر راضی رہے، بدعت اور نفسانی آرزؤں سے دور رہے، شریعت میں مضبوط قدم اور طریقت میں پائیدار و ثابت رہے، لوگوں پر تہمت لگانے کے کام سے احتراز کرے، نجات بخشنے والے علم کو سیکھنے کی لالچ کرے، اہلِ غفلت سے نفرت رکھے، سفر میں ساتھیوں کی اطاعت کرنے سے انکی مدد کرے، جماعت میں رہ کر اُن کی نگہبانی کرے، ماتحتوں کو نصیحت کرے، دنیا میں کم پر قناعت کرے، آخرت کے حالات اور خطرات پر غور و فکر کرے، اپنے قول و فعل کے تضاد سے ڈرتا رہے، قیامت کی خواری و ذلّت سے خوف کھائے اور خدائے دیّان کے فضل و کرم کا امّیدوار رہے ....]

چونکہ حضرت شاہ ہمدانؒ اہلِ فتیٰ میں سے تھے اور مردانگی و اخوّت اور جوانمردی و برادری آپ کا شعار تھا اور مردِ اخی کے ان تمام خواص و صفات کے حامل تھے، جن کا اقتباس اوپر درج ہوا، اس لیے اس سے پہلے کہ ہم کشمیر میں اُن کے سفروں کا تذکرہ کر کے ان کی سیاحت کے ذکر کی تکمیل کریں، فتوّت کے بارے میں مختصر طور پر کچھ کہنا بیجا نہ ہوگا۔

اوّل سیرتِ رسول صلّے اللہ علیہ وسلّم اور احوالِ صحابہ سے فتوّت کا پتہ چلتا ہے جس کو عملاً انھوں نے اپنی زندگی میں برتا اگرچہ قرآن مجید میں حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام جنھوں نے بتوں کو توڑ دیا، کو فتیٰ اور اصحابِ کہف کو، جو بت پرستوں کے شہر کو چھوڑ چکے ہیں، فتیہ

کہا گیا ہے۔ خلفائے راشدین میں چوتھے خلیفہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فتیٰ اور شاہِ مردان کہلائے۔ کیونکہ ولایت کے شاہ علیؓ ہیں اور فتوت تصوّف سے مربوط ہے، اس لیے حضرت علیؓ کی نسبت سے صوفیائے کرام فتوّت پر عمل پیرا ہوئے۔ صوفیائے کرام کا رابطہ دینی و اخلاقی تربیّت کو عام کرنے کی غرض سے عوام کے ساتھ رہا اس لیے جن لازمی شرائط پر لوگ عمل پیرا ہوئے صوفیائے کرام کا رابطہ دینی واخلاقی تربیت کو عام کرنے کی غرض سے عوام کے ساتھ رہا اس لیے جن لازمی شرائط پر لوگ عمل پیرا ہوئے ان میں فتوّت بھی شامل تھا فتوّت میں گویا خود رنج سہنا طعنوں کو برداشت کرنا، دوسروں کی اذیتوں کو خاموشی سے تحمل کرنا، اور ان کو راحت پہنچانا مقصود تھا اور یہ اعلیٰ اخلاقی کردار پیدا کرنے کی زبردست تربیت تھی۔ فتوت کی صفت رفتہ رفتہ لوگوں کے مختلف اصناف میں سرایت کر گئی اور عوام میں سے جن کا تصوّف سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا انھوں نے فتوت کو اپنا لیا اور بعد میں سیاستِ کشور میں بھی فتوّت کا عمل دخل رہا۔

ایران میں مثال کے طور پر فتوّت کا عنصر بہت ہی نمایاں طور پر عوام میں اس طبقہ پر ابھی بھی حاوی ہے جو پہلوانی یا کشتی گیری سے منسلک ہیں۔ خلاصۃ المناقب میں حضرت پہلوان محمودؒ کا ذکر ہے، قدس سرہٗ جن کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ”.... گاہ گاہ در خرابات آمدی و زنان را فرمودی کہ ساقِ پای برہنہ کنند، و چون برہنہ کردندی، نظر ہا کردی و خدا را ثنا گفتی.... خدمتِ پہلوان گاہ بودی کہ بگریستی، و اہلِ خرابات نیز بگریستندی....“[1]

[”.... کبھی کبھی رنڈی خانہ میں (یا شراب خانہ میں) جاتے اور وہاں عورتوں سے کہتے کہ پنڈلی کو ننگا کریں اور جب وہ پنڈلیوں کو ننگا کرتیں تو آپ ان کو دیکھتے اللہ کا شکر ادا کرتے ..... کبھی کبھی حضرت پہلوان روتے تھے اور رنڈی خانہ کے لوگ بھی رو پڑتے .....“]

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ نفس پر قابو پانے کی غرض سے پہلوانوں کا طائفہ کن صبر آزما امتحانوں سے گزرتا تھا۔ وہ نہ صرف خود جسمانی لحاظ سے طاقت ور بلکہ رُوحانی لحاظ سے بھی نفس پر مکمل قابو پانے کی راہ سے پہلوان بن جانا چاہتے تھے۔[2]

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

[2] ایران میں کشتی گیری کے لیے الگ جگہیں ہوا کرتی ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

بادشاہوں کے بزرگانِ دین سے خائف رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عوام میں چونکہ اخلاقی تربیت کی راہ سے اُن کی عزّت وتکریم بے انتہا تھی اس لیے بادشاہ لوگ بزرگانِ دین کو یا جلا وطن کرتے تھے یا اُن کے امراء و وزراء کی سازشوں کے نتیجے میں وہ خود ملک چھوڑ کر ہجرت کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس طرح کی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔

بہر حال فتوّت جیسا کہ بیان ہوا، اخوت کی ایک لازمی شرط کے طور پر حضرت شاہ ہمدانؒ کے کبروی سلسلہ میں غالب تھی اور اسی لیے اس سلسلہ کے اصحاب واحباب ایکدوسرے کو اخی یا برادر کہکر پکارتے تھے اور تمام عوام النّاس کو بھائی سمجھتے تھے۔ اخوّت وفتوّت کے حلقۂ برادری میں شامل ہونے والے، عام لوگوں کی بہبود، ان کی مدد اور دستگیری، مظلوموں اور مسکینوں کو ظالموں اور جابروں کے ظلم وستم سے آزاد کرنے کی خاطر کام کرتے تھے۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اصحابِ فتوّت کے کارناموں کو سراہا ہے اور ان کی جواں مردی اور ان کے نیک اعمال و کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ جماعت غریبوں پر نوازش کرنے اُن کو کھلانے پلانے اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے نیز مظلوموں کی دستگیری کرنے میں بے نظیر ہے۔ ان کی اصطلاح میں آخی اس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں اور تمام جوانوں کی طرف سے اُن کا رئیس مقرر ہو جائے۔ اس طریقے کو فتوّت کہتے ہیں۔ ان کے رئیس کی خانقاہ بھی ہوتی ہے جو فرش وفروش اور چراغ کی روشنی سے آراستہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جنہیں زورخانہ کہا جاتا ہے۔ پہلوانوں کا ایرانی طبقہ جوانمردی ومروّت میں وہاں خاص معروف ہے۔ زورخانہ میں مشق شروع ہونے سے پہلے پوریای ولی (یعنی پہلوان محمود) کا نام لے کر ان کی روح سے الہام لیتے ہیں، اور پھر اس کے بعد کُشتی کی مشق ہوتی ہے۔ پہلوان محمود خوارزم سے تھے اور پوریای ولی آپ کا لقب تھا۔ گلشن راز کے مؤلف محمود شبستری کے ہمعصر تھے۔ پہلوان محمود سے ایک مثنوی کنز الحقائق بھی منسوب ہے سن ۷۲۲ھ میں جب کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی عمر شریف آٹھ برس کی تھی۔ پہلوان محمود نے خیوق (خوارزم) میں وفات پائی۔

ہوتی ہے مسافروں کو جو اجنبی شہروں سے آتے ہیں خانقاہ میں ٹھہراتے ہیں اُن کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور جب تک مسافر چاہے خانقاہ میں ٹھہر سکتا ہے کسب و کار سے جو کچھ کماتے ہیں وہ خانقاہ کی بہبود کے لیے وقف ہوتا ہے ۔ میں نے دنیا بھر میں ان سے زیادہ نیک لوگ کہیں بھی نہیں دیکھے ....."[1]

فتوّت کی اہمیّت اور اس کی حقیقت نیز اخوّت کی اصلیت کے بارے میں حضرت شاہ ہمدانؒ نے اپنے ایک معروف طالبِ صادق اخی طوطی علی شاہ ختلانی کو مخاطب کر کے یوں فرمایا ہے:

".... ای عزیز! چون معلوم کردی کہ حقیقت این نوع طاعات کہ دأبِ اتقیاء و صلحا و اصفیاء و پیرایۂ اولیاء و اجباء راست از عامۂ مردم متصوّر نمی شود ۔ قسم دوم را غنیمت دان کہ بفضل خود اسباب حصول آن سعادت ترا مہیّا کردہ اند و آن احسان است با تن و مال بہ بندگان او کہ گنج عالم باقی و تخم سعادت ابدی است ۔ ازین تخم چنانکہ مینوانی بنہ، کہ در روز درماندگی بکار آید ۔ .... رسول اللہؐ فرمود کہ مومنان ہمچون یک دیوار عمارتند کہ ہر خشتی ازان خشتی دیگر را استوار میدارد ۔ ہمچنین آنانکہ از ایمان بہرہ ای دارند باید کہ در دین و دنیا معاون یک دیگر باشند و ہمہ یکدیگر را در کشیدن بار تکالیف و زحمتہای این سفر بحکم "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" مساوی دانند...."[2]

[... اے عزیز! اب جب تجھ کو معلوم ہو گیا کہ اس طرح کی اطلاعاتِ الٰہی کی حقیقت

---

[1] فارسی ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ، جلد اوّل صفحہ ۳۱۶ - ۳۱۵ ۔

[2] رسالہ فتوتیہ ۔ میر سیّد علی ہمدانی رح (قلمی نسخہ) فتوّت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ مثلاً فتوّت نامۂ سلطانی ۔ مولانا حسین واعظ کاشفی سبزواری ۔ باہتمام محمد جعفر محجوب تہران ۔ طبقات الصّوفیہ ۔ سلّمی (از پدرسن انگلستان) رسالہ الملامتیہ للسلّمی چھاپ مصر سن ۱۹۴۵ ۔ فتوت نامۂ ناصری ۔ رسالہ الفتوۃ ۔ علاءالدّولہ سمنانی رح ۔ باقی صفحہ ۱۸۵ پر)

پر عمل کرنا محض متقیوں اور صالحین اور صاف باطن بزرگوں کا طور طریقہ، اور اولیاء اللہ اور محبانِ الٰہی کو ہی کو زیب دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ عام لوگ اس طرح کی ریاضتوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اب دوسری قسم کو ہی غنیمت جان لو، جس کی سعادت حاسل کرنے کے ذرائع تجھے اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں، اور وہ سعادت ہے اسکے بندوں پر تن اور دھن سے احسان کرنا کہ یہی باقی رہنے والی دنیا کا خزانہ، اور ابدی سعادت کا بیج بونا ہے، جتنا تجھ سے ہو سکے اتنا یہ بیج بونے کی طرف متوجہ رہ، تاکہ اُس روز یہ بیج تمھارے کام آجائیں جس روز تم سے کچھ بن نہیں پڑے گا حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مومن لوگ ایک عمارت کی دیوار کی مانند ہیں، جس کی ہر ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کر دیتی ہے۔ اسی طرح سے اُن لوگوں کو جن میں ایمان ہو، چاہیئے کہ دین اور دنیا میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور سبھی ایک دوسرے کو اس سفر میں پیش آنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کا بوجھ اُٹھانے میں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ بیشک سبھی مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں ۔ کے پیش نظر، برابر جائیں ...]

فتوت کے پیروکاروں کا بنیادی کام کمزوروں اور محتاجوں کی حمایت و دستگیری تھی اور اس کام کو وہ دیہات اور شہروں میں انجام دیا کرتے تھے، بعض خاص خاندانوں میں جنہیں اصطلاحاً بیت کہتے تھے یہ مسلک موروثی تھا اور ان خاندانوں سے ہمیشہ منسلک رہتا تھا۔ اس کے علاوہ فتوت پر کاربند جوانمرد آدمی خوش و خرّم رہتا تھا اور بندگانِ خدا کا ایک شفیق ناصح اور دین و دنیا کے بھلائی کے کاموں اور اہم امور میں ان کا مددگار ہوتا تھا۔ فتوت کے اوصاف چار جانے جاتے ہیں: پارسائی، شجاعت، حکمت اور انصاف۔ اہلِ فتوت کے مرتبوں کا ایک سلسلہ ہوتا تھا اور اِن مرتبوں میں سے اہم ترین یہ تھے۔

کبیر : یہ دوسرے مراتب پر بلند درجہ تھا اور ان کا سردار مانا جاتا تھا۔

زعیم : یہ دوسروں کا کفیل ہوتا تھا اور وہ اس کی اقتدا کرتے تھے۔ اور یہ اُن کو وعظ و نصیحت اور فتوت کی فضیلتوں سے آگاہ کیا کرتا تھا۔

رفیق : وہ جماعت جو ایک ہی باپ اور خاندان (بیت) سے متعلق تھی، رفیق کہلاتے تھے۔

مسائل : جو اہلِ فتوت ایک دوسرے کے بھائی نہیں ہوتے تھے، مسائل کہلاتے تھے۔

وکیل: کبیر کا جو معاون (مددگار) ہوتا اُسے وکیل کہتے تھے۔

نقیب: زعیم کا معاون جو اہلِ فتوّت کے کاموں کی طرف متوجّہ رہتا تھا اور گویا ان کے درمیان ایک طرح کا قاضی ہوا کرتا تھا۔

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ فتوّتیہ میں فرمایا ہے کہ اخی اسی کا نام رکھا جاتا ہے جو کرم اور سخاوت اور پاکی اور امانت داری اور شفقت اور صبر و بردباری اور تواضع و تقویٰ کی صفتوں سے آراستہ ہو۔ اُسے تربیت و تعلیم کے ساتھ فتوّت کے دائرے میں لاکر خدمت بجالانے کا فریضہ سپرد کر دیا جاتا ہے اور فقر و درویشی کی کچھ چیزیں بطور خلعت اسے دی جاتی ہیں جیسے کُلاہ اور شلوار۔ کلاہ تاجِ کرامت کے طور پر اور شلوار، سترِ عورت کیلئے۔

فتوّت کے بارے میں ان مختصر سے اشارات سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ ایک باصفا جوانمرد (فتیٰ) بھی تھے اور فتوّت کے مسلک سے منسلک رہ کر خانقاہوں میں اخوّت و عالمگیر برادری کا درس بھی دیتے تھے اور اس مسلک کو اپنے مُریدوں اور طلاب میں عام کرنے سے اُنکی مراد یہ بھی تھی کہ وہ جسمانی قوّتِ برداشت کے علاوہ، تحمّلِ نفس کے صبر آزما بوجھ کو بھی اپنی آئندہ زندگی کی آسودگی کے لیے برداشت کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خود حضرت شاہ ہمدانؒ نے امراء و ملوک کی آزمائشوں کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ اُن کا اور ان کے شہروں تک کے نام لینے سے بھی چشم پوشی کی

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۸۳)

فتوت نامہ۔ نجم الدین زرکوب تبریزی؛ کتاب الفتوۃ۔ شیخ شہاب الدین سہروردی؛ کتاب الفتوۃ: اخی احمد المحب اردبیلی؛ کتاب الفتوۃ: ابوعبدالرحمٰن سلمی نیشاپوری۔ تحفۃ الاخوان = خواجہ عبداللہ انصاری۔

دوسرا باب

کشمیر میں ورود

تبلیغِ دین

خطّہ را آں شاہِ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین
(جاوید نامہ حضرت علّامہ اقبالؒ)

(۲)

کشمیر میں وُرُود تبلیغِ دِین

حضرت شاہ ہمدانؒ کے تمام سفروں[1] کی دستیاب اطّلاعات سے مرتّب تفصیلات، جن کا ذکر اگلے اوراق میں ہو چکا، کے سلسلے میں اب ہم اُن کے اہم ترین سفر کے بارے میں جو انھوں نے کشمیر میں کیے، گفتگو کریں گے۔

---

[1] تمام سفروں سے مراد ہیں وہ سارے سفر جن کا ذکر کتابوں اور تذکروں میں ہوا ہے اور جو ہمارے خیال میں ایک مکمل تذکرہ نہیں۔ چونکہ حضرت شاہ ہمدانؒ پر تحقیقی کام ایک منصوبہ بند طریقے پر نہیں ہوا ہے اور کبھی کوئی محقّق ذاتی ارادت و شوق سے اُن پر لکھنا چاہتا ہے تو مواد اور معتبر اسناد و مآخذ کی عدم موجودگی یا نارسائی کے پیشِ نظر فاضل محقّق کی تحقیق پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتی اور ظاہر وجوہات کے سبب اطّلاعات ناقص رہ جاتی ہیں۔ افسوس ہے کہ کشمیر میں مربوط مآخذ و اسناد و مواد کی مطلق عدم موجودگی کے باعث حضرت شاہ ہمدانؒ پر کوئی قابلِ ملاحظہ تحقیقی کام نہیں ہو پایا ہے۔ خدا کرے کہ محققین کو آیندہ ایسے معتبر اسناد و منابع مل جائیں جن سے حضرت شاہ ہمدانؒ کی پوری زندگی کے حالات اور کارنامے ہم پر روشن ہوں۔

کشمیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری کے بارے میں تذکروں کے بیانات متضاد ہیں۔ ذیل میں ہم معتبر دستیاب اسناد و تذکرہ ناموں سے آپ کے ورودِ کشمیر سے متعلق اطلاعات کو نقل کرتے ہیں۔

مقامی معتبر فارسی تاریخ و تذکرہ یعنی واقعاتِ کشمیر جو تاریخ اعظمی کے نام سے بھی مشہور ہے، کا فاضل مؤلف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری لکھتا ہے:

"... از برکات و عطیاتِ خاصۂ الٰہی کہ در زمانِ میمنت اقترانِ او (یعنی سلطان قطب الدین برادر سلطان شہاب الدین) فائض بہ کشمیر شد، قدوم سعادت لزوم جناب تقدس اکتساب ولایت انتساب، سیادت مرتبت، قطب الاولیاء، محبوب ربانی حضرت سید علی ہمدانی است نور اللہ مرقدہٗ، کہ در شہور سنہ ہفتصد و ہشتاد و یک نزول اجلال در کشمیر جنت نظیر فرمودہ بودند۔ تاریخ مقدم شریف او "مقدم شریف او" است۔ چنانچہ حضرت سید محمد خاوری، کہ ذکرش درین اوراق می آید، ابیاتِ شیرین تر از نبات، در بابِ قدوم آن حضرت سیدِ سادات گفتہ اند ؎

میر سید علی شہ ہمدان سیر اقلیم سبعہ کردہ نکو
شد مشرف ز مقدمش کشمیر اہلِ آن شہر از و ہدایت جو
سال تاریخ مقدم او را یابی از: مقدم شریف او

بہ تحقیق پیوست کہ از رفقاء و سادات و خدمہ قریب ہفتصد کس ہمراہ آنجناب بودند و خاص و عام این ولایت را بارشاد و ہدایت رہنمائی نمودند۔ فروکشِ آنجناب، در محلۂ علاء الدین پورہ در رباطی کہ در آنجا بود، شد و برای خمس الاوقات بر لبِ دریای بہت صفہ مربعی کہ الحال خانقاہ فیض پناہ است، آراستہ بودند و آنجا نماز می خواندند۔ و سلطان بہ اخلاق درست بہ خدمت خدام عالی مقام می رسید و آداب ارادت

و محبت بجا می آورد و نصح و نصایح از آن جناب شنیده بکار می برد ، چنانچه عقد دو خواهر، که بنا بر جهالت معاً به نکاح آورده بود، برهم زد. چون علم شریعت محمدی صلی اللّٰه علیه وسلّم درینجا هنوز ....

....کمتر داشت و مسلمان هم کمتر، و احکام اسلام و شریعت هنوز بخوبی شایع نه شده بود و سلطان هم لباس کفره می پوشید، آن را به امر و نهی حضرت سیّد ترک داد، و اوامر آن حضرت را بدل و جان بجا آورد. جناب حضرتِ سیادت دستگاه قطب اولیاء، باشاه قطب الدین از راه کمال لطف و کرم کلاه مبارک عطا فرموده بودند، سلطان آداب قبول آن بجا آورده در تاج خود تعظیماً و تکریماً نهاد و این سنّت و برکت تا آخر سلطنت فتح شاه در اولاد ایشان بود و فتح شاه آن را در کفنِ خود بپیچید و برد. خدمت مولانا محمد آنی علّامه و عارف روزگار بود گفت که برکت و سلطنت را زیر زمین بُرده، بعد آن پادشاهی اولاد قطب الدین خلل پذیرفت تا رفته رفته به حدّی رسید که انتقال به قوم چکان نمود چنانچه این مذکورات به تقریب مشروحاً به محل خود مرقوم می شود. در تواریخ قدیمه قدوم مبارک آن حضرت را در هفتصد و هشتاد و یک و مراجعت در هشتاد و شش نوشته اند اما کسی قائل نیست باین که آن جناب پنج شش سال در کشمیر توقف کرده باشند. پس عقل حکم میکند به تعدّد قدوم. چنانچه مشهور است که سه سال این بلده را از مقدم مبارک مشرّف کردند و سیر سه باره ربع مسکون آن حضرت مؤید این معنی است و قاضی ابراهیم ولد حمید الدین که قریب باین عهد بود در تاریخ خود این معنی را نوشته علی ای حال بالای صفه و جائی که این وقت حجرهٔ خاص است اکثر اوقات سکونت میفرمودند. و میگویند که تجلی ذاتی درآن مشرف بودند. چون قصد رحلت ازین شهر فرمودند بالتماس سلطان قطب الدین، مولانا محمد قاری را که همراه بودند حکم اقامت فرمودند. چون بسواد کنر رسیدند ندای یا ایّتها

اَلنَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي اِلٰی رَبِّكِ" بگوش رسیده مرغ روح ولایت بخش ایشان، بسایهٔ عرش اللّٰه پرواز نموده اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ، سنهٔ هفتصد وهشتاد وشش، ششم ذی الحجه۔ چون وقتِ انقطاعِ نفس بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ بر زبان مبارک رانده بودند، همین تاریخ شد۔ شیخ محمد سرائی که از صلحای وبلغای وقت بود، چنین گفت ــ قطعهٔ تاریخ؛

مفخرِ عارفان شهِ همدان ۔ کز دمش، باغِ معرفت بشگفت :: مظهرِ نورِ حق، که رویش را ۔ عاقبت، از جهانیان بنهفت
عقل تاریخِ سالِ رحلت او؛ "سیدِ ما علیِ ثانی" گفت

درمیانِ مردم کشمیر واهلِ طالقان ووالیِ پهکلی که سلطان محمد بود، بجهت دفن نزاع شده۔ هر طائفه بجانب خود میخواستند بعد غسل وجنازه، شیخ قوام الدین بدخشی که از محرمانِ خاص وملازمانِ با اختصاص بود گفت از هر قوم کسی که تابوت مبارک را تواند برداشت بآن طرف ببرند۔ هر کدام سعی کرده بودند وکسی نتوانست برداشت مگر شیخ قوام الدین که تنها متحمل شده۔ بنابر آن ملازمان نعش مبارک را از راه کنر وکوهستان چرار به ختلان بردند وپنجم شهر جمادی الاُخری دفن نمودند وآنجا زیارت گاه عالم وعالمیان ساختند۔ وعلمی که از حضرت شیخ محمد از کانی نزه تا وقت اجازت یافته بودند وچند بار درحرمین همراه حضرت میر رسیده درکشمیر وقت سفر لدی ماگری را علمداری فرموده بودند چون واقعهٔ ناگزیر آنحضرت شد ملک دیوی گنائی سعی کرده باتفاق لدی ماگری علم را بکشمیر آوردند وبر صفه که الحال حُجرهٔ خاص است، گذاشتند سلطان قطب الدین واکثر اعیان برای زیارت بر آن صُفه می آمدند۔ درعرض راه کتابخانهٔ آنحضرت باز مانده برای آوردن مولانا احمد بالتماس سلطان فرستادند۔ ذکر کمالات ظاهری وباطنی حضرت امیر از غایتِ شهرت احتیاج ندارد بلکه کمالِ جرأت است۔ کیفیت بنای خانقاه معلی را درثمرات شرح وبسط داده ودرین کتاب هم درمواقع خود مرقوم شود۔ از بار که عباذتگاه خمس الاوقات آنجناب شده معمور وزیارتگاه خاص وعام

است وحال مکرّر بہ تجدید بنا شدہ و تعمیر یافتہ، واز نوادر امکنہ این شہر است ے

بر زمینی کہ نشانِ کفِ پای تو بود   سالہا قبلۂ صاحبنظران خواہد بود

نسب حضرتِ امیر کبیرؒ بدین موجب است: جناب امیر کبیر ابن میر شہاب الدین ابن میر سیّد محمد ابن سیّد علی ابن سیّد یوسف ابن سیّد شرف الدّین ابن سید محبّ اللہ ابن سیّد محمد ثانی ابن سیّد جعفر ابن سیّد عبد اللہ ابن سیّد محمد اوّل ابن سیّد علی ابن سیّد حسن ابن سیّد حسین ابن سیّد جعفر الحجہ ابن سید عبد اللہ زاہد ابن سیّد حسین ابن امام ہمام زین العابدین علی ابن الحسین السّعید الشہید رضی اللہ تعالیٰ عنہم[1]۔۔۔۔"

(اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات و برکات سے اس بادشاہ (سلطان قطب الدین) کے سعادت سے لبریز عہد حکومت میں کشمیر جس چیز سے فیض یاب ہوا وہ تھی تشریف آوری جناب تقدس مآب، ولایت پناہ، سید والامرتبہ، قطب الاولیاء، محبوب یزدانی حضرت شاہِ ہمدان کی، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پاک کو نورانی رکھے۔ جو سال سات سو اکیاسی کے مہینوں میں، کشمیر جنتِ نظیر میں اپنی بر تر شان و شوکت کے ساتھ ٹھیرے تھے۔ آپ کے کشمیر میں قدم مبارک کے داخل ہونے کی تاریخ "مقدمِ شریف او" (آپ کے قدوم مبارک کی تشریف آوری) سے نکلتی ہے۔ چنانچہ حضرت سیّد محمد خاوری جسکا ذکر اس کتاب کے اوراق میں (آگے) آئے گا، نے قند و نبات سے بھی زیادہ شیریں اشعار میں حضرت سیّد سادات کی تشریف آوری کے بارے میں کہا ہے۔

---

[1] حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں فارسی میں لکھی گئی تواریخ اور تذکروں میں معتبر ترین تاریخ و تذکرہ کشمیر، واقعات کشمیر (تاریخ اعظمی) ہے جس کی پیروی میں نہ صرف بعد کی فارسی تاریخیں لکھی گئی ہیں بلکہ اسی تاریخ سے بہت کچھ اُن میں نقل ہوا ہے۔ میں نے حضرت شاہ ہمدانؒ سے متعلق اس تاریخ و تذکرہ سے پوری عبارت نقل کی ہے۔ علاوہ اس عبارت کے حضرت امیر کبیرؒ کے بارے میں اور کوئی اطلاع اس معتبر تاریخ میں درج نہیں ہے۔ یہ ساری عبارت میں نے اس لیے بھی نقل کی کہ چونکہ یہ تاریخ سال ۱۹۳۶/۱۳۵۵ھ میں چھپی ہے اور اب بالکل ناپید ہے اس لیے یہ عبارت آئندہ کے محققین کے لیے کارآمد ہوگی۔

میر سیّد علی شاہِ ہمدان ۔ جنہوں نے سات اقالیم کی سیاحت خوب کی ہے کی تشریف آوری سے کشمیر مشرّف ہوا ۔ اور اِس ملک کے لوگ اُن سے ہدایت یافتہ ہوئے آپکی تشریف آوری کی سالِ تاریخ ۔ "آپ کی تشریف آوری" سے ڈھونڈ لو
تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ سادات اور رفقا اور خدّام کی سات سو انراد پر مشتمل ایک جماعت آپ کے ساتھ تھی اور اِس ملک کے خاص و عام کو ارشاد و ہدایت سے رہنمائی فرمائی ۔ آپ کا قیام محلہ علاء الدین پورہ میں واقع ایک سرائے میں رہا اور آپ نے پانچوں اوقات گذارنے کی خاطر دریائے بہت (جہلم) کے کنارے پر ایک مربّع صُفہ، جواب خانقاہ فیض پناہ ہے ۔ بنوایا اور وہاں نماز ادا فرماتے تھے سُلطان دُرست نیّت اور خلوص کے ساتھ خدام علی مرتبہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور عقیدت و محبّت کے آداب بجا لاتا تھا اور حضرت عالی کی زبان سے پند و نصائح سن کر ان پر عمل پیرا ہوتا۔ چنانچہ آپس کی دو بہنوں کے ساتھ اس نے لاعلمی کی وجہ سے جو نکاح کیا تھا اُسے توڑ دیا۔ چونکہ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ابھی یہاں کمتر تھا، مسلمان بھی کم تھے، اسلام اور شریعتِ اسلام کے احکام بھی اچھی طرح سے نہیں پھیلے تھے اور بادشاہ بھی کافروں کا لباس پہنتا تھا تو حضرت سیّد کے امر و نہی سے اس نے ایسا کرنا چھوڑ دیا اور حضرت عالی کے احکام کی اس نے دل و جان سے تعمیل کی ۔ حضرت سیادت مآب قطب الاولیاء نے سلطان قطب الدین کو اپنے کمالِ لطف و کرم سے اپنی کلاہ مبارک عنایت فرمائی ۔ سلطان نے اس کو قبول کرنے کے تمام آداب بجا لاکر اسے عزت و احترام کے ساتھ اپنے تاج میں رکھ دیا اور یہ روایت و برکت اس کی اولاد میں سلطان فتح شاہ کے عہد تک قایم رہی ۔ فتح شاہ نے اسے اپنے کفن میں لپیٹ کر اور اپنے ساتھ قبر میں لے گیا حضرت مولانا محمد آنی نے، جو

رلے زر بہ تحقیق پیوست کہ از رفقاء و سادات و خدمہ قریب ہفتصد کس ہمراہ آنجناب بودند..."
تحقیق سے یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ آنجناب کے ساتھ ان کے رفقاء خدماء اور سادات کی سات سو افراد پر مشتمل جماعت تھی ...." (واقعات کشمیر)

اس زمانے کے علامہ اور عارف باللہ نے کہا کہ سلطان (فتح شاہ) سلطنت اور برکت دونوں چیزیں اپنے ساتھ دفنا چکا چنانچہ اس کے بعد سلطان قطب الدین کی اولاد کی بادشاہت میں فتور پیدا ہوا یہاں تک کہ سلطنت (کشمیری) چکوں میں منتقل ہوگئی مناسب مواقع پر تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر (اس کتاب میں) ہوگا۔ قدیم تواریخ میں حضرت عالی کی تشریف آوری سال سات سو اکیاسی اور واپسی (سات سو) چھیاسی میں لکھی ہے لیکن اس کا کوئی قائل نہیں کہ حضرتِ عالی نے کشمیر میں بیک وقت پانچ چھ سال گذارے ہوں گے۔ اس لیے عقل چند بار کی تشریف آوری کو باور کرتی ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ آپ نے تین سال اس ملک کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا حضرتِ عالی کے رُبع مسکون کی تین بار سیاحت کرنے کی حقیقت کی تائید کرتا ہے اور قاضی ابراہیم فرزند حمید الدین، جو اس عہد کے قریب تھے، نے اپنی تاریخ میں اس حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال صُفّہ پُر جو اس وقت حُجرۂ خاص ہے اکثر اوقات سکونت فرماتے تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ذاتی تجلی سے وہاں مشرف نہیں تھے (یعنی حجرۂ خاص میں اُن کی محض جلوہ گری ہوتی تھی جبکہ ذاتاً خود سرائے علاءالدین پورہ میں قیام پذیر تھے) جب آپ نے اس ملک سے واپسی کے سفر کا ارادہ فرمایا تو سلطان قطب الدین کی استدعا پر مولانا محمد قاری کو، جو آپ کے ہمراہ تھے، یہاں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ جب کنر سواد میں پہنچے تو "اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کے (جوارِ رحمت) کی طرف چل[1] کی ندائے حق سُنی اور آپ کی ولایت بخش روح مقدس عرشِ الٰہی کے سایہ میں رہنے کی خاطر پرواز کر گئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ (بیشک ہم سب اللہ کے ہیں اور ہم کو اُسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے) یہ ذی الحجہ کی چھ تاریخ تھی اور سال سات سو چھیاسی تھا۔ سانس کے منقطع ہونے کے وقت چونکہ آپ کی زبان مبارک پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تھا، تو یہی ان کی تاریخ وفات قرار پائی۔ شیخ محمد سرائی نے جو اس وقت کے صالحین اور فصیح

---

[1] سورۂ فجر۔ آیت ۲۸۔

زبان علماء میں سے تھے، قطعۂ تاریخ یوں کہا ؎
عارفوں میں قابلِ افتخار شاہِ ہمدان — جن کے سانس کی برکتوں سے معرفت کا باغ کھل اُٹھا
وہ نورِ الٰہی کے مظہر تھے اور انھوں نے اپنا چہرہ۔ بالآخر دُنیا کے لوگوں سے چھپا دیا
عقل نے انکی رحلت فرمانے کی سالِ تاریخ —" ہمارے پیشوا علی ثانی" کہا؛

کشمیر کے لوگوں اور طالقان کے رہنے والوں اور پکھلی کے بادشاہ جس کا نام سلطان محمد تھا، کے درمیان دفن کے معاملہ پر جھگڑا ہوگیا۔ ہر کوئی اپنے مُلک میں ہی دفنانے کا خواہاں تھا۔ غسل اور جنازہ کے بعد شیخ قوام الدّین بدخشی، جو خاص الخاص محرمانِ اسرار اور ملازمین میں سے تھا، نے کہا جس جگہ کا جو کوئی صاحب تابوت مبارک کو اٹھا سکے وہ وہاں لے جائے۔ ہر ایک نے اٹھانے کی کوشش کی لیکن کسی سے اٹھ نہ سکا سوائے خود شیخ قوام الدّین کے جس نے تنہا تابوت شریف کو اٹھا لیا۔ اس لیے ملازمین و خدّام نعش مبارک کو کنر سواد اور کوہستان چترار کی راہ سے ختلان لے گئے اور جمادی الآخر کی پانچ تاریخ کو دفن کیا اور اُس جگہ کو اہل عالم کی زیارتگاہ بنا دیا۔ جو علم آپ نے شیخ محمد اذکانی سے اجازت لیتے کے وقت تبرّک کے طور پر حاصل کر لی تھی اور حضرت امیرؒ کئی بار اسے حرمین شریفین کی زیارت کرنے وقت ساتھ لے گئے تھے اور کشمیر سے واپسی کے سفر پر جس کی علمداری کو آپ نے لدی ماگرے کے سپرد کر دیا تھا، تو حضرت عالی کے اس ناگزیر واقعہ (یعنی وفات) کی وجہ سے ملک دیوی گنائی کی کوششوں سے اور لدی ماگرے سے متّفق ہو کر دونوں اس علم شریف کو کشمیر لے آئے اور اس صفہ میں رکھ دیا جواب آج کل حُجرۂ خاص ہے۔ سلطان قطب الدین اور اس کے اکثر و بیشتر امراء اس کی زیارت کے لیے وہاں آتے تھے۔ راستے میں حضرت عالی کا کتابخانہ پیچھے رہ گیا تھا۔ مولانا احمد کو سلطان کی درخواست پر اُسے لانے کے لیے بھیجدیا گیا۔ باقی حضرت امیرؒ کے ظاہری اور باطنی کمالات حد سے زیادہ مشہور ہیں اس لئے انکے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ایسا کرنا تو بڑی جسارت ہوگی۔ خانقاہِ معلی کی تعمیر کی کیفیت کو میں نے شرح و تفصیل کے ساتھ ثمرات نامی اپنی تالیف میں لکھدیا

ہے اور اس کتاب میں بھی اپنے مواقع پر اس کا تذکرہ ہوگا۔ جب سے یہ حضرت عالی کے پانچوں اوقات کی عبادتگاہ بن گئی تب سے آباد ہے اور خاص و عام کی زیارتگاہ، اور بھی تک کئی بار نئے سرے سے بنی ہے اور تعمیر پا چکی ہے۔ اور اس ملک کی نادر عمارات میں سے ہے ؎

جس زمین پر آپ کے نقش قدم ہوں۔ وہ سالہا سال تک صاحبِ نظر لوگوں کی سجدہ گاہ ہوگی

حضرت عالی کا نسب نامہ یہ ہے: حضرت امیر کبیر فرزندِ امیر شہاب الدین فرزند میر سیّد محمد فرزند سیّد علی فرزند سیّد یوسف فرزند سیّد شرف الدین فرزند سیّد محب اللہ فرزند سیّد محمد ثانی فرزند سیّد جعفر فرزندِ سیّد عبداللہ فرزند سیّد محمد اوّل فرزند سیّد علی فرزند سیّد حسن فرزند سیّد حسین فرزند سیّد جعفر الحجہ فرزندِ سیّد عبداللہ زاہد فرزند سیّد حسین فرزند امام ہمام زین العابدین علی فرزند حسین السعید الشہید رضی اللہ تعالیٰ عنہم ....."

تاریخ حسن کے مولف نے لکھا ہے کہ "..... مریدوں اور متعلقین کی ایک بڑی جماعت کو ساتھ لے کر کشمیر کی طرف کوچ فرمایا۔ ماہ ربیع الاوّل ۷۷۴ھ میں شہاب الدین پورہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ سید محمد خاوری نے کشمیر میں ورود فرمانے کی تاریخ لکھی:

میر سیّد علی شہ ہمدان — سیرِ اقلیم سبعہ کردہ نکو
شد مشرّف ز مقدمش کشمیر — اہلِ آن شد از و ہدایت جو
سالِ تاریخ مقدمِ او را — گفتم از مقدمہ شریف بجو

مصنف وقایع کشمیر[1] لکھتے ہیں کہ حضرت امیرؒ کے کشمیر کو مشرّف فرمانے کے دنوں[2] میں سلطان

---

[1] وقائع کشمیر مؤلفہ علامہ احمد جو سلطان زین العابدین کا درباری شاعر اور مورّخ تھا۔ یہ تاریخ دراصل سنسکرت میں لکھی ہوئی "تاریخ رتناکر پوران" کا ترجمہ ہے جس میں پانچ ہزار سال پہلے ۳۵ بادشاہوں اور مزید سات بادشاہوں کا ذکر ہے جنہوں نے دوسری صدی کے اختتام سے چھٹی صدی عیسوی تک کشمیر پر حکومت کی۔ یہ ذکر دراصل تاریخ کشمیر میں بہر سے (باقی اگلے صفحے پر)

شہاب الدین پانچ لاکھ سوار اور پیدل سپاہی لے کر ہندوستان فتح کرنے کے ارادہ سے نکلا تھا۔ حضرت سیّد تاج الدّین اور سیّد حسن بہادر لشکر کے ہمراہ تھے اور یہاں سلطان قطب الدّین قائم مقام سلطنت تھا۔ سلطان قطب الدّین نے بڑی شان وشوکت اور کمال عزت وعقیدت سے حضرت امیرؒ کا استقبال کیا اور سید تاج الدین کی کوٹھی میں جو شاہی محل کے متصل تھی بٹھایا۔ مہمان نوازی اور خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ حضرت امیر کبیرؒ نے گلزار کشمیر کے سبزہ و تماشا میں تقریباً چار مہینے صرف کیے۔ پھر حرمین شریفین (مکہ و مدینہ) کی زیارت کے ارادہ سے ہندوستان کے راستے کوچ فرمایا۔ فیروز پور پہنچ کر سلطان شہاب الدّین اور سیّد تاج الدین کے ساتھ ملاقات کی کچھ دنوں کے بعد وہاں سے چل کر فیروز شاہ بادشاہ دہلی کی فوج میں پہنچے اور دونوں سلطنتوں کے درمیان جھگڑے کو دور کر کے صلح کی تجویز پیش کی۔ دونوں بادشاہوں کے اعلیٰ نمائندے ایک جگہ جمع ہوئے۔ ملک کی سرحدوں کے حدود کا تعین کیا اور طرفین کے عہد نامے تحریر ہوئے۔ عہد وپیمان اور دوستانہ تعلقات کے استحکام کے لیے فیروز شاہ کی لڑکیاں سلطنت قطبؒ الدّین اور سید حسن بہادر کے ساتھ بیاہی گئیں۔ سلطان شہابؒ الدّین نے جناب حضرت امیرؒ کو اسی جگہ سے واپس کشمیر تشریف لانے کے لیے عاجزانہ التجا کی۔ حضرت نے حرمین شریفین کی خواہش کے موجب سلطان کی درخواست منظور نہ فرمائی اور فرمایا کہ وہاں سے واپسی پر بشرط زندگانی کشمیر آؤں گا۔ جناب حضرت امیرؒ وہاں سے سیّد تاج الدین اور سید حسن بہادر کو ساتھ لے کر قصبہ سامانہ میں سید حسین کی ملاقات کو گئے جو کئی برسوں سے وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور سید حسین کو کشمیر آنے کی ترغیب دی۔ جس دن جناب حضرت

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) موجود ہی نہ تھا۔ اس لیے اس لحاظ سے یہ تاریخ بہت اہم ہے۔ تاریخ حسن کے مؤلف کو اس تاریخ کا نسخہ مل گیا تھا جس کا وہ اوپر حوالہ دے رہے ہیں۔ یہ میں نے کتاب سے انہی الفاظ میں عیناً نقل کیا ہے جیسے کہ عبارت میں درج ہے ملاحظہ ہو: اردو ترجمہ تاریخ حسن جلد سوم تذکرۂ اولیائے کشمیر موسوم بہ اسرار الاخیار۔ غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج رنبیر گنج بازار۔ چھاپ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء صفحات ۱۰-۱۱:

امیرؒ فیروز پور سے حرمین کی طرف عازم ہوئے۔ اُسی دن سید حسین سمنانی، سیّد تاج الدین کے ساتھ کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ مراسم حج کی انجام دہی اور عرب کے اطراف واکناف کی سیر کے بعد جناب حضرت امیرؒ نے ہندوستاں کے راستے سے آکر ۷۸۱ھ کے اوائل میں دوسری دفعہ اس دلپذیر خطہ کو اپنے مبارک قدموں سے تازگی بخشی۔ آپ کے ہمراہ سات سو سے زیادہ سیّد اور عالم تھے۔ محلہ علاؤالدین پورہ کی اس مسجد میں جو خانقاہِ معلّی کے متصل ہے، ڈیرہ ڈال دیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو سلطان قطب الدین کی کاروانسرائے میں جگہ دلوادی۔ دوسری دفعہ کشمیر کو منور فرمانے کی تاریخ یہ ہے:

شکر کز مقدم امیر کبیر　　باغ کشمیر ہمچو گُل بشگفت
ہاتفِ غیب سال مقدم او　　آمد اینجا علیِ ثانی گفت

جس جگہ موجودہ حجرۂ خاص ہے اسی جگہ اپنا خیمہ لگوا کر دو چلّے خلوت میں گذارے اور ذات الٰہی کی تجلیات سے مشرف ہو گئے۔ نماز جمعہ اور پنجگانہ نمازیں باجماعت اسی جگہ پڑھا کرتے تھے۔ سلطان قطب الدین پورے اخلاص سے حضرت امیرؒ کے خادموں کی خدمت گذاری بجالاتے تھے۔ حضرت امیرؒ سے بیعت کر کے مریدوں کے زمرے میں شامل ہو گئے اور حضرت امیرؒ کی تعلیم و تربیت سے باطنی صفائی حاصل کی اور جو بُری عادت اور رسمیں اس کو لگ گئی تھیں حضرت کے فرمانے سے انھیں چھوڑ دیا...... مختصر یہ ہے کہ جناب حضرت امیرؒ نے اڑھائی برس تک اس ملک کی سیر و سیاحت کی اشاعت دین اسلام اور بدعتوں کو دور کرنے میں گذارے کشمیریوں کے دل گرویدہ بنا کر انہیں دائرۂ اسلام میں لے آئے..... ۷۸۳ھ میں تبت اور ترکستان کی سیاحت کی خواہش سے کشمیر سے روانہ ہوئے تین برس تک ان ملکوں میں دین و اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ بلتستان، لداخ، کاشغر، ختن، ہُنگان اور چی وغیرہ کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے شہر افسوس میں اصحاب کہف کے غار کی زیارت سے مستفید ہو گئے ۷۸۵ھ میں پھر کشمیر کو رونق بخشی۔ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین کو ترویج دی۔ ہر شخص کو احکام شریعت کی پابندی کرنے کی تنبیہہ کی۔ اسلامی رسموں کو اس ملک میں جاری کیا اور اوراد فتحیہ روزانہ بلند آواز سے پڑھنے کی عام اجازت دی۔ ۷۸۶ھ میں پکھلی

تشریف لے گئے۔ رجب کنر سواد کے ملک میں پہنچے ۶ر ماہ ذی الحجہ کو اس جہان فانی کو الوداع کر کے ملک جاودانی کو سدھارے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سانس بند ہو گئی چنانچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے عدد ۷۸۶ھ تاریخ وفات ہے۔ مؤلف حسن کی طبع زاد تاریخ ہے:

جناب سیادت امیر کبیر　　چو در باغ جنت شد آرام گیر
حسن سال مولود و عمر و وصال　　درین بیت ہر سہ بگفت ای فقیر
سنِ باسط ۷۲ در رحمت اللہ ۷۱۴ ظہور　　قضا و پیر کامل امیر کبیر ۷۸۶ "

ان کے انتقال پر کشمیر اور طالقان اور سلطان محمد خان والی پکھلی کے درمیان "تدفین کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ ہر طائفہ چاہتا تھا کہ ان کی نعش مبارک اسی فرقہ کے ملک میں سپردِ خاک ہو۔ اسی ضمن میں شیخ قوام الدین بدخشی نے فرمایا کہ غسل دینے اور کفن پہنانے کے بعد جو فرقہ تابوتِ مبارک کو اٹھائے گا وہ اسے اپنی طرف لے جائے گا لوگوں نے حد درجہ کوشش کی اور کوئی تابوت کو ہلا نہ سکا۔ شیخ قوام الدین بدخشی آگے بڑھے اور تابوت کو اٹھایا اور ختلان پہنچا کر ۵ر جمادی الثانی ۷۸۷ھ کو نعشِ مبارک سپردِ خاک ہوئی۔ جو جھنڈا حضرت امیر کبیر رح نے شیخ محمد ازکانی سے اجازت کے وقت حاصل کیا تھا اور کئی بار حرمین شریفین کے سفر میں انکے ساتھ تھا اور کشمیر سے واپسی پر لدی ماگری کو اس کا علمبردار بنایا تھا اس پھریری کو معہ ڈنڈے کے اور عصائے شریف کو تلاش کر کے دیلوی گنائی اور لدی ماگرے کشمیر لے آئے اور ان تبرکوں کو اس چبوترے پر جس پر حجرہ خاص تعمیر کرانے کا خاکہ ڈالا گیا تھا رکھ دیا۔ تمام لوگ اور سلطان قطب الدین اور اسکے وزیر امیر اسی جگہ ان کی زیارت کو آتے تھے۔ اس وقت سے یہاں کے لوگ اس حجرے اور ان تبرکوں کو اجابتِ دعا کی جگہ اور فیض و برکت کا وسیلہ جانتے ہیں[1]"

---

[1] تاریخ حسن (جلد دوم) میں بھی وقایع کشمیر کا حوالہ دیا گیا ہے اور بعد میں کم و بیش تقریباً یہی اطلاع حضرت امیر کبیر رح کے کشمیر میں ورود کے بارے میں درج ہے۔ البتہ وقائع کشمیر کے مؤلف ملا احمد کے حوالے سے ہی لکھا ہے کہ حضرت امیر رح نے چھ ماہ کا عرصہ کشمیر میں گذارا۔ (باقی آگے)

نظم المناقب کے مولف کا بیان ہے کہ:

"...... خواجہ اسحاق اور قوام الدین بدخشی بیان کرتے ہیں کہ بیرجہاں کی تبلیغی عمل سے فراغت پا کر حضرت امیر کبیرؒ ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور جاجرہ کے حدود میں آکر وہاں رات کو ٹھہرے۔ قوام الدین اور دوسرے تابعین ہمراہ تھے۔ کھانا کھا کر سب راستے کی تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے سوائے بانیِ مسلمانی حضرتِ میر سیّد علی ہمدانیؒ کے جو سفر اور حضر میں زمین پر پہلو نہیں رکھا کرتے تھے۔ قبلہ رو ہو کر، تنہا اور اغیار پر دروازہ بند کیے، مراقبہ کی حالت میں تھے کہ حضرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ میں ملاقات ہوگئی۔ سرورِ دینؐ نے آپ سے فرمایا کہ کشمیر کی طرف روانہ ہو جائیے اور وہاں کے امور کو آراستہ کیجئے۔ کشمیر ایک ظلمت سرائے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہاں جا کر سبھوں کے دلوں سے کفر کے زنگ کو ہٹائیے اور کلمہ طیّبہ کو سب کی زبان پر جاری کروا کر ان کے دلوں کو روشنی سے بھر دیجئے۔ اگرچہ کچھ لوگ دین اسلام کے گرویدہ ہیں لیکن وہ کفّار سے بھی بدتر ہیں اور فقط نام کے اہل دین ہیں۔ وہ مشرک ہیں اور کافروں سے بھی پست۔ انکی زبانوں پر کلمہ طیّبہ تو ہے لیکن جنیو (زنّار) بھی باندھتے ہیں اور بموجب نصِّ قرآن مشرک نجس ہیں"۔ دوسرے دن صبح کو آپ نے کشمیر کی طرف روانگی کا اعلان فرمایا، احباب و اصحاب نے عرض کیا کہ حضرت

(بقایا حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور سال ۸۲ء کے اوائل میں تبت کی طرف عزیمت فرمائی جب کہ اوپر کی عبارت (اردو ترجمہ جلد سوم) میں چار ماہ کا عرصہ لکھا ہے۔ جلد دوم (فارسی) میں مختصر تذکرہ درج ہے جب کہ جلد سوم (اُردو ترجمہ) میں تفصیل وہی ہے جو اوپر نقل ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ حسن مولفہ پیر غلام حسن کھویہامی جلد سوم طبع ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ جموں کشمیر گورنمنٹ سری نگر سنہ ۱۹۵۰ء۔

سنا ہے کہ کشمیر کا راستہ کٹھن ہے اور راہ چلنے والوں کے لیے بڑے خطرات ہیں نیز وہاں کے مشرک و کفار مُردار خور ہیں۔ حضرت سیّد نے فرمایا کہ آج رات میرے جدّ بزرگوار صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں مجھ پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا کہ "میرے فرزند! کشمیر کی راہ اختیار کرو۔ وہاں جانا ہندوستان سے بہتر ہے اس لیے کہ وہاں کے لوگ بے دین ہیں کُفر کے تابع ہیں بدعتوں کے پرستار ہیں اس لیے تم اُن سب کو دینِ اسلام کی طرف ہدایت دو اور خُدائے واحد کی طرف انھیں راستہ دکھا دو۔ راہ طریقت میں اُن کا مرشد، اور حقیقت کی طرف اُن کا راہبر ہو جا"۔ اس لیے کوئی چارہ نہیں خواہ راستہ کتنا ہی دشوار گذار ہو۔ بندہ آقا کے حکم کی تعمیل کے لیے آمادہ ہے۔ تو حضرت مُرشد پاک ضمیرؒ کے امر سے ہم کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ ایک شیر نمودار ہوا جس نے ہمیں آگے بڑھنے کے لیے راستہ نہیں چھوڑا۔ حضرت سیّدؒ نے احباب و اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ جو ہم کشمیر جا رہے ہیں اللہ و رسولؐ کے حکم سے جا رہے ہیں۔ اس حکم کی تعمیل کرنے سے ہم سب کو کوئی چارہ نہیں بلکہ آپ سب کو اب اپنا وطن چھوڑنا ہوگا اور سختیوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ حضرت سیّد کی یہ گفتگو ابھی جاری تھی کہ شیر خود راستے سے اٹھ کر چلا گیا اور دُور جا کر نظروں سے اوجھل ہوا۔ دورانِ گفتگو ہم نے عرض کیا کہ حضرت! یہ راستے کے درمیان میں شیر کا آکر بیٹھنا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ حضرت سیّد نے فرمایا کہ یہ شیر وہاں کا ایک دیو جادوگر ہے جو شراب کے تین سیر، ایک آدمی اور روٹیوں سے بھرا ایک ٹوکرا ہر روز اپنی غذا مانگتا ہے۔ گویا اپنے خیال میں ہم میں سے کسی کو چھین لینے کے لیے آیا تھا لیکن ہمیں دیکھ کر فرار کر چکا۔ اب ہمارے وہاں پہنچتے ہی اسلام قبول کرے گا ہمارا مرید اور خادم بن کر سعادت مند بن جائے گا۔ جب ہم اس ملک میں پہنچے تو ہم نے وہاں اسلام کا نام تک نہیں پایا۔ اسلام کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔

شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف بُتکدے ہی بتکدے نظر آئے۔ راستے میں آتے آتے جو دیو ہمیں دکھائی دیا تھا وہ سخت ہیبت ناک صورت میں ایک بتخانے میں نظر آیا، مجھے حکم ہوا کہ اے قوام الدین! اس بتخانے میں ہنگام کے ساتھ اذان دو۔ میں نے اذان دی اور ایک شخص جناب حضرت سیّد کی خدمت عالی میں آیا اور کہا: "اے شاہ! آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے ان اطراف میں باعث رنج و ملال ہے اور موجب خوشی نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہو گا اگر آپ کسی اور ملک میں چلے جائیں"۔ یہ سُن کر حضرت امیر کبیرؒ کا جلال کِھل اٹھا اور جوش و خروش کے ساتھ اُس پر نگاہ ڈالی۔ وہ آدمی فوراً ہی قدموں پر گر پڑا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو کر مسلمان ہو گیا۔ حضرت سیّد کی عقیدت و ارادت میں اس نے اُن کی خادمی اختیار کر لی وہاں ایک صُفہ کی تعمیر ہوئی اور اب جو بھی وہاں آتا تھا مسلمان ہو جاتا تھا اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر اپنا ایمان محفوظ کر لیتا تھا۔ یہ ملک کُفر کا مسکن تھا۔ حضرت شاہ نے اسے دین آباد بنا دیا۔ شہر کے لوگ خاص و عام سب دین اسلام سے مشرّف ہو گئے وہاں کا بادشاہ بھی حضرت سیّدؒ کا مُرید صادق ہو کر آپ کی غلامی کے اہل بن گیا۔ کچھ عرصہ تک قیام پذیر رہنے کے بعد جناب حضرت امیرؒ نے پھر سے سفر کا ارادہ فرمایا اور کشمیر سے اپنے ملک واپس جانے کی تیاری کی۔ بادشاہ کشمیر نے بڑی منتیں کیں کہ رک جائیں لیکن حضرت شاہ نے اس کی استدعا کو قبول نہیں کیا اور وہاں مزید ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوئے۔ سفر میں اب کنڑ سواد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہنچے تو حضرت سیّد پر کمزوری کی حالت طاری ہوئی۔ یہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا کہ حضرت سیّدؒ خلوت گاہ میں تنہائی میں رہے۔ اور اسی خلوت میں ان کی علالت کا آغاز ہوا۔ ظہر کے وقت یہ علالت شروع ہوئی۔ آپ ایسی علالت حاوی ہوئی کہ چلنے سے قاصر ہو کر بستر پر بھی لیٹے رہے۔ پانچ دن تک سخت علیل رہے اور کوئی دانہ پانی تناول

نہیں فرمایا۔ بدھوار کی شب کو عشاء کی نماز کے وقت سب احباب و اصحاب کو بلا کر وصیت فرمائی کہ ہمیشہ نفس سے الگ رہ کر اللہ تعالیٰ کی ذکر میں مشغول رہنا۔ اوقات نماز کی حفاظت کر کے اورادِ فتحیہ سے مدد لینا۔ جو بھی کوئی میرے ساتھ رہا میں اس سے چاہوں گا کہ مجھے معاف کرے۔ میرے ساتھیوں اور میرے احباب و اصحاب میں سے ہر کوئی ایک سال تک میرے مزار کا مجاور رہیگا اور مجھے دعا کرتا رہے گا۔ اب میری قربت سے دور ہو جانے میں بہتر یہی ہے کہ ہر کوئی میرے روضہ کی مجاوری کرے۔ میری ان نصیحتوں پر عمل کیجیئے تاکہ آپ کو نیک بختی میسّر ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نے پھر نماز پڑھنے کی تاکید و تلقین کی اور وظائف کو پابندی کے ساتھ پڑھنے پر اصرار فرمایا۔ یہ نصائح سن کر سب احباب اپنی جگہ پہ چلے گئے اور دیر تک خود حضرت سیدؒ کے اوراد سنتے رہے کہ: "یا اللہ! یا رفیق! یا حبیب! تو ہی میرا غمگسار ہے۔ تو ہی میرا یار و یاور ہے اور تو ہی میرا طبیب ہے"۔ نصف شب تک یہی ورد آپ کی زبان پر تھا۔ اور محبوب کے ساتھ وصال کا وقت قریب تر آ گیا اور بسم اللہ سے قربِ محبوب کے سفر کا آغاز کر کے لقاءاللہ کی تکمیل فرمائی۔ آفرین ہو ان کی شان و شوکت پر اور وصلِ جانان کے لئے جان کو سپرد کر دینے پر۔ احباب نے آپ کے سالِ وصال کو بسم اللہ سے ہی متعیّن کر دیا۔ (۷۸۶ھ)۔ ارجعی[1] پر کاربند رہنے کے بعد سارا عالم غم و الم میں ڈوب گیا۔ ہر ایک ماتم زدہ تھا۔ بارِ غم سے آسمان کی طرح سب کی کمر خم ہو گئی اور درد و رنج میں سارے مبتلا ہو گئے۔ آسمان بھی گویا اشک ریز تھا اور اس نے بھی غم میں اپنا لباس نیلے رنگ میں رنگ دیا۔ چاند نے اپنے چہرہ پر سیاہ بادلوں کا نقاب چڑھا دیا اور اپنے بال نوچ ڈالے۔ آسمان کے ماتم کو دیکھ کر فرشتوں کی حالت بھی غیر ہو گئی اور انھوں نے بھی ہائے و ہو میں آسمان

---

[1] ارجعی الی ربک کی طرف اشارہ ہے۔

کا ساتھ دیا۔ دوسرے دن صبح کو جنازۂ حضرت کے بارے میں گفتگو ہوئی اور لوگوں نے کہا کہ اسی جگہ پر اب حضرت کا مزار ہوگا یہ دراصل ہماری خوش بختی تھی کہ ہما[1] ہماری سرزمین کی طرف رُخ کر چکا ہے لیکن دوسرے ممالک کے اصحاب اس رائے کے خلاف ہو گئے اور کہا کہ حق ہمارا ہے ان کو ہم اپنے ملک میں لے جائیں گے اور احباب نے حضرت سیّدؒ کی وصیتوں کو بھی بیان کیا کہ خود اُن کی اس بارے میں رائے کیا تھی بلکہ بعض اصحاب نے اظہار کیا کہ دو سال پہلے جب حضرت سیّد کلاب میں تھے تو وہاں آپ نے ایک جگہ کا مشاہدہ فرمایا تھا اور ہم سے کہا تھا کہ میری قبر یہاں پر ہوگی۔ لیکن لوگوں نے ان کی بات پر اعتماد نہیں کیا اور کہا کہ آپ حضرات کی یہ باتیں غرض مندی سے خالی نہیں ہیں۔ جب گفتگو بڑھنے لگی تو طے یہ پایا کہ جو کوئی تابوت شریف کو اٹھا سکے گا حضرت کا مزار شریف اسی کی سرزمین پر ہوگا۔ سبھی اس پر راضی ہوئے اور نعش مبارک نعش مبارک کو غسل دینے اور نورانی کفن چڑھانے کیلئے آگے بڑھے لیکن حضرتِ والاشکوہؒ کا تابوت شریف اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس کے بعد شیخ قوام الدینؒ آگے آئے اور انھوں نے تابوت شریف اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تابوت شریف ہوا کے دوش پر تھا، اصحاب نے بالمشافہ دیکھا کہ فرشتے پرندوں کی صورت میں جنازہ کے ساتھ تھے اور چاروں طرف جیسے جنازہ کو گھیر کے رکھا تھا۔ ہوا کے تخت پر سلیمان جاہ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کی سواری جا رہی تھی اور خود آپ شادمانی کے ساتھ جنت الفردوس میں جلوہ افروز تھے جمادی الاول کی ۲۵ تاریخ کو آپ نے خاکِ برجِ آفتاب کی طرح مزیّن کیا اور وہاں ایک قیامت برپا ہوئی۔ تمام فضلا و عقلا آہ و فریاد کرتے ہوئے

---

[1] ہما۔ ایک مشہور پرندہ جو نہایت مبارک خیال کیا جاتا ہے اور کہتے ہیں جو شخص اس کے سایہ کے نیچے آجائے بادشاہ یا صاحب اقبال بن جاتا ہے۔

جمع ہوئے اور فاتحہ خوانی کی.... [1]"

اس صریح بیان کے بعد مؤلف نے حضرت میر سیّد علی ہمدانی سے حقیقتِ سماع (جس میں جوشِ سماع اور کھڑا ہو کر رقص کرنا بھی شامل ہے) کے بارے میں سوالات پوچھے جانے اور قریۂ علی شاہ (کُلاب) کے جنگل میں جا کر وہاں درندوں کے دائرہ اسلام میں آجانے، اناج میں شبہہ کی بنا پر اسے اصحاب کے تناول نہ کئے جانے پر خادم کی طرف سے دریا میں ڈال دیئے جانے اور مچھلیوں کی فریاد کرنے اور حصول معرفت سے متعلق سوال کئے جانے کے عناوین کی تفصیل پیش کرنے کے بعد جناب حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے کشمیر میں دوسری بار کوہستان پنجاں کی راہ سے تشریف لانے اور للہ عارفہؒ اور حضرت شیخ العالم سے اُن کی والدہ محترمہ کے شکم مبارک میں بھی ملاقات کرنے کا ذکر ہے[2] چونکہ ان واقعات کا کسی اور مآخذ میں سوائے ان دو یا تین تالیفات کے ذکر نہیں ہے اس لیے اس سے پہلے کہ ہم تمام متضاد بیانات کا جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، تفصیل سے جائزہ لے کر ایک حتمی رائے قائم کریں، نظم المناقب اور منقبت الجواہر سے حضرت امیرؒ کی دوسری بار تشریف آوری کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ حضرت امیر کبیرؒ کی زندگی کے بارے میں کئی اور تذکروں میں[3] بھی ذکر موجود ہے لیکن وہ ان ہی

---

[1] نظم المناقب: منقبت الجواہر۔ [2] یہ بات قابل ذکر ہے کہ نظم المناقب کے مؤلف غلام محمد نرآلی نے اس مثنوی کو فاعلاتن مفاعلن فعلن کے بحر میں لکھا ہے جبکہ دوسری بار تشریف آوری کا عنوان جو ۶۹ ابیات اور للہ عارفہؒ اور شیخ العالمؒ سے ملاقات کا عنوان جو ۱۵۷ ابیات پر مشتمل ہے فعولن فعولن فعولن فعول کے بحر میں ہے گویا یہی دو عناوین مختلف بحروں میں ہیں اور خادمان نام کے تخلص سے ہیں جبکہ نظم المناقب کا مؤلف مسکین تخلص کرتا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ دونوں عنوان اصل مؤلف کے نہیں ہیں بلکہ کسی اور نے اس میں داخل کر دیئے ہیں جو خادمان کہلاتا تھا المناقب قلمی نسخہ نمبر ۱۹۷۷؛ [3] حبیب السیر: ہفت اقلیم: مجمع النفائس: مجمع الفصحا: ریاض العارفین: روز روشن: طرائق الحقائق: تذکرۃ الشعرا نشر عبدالحمید عرفانی: بزرگان و سخن سرایان ہمدان: ریاض الشعرا: نفحات الانس: مجالس العشاق:

اہم اور معتبر ماخذ کا چربہ ہے اور بعض ماخذوں میں ہوبہو نقل ہے، جن سے ہم نے نقل کیا ہے نظم المناقب میں دوسری بار حضرت امیرؒ کی تشریف آوری اور للہ عارفہؒ اور شیخ العالمؒ سے ان کی ملاقات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ یوں ہے[1]:

”... کشمیر کے ملک کی طرف سفر کرنے کے دوران آپ ہر منزل پر ہر ایک کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آتے تھے... جب کشمیر کے پنجال[2] پہاڑ پر پہنچے تو پہاڑ کے اوپر ایک عمر رسیدہ زاہدِ گوشہ نشین کو دیکھا جس کا جسم بال کی طرح نازک ہو چکا تھا اور جس کے بال برف کی مانند سفید ہو چکے تھے اور اس قدر نحیف اور کمزور تھا کہ بید کے درخت کی ٹہنیوں کی طرح لرزتا تھا۔ آپ نے اس کی گردن میں کفر کا جنیو (زنّار) اور اس کی پیشانی پر تلک دیکھا لیکن سخت ریاضت کی وجہ سے صاحب بصیرت امیر کبیرؒ نے اس میں قلب کی صفائی دیکھی۔ حضرتؒ کے سامنے اس کا مافی الضمیر روشن تھا۔ وہ لوگوں کی حاجتیں پورا کرنے والا، محتاجوں کی دستگیری کرنے والا اور شب و روز عبادت گذار آدمی نکلا۔ آپ کو دیکھ کر وہ آپ کے قدموں پر جھک گیا اور دونوں کی آپس میں بہت گفتگو ہوئی۔ برہمن گوشہ نشین نے حضرتِ امیرِ جہانؒ کے ساتھ اسرارِ الٰہی کے بارے میں کئی باتوں کا اظہار کیا جن کو سن کر حضرت امیر کبیرؒ کو حیرت ہوئی کہ ایک کافر کو اسرارِ خداوندی پر کشف حاصل ہے۔ حضرت امیر نے دل میں خیال کیا کہ اگر یہ مسلمان ہو جائے گا تو واقعی برج عرفان کا چاند بن جائیگا اظہار تعجب کرنے کے بعد حضرت شاہ ہمدانؒ نے برہمن سے از راہ امتحان فرمایا کہ

---

[1] نظم المناقب: عنوان ”رسیدن مرتبۂ دوم جناب امیر کبیر میر علی سید ہمدانی رضی اللہ عنہ خصال ہمایوں نال بر سر قلعۂ پنجال و براہ راست آوردن کھید کھنسال از کفار شیرین مقال“ نیز ملاحظہ ہو منقبت الجواہر ملّا حیدر بخشی:

[2] پنجال وہ سلسلۂ کوہ جس میں مشہور پہاڑ بانہال بھی آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے گویا حضرت امیر کبیرؒ بانہال کی راہ سے دوسری بار کشمیر میں داخل ہوئے تھے۔

میرا ایک ساتھی کھو گیا ہے اگر تم سے ہو سکے تو تم اس کو ڈھونڈھ کر دیکھ لو کہاں ہے اس کا نام علی ہے اور آل علیؑ سے اس کی نسبت ہے۔ دل و جان سے توجہ کر لو اور کوشش کر لو اسے ڈھونڈنے کی شاید تمہاری توجہ سے مل جائے"۔ برہمن نے حضرت امیر سے یہ بات سن کر پاتال سے یعنی زمین کے سب سے نچلے حصے سے بلند ترین آسمان تک تلاش کی۔ اپنی تمام تر کرامات میں ڈوب گیا اور ہوا کی طرح اطراف عالم میں گھوما اور اپنی کمال ہمت کے گھوڑے سے لوٹ کر اتر آیا اور اپنے مخفیانہ اسرار کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: "میں نے اسے زمین کی نچلی تہوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک ڈھونڈا۔ میں نے اسے کہیں نہیں پایا گویا اس کی موت واقع ہوئی ہے یا پھر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ علی آپ ہی ہیں میں نہیں ہوں"۔ یہ سن کر حضرت سید علی ہمدانیؒ ہنس دیئے اور غور فرمایا کہ اس برہمن نے میرا پتہ کیسے پایا۔ آپ نے برہمن کی آگہی اور اس کے دانش و عقل پر آفرین کہی اور اس کے بعد فرمایا: "اے برہمن! یہ رتبہ تم نے کیسے پایا؟ اس راہ میں آنے کی تجھے اجازت کیسے مل گئی۔ تم تو سراسر کافر ہو۔ لیکن تمہارے کام اسرار درون سے تعلق رکھتے ہیں"۔ برہمن نے کہا: "میں نے آج تک سرکش اور باغی نفس کے احکام کی تعمیل نہیں کی ہے۔ جو کچھ اس نے مجھ سے کہا میں نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔ خواہ اس نے آشکارا طور پر یا خواہ پوشیدہ طور پر مجھے جو بھی کرنے کو کہا میں نے اس سے منہ موڑ لیا"۔ حضرت امیرؒ نے فرمایا "اے صاحب عمل اور نکتہ دان زاہد گوشہ نشین! ذرا اپنے نفس سے پوچھ لو کہ اسلام کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ کیا دین اسلام سے دور رہ کر دوزخ کا ڈر اسے نہیں ہے؟ برہمن نے جواب دیا: "مجھے اسلام قبول کرنے سے ممانعت کرتا ہے اور کافروں کے طور طریقوں پر ہی فارغ رہنا چاہتا ہے"۔ حضرت امیرؒ نے فرمایا یہ کیا عقل و دانش ہوئی؟ نہیں اس سے زیادہ اور کچھ مت بولو۔ دراصل یہ نفس امارہ ہے جو تم سے بات کر رہا ہے اور وہی تجھے

راہ حقیقت سے منحرف کرنا ہے ۔ اور تمہاری عمل کو تیز ہواؤں کے سپرد کرکے بکھیر دیتا ہے ۔ تم اپنی بے قدری ہو جانے کی وجہ سے نفس کی یہ بات مت مان لو اسلام کا تاج سر پر رکھ لو اور میری دعوت کو قبول کر لو ۔ تمہارا دل ایک درخشاں ہیرے کی طرح چمکنے لگ جائے گا بلکہ ایک چاند کی طرح! حضرت امیر کی بات سن کر برہمن گوشہ نشین نے اپنے آپ کو ایسا سمیٹ لیا جیسے خزانے کے اوپر سانپ ۔ اور اپنے نفس سے کہا: "مجھے صحیح جواب دو ۔ اے نفسِ ستمگر مجھے تم سے سچا جواب چاہیئے"۔ اس کے نفس نے اُسے جواب دیا: "ابھی تک تو تم کافر تھے ۔ اور تلقین اسلام سے بے بہرہ اور بے نصیب ۔ اب چند دلوں کے لیے کیا مومن ہو جاؤ گے ۔ تمہارے جو اپنے طور طریقے ہیں اُن کو مت چھوڑ ۔ ان ہی پر قناعت کر"۔ نفس سے یہ جواب پاکر برہمن نے فوراً اُس کی اس بات سے منہ موڑ لیا ۔ اور کھڑا ہو گیا ۔ اور عقیدت کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر حضرت امیر کبیرؒ سے کہا میں خاکسار آپ کی راہ کا ایک حقیر ترین ذرہ ہوں ۔ میں نے اپنے نفس ستمگر کے کہنے سے منہ موڑ لیا کیوں کہ اس نے مجھے خواری اور سرگشتگی کا درس دیا تھا میرا دل آپ کے سچے دین کا اسیر ہو گیا ۔ مجھے کلمہ شہادت پڑھا دیجیے اور میرے گناہوں کو معاف کر دیجیے برہمن نے اللہ تعالٰی کی وحدانیت کا اقرار کر لیا ۔ حضرت رسولؐ کو رسول خداؐ مان لیا اور چہار یارانِ باصفاؓ کی محبت کو دل میں نقش کر لیا ۔ کبروی سلسلے کے مٹکوں سے جام معرفت نوش کیا اور ہوا و ہوس پر لات ماری امیر مبارک نفسؒ کی برکت سے سعادت ابدی سے مالا مال ہو گیا اور صاحب حال بھی اور پیر پنچال کے نام سے مشہور ہو گیا"۔

اس کے بعد نظم المناقب میں للہ عارفہ اور شیخ العالمؒ کا ذکر یوں بیان ہوا ہے[1]۔

---

[1] نظم المناقب: عنوان "ذکر ملاقات علی ثانی رضی اللہ عنہ با للہ عارفہ دیوانہ و در شکم مادر شیخ العالم والدہ ماجدہ پیش جناب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ احوال خود اظہار کرد" منقبت الجواہر ملا حیدر بدخشی"۔

"..... دوسرے روز حضرت امیرؓ نے گھوڑے کا زین باندھا اور شاہ ولایتؓ کی طرح دلدل پر سوار ہو گئے۔ پیر پنچال سے اجازت لی اور پہاڑ سے آبادی میں اُتر آئے۔ بجلی کی تیزی کی طرح گھوڑا دوڑاتے رہے اور ہیرہ پور میں پہنچے۔ آپکے تیز رو اور تیز قدم خدام بھی آپ کے آگے پیچھے رواں دواں تھے۔ ایک ندی کے کنارے رات گذاری اور دوسرے دن وادی کشمیر میں داخل ہوئے۔ بوستان کشمیر کھل اٹھا۔ آپ کے قدوم مبارک کی برکت سے مس سونے میں بدل گیا خار و خس سے پھول کھلنے لگے۔ طلسم و جادو کی شہر میں عام حکم فرمائی تھی۔ آپ کے علم کی قوت اور دینی و روحانی طاقت اور تقویٰ سے وہ سب باطل ہوا اور شریعت محمدیؐ عام ہو گیا۔ جب آپ نے اسلام آباد میں قیام فرمایا تو وہاں دین اسلام کو اُستوار بنایا۔ اسلام آباد کے بازاروں میں داخل ہو کر وہاں کے لوگ وہاں کے تاجر اور وہاں کے امیر و غریب سب دوڑتے ہوئے تمام اطراف سے آپ کے قدموں پر گرتے پڑتے اشکباری کرنے لگے۔ خم ہو کر راست ہوئے۔ تعلیم و اکرام سے انکساری و عاجزی کا اظہار کیا۔ اور آپ کی فرمائشات پر ہمہ تن گوش ہوئے امیر عرب پادشاہ عجمؒ نے اہالی اسلام آباد کی رشد و ہدایت فرمائی۔ اُنکو بہت نوازا۔ اپنے دستِ مبارک سے بھی اور زبانِ مقدس سے بھی۔ سخاوت و کرم کے دروازے اُن پر کھول دیئے اور ابر نیسان کی طرح وعظ و نصائح اور رہبریِ دینِ اسلام کی بارشوں سے اس سارے علاقے کو سیراب کر دیا۔ آپ کے دست کرم کی بدولت گدا شاہ بن گیا اور آپ کے روی انور کی روشنیوں سے چھوٹے چھوٹے ستارے چاند جیسی روشنی بکھیرتے لگے۔[1]

ان ہی ایام میں ایک عورت ذات تھی دیوانہ اطوار۔ دیوانہ تو نہیں تھی

---

[1] اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلام آباد کے اہالی سلام کی مضبوط رسی کو محکم تھامے ہوئے ہیں اور غیرتمند مسلمان ہیں۔

بلکہ حضرت رابعہؒ کی طرح ایک عارفہ تھی لیکن للہ دایوانہ کہلائی جاتی تھی، لباس سے مطلق عاری نہ سر پہ چادر اور نہ جسم پر کوئی کپڑا۔ اُسکی نظر میں کیا مرد کیا عورت سبھی یکساں تھے خمخانۂ وحدتِ خداوندی کا جوش اُس میں موجزن تھا اور قربِ الٰہی کی شراب کی مستی سے مدہوش رہا کرتی تھی۔ پانپور قصبہ میں رہتی تھی۔ ایک پروانہ تھی جو فقط آتش عشق کے گرد گھومتی تھی۔ دُنیائے دُوں کی آلائیشوں سے فارغ رہ کر معرفتِ الٰہی کی خم سے جام پر جام پی چکی تھی۔ ان سات آسمانوں کے نیچے اُس جیسی عارفہ کو کسی نے نہ زمین پر دیکھا اور نہ زمانے میں.... بہر حال اُس کی نظر حضرت امیرؒ پر جب پڑی تو اُن کے سامنے سے ہوا کی طرح بھاگ نکلی وہ چُھپ جانے کے لیے جگہ کی تلاش کرنے لگی اس لیے کہ صاحبِ کرامت حضرت امیر کبیرؒ کے آگے اب اُسے شرم آنے لگی اور کہا کہ عورت کے لئے عریاں ہو کر پھرنا بے حیائی ہے۔ مردوں سے تو چھپ جانا اور بھاگ جانا چاہیے۔ بھاگتے بھاگتے ایک نانوائی کی دکان پر پہنچی جس کا تنور جل رہا تھا۔ اور فوراً ہی اُسی تنور میں کُود پڑی۔ جیسے کہ آگ میں سمندر[1]۔ چونکہ اس کا دل عشق الٰہی کی آگ میں پُر حرارت تھا ہی، اس لیے یہ آتش تنور اُس پر حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام کی طرح گلزار میں بدل گیا۔ بیچارے نانوائی کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ اس نے سخت گھبراہٹ میں اس خیال سے کہ کسی نے یہ ماجرا دیکھا نہیں تنور کو ایک بڑی پتیلی سے ڈھک دیا۔ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ اُسی وقت عارفہ کی تلاش میں اسی نانوائی کی دکان کے آگے رُک گئے اور نانوائی سے کہا۔ "یہ عشق الٰہی کی ماری ہوئی عورت

---

[1] سمندر۔ آگ کا ایک چھوٹا سا جانور جو چوہے کی مانند ہوتا ہے اور آگ میں رہتا ہے جیسے مچھلی پانی میں۔ آگ سے باہر آ کر یہ مر جاتا ہے اور آگ میں ہی رہ کر یہ زندہ رہتا ہے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ ایک پردار جانور ہوتا ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ اس آتشکدہ میں ہوتا ہے جس میں مسلسل سو سال تک آگ جلتی رہے بعضوں نے اس کا نام سمندل، سمندول اور سمندردل بھی لکھا ہے۔

کدھر کو نکل گئی ؟ وہ عریاں عورت تو اسی دکان میں داخل ہوئی کیوں کہ مرد کو دیکھکر بھاگ نکلی اور مارے شرم کے چھپ جانا چاہتی تھی ۔ اگر تم نے اسکو بادلوں کے کے نیچے بھی چھپا کر رکھ دیا ہو تو اس چاند کو فوراً پردے سے باہر نکالو ۔ ہم اس کے روئے منور کا دیدار کرنا چاہتے ہیں ۔ دوست کی خوشبو اب دماغ سے اُتر کر روح میں سرایت کر گئی ہے ۔ میں تمہاری دکان پر اسی لیے رُک گیا ہوں کہ اس سرو قد کو عیاں دیکھ لوں ۔" نانوائی نے یہ باتیں سن کر کچھ انکار اور کچھ اقرار سے کام لیا اور اس کا رنگ فق ہو گیا اور حلق میں جیسے رسی اٹک گئی ۔ اور کچھ کہہ نہ پایا ۔ حضرت امیرؒ نے کہا ۔ "تمہاری یہ کیا حالت ہو رہی ہے ؟ تم سچ بولو کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو ۔" نانوائی جس کے ہونٹ مارے وحشت کے خشک اور چہرہ زرد ہو گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہا رہا تھا کو سوائے حقیقت بیان کرنے کے اب کوئی چارہ نہیں تھا ۔ حضرت امیر جہانؒ سے عرض کیا کہ : "جنت کی حور کی مانند وہ خاتون اس تنور میں کود گئی ۔ آب روان کی آئی اور ہوا کی طرح دوڑ کر وہ خاکی نژاد عارفہ اس آگ میں کود گئی ۔ میں خاک بسر آدمی کیا کروں گا اگر وہ اس آتش تنور میں جل کر راکھ ہوئی ہو گی ؟ اے شاہؒ ! حقیقت یہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں ۔ اب آپ کی مرضی ہے ۔ خواہ مجھے آپ قتل کر دیں یا مجھے بخشش دیں ۔" حضرت امیر جہانؒ نے جب نانوائی سے یہ سب کچھ سن لیا تو آپ نے فوراً تنور کے اوپر سے ڈھکنا اُٹھا لیا اور اس مدہوش خاتون کو دیکھا جو حور کی طرح پاکیزہ لباس پہنے غرق نور تھی ۔ بہ صورت پری اور بہ سیرت فرشتہ ، بہ ظاہر زمین لیکن بہ باطن آسمان ! بیگانوں کے سامنے ایک دیوانہ لیکن آشنا کے سامنے ایک ہوش مند عاقلہ ! عمدہ لباس پہنے ہوئے تنور سے باہر آ گئی اور اس بادشاہ ملک عرفانؒ کے آگے آکر اُن کی انیس و ہمدم ہو گئی ۔ سلام و تہنیت ادا کی اس ماہِ روشن نے حضرت امیرؒ کے حضور میں جس کا جواب آپ نے دے کر پوچھا کہ : "اے نیکنام عارفہ ! میرے دل میں ایک عجیب سا سوال ابھر رہا ہے

اس کا تم جواب دو۔ ابھی تک اگر تم عریاں پھرتی تھیں اس کی وجہ کیا تھی اور اب جب مجھے دیکھ لیا تو ستر سے کام لیا؟ مجھے دیکھ کر ہی تم بھاگ گئیں؟ آخر تم نے مجھ میں ایسی کیا بات دیکھی؟ تم نے تو مجھے ایک نظر بھی نہیں دیکھا اور وحشی ہرنی کی طرح بھلانگیں لگاتی ہوئی بھاگ گئیں؟

شعلہ زن آگ میں پروانہ کی طرح کود پڑی، اور اے شیرِ زنِ مطلق تجھے کوئی ہراس نہیں ہوا۔؟ اس خانۂ آتش میں تم نے سمندر کی طرح رہنا گوارا کر لیا۔؟"

حضرت امیرؑ کی خدمت میں اس خاتون نے پسندیدہ جواب عرض کیا جس سے حضرت امیرؑ خوش ہو گئے۔ اس نے جواب دیا کہ: "عادت و سیرت اور ذات و صفات میں عورتیں شہر اور دیہات میں آپس میں مردوں کی طرح ہی ہوتی ہیں۔ عورتیں دوسری عورتوں سے کبھی ستر و حجاب سے کام نہیں لیتیں بلکہ ایک دوسرے کو راز و نیاز میں شریک بھی کرتی ہیں۔ عورت ایک ہو یا دس، سو ہوں یا ہزار ایک دوسرے سے ہمکلام رہتی ہیں۔ اگر کوئی عورت اپنے جسم کو عُریاں کر بھی لے جب بھی وہ دوسری عورت سے اس بارے میں خائف نہیں ہوتی لیکن اگر کہیں سے کوئی مرد آنکلا تو فوراً ہی خواہ کسی چیز سے، اپنے آپ کو لپیٹ لیتی ہے۔ ابھی تک اگرچہ میں بظاہر مست و مدہوش تھی اور عُریاں، عورتوں سے میرا کوئی حجاب نہیں تھا اور نہ ان سے کوئی خوف۔ اب جب کہ میں نے ایک مردِ راہِ خدا کو دیکھا تو مجھے اپنی عریانی سے شرم آ گئی۔ میں نے انتہائی جلدی کی کہ میں خود کو کہیں چھپا لوں اور اپنی عریانی پر پشیمان ہو جاؤں۔ اس لیے میں ہر طرف بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے چھپ جانے کے لیے کوئی جگہ مل ہی نہیں رہی تھی۔ راستے میں اگر کوئی مجھے کنواں مل جاتا تو میں اُسی میں کود جاتی۔ میں اس نانوائی کی دُکان پر پہنچی اس کے جلتے تنور کی آگ کو دیکھ کر میرے دل نے مجھ سے پکار کر کہا کہ آگ میں چھپ جا۔ نیک مردوں کے سامنے عریاں ہو کر کیسے جا سکتی ہے؟ میں نے

آگ کا انتخاب اسی لیے کیا کہ ایک مردِ خدا کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر چھپالوں تاکہ وہ میرا نشان تک نہ پائے اور میں (مارے شرم کے) جل ہی جاؤں لیکن آپ کے مبارک قدوم شریف کی برکت سے میری یہ آگ نور میں بدل گئی۔ اے شاہؒ آپ سے چشم بد دور رہے"۔ نیک رائے اور فرخندہ خو حضرت امیرؒ نے یہ جواب سن کر اُسے مرحبا کہی اور فرمایا: "اگر مرد ہو کر بھی ایک مردِ حق سے بے خبر ہے تو اسے مرد نہیں کہا جائیگا۔ وہ تو عورت سے بھی بدتر ہے۔ اگر ایک عورت رازِ خداوندی سے باخبر ہے تو وہ مردوں سے بھی مردانگی میں سبقت لے جاتی ہے"۔ اس کے بعد حضرت شاہ شاہانؒ نے للہ عارفہؒ سے کہا کہ: "مردوں کے راز سے تجھے واقف کرنا ضروری ہے۔ میں حضرت فخرِ زمین و زمان صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم مبارک سے یہاں کشمیر میں آگیا ہوں۔ انھوں نے مجھے ایک ہیرے کا پتہ دیا ہے۔ میں اس ہیرے کی تلاش میں ہوں وہ ہیرا اپنے باپ کی پشت میں سے اپنی ماں کے بطن میں آچکا ہے۔ اس سعیدِ ازلی کے وجود سے سارا عالم سعادت مند ہو جائے گا۔ اور چند ہی دنوں میں وہ چاند عیاں ہو کر نکلنے والا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو کہ ہم دونوں اس کی والدہ سے اس گوہرِ بے بہا کی تعظیم میں ملاقات کریں"۔ اس کے بعد جناب حضرت امیر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ خوشی و مسرّت کے ساتھ کیموہ کی طرف روانہ ہو گئے راہ میں محتاجوں کی دستگیری فرمائی۔ پیر و جوان اور مرد و زن آپ کی عنایات و اکرام سے محظوظ ہوئے اور آپ کے فضل و کرم کے دامن بھر کے لے گئے۔ ہر خاص و عام کا دل آپ کے کرم و سخاوت سے فیض یاب ہوا اور آپ کی بخشش اور لطف وجود سے گدایانِ محتاج سیر ہو گئے۔ کیموہ پہنچ کر راستے ہی میں، آگے سے حضرت شیخ نورالدینؒ کی والدہ آرہی تھی۔ جس کے نورِ قلب سے زمین منوّر ہو رہی تھی اور جب اس نے حضرت امیرؒ کو تشریف لاتے دیکھا تو حیا سے اس کے چہرے پر پسینہ آگیا۔ حضرت سلطان دینؒ کے روئے انور کو دیکھ کر اس پر ایک طرح کی بے ہوشی سی چھا گئی۔ اس کے شکم میں درِّ عدن نے کروٹ لی نور زمین

پر بیہوشی کے عالم میں ایسے گر پڑی گویا اس کی روح پرواز کر گئی حضرت امیرؒ اس کے سرہانے پرآکر کھڑے رہے اور اصحاب حیران تھے ۔ صدف کی گہرائی سے اُس چھپے ہوئے موتی نے حضرت امیر والامرتبہؒ سے ہمکلامی کی جس کے بعد آپ نے ان سے کہا کہ آپ اپنی جگہ پر لوٹ جایئے ۔ موتی واپس صدف میں اپنی جگہ پر آگیا اور والدۂ ماجدہ کی بے ہوشی برطرف ہوگئی ۔ حضرت امیر جہانؒ نے اُسے کہا "اے زنِ پاکیزہ ! آپ بلا کسی خوف کے مجھ سے بات کیجیے ۔ آپ کو اگر کوئی مشکلات پیش آرہی ہیں تو مجھ سے کہہ دیجیے تاکہ آپ امان میں رہیں اگر بچے کے شکم میں ہونے کی وجہ سے آپ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو آپ بے پردہ مجھ سے کہدیں ۔" حضرت شیخ نورالدینؒ کی وجہ سے سرجھکا کر عرض کیا : "بس اسی طرح کی بے ہوشی جو آپ نے ملاحظہ فرمائی ، دن میں پانچ بار مجھ پر طاری ہو جاتی ہے ۔" حضرت امیر جہانؒ نے اسے مرحبا کہی اور فرمایا ایک تابدار موتی آپ کے شکم مبارک میں پل چکا ہے ۔ اور یہ گوہر درخشان ان ہی ایّام میں نمودار ہونے والا ہے ۔ یہ دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک چراغ ہوگا جس کی روشنی کے آگے باطل کا دیو نیست و نابود ہو کر رہے گا ۔ دراصل آپ کا یہ بچہ آپ کے شکم مبارک میں پانچ مقررہ اوقات پر خدا کے حضور سربسجود ہو جاتا ہے اور قبلہ کی طرف اپنا رُخ کر کے نماز ادا کرتا ہے ۔ یہ خدا کا بندۂ خاص آپ کے شکم میں خدا کے حضور حاضر ہو کر اپنے راز و نیاز پیش کرتا ہے ۔ آپ اس دُرِّ عرفان کا خیال رکھیں اور اس کی حفاظت کریں ۔ حضرت شفیع اُلامم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بدبخت اور نیک بخت ، بدبختی اور نیک بختی ماں کے شکم میں سے ہی ہوتی ہے ۔" اس کے بعد حضرت امیر کبیرؒ نے للہ عارفہ سے کہا کہ اب میرا ارادہ اپنے وطن میں لوٹ جانے کا ہے اور میں پھر ان سے مل لوں گا ۔ اور حضرت امیر عربؒ ختلان روانہ ہو گئے ۔ ۔ ۔ "

حضرت امیر کبیرؒ کے للہ عارفہ اور شیخ نورالدین ریشیؒ کی مندرجہ بالا کیفیت کے

کے بارے میں مؤلفِ ایران صغیر یا تذکرۂ شعرای فارسی زبان کشمیر لکھتے ہیں: ۔ [1]

"...... ہم چنین در تذکرہ ہا نوشتہ اند کہ لالا (للہ) معروفترین زن عارفہ کشمیر (کہ زندگانی و شعر عرفانی او با بابا طاہر بی شباہت نیست) در سن چہل و چند سالگی بدست شاہ ہمدان مسلمان شد۔ و نیز نقل می کنند کہ لالا (للہ) مثل دیوانہ ہا نیم لخت و عریان در بیابان و آبادیہا می گشت و شعر می سرائید و اگر مردی بہ رویۂ او ایراد می گرفت جواب می داد کہ من بین شما مرد حقیقی نمی بینم و احتیاج بہ حجاب ندارم... اتفاقاً روزی از دور چشمش بہ سید علی ہمدانی رح افتاد۔ فی الفور فریاد زد: "وای! او مرد است" و با عجلہ و شتاب مخصوص فرار کردہ از آنجا دور شد و پس لباس پوشیدہ بخدمت او رسید و مشرف بدین اسلام گردید۔ ہمین زن شیخ نور الدین ریشی رح را کہ سرچشمۂ الہام بودہ در دوران طفولیت شیر دادہ است۔ بعد از شاہ ہمدان رح بزرگترین شخصیت روحانی کشمیر شیخ نور الدین ریشی بودہ است..."

"...... اسی طرح تذکروں میں لکھا ہے کہ للہ عارفہ کی سب سے مشہور عارفہ (جس کی زندگی اور جس کے عارفانہ اشعار بابا طاہر ہمدانی سے ملتے جلتے ہیں ۴۴ سال کی عمر میں شاہ ہمدان کے ہاتھوں مسلمان ہو گئی اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ للہ دیوانوں کی طرح نیم برہنہ حالت میں ویرانوں اور آبادیوں میں گھومتی پھرتی تھی۔ اور شعر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی مرد اس کے اس رویہ پر اعتراض کرتا تو جواب دیتی کہ تم لوگوں میں تو کوئی حقیقی مرد ہے ہی نہیں اس لیے مجھے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچانک ایک روز دور سے اس کی نگاہ حضرت سید علی ہمدانی رح پر پڑی اور فوراً بول اٹھی: "ہاں یہ ہے مرد!" اور تیزی سے بھاگ نکلی اور پھر کپڑے پہن کر ان کی خدمت میں آ گئی۔ اور دین اسلام سے مشرف ہوئی۔ اسی عورت نے شیخ نور الدین ریشی رح کو جو الہام کا سرچشمہ تھے بچپن میں دودھ پلایا تھا۔ شاہ ہمدان رح کے بعد کشمیر کی سب سے بڑی

---

[1] ایران صغیر یا تذکرۂ شعرای فارسی زبان کشمیر تألیف خواجہ عبد المجید عرفانی از نشریات کتابفروشی ابن سینا تہران سال ۱۳۳۵ چاپ اول صفحہ ۱۳-۱۴:

روحانی شخصیت شیخ نورالدین ریشیؒ تھے۔۔۔۔۔

ہیں نے پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ ان اہم ترین منابع سے حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کے کشمیر میں ورود سے متعلق بیانات نقل کئے ہیں جو متضاد ہیں۔ اگرچہ جیسا پہلے بیان ہو چکا، حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں آمد کے سلسلے میں مختلف کتابوں میں ذکر موجود ہے[1] لیکن وہ ان ہی منابع سے ماخوذ ہے۔ صحیح کیفیت کے تعین کے بارے میں مندرجہ بالا منابع کے بیانات پر غور و بحث کرنا ضروری ہے۔

ان متضاد بیانات کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کشمیر میں ایک ہی بار تشریف لائے اور اپنی ماموریت کی تکمیل کے بعد ختلان چلے گیے۔

۲۔ حضرت شاہ ہمدانؒ دو بار تشریف لائے۔ پہلی بار صرف چار ماہ رہے اور دوسری بار سات سو سادات کے ہمراہ آئے اور ماموریت کی تکمیل کے بعد ختلان لوٹ گیے۔

۳۔ حضرت شاہ ہمدانؒ سال ۷۷۴ھ میں پہلی بار کشمیر آئے۔ چھ ماہ رہ کر لوٹ گئے۔ پھر دوسری بار سات سو سادات کے ہمراہ سال ۷۸۰ھ میں تشریف لے آئے۔ پھر دو اڑھائی سال قیام رہا اور پھر تیسری بار سال ۷۸۵ھ میں سال بھر رہ کر ۷۸۶ھ میں ختلان کی طرف روانہ ہوئے۔

۴۔ حضرت شاہ ہمدانؒ پہلی بار جب تشریف لے آئے تو چار ماہ کے مختصر قیام کے بعد پنجاب

---

[1] قبلا فٹ نوٹ میں درج کی گئی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں میں کلیجا حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں اشارات ملتے ہیں: اعیان الشیعہ سید محسن الامین عاملی، رہنمای ہمدان از مرحوم صادق وحدت۔ تاریخ فرشتہ از مرزا شاہ: تاریخ رشیدی از مرزا حیدر دوغلت: مقالات دانش آموزان (مذارت لوہنگ دہز سال ۱۳۱۴ تہران): تاریخ ادبیات ایران از ہرمان اینہ (ترجمہ فارسی رضا زادہ شفق): الذریعہ از مرزا آقا بزرگ تہرانی: مقالات تحقیقی آقای علی اصغر حکمت۔ مجلہ یغما شمارہ ۶ سال چہارم تہران: تاریخ کبیر از جامی محی الدین مسکین سرائے ہلی:

کے راستے ختلان تشریف لے گئے اور پنجاب میں آپ نے سلطان شہاب الدین کشمیری اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے درمیان باہمی جنگ کو ختم کرا کے آپس میں صلح کرادی اور اس صلح کے بعد سلطان شہاب الدین کشمیر لوٹ آیا۔

۵۔ دوسری بار حضرت شاہ ہمدانؒ کوہ پنجال (بانہال کی راہ) کو عبور کر کے کشمیر میں داخل ہوئے اور پہاڑ کی راہ میں ایک گوشہ نشین برہمن سے ملاقات ہوئی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ اور بانہال سے بیرہ پور آگئے اور وہاں سے اسلام آباد گئے۔ اور سری نگر آتے آتے پا کے قریب آپ کی ملاقات للّہ عارفہ سے ہوئی اور للہ عارفہ کے ہمراہ کیموہ تشریف لے گیے۔ اور وہاں حضرت شیخ العالمؒ کے ساتھ غائبانہ ملاقات ہوئی اور پھر سری نگر لوٹ کر ختلان چلے گئے

مذکورہ متضاد بیانات تین اہم مآخذ و منابع سے ماخوذ ہیں جن کا ذکر ہو چکا۔ ان اختلافات کو کسی حد تک دور کرنا ناگزیر ہے۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی اولین تشریف آوری جس کا ذکر مقامی فارسی منابع میں سب سے اہم ترین ماخذ واقعات کشمیر میں ہے سال ۷۷۴ھ میں نہیں بلکہ سال ۷۸۱ھ میں تھی۔ واقعات کشمیر کا مؤلّف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری خود ایک محقّق، ایک فاضل ادیب، ایک اچھا فارسی شاعر اور اپنے عہد میں کشمیر کا ایک بے نظیر فارسی تاریخ گو اور ایک زبردست مؤرّخ تھا۔ وہ اپنے فنون میں ماہر تھا۔ اور خود ایک صاحب تجربہ تاریخ نویس، اور تاریخ گو کی حیثیت سے تاریخ گوئی کے دقیق رموز سے پوری طرح آشنا تھا۔ سیّد محمد خاوری کے جو ابیات حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں پہلی بار کی تشریف آوری کے بارے میں خواجہ موصوف نے نقل کئے ہیں اُن سے سال ۷۷۴ھ نہیں بلکہ سال ۷۸۱ھ نکلتا ہے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے۔ "کہ در شہور سنہ ہفتصد و ہشتاد و یک نزول اجلال در کشمیر جنت نظیر فرمودہ بودند" (کہ سال سات سو اکیاسی کے مہینوں میں (حضرت شاہ ہمدانؒ نے) کشمیر جنت نظیر میں نزول باعظمت فرمایا تھا) تاریخ حسن کے مؤلف نے جو بیشتر واقعات کشمیر سے ہی نقل کر چکا ہے.. ان ابیات کو قدرے اختلاف کے ساتھ، جیسا کہ اگلے اوراق میں ذکر ہو چکا ہے، بیان کیا ہے۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے ابیاتِ مربوط یوں لکھتے ہیں: میر سیّد علی شہ ہمدان۔

سیر اقلیم سبعہ کردہ نکو : شد مشرف ز مقدمش کشمیر : اہل آن شہر از وہدایت جو : سالِ تاریخ مقدم اورا : یابی از "مقدم شریف او" : اور اب مؤلف تاریخ حسن کے یہی ابیات جو سید محمد خاوری رح کے ہیں ملاحظہ ہوں :

میر سید علی شاہ ہمدان : سیر اقلیم سبعہ کردہ نکو : شد مشرف ز مقدمش کشمیر : اہل آن شد ازو ہدایت جو : سال تاریخ مقدم اورا : گفتم : از مقدمہ شریف بجو :

جیسا کہ ظاہر ہے یہ ایک فاحش اختلاف ہے۔ خواجہ اعظم نے لکھا ہے : یابی از : مقدم شریف اُو۔ اور اس میں تاریخ کے تینوں لفظ یعنی مقدم اور شریف اور اُو کو شامل کیا گیا ہے۔ نہ کہ صرف دو لفظوں کو ہی یعنی مقدم شریف۔ اُو کا لفظ خود بخود اس میں آجاتا ہے اور "اُو" کسی بھی صورت میں مقدم شریف سے علیحدہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو خواجہ محمد اعظم دیدہ مری جیسا ماہر فن اسے سرے سے شامل ہی نہیں کرتا اور وہ بھی سال سات سو اکیاسی کی بجائے سال سات سو چہتر ہی اخذ کرتا۔ لیکن چوں کہ لفظ "اُو" "مقدم شریف" کا ایک جزو غیر منقسم ہے اس لیے صریحاً مقدم شریف اُو سے صحیح سال نکلتا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ حسن کے مؤلف نے لکھا ہے :[1] گفتم : از مقدمہ شریف بجو : گفتم اور یابی میں بھی اگرچہ اختلاف الفاظ ہے لیکن یہاں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا (اگرچہ کاتب کی ذاتی شوخی عیاں ہے) لیکن از مقدمہ شریف بجو کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اوّل تو مقدمہ شریف ایک مہمل لفظ ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں۔ دوم یہ کہ "گفتم از" کے بعد تینوں الفاظ کو تاریخ کے تعیّن کے لیے شامل کرنا لازمی ہے اور اسی طرح سے مقدمہ شریف بجو سے سال ۷۹۰ھ نکلتا ہے۔ اب اگر ہم مقدمہ کو کاتب کی غلطی مان لیں یا چھاپی اشتباہ جب بھی مقدم شریف بجو میں بجو کو شامل کرنا لازمی ہے اور تاریخ گوئی کے نکتہ دان فضلا اور ماہرین فن اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ تو اس لحاظ سے سال ۷۷۴ھ نہیں بلکہ سال ۷۸۵ھ بنتا ہے۔ دراصل مؤلف تاریخ حسن نے مقدم شریف پر ہی اکتفا کر کے سال ۷۷۴ھ نکالا ہے جو صحیح نہیں

---

[1] واقعات کشمیر صفحہ ۳۶ :

ہے۔ اور صحیح سال ۷۸۰ھ ہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خلاصتہ المناقب کے حوالے سے ہم قبلاً اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت شاہِ ہمدان رح منتقل بود و باش کے لیے کولاب میں جو اُس زمانے میں قریۂ علی شاہ کہلاتا تھا سال ۷۷۳ھ میں پہلی بار وارد ہوئے تھے جب کہ اُن کے طالب صادق نور الدّین جعفر بدخشی بھی اسی سال وہاں آئے اور برادر حق گوی کے ساتھ [جنہوں نے حضرتِ شاہِ ہمدان رح کے کولاب میں وارد ہونے کے بارے میں خواب دیکھا تھا] حضرت شاہ ہمدانؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت رح کولاب سے قیچناہی گاؤں میں چلے گیے۔ جہاں جناب امیر رح کے ایک ارادتمند نے نیا مکان بنوایا تھا۔ اور وہاں تین ماہ قیام کیا۔ اس اثنا میں نور الدّین بدخشی آپ رح کی خدمت میں برابر آتے رہے اور اپنا ایک خواب بھی اخی حق گوی کے توسط سے کہلوایا کہ گویا حضرت شاہ ہمدان رح مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ نے فرمایا تھا کہ چونکہ ہم نے بدخشان اور چین کا سفر کرنے کی نیت کی ہے اس لیے ایسا خواب دیکھا گیا ہے۔ اس کے بعد رجب کے مہینے کا چلّہ گذارا۔ پھر نور الدین جعفر بدخشی سے عیدِ رمضان کے بعد آنے کو کہا۔ اور اس کے بعد نور الدین جعفر بدخشی کو اپنی بیعت میں لے کر آپ بدخشان چلے گئے اور وہاں سے تین ماہ کے اپنے اول سفر (بدخشان) کے بعد ختلان لوٹ آئے اور پھر ختلان میں تین ماہ کے قیام کے بعد چین کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اور چین کے سفر سے واپسی پر بھی حضرت شاہ ہمدان رح براہ راست ختلان لوٹ آئے اور چونکہ نور الدّین جعفر بدخشی اس وقت اپنے وطن بدخشان میں اپنے آبائی گاؤں روسنا چلے گئے تھے اس لیے حضرت شاہِ ہمدان رح کولاب سے اُن سے ملنے کے لیے خود بدخشان تشریف لے گیے۔ خلاصتہ المناقب جیسے معتبر ترین ماخذ میں یہ سارے واقعات، جن کا ذکر ہوا۔ درج ہیں اور ان سے روشن ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہِ ہمدان رح کے یہ سارے مذکورہ بالا سفر جن میں ختلان اور بدخشان اور چین شامل ہیں۔ سال ۷۷۱ھ سے ہی شروع ہوئے اور ظاہر ہے کہ قیاساً آپ سال ۷۷۴ھ میں یا بدخشان میں تھے۔ یا چین کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اور چین میں تب تک آپ قطب الاقطاب حضرت شیخ برہان الدّین ساغرچی رح کی خدمت میں رہے جب

تک بقول خود آپ کے (بحوالہ رسالہ قدریہ) آپ کا متعلقہ کام تکمیل کو پہنچا[۱]۔ چین میں اگر آپ کے قیام کی مدّت ایک سال ہی مان لی جائے جس میں وہ زیارت بھی شامل ہے جو آپ نے حضرت آدمؑ کے دوسرے قدم شریف کے سلسلہ میں ایک بودھ مندر میں کی ننھی اور جیسے سراندیپ سے بودھ پجاری کاٹ کر لے گئے تھے۔ تو بھی حضرت شاہِ ہمدانؒ کی چین سے براہِ راست ختلان میں واپسی سال ۷۷۶ھ میں ہوئی ہوگی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر حضرت شاہ ہمدانؒ سال ۷۷۴ھ میں کشمیر میں نہیں تھے۔ بلکہ ان کا اولین سفر کشمیر سال ۷۸۰ھ میں ہی تھا۔ سیّد محمد خاوری نے جو تاریخ لکھی اس کی تائید میں کسی اور صاحب نے "آمد اینجا علی ثانی" گفت سے یہی سال نکالا ہے اور یہ جیسا کہ کہا گیا ہے[۲] دوسری مرتبہ آپ کی تشریف آوری کے بارے میں نہیں ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر سال ۷۷۴ھ میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں تشریف آوری ہوئی ہوتی تو اس اہم ترین تاریخی واقعہ کا ذکر خلاصۃ المناقب کے مولف نے یقیناً کیا ہوتا بلکہ رفقای سفر میں وہ بھی شامل ہوا ہوتا کیونکہ نور الدین جعفر بدخشی حضرت شاہِ ہمدان کے عزیز ترین ارادتمندوں میں سے تھے۔ اور خود نور الدّین بھی اس واقعہ کو عالم اسلام کا ایک معجزہ سمجھ کر اس کا تفصیل سے ذکر کرتے۔ حضرت علی ثانی امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کی کشمیر میں تشریف آوری کے بارے میں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے البتہ قدیم تواریخ کا حوالہ دے کر لکھا ہے "کہ آپ سال سات سو اکیاسی میں تشریف لائے۔ اور سال سات سو چھیاسی میں واپس چلے گئے۔ لیکن کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ آپ نے بیک وقت کشمیر میں پانچ چھ سال تک قیام کیا ہوگا اس لیے

---

[۱] یہ روئداد اگلے اوراق میں آچکی ہے۔ [۲] تاریخ حسن جلد سوم (اردو ترجمہ موسوم بہ تذکرہ اولیای کشمیر) صفحہ ۱۵، (اس سے سال ۷۸۰ھ نہیں بلکہ ۷۸۱ھ نکلتا ہے لیکن چوں کہ فن تاریخ گوئی کے اصولوں اور پابندیوں میں ایک سال کا فرق اہم نہیں اس لیے سال ۷۸۰ھ کو ہی قبول کیا جاتا ہے۔

اس لیے عقل یہی بتلاتی ہے، جیسا کہ مشہور ہے کہ تین سال تک اس ملک کو اپنے قدوم مبارک سے مشرّف فرمایا اور رُبع مسکون کی تین بار کی آپ کی سیر بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔"[1]

جہاں تک اوّل بار صرف چار ماہ یا چھ ماہ[2] تک قیام فرمانے کا تعلق[3] ہے اس میں تامّل ہے کیوں کہ حضرتؒ سیر و تماشا کے قائل نہیں تھے کہ یہاں چار ماہ کا اپنا قیمتی اور فیض بخش وقت محض ایک سیّاح کی حیثیت سے گذار کر چلے جاتے حضرت شاہ ہمدانؒ کی زندگی ایک با مقصد زندگی تھی۔ اور اس مقدس مُراد و مقصد اور روحانی مأموریت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہی آپ کو خلق کیا گیا تھا اور اسی لیے آپ کی ساری زندگی دنیا کے بیشتر ایسے ممالک کے سفروں میں گزر گئی جو کہ مسافت کے لحاظ سے نہ صرف بہت دور تھے بلکہ اجتماعی تمدن اور دین اسلام سے بھٹک جانے کے لحاظ سے فوری توجہ چاہتے تھے اور یا یہ ایسے ممالک تھے جہاں تبلیغ دین کی مأموریت ایک ترجیحی مأموریت تھی۔ کشمیر دونوں لحاظ سے اہم تھا یہاں دین اسلام رائج ہو چکا تھا لیکن اسلامی اجتماعی تمدن اور شریعت کی صحیح بنیاد قایم نہیں ہو پائی تھی۔ نیز دین اسلام کی توسیع کے لیے آرزو مندانہ حدود تک تبلیغ کی کمی تھی۔ اس لیے حضرت بانی مسلمانی میر سیّد علی ہمدانیؒ کا اوّل بار چار یا چھ ماہ کے لیے اور وہ بھی محض

---

[1] واقعات کشمیر صفحہ ۳۶؛ خواجہ محمد اعظم نے جن تواریخ کو پیش نظر رکھ کے واقعات کشمیر لکھی ان کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ؛ "لکھتے وقت جو کتابیں میرے زیر نظر رہیں وہ ہیں تاریخ سید علی، تاریخ رشیدی مؤلّفہ مرزا حیدر، منتخب التواریخ مؤلّفہ حسن بیگ، تاریخ حیدر ملک چاڈورہ، ریشی نامہ مؤلّفہ بابا نصیب، درجاتِ سادات مؤلّفہ خواجہ اسحاق ناوچہ، اسرار الابرار مؤلّفہ بابا داؤد مشکواتی، تحفۃ الفقرا اور اپنے مرشد روحانی (ملّا محمد مُراد ٹنگ) کے رسالہ جات اور مآثر عالمگیری مؤلّفہ مستعد خان اور دو ایک اور عہد عالمگیری کے اواسط تک متاخرین کی لکھی ہوئی تواریخ۔ [2] تاریخ حسن جلد سوم اردو ترجمہ صفحہ ۱۴؛ [3] تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۷۶۔ اس بارے میں کہ حضرت شاہ ہمدان نے چھ ماہ قیام کیا مؤلف نے ملّا احمد صاحب وقایع کشمیر کا حوالہ دیا ہے۔

سیاحتی سیر و تفریح کے لیے آنا ناقابل یقین ہے۔

جہاں تک حضرت شاہ ہمدانؒ کے فیروز شاہ تغلق اور سلطان شہاب الدّین شہمیری کی باہمی جنگ کو ختم کرواکے ان میں صلح کرانے اور فیروز شاہ کی بیٹیوں کا سلطان کشمیر کے بیٹوں کے ساتھ عقد ہو جانے کا تعلق ہے اس بارے میں ہندوستان کی اہم تواریخ مطلق خاموش ہیں اور کوئی بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا جس سے متذکرہ بالا اہم واقعہ کی تصدیق ہو سکے۔ خود تاریخ دہلی جو فیروز شاہ اور اس کے عہد کے واقعات پر مشتمل ہے اس بارے میں کچھ نہیں بتاتی[1] اس لیے یہ واقعہ مؤرخین کی تحقیق پر انحصار رکھتا ہے اور آئندہ کی تحقیق ہی بتا سکیگی کہ سلطان شہاب الدین شہمیری کی مقامی فارسی تواریخ میں درج فتوحات ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی جنگوں میں کس حد تک اثر انداز تھیں اور کیا واقعی سلطان فیروز شاہ کے ساتھ اس کی جنگ میں جناب شاہ ہمدانؒ نے مداخلت فرما کر اُن کے درمیان صلح کروا کے دونوں کو قریبی رشتہ میں منسلک کر دیا تھا یا یہ محض ایک افسانہ ہے[2] یا متعصّبین

---

[1] واقعات کشمیر نے اس بارے میں لکھا ہے کہ: "اینی حکایت را اکثر تواریخ بنقلم آوردند الّا صاحب تاریخ دہلی کہ در حالات فیروز شاہ است اصلاً التفات باین قصّہ نہ کردہ است" (اس داستان کو سبھی تواریخ نے لکھا ہے سوائے تاریخ دہلی کے جو فیروز شاہ کے حالات میں ہے، اس نے اس قصّہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے)۔ واقعات کشمیر صفحہ ۳۴؛ فیروز شاہ کی بیٹیوں کا حضرت شاہ ہمدانؒ کے توسط سے سلطان شہاب الدّین کے بیٹوں کے ساتھ عقد ہونے کے بارے میں ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۷۳؛ [2] سلطان شہاب الدین نے جو فتوحات کیں اور دور ممالک تک اپنی اور کشمیر اور اہل کشمیر کی عزت افزائی سے قطع نظر کشور کشا ملت کشمیر کی حیثیت میں شہرت عام کر دی اس کی طرف جاوید نامہ میں ڈاکٹر اقبالؒ نے "زیارتِ امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی و ملّا محمد طاہر غنی کشمیری" کے عنوان میں زندہ رود کی زبانی کہلوایا ہے: عمر ہا گل رخت بربست و کشاد ؛ خاک ما دیگر شہاب الدین [سالہا سال تک پھول آتے رہے جاتے رہے لیکن ہماری مٹی سے دوسرا شہاب الدّین پیدا نہیں ہوا] مقامی فارسی تاریخوں میں درج ہے کہ سلطان شہاب الدّین کشمیری نے (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

نے عمداً اس پر پردہ ڈال دیا ہے۔

منقبت الجواہر اور نظم المناقب کے مؤلّفین نے حضرت شاہ ہمدانؒ کی دوسری مرتبہ تشریف آوری کے بارے میں اُن کا راستہ بھی متعیّن کیا ہے۔ نظم المناقب نے بیشتر منقبت الجواہر ملّا حیدر بدخشی سے ہی استفادہ کیا ہے اور یہ قبلاً ہم کہہ چکے کہ نظم المناقب نامی فارسی مثنوی میں حضرت شاہ ہمدان کی دوسری مرتبہ کشمیر میں آمد سے متعلق ۶۹ ابیات ہیں وہ نہ صرف اصل مثنوی کی بحر فاعلاتن مفاعلن فعلن سے مختلف ہیں اور دوسری بحر میں کہے گئے ہیں [فعولن فعولن فعولن فعول) بلکہ کسی اور شاعر کے ہیں۔ جو خادمان تخلص کرتا تھا ورنہ نظم المناقب میں مؤلف غلام محمد نزالی نے حضرت امیر کبیر کی کشمیر میں ایک ہی بار کی تشریف آوری پر اکتفا کیا ہے اور جیسا کہ اگلے اوراق میں نقل ہو چکا، اس کتاب کے مؤلّف کے مطابق حضرت شاہ ہمدانؒ نے دیو نما راہب کو مسلمان بنانے کے بعد دین اسلام کو رواج دے کر سلطان (قطب الدین) کی استدعا کے باوجود بھی کشمیر میں ٹھہرنا قبول نہیں کیا اور ختلان کی طرف روانہ ہوئے اور پکھلی پہنچکر رحمت ایزدی سے پیوست ہوئے۔ دوسری بار کی تشریف آوری کے سفر کشمیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ للہ عارفہ سے بھی ملے اور پھر اس کی ہمراہی میں کیموہ بھی تشریف لے گیے جہاں حضرت شیخ العالم نورالدین رشیؒ کی والدہ سے ملاقات کر کے نورالدین ریشی رحمۃ اللہ علیہ (جو ابھی والدہ کے شکم مبارک میں ہی تھے) سے ہمکلام ہوئے۔ تاریخی اعتبار سے یہ دونوں واقعات بحث طلب ہیں۔ للہ عارفہ کے بارے میں پہلی اطلاعات واقعات کشمیر جیسی معتبر کتاب اور اہم ماخذ سے اُس کی حضرت شاہ ہمدانؒ کے ساتھ ملاقات کے بارے میں یوں دستیاب ہیں: "در قصہ حضورِ اُو در ایام نزولِ رایات ارشاد حضرت

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) لداخ، کاشغر، گلگت، داردو، پشاور، کابل، خراسان ملتان، لاہور، پنجاب، سیالکوٹ، لوہرکوٹ، جموں اور فیروز پور فتح کئے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ حسن جلد دوم (فارسی) صفحہ ۱۷۲-۱۷۳: واقعات کشمیر صفحہ ۳۴: کشمیر (انگریزی) صوفی غلام محی الدین جلد اوّل ص ۹۴-۹۲- لاہور ۱۹۴۸:-

قطب ربانی علی ثانی رضی اللہ عنہ نزد ارباب تحقیق ثابت نہ شد۔[1] (اس للہ عارفہ) کے حضرت قطب ربانی علی ثانی کے (کشمیر میں) ایام نزول مبارک میں حاضر ہو جانے کا قصہ محققین سے ثابت نہیں ہے] للہ عارفہ کی دقیق تاریخ پیدائش اور سال وفات کے بارے میں کوئی صحیح اطلاع دستیاب نہیں اور کتابوں میں یہی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ چودھویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئی اور اسکی حضرت شاہ ہمدانؒ کے ساتھ ملاقات کے بارے میں یہی لکھا گیا ہے کہ روایت ہے اس کی ملاقات پہلی دفعہ شاہ ہمدانؒ کے ساتھ ہوئی تو کہتے ہیں اُن سے دوچار ہوتے ہی وہ ایک نانوائی کے تنور میں جا چھپی لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے زرق برق لباس میں پھر نمودار ہوئی۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو کہا میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک مرد (یعنی مرد خدا) کو دیکھ لیا۔ اس واقعہ کا ذکر منقبت الجواہر اور تنظم المناقب سے ہو چکا ہے اور ان ہی دو منابع سے للہ عارفہ کی زندگی پر مبہم اطلاعات کے سلسلے میں یہ واقعہ عام طور پر نقل کیا گیا ہے[2] اور عام لوگوں کے دل میں نقش پذیر ہے۔ مؤلف تاریخ حسن نے للہ عارفہ کے بارے میں جو تفصیل بیان کی ہے اس میں اس کی حضرت شاہ ہمدانؒ کے ساتھ ملاقات کا مطلق کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ ”حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیان جہان گرد، قدس سرہ، کشمیر تشریف لائے۔ للہ عارفہ سیرہ پور تک ان کے استقبال کو گئی ... حضرت نے للہ کی دیوانگی، بے چینی اور اضطراب کو دیکھ کر دلاسا اور مدارا اور تشفی سے للہ کو سمجھایا کہ دیوانگی اور شوریدگی پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے اور تمہارے مرشد اور مربی سید حسین سمنانیؒ جلد ہی یہاں پہنچنے والے ہیں وہ آئیں گے اور تمہارے واصل بہ خدا ہونے کی پیاس کو بجھائیں گے حضرت سید حسین سمنانیؒ نے یہاں کا رخ کیا اور للہ سات پڑاؤ تک پیشوائی کو گئی۔ ملاقات ہوئی۔ تبادلۂ خیالات ہوا۔ للہ کی بے چینی دیوانگی، ہشیاری اور سکون اور اطمینان میں بدل گئی۔ اور مدعا و مقصد حاصل

---

[1] واقعات کشمیر صفحہ ۳۵ : [2] ملاحظہ ہو : لل دید مؤلفہ پروفیسر جیالال کول۔ کلچرل اکاڈمی جموں کشمیر ۱۹۶۱ صفحہ ۱۰-۱۱ :

ہو گیا[1]..." خواجہ اعظم نے واقعات کشمیر میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے نہ ہی مخدوم جہانیاں رح کے کشمیر میں ان ایام میں آنے کا کوئی ذکر کیا ہے۔ تاریخ حسن نے سیّد جلال الدین مخدوم جہانیاں کے للہ عارفہ کے ساتھ ملاقات کے بارے میں کوئی ماخذ نہیں بتلایا ہے البتہ حضرت شاہ ہمدان رح کے عہد سے قریب ہونے کی معتبر تاریخ وقایع کشمیر مؤلفہ ملّا احمد علامہ کا جو حوالہ دیا ہے اس میں فقط سیّد موصوفؒ کی کشمیر میں آمد کا ذکر ہے للہ عارفہ کے ساتھ ملاقات کا نہیں۔ لیکن حضرت شاہ ہمدان رح کے فرزند ارجمند جناب حضرت میر محمد ہمدانی رح کے ساتھ للہ عارفہ اور حضرت شیخ العالم رح دونوں کی ملاقات اور رفیقیابی کی بات جیسا کہ تذکروں میں درج ہے حقیقت کے قریب ہو سکتی ہے۔ نہ کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کے ساتھ اور نہ سید حسین سمنانی رح کے ساتھ جو بعض مقامی تذکرہ نویسوں کے بقول حضرت شاہ ہمدانؒ سے پہلے اُن ہی کی خواہش سے کشمیر میں آئے تھے۔ شیخ العالم رح نے ابھی عرصۂ وجود میں قدم ہی نہیں رکھا تھا اور للہ عارفہ کی شاہ ہمدان رح سے ملاقات کا قصّہ محض روایت کے طور پر سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے جو بقول مؤلف خواجہ اعظم دیدہ مری تحقیق سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے یہ دونوں

---

[1] ملاحظہ ہو: تاریخ حسن جلد سوم (اردو ترجمہ) صفحہ ۴۴۸-۴۴۹: مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین رح کی کشمیر میں آمد کے بارے میں مؤلف تاریخ حسن نے لکھا ہے "صاحب وقایع کشمیر می نگارد کہ در زمان سلطان علاء الدین جناب سیّد جلال الدین مخدوم جہانیانِ جہانگرد، قدس سرہ، خطۂ کشمیر را بقدوم میمنت لزوم خود طراوت و نضارت بخشیدند و ہمگی دو سہ ہفتہ سیاحت اطراف فرمودہ رجعت نمودند" [وقایع کشمیر کا مؤلف لکھتا ہے کہ سلطان علاء الدین (۷۴۸، - ۷۶۱ھ) کے عہد میں سیّد جلال الدین مخدوم جہان گرد نے خطّہ کشمیر کو اپنے مبارک قدموں سے تر و تازگی بخشی اور کل دو تین ہفتوں میں اطراف کی سیر و تفریح کے بعد واپس چلے گیے] ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد دوم (فارسی) صفحہ ۱۷۰:

[2] ویسے بھی کشمیر میں حضرت شاہ ہمدان رح اور للہ عارفہ کے درمیان ملاقات کا ذکر انیسویں صدی کے دوران عام ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بابا داؤد مشکواتی نے اسرار الابرار میں للہ عارفہ رح کا نیم عریان حالت میں چلنے پھرنے کے دوران حضرت شاہ ہمدان رح سے نہیں بلکہ متعلقہ طایفہ میں سے (خداشناس جماعت میں سے) ایک شخص سے (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

واقعات ایسے ہیں جنہیں قطعی تحقیق اور دلایل و بُراہین سے ثابت ہونے تک تاَمل پذیر قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری کے بارے میں اگرچہ تاریخ گوئی کے ابیات صرف سال ۷۸۰ھ [مقدم شریف اُو، اور، آمد اینجا علی ثانی] سے متعلق ہیں لیکن اُن کی دوسری بار سال ۷۸۵ھ کی تشریف آوری بھی یقینی ہے ۔ اُن کی تینوں بار کی آمد، جیسا کہ تمام مقامی تاریخوں اور تذکروں میں درج ہے اس لحاظ سے بھی یقینی ہے کہ آپ اپنے دور و دراز وطن سے اس اجنبی ملک کشمیر میں اکیلے اور تنہا نہیں آئے تھے بلکہ سات سو اصحاب و احباب اور مبلغین و خدام کا ایک خداشناس قافلہ لے کر آئے تھے اور خود امیر کارواں تھے اتنے بڑے قافلے کو رُوبراہ کر کے فرداً فرداً فرائض و ماموریت سپرد کرنے کا کام فرصت کا طلب گار ہے اور احتیاط و تحمل کا، صبر کا اور مصلحتوں کا ۔ اس لیے تبلیغ کا اساسی فریضہ نہ عجلت میں پایۂ

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) ملاقات ہونے کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں : "تا یکی ازین طایفہ بروی گرزشت" [یہاں تک کہ اسی طائفہ میں سے ایک آدمی کا اس سے گزر ہوا] اگر یہ آدمی حضرت شاہ ہمدانؒ ہوتے تو بابا داوُد مشکواتی یقیناً ان کا نام لیتے لیکن چونکہ ان کو خود اس بارے میں تردّد تھا اس لیے "یکی ازین طایفہ" بڑے احتیاط کے ساتھ لکھ دیا : ملاحظہ ہو اسرار الابرار قلمی نسخہ نمبر ۵۶ ریسرچ ڈپارٹمنٹ حکومت کشمیر : تاریخ رشیدی مؤلفہ مرزا حیدر دوغلت میں بھی للّہ کا ذکر نہیں نرا ین کول عاجز کی منتخب التواریخ میں للّہ عارفہ کا کوئی ذکر نہیں ۔ صوفی غلام محی الدین کی کشیر میں وہی باتیں درج ہیں جو عام کشمیری کو للّہ عارفہؒ کے بارے میں یاد ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ للّہ عارفہ کے صحیح اور دقیق سال پیدائش کا تعیّن آج تک نہیں ہوسکا عبدالوہاب شایق نے تاریخ شایق میں للّہ عارفہ کا سال پیدائش ۷۳۵ھ لکھا ہے ملاحظہ ہو : تاریخ شایق نمبر ۵۷ قلمی نسخہ ریسرچ ڈپارٹمنٹ ؛ بعض تذکرہ نویسوں اور مؤرّخوں نے سال ۷۰۰ھ (۱۳۰۰ء [دیکھئے تاریخ حسن اور تاریخ کبیر حاجی محی الدین مسکین] اور بعضوں نے ۷۳۶ھ [۱۳۳۵ء] لکھا ہے (کشیر اور محب الحسن کی کشمیر انڈر سلطانز) :

تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس میں کسی طرح کی کم توجہی و غفلت کی کوئی گنجائش تھی چونکہ حضرت امیرؒ نے اپنی زندگی میں ہی اپنی ماموریت کی تکمیل کی اور کسی بھی صورت میں انھوں نے اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑا اسلئے کشمیر میں ان کی ماموریت تمام جگہوں کی ماموریت کے مقابلے میں اہم بھی تھی اور دشوار بھی۔ دشوار اس لیے کہ ایک بہت بڑے قافلے کو وادی کے تمام دیہات اور قصبوں میں بھیج کر ان کی تبلیغی مشاغل کی کامیابیوں یا ناکامیوں پر کڑی نظر رکھ کر اُن کو بالآخر کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے خود قلیل عرصہ میں ان جگہوں میں جاکر ذاتی ملاحظات کرنا، مبلّغین کے کام کی رفتار کا جائزہ لینا اور ہر جگہ پر شخصی نگرانی میں خانقاہیں مسجدیں اور دینی علوم سے متعلق کتابخانے قائم کرنا اور پھر خود دارالخلافہ (سری نگر) میں لوٹ کر ان ہی کاموں میں رات دن مشغول رہنا۔ نیز دیگر تبلیغی اور دینی اُمور کو ایک ایسے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا کام جب کہ رسل و رسائل اور نقل و حمل کے وسائل کی سخت دشواری تھی اور کئی اور ذرائع کی کمی بھی تھی وقت اور مجال چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ماموریت الٰہی کے اس اہم ترین اور مقدس کام کو، جیسا کہ آپ اسے خود مکمل ہوتا دیکھنا چاہتے تھے کشمیر میں تین بار آتے جاتے رہے۔ سال ۷۸۰ھ میں اور پھر سال ۷۸۳ھ میں اور آخر میں سال ۷۸۵ھ کے اواخر یا سال ۷۸۶ھ کے آغاز میں۔ ہر بار آپ نے کم سے کم ایک سال کا یا اس سے زیادہ کا عرصہ گذارا ہوگا۔ لیکن سال ۷۸۰ھ سے سال ۷۸۶ھ (جو آپ کی حیات مبارک کا آخری سال تھا) مسلسل چھ سال تک نہیں رہے[1]۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ نے پانچ

---

[1] منقبۃ الجواہر میں لکھا ہے "تاریخ رسیدن جناب سیادت در کشمیر۔ لمؤلفہ

قطب الدین فرمودہ
چو آمد آن شہ از ملک ولایت ٭ گرفت کشمیر از اسلام رایت
بگفتند از کہ یافت تربیت این ملک ٭ از ان گفتم کہ از ان شاہ ہدایت"

(از ان شاہ ہدایت سے ۷۸۵ھ نکلتا ہے جو صحیح ہے جیسا کہ ہم نے بھی آخری بار کی تشریف آوری کے بارے میں لکھا ہے)۔ ملاحظہ ہو: منقبۃ الجواہر، ریسرچ ڈپارٹمنٹ حکومت کشمیر جہاں اس کے دو نسخے موجود ہیں اور متن میں کافی اشتباہات ہیں۔

سال کا عرصہ گذارا لیکن واقعات کشمیر کے مؤلّف نے لکھا ہے کہ آپ نے کشمیر میں تین سال گذارے گویا اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ تین سال سے کم کا عرصہ آپ نے کشمیر میں نہیں گذارا۔ اسی لیے میں نے قیاساً ڈیڑھ سال کے عرصہ کا وقفہ ہر بار کی آمد کے وسط میں رکھا ہے کیوں کہ حضرتِ شاہ ہمدانؒ جیسا کہ ہم نے اُن کے سفروں کے بارے میں دیکھا، بہت زیادہ عرصہ ایک ہی جگہ پر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اپنی بے چین و بیقرار طبیعت سے مجبور تھے، اور نسیم صبح کی طرح ہر اس جگہ پر پہنچنا چاہتے تھے جہاں اُن کو غیب سے اشارہ ملتا یا خود اپنی آرزو اور تڑپ سے وہاں پہنچکر اسلام کی خوشبو کو پھیلانا چاہتے تھے۔ آپ نے ایک بار قریۂ علی شاہ (کولاب) میں مولانا نورالدین جعفر بدخشی سے فرمایا تھا کہ: "دہ ماہ است کہ ہر جا کہ ساکن شدم حضرت حکیم مطلق فرمود کہ برو! مردم را ارشاد کُن..... مارا دہ ماہ ہیچ جا قرار نیست[1] [دس ماہ تک جہاں کہیں بھی رہا خدائے حکیمِ مطلق نے حکم کیا کہ جاؤ! لوگوں کو راہِ حق دکھا۔ دس ماہ تک میں ایک جگہ ٹھہر نہیں پاتا۔]

کشمیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی تبلیغاتی فعالیتوں کا ذکر کرنے سے پہلے کشمیر کے اس عہد کے مختلف اجتماعی حالات اور معاشرتی پہلوؤں کا بیان ناگزیر ہے۔

سلطان محمود غزنویؒ کے شمالی ہندوستان میں سلطنت قایم کرنے کے نتیجے میں کشمیر اسلامی اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگرچہ سلطان زین العابدین شہمیری (۸۲۷ھ ـ ۸۷۸ھ = ۱۴۲۳ - ۱۴۷۳ء) بادشاہِ کشمیر کے معتبر درباری مؤرخ صاحب وقایع کشمیر ملّا احمد علّامہ کے حوالے سے تاریخ حسن کے مؤلّف نے سلطان محمود غزنوی کے چند بار کشمیر آنے کا ذکر کیا ہے لیکن اس بارے میں ابھی مزید تحقیق کرنا باقی ہے[2]

---

[1] خلاصۃ المناقب؛ [2] یہ کام بالخصوص کشمیر کے موجودہ مؤرخین کا ہے کہ سلطان محمود غزنویؒ کے کشمیر میں چند بار آنے کے کشمیری مسلمان مؤرخین کے بیان کو ایک غیر معتبر اور خیالی بات نہ جانتے ہوئے اسے ایک اہم تاریخی واقعہ جان کر اس پر تحقیق کروائی جائے۔ اسی طرح جیسا کہ میں نے قبلاً بیان کیا ہے سلطان شہاب الدین شہمیری پادشاہ کشمیر کی وسیع فتوحات کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) بارے میں بھی تحقیق کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ تاریخ حسن کے مؤلف کے حوالہ جات کو ہم کیسے اور کن دلائل و براہین سے ٹھکرا سکتے ہیں جب کہ اس نے صریحاً سلطان محمود غزنویؒ کے کشمیر میں ورود کے بارے میں یوں لکھا ہے ... "سال ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں سلطان نے قنوج کو فتح کرنے کے ارادے سے اپنے عزم کا گھوڑا دوڑا کر دریائے سندھ کو پار کیا اور وہاں سے سیر و تفریح کی خاطر کشمیر روانہ ہوا۔ سنگرام راج نے مناسب ہدایا اور تحایف پیش کیے اور وہ سلطان کی لطف و عنایت کا مرہون ہوا۔ ایک ماہ اور دو دن تک سلطان سیر کشمیر میں مصروف رہا اور ہیرہ پور کے راستے سے لوٹ گیا..." (تاریخ حسن جلد دوم ۱۱۵)؛ اسی تاریخ کے صفحہ ۱۲۱ پر درج ہے کہ "... جب ترلوچن پال کے تعاقب میں سلطان محمودؒ نے عزم کشمیر کیا تو راجوری کے راستے روانہ ہوا۔ وہاں کے راجہ نے استقبال کر کے عجیب و غریب تحائف پیش کیے۔ سلطان نے خراج شاہی مقرر کر کے اُسے تخت پر برقرار رکھا۔ ترلوچن پال دوسری طرف سے فرار کر گیا۔ سلطان نے وادیٔ کشمیر سے کافی مال غنیمت حاصل کیا اور ایک کثیر جماعت کو دین اسلام سے آشنا کر کے ایک ماہ تک کشمیر میں رہ کر غزنی چلا گیا۔" صفحہ ۱۲۲ پر سال ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) کے واقعہ کی تکرار میں اضافہ کیا ہے کہ "... راجوری کے راستے سے لوٹ کر راجہ سنگرام دیو بھی امر سلطانی کے بموجب فوج کے ساتھ روانہ ہوا..." سال ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء) سے مربوط واقعہ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "... سال ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء) میں سلطان نے سیر کشمیر کا ارادہ فرمایا۔ راستے میں قلعہ لوہر کوٹ کا محاصرہ کیا اس میں ایک مہینہ تک مصروف رہا لیکن چونکہ قلعہ بہت زیادہ مستحکم تھا یہ فتح نہ ہو پایا اور پھر لوٹ کر لاہور چلا گیا..." (تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۲۵)؛ اگر خود کلہن نے راج ترنگنی میں راجہ ہرش بادشاہ کشمیر کو جو سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا اور ظاہر ہے اس طاقتور سلطان کا باجگزار بھی) مسلمانوں کے ساتھ مراسم بڑھانے اور ان کو اپنی فوج کی تربیت دینے بلکہ فوج میں بھرتی کرنے پر راجہ موصوف کو ترشکا کہا ہے۔ (یعنی غیر ہندو یا مسلمان) تو کیا یہ کشمیری تواریخ کے محققین پر اور زیادہ لازم نہیں بن جاتا کہ وہ ہماری تاریخ کے اس اہم عہد کے تاریخی حقائق کو ہمارے سامنے لاکر اور ابھی تک خاموشی اور بے خبری) میں بلکہ فراموشی) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قطع نظر اس کے کہ سلطان محمود غزنوی کی وساطت سے کشمیر میں ایک بڑی جماعت دائرہ اسلام میں آگئی ہے[1] یا حمیم بن سامہ کے کشمیر میں عربوں کی ایک جماعت کے ہمراہ آنے[2] (سال ۹۵ھ ۷۱۳ء) یا تارا پیڈ کے (۶۹۲ء تا ۷۳۵ء) کابل و خراسان میں فتوحات کے نتیجے میں ان جگہوں کے فضلاء و علماء کو جن میں مسلمان بھی تھے اپنے ہمراہ کشمیر لاتے ہے[3] یا خود سلطان محمودؒ کے عہد میں

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی ظلمتوں میں ارادی طور پر دھکیلے گئے اس دور کی اصلیت کو روشن کریں سلطان محمودؒ کے درباری شاعر جنہوں نے ہمیں سلطان محمودؒ کے دور کے بہت سے واقعات سے کیا روشناس کرایا اور ان ہی شعراء کے وجود سے بہت سے حقائق محمودی عہد کے اب ہماری تواریخ کے باب بن چکے ہیں محض لغو اور بے بنیاد ہیں؟ کیا فرخی سیستانی کے ان اشعار کو بیہودہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ ؎

گاہ است کہ یکبارہ بہ کشمیر خرامیم — از دست بتان پہنہ کنیم از سر بت گوی
شاہیست بہ کشمیر اگر ایزد خواہد — امسال نیارامم تا کین نہ کشم زوی

(دیوان فرخی سنیانی چھاپ تہران)

اور محمود کے بیٹے امیر محمد سے کہتا ہے:

باش تا با پدر خویش بہ کشمیر شوی — لشکر ساختہ خویش بہ کشمیر بری (دیوان فرخی سنیانی چھاپ تہران)

[اب وقت آگیا ہے ہم فوراً کشمیر کی طرف روانہ ہوجائیں۔ بتوں کے بازؤں کو چوگان بنائیں اور اُن کے سروں کو گیند۔ کشمیر میں ایک بادشاہ ہے اگر اللہ نے چاہا تو اس سال تب تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب تک نہ اس سے انتقام لوں گا۔]

[ذرا ٹھہرو، تم نے اپنے باپ کے ساتھ کشمیر جانا ہے۔ جو تمہاری فوج آمادہ ہے اُسے تم نے اپنے ساتھ کشمیر لے جانا ہے]

[1] تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۲۱ [2] ایران صغیر یا تذکرہ شعرای پارسی زبان کشمیر مؤلفہ عبدالحمید عرفانی صفحہ ۸ [3] کشیر جلد دوم صفحہ ۸۴/۸۵: تارا پیڈ نے کوئی فتوحات نہیں کی ہیں مؤلف کشیر صوفی غلام محی الدین نے تاریخ حسن کا حوالہ دیا ہے لیکن اس میں فتوحات للتادت سے منسوب ہیں جو تارا پیڈ کا بھائی تھا جس نے کل چار سال اور چوبیس دنوں تک حکومت کی ہے۔ خود للتادت کے ضمن میں اگرچہ تاریخ حسن (جلد دوم) لکھتا ہے کہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسلمانوں کے کشمیر میں آکر مقیم ہونے[1] یا اٹلی کے معروف سیاح مارکوپولو جو سال ۱۲۷۷ء میں (یا سال ۱۲۷۵ء) کشمیر آیا تھا، کے بقول کہ اس نے مسلمانوں کی قابل ملاحظہ تعداد کشمیر میں ساکن دیکھی تھی،[2] یہ بات کاملاً درست ہے کہ قابل توجہ حد تک آٹھویں صدی کے آغاز تک کشمیر میں مسلمانوں کے وجود اور اسلام کی تبلیغ کے بارے میں ہماری اطلاعات بیشتر ناقص اور قیاس وگمان پر منحصر ہیں[3]۔

کشمیر میں اسلام کی ترویج سال ۷۲۵ھ[4] یا سال ۷۲۶ھ[5] (۱۳۲۴ء یا ۱۳۲۵ء) سے ہوئی جب کہ سید عبدالرحمن رح[6] [یا سید شرف الدین یا شاہ بلال] کشمیر میں مبلغین کی ایک جماعت

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) دانشورانِ عاقل، عالمانِ فاضل اور اُستادانِ کامل کو اپنے ساتھ لایا لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ ان میں مسلمان بھی تھے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۸۴)

[1] [2] ایران صغیر یا تذکرہ شعرای پارسی زبان کشمیر مؤلفہ عرفانی صفحہ ۹ [3] اس پر بھی کوئی تحقیق کرنا مسلمان کشمیری مورخین نے گوارا نہیں کیا ہے [4] واقعات کشمیر صفحہ ۳۰ [5] تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۶۶

[6] سید عبدالرحمن شرف الدین رح کشمیر میں بلبل شاہ کے لقب سے زیادہ معروف ہیں۔ اس لقب کے بارے میں تذکرۃ العارفین مؤلفہ بابا علی ریبنہ رح (برادر حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح) کا حوالہ دیتے ہوئے صاحب تاریخ حسن لکھتا ہے "کہ ایک دن حضرت سید شرف الدین رح وضو کرنے کے ارادے سے نہر کے کنارے کھڑے تھے۔ ایک درخت کی ٹہنی پر آپ نے ایک خوش آواز بلبل دیکھی جو نہایت میٹھی آواز میں گا رہی تھی۔ بلبل نے آسمان کی طرف پرواز کی اور حضرت سید رح نے بھی اس کے پیچھے ہوا میں اڑان فرمائی۔ اس بلبل کو پکڑ کر اپنے حجرے میں آ گئے لیکن بلبل انکے ہاتھ سے غائب ہو گئی۔ ایک واقف ساتھی نے اس کی کیفیت دریافت کی تو فرمایا کہ وہ پرندہ میری روح تھی جو آسمان پر چڑھ رہی تھی میں اس کے پیچھے گیا اور اپنی روح کو پکڑ کر لے آیا۔ سائل نے ان کی بات پر اعتماد نہیں کیا اور جب حضرت سید رح پر یہ بات روشن ہو گئی تو انھوں نے اپنا لعاب اس کے منہ میں ڈال دیا جس سے اس پر عالم ملکوت اور لاہوت تک کے حالات روشن ہوئے اور حضرت سید رح نے جو فرمایا تھا اس پر یقین ہو گیا۔ لوگوں میں جب یہ بات پھیل گئی تو انھیں بلبل شاہ کا لقب دیا۔" دیکھئے تاریخ حسن جلد سوم (اردو ترجمہ) صفحہ ۵۔

کے ہمراہ داخل ہوئے۔ اور یہاں کے بادشاہ ٹُہاچُن رگیا۔ لبو رینچن کو، جو بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ مسلمان بنا دیا۔ اور اس کی پیروی میں تمام درباری امرا اور وزرا، دائرہ اسلام میں آ گئے۔ اس بارے میں واقعات کشمیر کے مولف نے لکھا ہے۔

"اگرچہ رنتجو شاہ (یا رینچن شاہ) کے زمانے میں لوگوں کا دین ایک ہی تھا یعنی سب کُفر سے منسلک تھے لیکن مسلکوں کی تعداد اور عقائد و طریق و اطوار کے اختلافات و اقسام بہت زیادہ تھے۔ سبھی ایک دوسرے کے مسلکوں اور عقیدوں کو ردّ کرتے تھے۔ بادشاہ رینچن اس صورت حال کے بارے میں بہت تذبذب میں رہتا تھا اور غور و فکر کرنے کے بعد اور اپنی دانشمندانہ رائے و تدبیر سے کام لے کر بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ اس ملک (کشمیر) کا کونسا عقیدہ یا دین اپنے لیے اختیار کرے۔ اگرچہ ہر طایفہ کے علما، دلائل و براہین کے ساتھ اپنے دین کی خوبیوں کی تاویل و تعبیر بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کیا کرتے لیکن اسکی بلند سوچ اور فکر کے آگے کسی ایک کا تاثر اس کے دل میں نہیں اُترتا تھا۔ اور دن رات وہ کسی صحیح دین کی تحقیق و تلاش میں رہتا بلکہ اس اضطراب کی وجہ سے وہ بے چین اور بڑے خلوص اور بڑی نیک نیتی سے اللہ کے حضور دست بدعا رہتا کہ درست و راست دین کو حاصل کرے اور طریق مستقیم کو پائے۔ کئی راتیں اسی سوز و گداز اور عجز و نیاز میں گذاریں۔ ناگاہ سعادت ازلی کے بموجب اس کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی کہ صبح سویرے جس کسی آدمی پر اُس کی نگاہ پڑے گی ملّت و دین کی تلاش میں سرگرداں یہ بادشاہ اُسی شخص کے دین و آئین کو اختیار کرے گا۔ اس رات میں وہ عجیب حالتوں سے گذرا اور کمال شوق و محبت میں گویا کہہ رہا تھا کہ: "یا اللہ! کیا اس رات کی صبح نہیں ہو گی یا شاید سورج میں روشنی نہیں رہی؟ میں آج کی اس رات میں

سوزِ عشق کی تپش میں جل رہا ہوں مجھ میں غوغای عشق کی طاقت نہیں ہے"۔ صبح سویرے محل شاہی میں نظارہ کرنے کی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور انتہائی بیقراری کے ساتھ فضل و عنایتِ الٰہی پر دل لگا کر اس کی نظر دریا کے قبلہ کی طرف گئی۔ تو دیکھا ایک بلند مرتبہ فرشتہ صورت بزرگ انتہائی وقار اور بُردباری کے ساتھ بیٹھ کے ایک تختہ پر، ساحل دریا پر بڑے ادب و احترام کے ساتھ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور قانون دین کے مطابق بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ بادشاہ نے یہ برگزیدہ طریقۂ عبادت ملاحظہ کر کے اسے پسند کیا اور اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کا اظہار کر کے بلا کسی تامل کے فوراً اُن کے حضور میں حاضر ہوا۔ آداب و احترام لازم بجا لانے کے بعد بادشاہ نے اُن سے اس دین و آئین کی اصل و حقیقت کے بارے میں استفسار کیا آنجنابؒ نے دین و ملت مصطفویؐ کی تفصیل سے وضاحت فرمائی اور شریعت کی بنیادی حقیقتوں اور ضروریات کی توضیح اور دین اسلام کو قبول کرنے سے متعلق اس دین کے اصل و فروع کی بنیادی حقایق کی شرح بیان کی نیز حضرتِ فخر کائنات سید البریّات علیہ افضل الصّلوات والتّحیات کے معجزات بادشاہ کو ترغیب دینے کے لیے واضح کر دیے۔ بادشاہ ان تمام مباحث و دلائل و براہین سے متاثر ہو کر صفائی دل اور پاکی یقین و اعتقاد کے ساتھ اسلام کی سعادت سے مشرّف ہوا اور اسی دن اپنے اہل بیت کو بھی اس خوش بختی تک پہنچا دیا۔ یعنی ؎

عظمت واکرام کے افق سے سعادت کی صبح پھوٹی اور دعوت اسلام کے لیے اجابت کا وقت آ پہنچا۔ دوسرے روز راون چند[1] اور سلطنت کے امراء اور

---

[1] راون چند، آخری ہندو بادشاہ سہدیو کے سپہ سالار رامچندر کا بیٹا تھا جس کی بہن کے ساتھ رینچن نے شادی کی تھی اور کشمیر کا بادشاہ بنتے ہی اسے رعایتیں دے کر اپنا طرفدار بنا لیا تھا ملاحظہ ہو واقعات کشمیر صفحہ ۲۸۔

وزرار اور عوام میں سے کثیر تعداد نے اس بزرگوں کے پیشوا کے دست حق پرست پر اسلام سے مشرف ہونے کی بزرگی و بلندی پائی۔ اس قدوۃ الواصلین امام العارفین مروّج الاسلام کاسر الاصنام حق گاہ، مؤید الدین کا نام حضرت بابا بلبل شاہ تھا قدس اللہ سرہ الاقدس جو متواتر روایتوں کے بموجب اپنے مرشد بزرگوار کے حکم سے طی مکان کر کے وطن سے اپنے اسی وقت یہاں آ گئے۔ بعض کتابوں میں دیکھا گیا کہ مرشد طریقت کے حکم سے اسلام کو پھیلانے کے لیے ان ایام سے پہلے ہی وہ سہہ دیو[1] کے زمانے میں کشمیر میں تھے اور اس امر عظیم کو انجام دینے کے انتظار میں تھے۔ بہر حال آپؒ کے پیر طریقت کے تعین میں اختلاف ہے۔ اگر مورخین آپؒ کو حضرت شیخ الشیوخ شہاب الحق والملۃ و والدین السہروردی قدس سرہ سے منسوب کرتے ہیں بلکہ ان کا متبنیٰ قرار دیتے ہیں اور بعض شاہ نعمت اللہ ولی، جو حضرت شیخ الشیوخ شہاب الحق سے منسوب و مخصوص ہیں کے معنوی فرزندوں میں سے مانتے ہیں لیکن یہ خاکسار راقم حروف محمد اعظم کہتا ہے کہ حضرت شیخ الشیوخ سال ۶۳۲ھ میں رحمت حق ہوئے تھے اور حضرت بابا بلبل شاہؒ کا کشمیر میں ظہور سال ۷۲۵ھ میں ہوا تھا۔ درمیان میں ایک سو تین سال کا فاصلہ ہے[2]۔ اس لیے ان سے براہ راست توسل بعید نظر آتا ہے۔ باقی اللہ کے علم میں ہے۔ اسلام لانے کے بعد رینچن شاہ اور اس کے امرا نے پیر بزرگوار کے حکم سے دریا کے کنارے ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور یہ پہلی خانقاہ ہے جو کشمیر میں بنی

---

[1] سہہ دیو کشمیر کا آخری ہندو بادشاہ تھا۔ جو رینچن کے کشمیر پر قابض ہوتے ہی کشتواڑ بھاگ گیا۔ اور پھر سے قبضہ کرنے کی خواہش سے کشمیر لوٹ آیا لیکن قتل ہوا اور رینچن تخت نشین ہوا (سال ۷۲۵ھ : ۱۳۲۴ء) ملاحظہ ہو: واقعات کشمیر صفحہ ۲۸

[2] کاتب کا اشتباہ ہے۔ اس حساب سے ۹۳ سال کا وقفہ ہے۔

اور اس کے اخراجات کے لیے اور باورچی خانے کے مصرف کے لیے کئی گاؤں مقرر ہوئے۔ جب تک کشمیریوں کی بادشاہت تھی بہت سے غریب اور محتاج اس خانقاہ کے باورچی خانے سے کھانا پایا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے مدفن کے محلے کو بلبل لنگر کہتے ہیں۔ جمعہ کی نماز اور اپنے ہمراہیوں کی جماعت کی نماز کے لیے آپ نے خود ایک جامع مسجد تعمیر کی اور وہاں خود حاضر ہو کر جایا کرتے تھے۔ جس جگہ اب سید السادات حضرت میر ویسی باباؒ کا روضہ ہے وہاں بڑی اونچی اور آراستہ حویلی تھی۔ اور اس پر اور خانقاہ پر چھلے ہوئے پتھر (جنہیں کشمیری زبان میں ڈور کنہ کہتے ہیں) استعمال ہوئے تھے اور یہ پتھر آج بھی مٹی کے نیچے سے نکل آتے ہیں۔ آج کی خانقاہ بظاہر دوسری دفعہ کی تعمیر ہے اس کے بعد اُس جامع مسجد میں آگ لگ گئی اور اس کی جگہ ایک چھوٹی سی مسجد بنی جس کے پتھر اسی مسجد جامع کے آج بھی اس میں نظر آتے ہیں اور رینچن شاہ کی مسجد کہلاتی ہے اور نیم آباد ہے۔ لوگ نماز پنجگانہ اس بقعہ شریف میں ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں۔ رینچن شاہ کی حکومت ڈھائی سال تک رہی۔ سال ۷۲۷ھ میں (سال ۱۳۲۶ء) کل نفس ذائقة الموت کی شربت چکھنے کے بعد اس فانی دنیا سے باقی رہنے والی دنیا میں چلا گیا۔ مرحبا ایسی زندگی اور ایسی موت پر جو بموجب حدیث شریف "جو میری سنت پر رہ کر مرا وہ نیک مرد مرا" ایک دائمی ثواب ساتھ لے کر گیا اور اس ملک میں اسلام کی سنت کی بنیاد مضبوط کر کے اپنے پروردگار کے پاس چلا گیا۔ اس کی قبر خانقاہ کے جنوب میں حضرت باباؒ کے مزار کے صفہ کے باہر ہے۔ حضرت شیخ الانام سراج الاسلامؒ کے حالات کے بارے میں یہ لکھتا ہوں کہ حضرت باباؒ کو بعضوں نے شاہ بلبل کے نام سے یاد کیا ہے اور بعض انہیں شاہ بلال کہتے ہیں۔ آپ ظاہر اور باطنی علوم کے عالم تھے اور کافی سیر و سیاحت کی تھی۔ ظاہر اور باطن میں یگانہ و تنہا تھے۔ کہتے ہیں آپ

کا اصلی نام سید شرف الدین ہے۔ وقت کے کامل عارفوں میں سے تھے۔ اور توکل اور یگانگت و تنہائی میں نادرۂ روزگار تھے۔ مشہور ہے کہ فرماتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ طاقت عطا فرمائی ہے کہ بغیر غذا کے اور سامانِ زندگی کے رہ سکتا ہوں اور رُوح نکل جانے کے بغیر ہی اسی جسم کے ساتھ دوسری دنیا میں پہنچ سکتا ہوں اور اسی جسم کی میں ابدالآباد تک (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) حفاظت کر سکتا ہوں لیکن چونکہ یہ تینوں باتیں سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق نہیں ہیں اس لیے میں ایسا نہیں کروں گا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قایم رہنا اور اس کی اطاعت کرنا میرے نزدیک ہزاروں کرامتوں سے اور خلاف سنّت عبادتوں سے بہتر ہے۔" کھانے پینے کے معاملے میں اور وقت کی رعایت برتنے میں کمالِ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ سال ۷۲۷ھ رسال ۱۳۲۶ء میں جنّت میں تشریف لے گئے۔ کمال تواضع سے آپ نے اپنے رفیق مولانا احمد علامہ کی قبر کے بغل میں اپنے دفن کی جگہ کا تعیّن کیا تھا۔ حضرت بابا کے یہ حالات لکھتے لکھتے اس خاکسار[1] کے دل میں خاصِ الٰہ آپ کی تاریخ وصال کا الہام ہوا کیونکہ ایک تو انکے ہی قرب وجوار میں میری پرورش ہوئی[2] اور دوسرے یہ کہ آپ کی رحلت کی تاریخ آج تک کسی نے کہی نہیں ہے۔ اس لیے اپنی سعادت کیلئے میں نے وسیلۂ وشفاعت ڈھونڈنے کی نیّت سے یہ تاریخ کہہ دی۔

سالِ تاریخِ وصلِ حضرتِ شاہ　بُلبُلِ قدس گفت: خاصِ الٰہ

[حضرت شاہ رحؒ کے سالِ وصال کی تاریخ بلبل قدس نے کہی کہ: اللہ کا خاص]

حضرت بابا بلبل شاہ رحؒ کی قبر شریف دریائے بہت (دریائے جہلم) کے مشرقی

---

[1] یعنی خواجہ محمد اعظم مؤلف واقعاتِ کشمیر

[2] اشارہ ہے خواجہ اعظم دیدہ مری کے حضرت میر بابا اویس کے روضۂ شریف میں آکر عبادت واذکار میں مشغول رہنے کی طرف جو روضۂ شریف، حضرت بلبل شاہ رحؒ کے روضۂ شریف کے قریب واقع ہے۔

کنارے پر ایک لمبی پتھر کی تربت ہے اور مولانا (احمد علامہ) کی قبر اُن کے سامنے ہے اور آپ کے ہمراہی اصحاب اور بعض معتقدوں اور دربار شاہی کے امراء اور وزراء وغیرہ کی قبریں مزار شریف کے بالائی حصے میں ہیں۔ آپ کے ملفوظات میں یہ کلام شامل ہے آپ نے فرمایا: "سالک کا دل جب تک اخلاص و خلوص سے معمور اور اس کی زبان جب تک صحیح و درست نہ ہو، تب تک اس راستے (یعنی راہِ طریقت) کے غول (گمراہ کرنے والے چھلاوے) اُسے ایک منزل پر بھی پہنچنے نہیں دینگے۔" نیز فرمایا: "حرام سے اس طرح سے دور رہنا چاہیئے جس طرح سے پہاڑ پر سانپ سے۔ شک و شبہ والی غذا سے بھی بھاگنا چاہیئے چنانچہ بازار میں میسر حلال غذا میں سے بھی تھوڑا ہی کھانا چاہیئے تاکہ مکروہ کے مخمصے میں نہ پڑ جائے۔ ایک متقی آدمی جب تک حلال میں بھی بعض چیزوں سے پرہیز نہ کرے وہ حرام اور مشکوک چیزوں سے دور نہیں رہ سکے گا۔" حضرت شیخ کرامات کے مظہر تھے اور کمالات کے ایک سمندر تھے۔ اظہار کرامات و کمالات میں کم ہی رغبت رکھتے تھے۔ کشمیر کے تمام لوگوں پر اس پیر روشن ضمیرؒ کے بڑے حقوق ذمہ ہیں اس لیے اُن پر لازم ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی میں کم از کم اُن پر فاتحہ بھیجا کریں، نیز رینچن شاہ پر بھی، اور اس کا نام نیکی کے ساتھ لیا جائے کیوں کہ وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ[۱]۔ بعض تواریخ میں دیکھا گیا کہ حضرت بابا (بلبل شاہ صاحبؒ) نے رینچن شاہ کا مسلمان ہو جانے کے بعد سلطان صدر الدین نام رکھا[۲]۔۔

---

[۱] سورۃ الواقعہ آیت ۱۰-۱۱ [اور جو اعلیٰ وہ تو اعلیٰ ہی درجہ کے ہیں (اور) وہ (خدا تعالیٰ کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں۔ ترجمہ۔ از مولانا اشرف علی تھانویؒ] ؛ [۲] ملاحظہ ہو: واقعات کشمیر ص ۲۹-۳۱ حضرت بابا بلبل شاہ کے بارے میں یہ مفصل اطلاعات ہیں اور اس سے زیادہ کسی بھی تذکرہ میں یا تاریخ میں دستیاب نہیں بلکہ واقعات کشمیر سے ہی بعد کی تواریخ میں نقل کئے گئے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہیں۔ کہیں کم اور کہیں بہت ہی کم۔ جن تواریخ نے واقعات کشمیر سے استفادہ کیا ہے یا ہو بہو نقل کیا ہے ——— اُن میں: گوہر عالم مؤلفہ خواجہ اسلم منعمی، باغ سلیمان مؤلفہ میر سعد اللہ شاہ آبادی، وقایع نظامیہ مؤلفہ ملا محمد نظام الدّین، تاریخ کشمیر مؤلفہ ہدایت اللہ متو، تحقیقات امیری مؤلفہ امیر الدین پکھلیوال، تاریخ ہادی یا خوارق السّالکین مؤلفہ محمد حیات، وجیز التّواریخ مؤلفہ غلام نبی خانیاری، تاریخ حسن مؤلفہ پیر غلام حسن شاہ کامر د (کھویہامی) اور تاریخ کشمیر مؤلفہ ملا محمد خلیل مرجان پوری شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات کشمیر نے بزرگانِ دین کے ساتھ ذاتی عقیدت کی بنا پر حضرت بلبل شاہؒ کا تفصیل کے ساتھ دستیاب منابع کی روشنی میں ذکر کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے وطن، اُن کے نام اور ان کے صوفی سلسلۂ طریقت کے انتساب کے بارے میں نیز ان کی جماعت میں شامل مبلغین کی تعداد وغیرہ جیسی اہم باتوں کے بارے میں، نہ صرف یہ کہ ہماری اطلاعات انتہائی ناقص اور تشنہ ہیں، بلکہ ان اہم مطلوبہ باتوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بعض مقامی تواریخ میں لکھا ہے کہ آپ خراسان کے تھے۔ اور بعض میں ترکستان۔ محبّ الحسن نے کشمیر انڈر سلطانز میں لکھا ہے کہ حضرت بُلبُل شاہ ایک ہزار مبلّغین کی جماعت کے ساتھ راجا سہہ دیو کے زمانے میں یہاں ترکستان سے آئے تھے۔ واقعات کشمیر کی پیروی میں بیشتر مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت بلبل شاہؒ کا سلسلہ طریقت سُہروردی تھا۔ وہ شاہ نعمت اللہ ولیؒ کے مرید تھے۔ لیکن شاہ نعمت اللہ (جن کا نام نور الدّین شاہ نعمت اللہؒ) تھا کرمان (ایران) کے تھے۔ اور وہ خود ہی اپنے سلسلۂ نعمت اللہی کے موجد حضرت بلبل شاہؒ کا انتقال کشمیر میں سال ۷۲۷ھ (۱۳۲۶ء) میں ہوا اور حضرت شاہ نعمت اللہ ولیؒ سال ۷۳۱ھ (۱۳۳۰ء) میں پیدا ہوئے اور سال ۸۳۴ھ (۱۴۳۰ء) میں وفات پائی۔ حضرت شیخ شہاب الدّین سہروردی (وفات ۶۳۲ھ: ۱۲۳۴ء) اور حضرت بلبل شاہ کے درمیان پچانوے برس کا فاصلہ ہے اسلیے یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ آیا حضرت بلبل شاہؒ ترکستان کے تھے۔ یا خراسان کے اور اگر خراسان کے تھے تو کس جگہ کے تھے یا ترکستان میں کونسی جگہ اُن کا وطن تھا۔ نیز وہ کس سلسلۂ طریقت سے منسوب تھے۔ کئی سال پہلے جب میں مشہد (ایران) یونیورسٹی میں "فارسی ادب کشمیر میں" کے موضوع پر تقریر کرنے گیا تھا۔ تو اس موضوع پر کہ حضرت شاہ بلبل شاہؒ خراسان کے تھے یا ترکستان کے تھے میں نے مشہد یونیورسٹی کے دانشکدۂ معقول و منقول کے ایک عالم استاد علی رضا مجتہد زادہ سے بات کی۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

واقعات کشمیر کی اس تفصیل سے صرف یہ ایک نمایاں بات ہمارے لیے روشن ہو جاتی ہے کہ اس عہد کا بودھ مذہب کا کشمیری بادشاہ لہاچن رگیالبو رینچن، حضرت بلبل شاہؒ کے ساتھ عالمانہ بحث و تمحیص اور باہمی مناظرہ کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں شاہی دربار کے امراء اور وزراء اور قریبی رشتے کے لوگ بھی۔ لیکن جیسا میں عرض کر چکا خود بلبل شاہ کہاں کے تھے ان کا نام کیا تھا اور کس سلسلے سے مربوط تھے ابھی تک ہمارے لیے تحقیق طلب مسئلے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق وہ ایک ہزار مبلّغین پر مشتمل جماعت کے ساتھ کشمیر میں آئے تھے[1]۔ لیکن حضرت

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) (سنا ہے اب وہ مرحوم ہو گئے ہیں۔ اللہ انھیں مغفرت کرے) تو انھوں نے فوراً ہی ایک کتاب جو غالباً خراسان کے مبلغین کے بارے میں تھی کو قریب آدھے گھنٹے تک دیکھا لیکن اس میں سید شرف الدین یا سیّد عبد الرحمٰن، جو تبلیغ دین کے لیے خراسان سے کشمیر گئے تھے (آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں) کا نام نہیں تھا۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ شاید حضرت بلبل شاہؒ ترکستان سے یہاں آئے ہوں (اگرچہ یہ یقینی نہیں اور ممکن ہے خراسان سے ہی آئے ہوں اور خراسان کے مبلغین میں اگر ان کا نام نہیں تو یہ کوئی آخری فیصلہ بھی نہیں) لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کے بارے میں واقعات کشمیر کے معتبر اطلاعات اور مختصر سے ذکر کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں جانتے اگرچہ ان اطلاعات میں بھی تاریخی غلطی ہے جیسا کہ میں نے ذکر کیا۔ اس لیے صحیح تحقیق سے ہی ہماری اطلاعات میں نہ صرف اضافہ ہو گا بلکہ بہت سی بے اساس باتوں کو رد کیا جا سکیگا [شاہ نعمت اللہ ولیؒ، جن کے خوبصورت مزار واقع ماہان (کرمان) پر میں حاضر ہوا ہوں، کے حالات طرائق الحقائق مؤلّفہ معصوم علی شاہ تہران ۱۳۱۹ھ جلد سوم اور ترجمہ احوال شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی تصحیح ان اوبن تہران ۱۳۳۵ شمسی میں تفصیل سے درج ہیں۔ خزینۃ الاصفیاء مؤلفہ مولوی مفتی غلام سرور لاہوری جلد اول طبع کانپور میں بھی ان کے حالات درج ہیں]۔

[1] ملاحظہ ہو: کشمیر انڈر سلطانز مؤلّفہ محب الحسن طبع ایران سوسائٹی کلکتہ 1959 صفحہ ۳۹ (مؤلّف فاضل نے مقامی فارسی تواریخ سے صرف نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کشمیر کے مسلم عہد کے بیشتر تاریخی واقعات کے متعلق تحقیق کرنے کی زحمت سے بے نیاز رہے ہیں۔

بلبل شاہؒ نے اس مبالغہ آمیز تعدادِ مبلّغین سے کیا کام لیا یا گر اتنی بڑی تعداد ان کے ساتھ نہیں تھی بہت ہی کم بھی مان لیں، پھر بھی راہ خدا کے اُن مجاہد عالموں، فقیہوں، دین داروں متّقیوں اور محسنوں نے کیا تبلیغی اُمور وادی کشمیر میں انجام دیئے اس کے بارے میں ہماری تاریخ قطعاً خاموش ہے۔ ہم تو جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اُن کے صحیح نام اور وطن اور مسلک سے بھی بے خبر ہیں۔ مقامی تاریخوں میں درج ہے کہ سال ۷۲۵ھ میں (۱۳۲۴ء) رینچن تخت نشین ہوا اور ظاہر ہے اُسی سال وہ مسلمان ہوا کیونکہ سال ۷۲۵ھ میں ہی حضرت بلبل شاہؒ کا کشمیر میں ظہور ہوا اور سال ۷۲۷ھ (۱۳۲۶ء) میں ان کی وفات ہوئی، تو اس دو یا اڑھائی سال کی قلیل مدت میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دینِ اسلام کی تبلیغ میں کیا کچھ ہوا اس کی تفصیل پردۂ اخفا میں ہے۔ بعد کے مؤرخوں نے بھی اس بارے میں نہ کوئی تحقیق کی اور نہ ہی کوئی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ دین اسلام کے تازہ ہی رواج پانے اور اسے مستحکم بنانے کی غرض سے نومسلم بادشاہ سلطان صدر الدّین (جو کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا) نے مسجد بنائی اور حضرت بلبل شاہؒ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی۔ واقعات کشمیر سے قطع نظر کشمیر کی خانقاہوں اور اہم مزاروں سے متعلق جو قیمتی اطلاعات احسن التواریخ[1] میں درج ہیں، ان دو خانقاہوں کے بارے میں وہ یہ ہیں کہ سلطانِ موصوف رینچن شاہ (یا سلطان صدر الدّین) نے:

> "برای بود و باش خود عمارتی متین از سنگہا تراشیدہ و بہ جای روضۂ مبارکہ حضرت سیّد السّادات میر محمد امین اویس منطقی رحمۃ اللہ علیہ احداث کردہ بود، بہ نزدیک آن جانبِ شرقی متصل عالی کدل برای جمعہ و جماعت مسجد جامع کہ احاطۂ آن تا بڈھ گیر بنا نمود بعد ازان مسجد جامع بہ حادثۂ آتش مشتعل

---

[1] ملاحظہ ہو: احسن التّواریخ مؤلّفہ مفتی محمد صدر الدین قلمی نسخہ کتاب خانۂ مفتی اعظم مفتی محمد بشیر الدّین مہاراج گنج سری نگر کتاب نمبر ۳۲۸۔ (مفتی صدرالدین موصوف کا انتقال ۱۰؍ شوال ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء کو ہوا)۔

گشتہ بہ جای آن مسجدی۔ کہتر از سنگ تراشیدہ تعمیر کردہ اند کہ تا عہد خالصہ معمور، حال جمع نزولات [در سال ۱۳۵۱ھ خارج از نزولات شدہ نماز خوانی در مسجد مذکورہ کردہ می شود۔ ضمیمۂ نوامیہ]":

[سلطان صدر الدین رینچن شاہ نے اپنے رہنے کی خاطر چھلے ہوئے پتھروں کی ایک محکم عمارت، حضرتِ سیّد السّادات میر محمد امین اُویس منطقی علیہ الرّحمہ کے روضۂ مبارک کی جگہ پر تعمیر کروائی تھی۔ اور اس کے قریب ہی مشرق میں عالی کدل[1] کے ساتھ جمعہ اور جماعت کے لیے جامع مسجد بھی بنوائی جس کا احاطہ بدھ گیر[2] تک تھا۔ اس کے بعد یہ جامع مسجد آگ کے حادثہ کا شکار ہو گئی اور پھر اس کی جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر ہوئی چھلے ہوئے پتھروں کی جو عہد خالصہ تک آباد تھی اور اب محکمۂ نزول میں ہے [سال ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں محکمہ نزول سے آزاد ہو گئی اور اب اس میں نماز خوانی ہو رہی ہے۔ مفتی قوام الدّین کا ضمیمہ]:

خانقاہِ بُلبُل شاہ کے بارے میں مؤلّفِ احسن التواریخ لکھتے ہیں:

"تا عہد ۷۲۵ھ در بلاد کشمیر اسلام شایع نہ بود۔ در آن وقت رینچن شاہ بدست حضرتِ سیّد عبد الرّحمٰن قلندر را الملقّب بہ بلبل شاہ رح با جم غفیر اسلام قبول نمود بہ امر رہبر خود بر کنارۂ دریای بہت خانقاہی متین بہ اسراف زرِ کثیر احداث نمود و این اوّل خانقاہی است کہ در کشمیر بنا یافت و چند مواضع برای مطبخ و خادمان و خانقاہ معیّن نمود تا عہد چکان لنگر جاری بود، بنا بر آن بہ بلبل لنگر مشہور گردید۔ در ۱۰۰۳ھ خانقاہِ مذکور بہ واقعۂ آتش سوختہ باز تعمیر یافت۔ حال منہدم، جمع نزولات [در سال ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۸۹ بکرمی

---

[1] کدل کشمیری میں پُل۔ دریائے جہلم پر جو پُل بنے ہیں اُنمیں ایک کا نام عالی کدل ہے جسے سُلطان علی شاہ شہمیری (جو سلطان زین العابدین بڈشاہ کا بھائی تھا) نے بنایا تھا۔

[2] اب عالی کدل کے ساتھ یہ ایک بڑے محلّہ کا نام ہے۔

مہاراجہ ہری سنگھ مسجد مذکور را آزاد نمودہ و خارج از نزولات فرمود ــ ضمیمہ قوامیہ]:

[سال ۷۲۵ھ (۱۳۲۴ء) تک ملک کشمیر میں دین اسلام نہیں پھیلا تھا۔ اس عہد میں رینچن شاہ نے حضرت سید عبدالرحمٰن قلندر رحمۃ[1] کا لقب بلبل شاہ تھا کے ہاتھ پر ایک بھاری تعداد کی جماعت کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ اپنے مرشد کے حکم سے اُس (رینچن شاہ) نے دریائے جہلم کے کنارے پر کافی رقم خرچ کر کے ایک مضبوط خانقاہ بنائی اور یہ پہلی خانقاہ ہے جو کشمیر میں تعمیر ہوئی اور خانقاہ کے باورچی خانہ اور خادموں اور خانقاہ کے لیے کئی گاؤں مقرر کئے۔ چک بادشاہوں کے زمانے میں یہ لنگر جاری تھا۔ اور اسی لیے بلبل لنگر کے نام سے مشہور ہوا۔ سال ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں مذکورہ خانقاہ آگ کے واقعہ میں جل گئی اور پھر تعمیر ہوئی۔ اس ذقت گر چکی ہے اور محکمۂ نزول میں ہے [سال ۱۳۵۱ھ مطابق سال ۱۹۸۹ء بکرمی (۱۹۳۲ء) میں مہاراجہ ہری سنگھ نے مذکورہ مسجد کو آزاد کر کے محکمۂ نزول سے خارج کر دیا ــ ضمیمہ مفتی قوام الدین]

بلبل شاہ کے کشمیر میں دو یا ڈھائی سال کی مدّت کے قیام کے دوران اس ایک مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کے سوا اور کچھ معلوم نہیں۔ آپ کے ایک برگزیدہ ساتھی ملّا احمد علامہ کی رفاقت سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کے ہمراہ مبلغین علماء کی ایک جماعت بھی تھی جو دین اسلام کو یہاں پھیلانے کے مقصد سے آئی تھی۔ لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ کسی بھی تاریخ میں جو اس دور کے بعد لکھی گئی بلبل شاہ اور ان کے ہمراہ مبلغین کے بارے میں تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ مقامی ہندو مؤرخین بھلا اس کا ذکر کیا کرتے[2]، بعد کے مقامی مسلمان مؤرخین نے

---

[1] حضرت بلبل شاہ رح کے بارے میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ہماری اطلاعات اس قدر ناقص اور نہ ہونے کے برابر ہیں کہ ابھی تک کم سواد اُمّی عوام میں مشہور ہے کہ آپ رح ایک مطلق مدہوش قلندر اور مجذوب تھے اس حد تک کہ بلبلوں نے آپ کے لمبے اور گھنے بالوں میں اپنے آشیانے بنا لیے تھے جن کو سر پر لے کر گویا اسی حالت میں وہ سری نگر کی راہوں میں چلتے پھرتے تھے اور اس حالت سے بے خبر تھے۔ [2] جبرن راج مصنف (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

بھی اس بارے میں تلاش و تحقیق نہیں کی اور اس کے نتیجہ میں ہم اس دور کے اُن مفید اور اہم اطلاعات سے ابھی تک بے نصیب ہیں جو دینِ اسلام کے باضابطہ اور منظّم طریقے پر آغاز کے سلسلہ میں ہمارے پاس ہونے چاہیئے تھے[1]

لیکن حضرت بلبل شاہؒ کی وفات (۷۲۷ھ : ۱۳۲۶ء) سے حضرت شاہ ہمدانؒ کی سال ۷۸۰ھ ۷۸۱ھ (۱۳۷۸-۸۹ء) میں کشمیر میں آمد تک کے ۵۳ سال تک کے طویل عرصہ کو بالکل ہی بے ثمر عرصہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی دینی سرگرمیوں سے بالکل ہی خاموشی اور غیر دلچسپی کی مدّت سمجھا جا سکتا ہے۔ سلطان صدرالدین رینچن شاہ کی وفات سے ۷۲۷ھ حضرت شاہ ہمدانؒ کے کشمیر میں معاصر بادشاہ سلطان قطب الدین شہمیری کی تخت نشینی تک (سال ۷۸۰ھ ۱۳۷۸ء) کے اس عرصہ میں بدستور مسلمان بادشاہوں نے سوائے پندرہ سال کی ہندو مذہب والے اودین دیو کی حکومت

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) دوِتیا راج ترنگنی (منکھا کی سری کنٹھ چرتیا پر بھی تفسیر لکھی ہے) شری ور مصنف راج ترنگنی (اور یوسف زلیخای جامی کا مترجم بنام کتھا کوتکا) پراجیہ بھٹ مصنف راجاولی پاتک اُشو کا راجاولی پاتک کی تکمیل جون راج نے سلطان کشمیر رینچن شاہ کے اسلام قبول کرنے پر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور خود کو خوش فہمی میں رکھتے ہوئے یہ غلط بیانی کی کہ برہمنوں نے اسے شیو مت میں لینے سے انکار کیا۔ کشمیری برہمن ایک غیر مذہب کے بادشاہ کو (نہ کہ کسی عام آدمی کو) اپنے مسلک میں نہ آنے دے کر اپنے مذہب کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے سے انکاری ہوئے ناقابل یقین مصلحت اندیشی ہے۔

دراصل جب رینچن شاہ مسلمان ہوا تو یہ حقیقت برہمنوں کے بغض و حسد کا باعث بنی۔ ملاحظہ ہو: فٹ نوٹ صفحہ ۳۹ کشمیر انڈر سلطانز مؤلفہ محب الحسن۔

[1] بعد کی اہم تواریخ وقائع کشمیر (ملا احمد) تاریخ نادری مؤلفہ ملّا نادری (جو اب ناپید ہے) تاریخ کشمیر مؤلفہ قاضی ابراہیم فرزند حمید الدین، تاریخ سید علی فرزند سید محمد ماگرے، بہارستان شاہی (مصنف نامعلوم) منتخب التواریخ مؤلفہ حسن بیگ خاکی، تاریخ کشمیر مؤلفہ حیدر ملک چاڈورہ، نوادر الاخبار مؤلفہ عبد الصبور غافل، اور کئی دیگر تواریخ جو مسلمان مورخین نے لکھی ہیں بلبل شاہ کی تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں خاموش ہیں۔ خدا کرے ایسے منابع کبھی کسی وقت کہیں مل جائیں جن کی وساطت سے اس اہم اسلامی دور کے آغاز کے مجاہدینِ اسلام کی کشمیر میں سرگرمیوں اور ان کے ناموں اور رفیقوں کے بارے میں تفصیلی حالات ہم تک پہنچ جائیں۔

کے سال ۷۲۸ھ (۱۳۲۶ء) سے سال ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) تک جس میں ہندو مذہب کی کوٹہ رانی کا بھی مختصر دورِ حکومت شامل ہے] حکومت کی اس[1] پورے عرصے میں یقیناً دین اسلام کو مزید استوار بنانے کے لیے اقدامات ہوئے ہونگے ورنہ ڈھائی برس تک غیر مسلموں کے اکثریت والے ملک میں ایک نو مسلم بادشاہ کی حکومت قائم کی ہوئی حکومت اور اسکا دین کہاں تک آگے بڑھتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت بلبل شاہ ـــ کے ساتھی مبلغین ایک عرصہ تک تن دہی سے شب و روز سرگرم عمل رہے اور انھوں نے اپنے روحانی پیشوا کے روشن کئے ہوئے چراغ کے نور کو بجھانے سے نجات دلانے اور اس روشنی کو اطراف میں پھیلانے کے لیے سخت کوشش کیں۔ اگر اس طرح کی کوششیں درمیان میں نہ ہوتیں تو بلا شبہ اسلام آتے ہی واپس اُسی طرف لوٹ چکا ہوتا جہاں سے بُلبل شاہؒ اور اُن کے ہمراہی مجاہدین آئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی شاملِ حال تھی لیکن سلطان۔ صدرالدین ریچن شاہ کی وفات کے فوراً بعد پندرہ سال تک حکومت اودین دیو کے ہاتھ میں رہی جو کبھی کشمیر چھوڑ کر بھاگا اور کبھی لوٹ آیا اور ہر بار حکومت اُسی کے پاس رہی جب کہ شاہ میر کی جرأت و دلیری نے ہی ہر بار حکومت کشمیر کو اس کے لیے سنبھال کے رکھا۔ پندرہ سال کا یہ عرصہ بھی دین اسلام کی ترویج کا زمانہ رہا اور یہ ترویج اُن ہی مسافرانِ راہ خدا کے ہاتھوں ہوئی جو حضرت بلبل شاہؒ کے ساتھ وادی کشمیر میں داخل ہوئے تھے چنانچہ ۵۳ سال کے عرصے میں (جب تک حضرت شاہ ہمدانؒ کی اوّلین بار تشریف آوری ہوئی) کئی اہم مسلمان ریشی بھی معرفت الٰہی اور توحید ایزدی کی تبلیغ کے نتیجے میں ہی اس خاک سے اٹھے جن میں خلاص من ریشی، پلاسمن ریشی، یاسمن ریشی، للہ عارفہؒ اور حضرت نورالدین ریشیؒ قابل ذکر اور معروف ہیں۔ سلطان جمشید (سال تخت نشینی ۷۴۷ھ؛ ۱۳۴۶ھ؛) جو سلطان شمس الدین شہمیر (۷۴۳ھ - ۷۴۷ھ؛ ۱۳۴۲ء - ۱۳۴۶ء) کا بیٹا تھا کے عہد حکومت میں تین مشہور ریشیوں کے ظہور کے بارے میں واقعاتِ کشمیر کے مؤلف نے لکھا ہے کہ:[2]

---

[1] مقامی فارسی تواریخ۔ واقعات کشمیر صفحہ ۳۱-۳۲؛ تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۶۰-۱۶۸؛

[2] ملاحظہ ہو واقعات کشمیر صفحہ ۳۳۔

".... در عہد سلطنت او خلاص من و پلاسمن و یاسمن سہ برادر بودند کہ در دور ظہور اسلام اعلام مجاہدہ برسم ریشیان افراختہ اند و بکمال ریاضت و عبادت خود را از سایر صلحا ممتاز ساختند۔ از سہ برادر کہ کلان و کامل است خلاصمن بودہ۔ عمری بسیار یافت و ہرگز بہ راہ حرص و ہوا نشتافت و یک موی ریش او سفید نہ شد۔ بعدہ پلاسمن کہ عمرش قریب بہ عمر برادر بودہ واند کی مو سفید کردہ بدستور برادر مستقیم الحال گذرا یندہ۔ بعدہ یاسمن کہ ہم موی را سفید کرد ہم عمر کمتر داشت موافق قصہ مشہور از دست نندی نام لولی فریب خورد ...... آخر الامر باز تائب شد و نندی را ہم جذبہ کردہ بہ راہِ حق آورد ....."

[اس کے زمانہ سلطنت میں خلاصمن اور پلاسمن اور یاسمن تین بھائی تھے جنہوں نے ریشیوں کے طرز پر اپنی مجاہدت ظہور اسلام کے دور میں شروع کی اور کمالِ عبادت و ریاضت سے اپنے آپ کو تمام صالحین سے ممتاز بنا دیا۔ ان تین بھائیوں میں سب سے بڑا اور کامل ریشی خلاصمن تھا۔ اس نے لمبی عمر پائی اور مطلق حرص اور نفسانی خواہش کے پیچھے نہیں رہا اور اس کی داڑھی کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا۔ اُس کے بعد پلاسمن تھا جس کی بھی عمر تقریباً بھائی کے برابر ہی تھی اور اس کے تھوڑے سے بال سفید ہو گئے تھے اور بھائی کے کہنے سے درست و راست روی کی حالت میں عمر گزاری۔ اس کے بعد یاسمن ریشی تھا جس کے بال بھی سفید ہوئے اور عمر بھی چھوٹی تھی مشہور داستان کے بموجب ایک نُندی

---

[1] ان تینوں ریشیوں کے بارے میں ملاحظہ ہو: تاریخ حسن جلد سوم (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۱۰۔ ۱۱۱ - ۱۱۲: - تاریخ حسن کے مؤلف نے پلاس من ریشی کو خلاص من اور یاسمن ریشی کا باپ لکھا ہے اور وہ بیجبہارہ کے کریوہ پر دفن ہے۔ خلاصمن نے سلطان شمس الدین کے زمانے میں وفات پائی اور باپ کے ساتھ ہی کریوہ بیجبہارہ میں دفن ہوا اور یاسمن بھی اُسی جگہ اپنے بھائی کے پاس دفن ہے اور اس نے سلطان علاء الدین کے عہد میں وفات پائی۔

نام کی مُطربۂ طنّاز سے فریب کھایا.... اور بالآخر توبہ کیا اور زندی کو بھی جذبۂ الٰہی سے راہ حق پر لے آیا....]

ان تین ممتاز ریشیوں کے علاوہ معرفتِ الٰہی اور توحیدِ ایزدی جو دینِ اسلام کی براہ راست تبلیغ کا نتیجہ تھے، کی تخلیق دو اور برگزیدہ اولیا تھے جو للہ عارفہ رح اور حضرت شیخ العالم نورالدّین ریشی رح کے نام سے معروف ہیں۔ ان کی کمالِ ریاضت و مجاہدت، ان کی عالمگیر اخوّت کی تعلیمات، ان کا عرفانِ الٰہی کے رموز و نکات سے معمور متصوفانہ کلام، اور ان کا تقدّس ان کی تکریم اور احترام کے تاثّرات ہر کشمیری کے دل میں نقش پذیر ہیں[1]

حضرت شاہ ہمدان رح کے دو چچیرے بھائی[2] سیّد حسین سمنانی رح اور سیّد تاج الدین رح سمنانی بھی دینِ اسلام کو کشمیر میں تقویت دینے کے لیے آئے۔ سیّد تاج الدّین سلطان شہاب الدین کشمیری کے عہد سلطنت میں سال ۷۶۲ھ (۱۳۶۰ء) میں تشریف لائے۔ سلطان

---

[1] کلچرل اکاڈمی سری نگر نے ان دونوں کشمیری اولیاءاللہ کی زندگی پر کئی کتابیں اور خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو: لل دید۔ پروفیسر جیالال کول ۱۹۷۵ ایڈیشن اور ۱۹۶۱ ایڈیشن، نورنامہ مرتبہ محمد امین کامل ۱۹۶۵ اڈیشن: للہ عارفہ رح کو کشمیری عام طور پر لل دید کہتے ہیں۔ دید کشمیری لفظ ہے اور بزرگِ معمّر اور صاحب عزت خاتون کو کہتے ہیں۔ للہ عارفہ رح بھی بیجبہارہ میں دفن ہے اور حضرت نورالدّین کا روضہ شریف چرار نامی گاؤں میں ہے جہاں ہر سال ۲۶ رمضان المبارک کو جو ان کا روز وصال ہے عُرس ہوتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو واقعات کشمیر صفحہ ۳۴۔ ۱۳۵ اور تاریخ حسن جلد سوم (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۱۳ اور ۴۴۷:

[2] عبدالحمید عرفانی نے ایران صغیر یا تذکرہ شعرای فارسی زبان کشمیر میں لکھا ہے کہ دونوں حضرات شاہ ہمدان رح کے ماموں زاد بھائی تھے۔ اگر یہ صحیح ہو تو پھر حضرت شاہ ہمدان رح کی والدۂ ماجدہ محترمہ سمنان کی تھیں۔ لیکن واقعات کشمیر، تاریخ حسن اور دیگر مقامی مورخین نے لکھا ہے کہ یہ دونوں شاہ ہمدان رح کے چچیرے برادر تھے۔

[3] قدم رنجۂ سیّد نیک رو سے تاریخ نکلتی ہے۔ (۷۶۲ھ) ملاحظہ ہو واقعات کشمیر صفحہ نمبر ۳۸ خرد گفت تاریخ شریف آں: قدم رنجۂ سید نیک روم، تاریخ حسن جلد سوم (اردو ترجمہ) صفحہ نمبر ۶۔

شہاب الدّین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ اور شہاب الدین پورہ (موجودہ شہام پورہ۔ نوہٹہ سری نگر) میں اپنے شاہی محل کے پاس انکے لیے بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی۔ سلطان نے ایک خانقاہ بھی ان کے مریدوں اور خادموں کے لیے بنائی جہاں ریاضت و عبادت کا سلسلہ زور و شور سے جاری رہا۔ پرگنہ ناگام خانقاہ مذکور کے اخراجات کے لیے مقرّر تھا۔ سلطان شہاب الدّین ان کے روحانی کمالات اور خُدا دوستی کا اس قدر معتقد تھا کہ مقدمات کے فیصلوں اور جنگی مصلحتوں میں بھی آپ کے مشوروں سے استفادہ کرتا تھا بلکہ سلطان موصوف کو جنگوں میں جو کامیابیاں ہوئیں اُن کو آپ ہی کی نیک دُعاؤں کا نتیجہ جانتا تھا۔ ویسے سیّد تاج الدین شہمیری یہاں سیّد مسعودؒ کی سفارش پر آئے تھے۔ سیّد مسعودؒ نے اپنے مرشد طریقت کے حکم سے سیر و سیاحت جب شروع کی تو سلطان شہاب الدّین شہمیری کے عہد میں (۷۶۱ھ ۷۸۰ھ : ۱۳۵۹ء ۔ ۱۳۷۸ء) وہ کشمیر بھی آئے ان ایّام میں سلطان کا بیٹا شہزادہ حسن میرزا اختّناق کی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے قریب الموت تھا۔ سیّد مسعودؒ کی دعاؤں کی برکت سے وہ شفایاب ہوا۔ اگرچہ بادشاہ نے سیّد مسعودؒ کو کشمیر میں ہی قیام کرنے کی استدعا کی لیکن انھوں نے اپنے مُرشد طریقت کی طرف سے کسی ملک میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ کی استدعا کو قبول نہیں کیا۔ سلطان کی رغبت سے متاثر ہو کر سیّد مسعودؒ نے وطن لوٹ کر وہاں سے اپنے رفیق سیّد تاج الدّین کو کشمیر آنے کی ترغیب دی اور وہ اپنے اہل بیت کے ہمراہ سال ۷۶۲ھ میں یہاں تشریف لائے[1]۔

سیّد حسین سمنانیؒ سال ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) میں وارد کشمیر ہوئے[2]۔ کہا جاتا ہے کہ آپ پیر

---

[1] تاریخ حسن جلد ۳ (اردو ترجمہ) صفحہ ۷-۸ ؛ [2] تاریخ حسن جلد ۳ (اردو ترجمہ) صفحہ ۹ ؛ واقعات کشمیر میں آپؒ کے کشمیر میں آنے کا سال تاریخ درج نہیں ہے۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ آپؒ اور سیّد تاج الدّینؒ [جو حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے والد ماجد حضرت میر شہاب الدین کے برادر زادہ سیّد محمد (یعنی بھتیجے) کے فرزند تھے۔ اس حساب سے دونوں سیّد زادگان حضرت شاہ ہمدان کے چچیرے بھائی (ربانی حاشیہ اگلے صفحے پر)

پنچال کی راہ سے آئے اور پیر پنچال پر ہی ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرا کر آپ کے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور پیر پل کے مشہور واقعہ سے ہیرہ پور پہنچے[1] اور وہاں

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) سید محمد کے فرزند تھے نہ کہ براہِ راست شاہ ہمدانؒ کے چچیرے بھائی] حضرت شاہ ہمدانؒ کے حکم سے راستے کی حالت اور کشمیر کے احوال کی تحقیق کرنے کے لیے وارد کشمیر ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ سیّد تاج الدین جیسا کہ اوپر بیان ہوا بقول مؤلف تاریخ حسن اور واقعات کشمیر سال ۷۶۲ھ (۱۳۶۰ء) میں آئے اور اُن کے ساتھ سیّد حسین سمنانیؒ اس وقت نہیں تھے بلکہ سید حسین سمنانی سیّد تاج الدین کے تیرہ سال بعد [یعنی سال ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) آئے۔ اس لیے تحقیق راہ اور حال واحوال کشمیر کو جاننے کے لیے وہ شاہ ہمدانؒ کی طرف سے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ ان کی طرف سے گویا نمائندے بن گئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دونوں سیّد زادگان کشمیر میں ہی قیام پذیر رہے۔ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ ان کی طرف سے راستے اور احوال کشمیر کی تحقیق پر مبنی بیان ملنے پر ہی حضرت شاہ ہمدانؒ کشمیر میں تشریف لائے تھے۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا واقعتاً ان دونوں حضرات کی طرف سے جبکہ ان کے یہاں آنے کی مدت میں ایکدوسرے سے تیرہ سال کا فاصلہ ہے راہ اور حال واحوال سے متعلق کوئی جواب شاہ ہمدانؒ کی خدمت میں گیا بھی تھا یا نہیں۔ واقعات کشمیر اور تاریخ حسن کے مؤلّفین نے لکھا ہے کہ میر سیّد حسین سمنانی کو بعض سامانی کہتے ہیں۔ سمنان ایران کا ایک شہر ہے اور فتنہ کی وجہ سے وہ ہندوستان میں سامانہ میں رہے جو دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے اور اس لیے سامانی کے لقب سے بھی یاد کیے جاتے ہیں چنانچہ سامانہ کے سادات مشہور ہیں لیکن زیادہ معتبر روایت یہی ہے کہ سمنان کے تھے۔ راستے اور احوال کو جاننے کی بات واقعات کشمیر نے لکھی ہے تاریخ حسن نے لکھا ہے حضرت امیرؒ کے حکم اور اپنے بھائی سیّد تاج الدین کی ترغیب سے کشمیر کی سیر کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن واقعات کشمیر کا مؤلّف نے سید حسین سمنانیؒ کو حضرت شاہ ہمدانؒ کی طرف سے تحقیق راہ کے لیے بھیجے جانے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ نے سیّد حسین سمنانیؒ کے فرزند سیّد حسن اور چچیرے بھائی سیّد حیدر کو بھی اُنکے پیچھے بھیجدیا اور انھوں نے حضرت شاہ ہمدانؒ کو صورت حال کے بارے میں لکھا اور اُن ہی کے بیان کے مطابق حضرت سیادتؒ کشمیر تشریف لائے۔ اِن متضاد بیانات کے پیش نظر کہ کبھی سیّد حسین سمنانیؒ کبھی سیّد تاج الدینؒ اور کبھی سید حسین سمنانیؒ کے فرزند اور چچیرے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے پرگنہ دیوسر کے گاؤں کولگام میں قیام پذیر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد آپؒ کا فرزند سید حسن اور بھتیجا سید حیدر بھی سمنان سے مع اہل وعیال کے ان سے آکر ملے۔ سید حسین سمنانیؒ ایک بلند مقام درویشِ خدا پرست تھے کشمیر میں آکر آپ نے اسلام کے دین کو فروغ دیا۔ اور سنت و شریعتِ رسول کو پھیلانے کے لیے کوشش کیں۔ حضرت شیخ العالم نورالدین نورانی رحمۃ اللہ علیہ اکثر آپؒ کے پاس روحانی استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ سال ۸۲۵ھ میں آپ رحمت حق ہوئے؎ اور بہت سے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) بھائی کے ذمہ کشمیر کی راہ اور یہاں کے حال واحوال کی تحقیق کا کام تھا یہ امر ناقابل یقین ہے اور اس سے نعوذ باللہ حضرت شاہ ہمدانؒ کے کشمیر میں روحانی ماموریت کا دینی فریضہ، جو خالص آنکے جدّ بزرگوار صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا، انجام دینے میں تردّد کا شائبہ ظاہر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی امکانی اجازت سے یہ حضراتِ سادات دینی خدمات انجام دینے کی غرض سے اپنی خوشی و رضا سے حضرت شاہ ہمدانؒ کے پیش دست نمائندے بن کر آئے اور دین اسلام کی حتی المقدور خدمت کی

؎ واقعات کشمیر اور تاریخ حسن اور کئی مقامی تواریخ میں لکھا ہے کہ چوں کہ گھوڑے کے زخمی ہو جانے پر وہاں پر ٹھہرنے کا موقعہ محل نہیں تھا آپ نے قریب ہی کے ایک پتھر پر بیٹھ کر اُسے دوڑایا۔ یہ پتھر اب بھی موجود ہے۔ اور پیر پل کے نام سے مشہور ہے۔ (کشمیری زبان میں بڑے پتھر یا چٹان کو پل کہتے ہیں اور "پیر پل" کے معنی ہیں پیر صاحب کا بڑا پتھر یا پیر صاحب کی چٹان) ؎ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے آپ کی وفات کی تاریخ یوں لکھی ہے ؎

سالِ وصلش زروی حُب طلبی　　　زبدۂ خاندان آل نبی (۸۲۵ھ)

لیکن تاریخ حسن کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات ۱۱ر ماہ شعبان ۷۹۲ھ کو ہوئی واقعات کشمیر کے مطابق گویا آپ کشمیر میں آنے کی تاریخ (۷۷۵ھ بقول تاریخ حسن) سے پچاس سال تک دین اسلام کی خدمت انجام دیتے رہے اور بقول تاریخ حسن صرف سترہ سال تک۔ ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد ۳ (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۰۱، اور واقعات کشمیر صفحہ ۳۸؛ سید حسن سمنانی کولگام میں مدفون ہیں جہاں ہر سال ۱۱ر شعبان کو ایک عظیم الشان عُرس ہوتا ہے۔

لوگوں کو ظاہری اور باطنی فیض پہنچایا۔

سیّد حسن بہادرؒ نے بھی دینِ اسلام کو آگے بڑھانے میں مدد کی۔ آپ سیّد تاج الدینؒ کے فرزند تھے۔ طبعاً بڑے نڈر تھے اس لیے سلطان شہاب الدّین نے ان کو فوج کا سالار بنا دیا۔ پرگنہ کھویہامہ اور رانجھہامہ کی جاگیریں دینے کے علاوہ سلطان نے اُن کو اپنا داماد بھی بنا لیا۔ سیّد حسنؒ صاحبِ دنیا بھی تھے صاحبِ دین بھی۔ دینِ اسلام کو فروغ دینے میں انھوں نے بھی کام کیا اور باطنی اُمور میں بھی آپ فیض پہنچاتے رہے۔ اپنے والدِ بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سیّد یوسفؒ سیّد تاج الدّین کے ساتھیوں میں تھے۔ اور انھوں نے بھی دینِ اسلام کی خدمات میں سیّد تاج الدینؒ جو ان کے مرشد بھی تھے، کا ہاتھ بٹایا۔ سیّد یوسفؒ بڑے متقی اور صاحبِ ریاضت تھے۔ سیّد تاج الدین کے مقبرہ میں مدفون ہیں۔

سیّد حیدرؒ ایک عارف باللہ بزرگ تھے۔ مظہرِ کرامات و عنایاتِ الٰہی تھے اور حضرت سیّد حسین سمنانیؒ کے ہمراہ آپ نے بھی شریعت دینِ اسلام کو فروغ دینے میں بڑی کوشش کی ہیں اور سیّد حسین سمنانیؒ کی قبر مبارک کے پہلو میں مدفون ہیں۔

سیّد باقرؒ اور سیّد زیرکؒ دونوں سیّد حسین سمنانیؒ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ دونوں صاحبِ کرامات ہونے کے علاوہ دینِ اسلام کے خدمت گزار تھے اور دونوں ایک ہی جگہ پرگنہ دچھن پارہ کے ویری سرن گاؤں میں ایک ٹیلے پر مدفون ہیں۔

مذکورہ ساداتِ بزرگوار کی آمد اور ان کی منفرد ور پھر مساعی کا ذکر جو ہم نے کیا ہے اس سے صرف یہی دکھانا مقصود ہے کہ حضرت بلبل شاہؒ کی وفات کے بعد حضرت امیرِ کبیر میر سیّد علی ہمدانی شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری تک کے ۵۳ سالہ طویل فاصلے میں دینِ اسلام کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے والے دینی پہلوان موجود تھے جو مجاہدانِ راہ اسلام کی اُسی جماعت کے افراد تھے جنھیں اوّلین مبلغ بلبل شاہ صاحبؒ اپنے ہمراہ یہاں لائے تھے یا جو برابر وقتاً فوقتاً محض رضائے الٰہی کی خاطر اُس کے دین کے تازہ بوئے گئے پودے کی آبیاری کے لیے اسلامی مراکز سے یہاں آتے رہے۔ ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ ان سارے مجاہدانِ راہ اسلام کی مجموعی مساعی اور کوششوں کے بارے میں ہماری اطلاعات نا مکمل ہیں لیکن بہر صورت

یہ تو یقینی ہے کہ جہاں جہاں کشمیر میں انکی سرگرمیاں رہی ہوں گی وہاں دینی مدارس اور مسجدیں قایم کی ہوں گی ۔ اس بارے میں ایک اہم مثال کا بیان ناگزیر ہے ۔ معتبر تاریخ نویس خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے سُلطان قطب الدّین شہمیری کے عہدِ سلطنت (۷۸۰ھ تا ۸۰۰ھ / ۱۳۷۸ء ۔ ۱۳۹۳ء) میں جن حضراتِ سادات و بزرگانِ دین کی آمد اور اُن کی مصروفیات کا ذکر کیا ہے اُن میں سے ایک مقامی کشمیری بزرگ عارف باللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> "...... مظہر ایقان شیخ سلیمان ــ از اکابر طائفہ ہنود کشمیر بود شری کنٹ نام داشت ۔ بہ رہنمونی وجذبۂ ازلی، در مدرسۂ اسلام آمدہ قرآن را یاد گرفت و بہ بیم قوم خود کہ اطلاع یابند، از شہر فرار نمودہ بہ سمرقند رفت و بہرہ ور در علوم شدہ معاودت بہ کشمیر نمود و بہ سبب تی اعمام باز انتقال نمودہ بہ کولاب رفت و شرف ملازمتِ امیر کبیرؒ حاصل نمود و از وطن و مسکنش پُرسید ندکشمیر را بہ باغ سلیمان نامیدہ عرضِ احوال کردہ از جناب آن قطب الاقطاب مسمّٰی بہ شیخ سلیمان شد و پسرش شیخ احمدؒ کہ ہمراہ بود، نیز مورد الطاف شدہ بہ تعلیم و تربیت فائز گردید ۔ در جوار مسجد جامع روبروی مزار سیّد محمد لورستانی مدفون است ...."

[صاحب یقین شیخ سلیمان ــ ہندو قوم کے اکابرین کشمیر میں سے تھے اور شری کنٹ نام تھا ۔ ازلی کشش و رہنمائی سے مدرسۂ اسلام میں داخل ہو کر قرآن مجید یاد کر لیا ۔ اور اپنی قوم کے ڈر سے کہ اُن کو کہیں پتہ نہ لگ جائے شہر سے بھاگ کر سمرقند چلے گیے اور علوم دین میں تعلیم سے بہرہ ور ہو کر کشمیر لوٹ آئے ۔ چچیرے رشتہ داروں کی وجہ سے پھر ہجرت کر کے کولاب چلے گئے اور حضرت امیر کبیرؒ کی خدمت میں پہنچے ۔ انھوں نے آپ کے وطن اور مسکن کے بارے میں پوچھا ۔ آپ نے کشمیر کا نام باغِ سلیمان بتا کر اپنے حالات عرض کیے ۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے آپ کا نام شیخ سلیمان رکھا اور آپ کے بیٹے شیخ احمد کو، جو ساتھ تھا، لطف و عنایت سے نوازا اور ان کی تعلیم و تربیت فرمائی ۔ سیّد محمد لورستانی کے مزار کے سامنے جامع مسجد

کے نزدیک دفن ہیں[1]۔۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

حضرت شاہ ہمدانؒ جب کشمیر میں تشریف لے آئے تو یہاں کے حالات کچھ بہتر نہیں تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی سے اجتماعی اور سیاسی لحاظ سے کشمیر لوٹ چکا تھا بادشاہ ہی عموماً اپنی عیش پرستی اور شہوت دوستی کی وجہ سے اجتماع میں فساد پیدا ہونے کے ذمہ دار تھے۔ ان کے وزراء اور حکّام بھی بادشاہوں کی پیروی میں لوگوں اور عام رعایا کی ضروریات کو پورا کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ رعایا حکّام اور بادشاہوں کے ذاتی اخراجات پوری کرنے کے لیے مجبور تھے۔ اور مجموعی طور پر ان کی زندگی سخت بن چکی تھی۔ اس کے نتیجے میں، طاقتور فرقے اور طائفے جن میں ڈامر اور لون اور ماگرے شامل تھے رفتہ رفتہ حکومت گر بن گئے! اور ان فرقوں نے اپنے علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم کی تھیں۔ ان میں وہ بڑے بڑے زمیندار بھی تھے

---

[1] واقعات کشمیر صفحہ ۴۸: ضمناً اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک حضرت شاہ ہمدانؒ ابھی سفر کشمیر پر روانہ نہیں ہوئے تھے۔ اور یہ سلطان قطب الدین کی ابتدائی سلطنت (سنہ ۷۸۰ھ سنہ ۱۳۷۸ء) کا زمانہ تھا۔ گویا حضرت شاہ ہمدانؒ جیسا کہ ہم قبلاً کہہ چکے تھے سنہ ۷۸۰ھ یا سنہ ۷۸۱ھ میں پہلی بار یہاں تشریف لائے تھے۔ اگر اس سے پہلے آ چکے ہوتے تو شری کمنٹ (شیخ سلیمانؒ) کو لاب نہ جانتے اور نہ ہی حضرت شاہ ہمدانؒ ان سے کشمیر کے بارے میں پوچھتے اور باغ سلیمان کا نام سن کر نہ ہی شری کمنٹ کا نام سلیمان رکھتے [کشمیر باغ سلیمان بھی کہلاتا ہے کیوں کہ حضرت سلیمان پیغمبر یہاں سری نگر کے وسط میں واقع پہاڑی پر ایک بار اس طرف گذرتے ہوئے اترے تھے جب سے یہ پہاڑی تخت سلیمان اور وادی باغ سلیمان کہلائی۔ ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد اوّل صفحہ ۸۱ (کشمیر کے ہندو اس پہاڑی کو شنکراچاریہ پہاڑی کہتے ہیں؛) ظاہر ہے شیخ سلیمان کے کولاب پہنچنے کے بعد ہی جناب حضرت امیر کبیرؒ کشمیر تشریف لائے ہیں اور کوئی بعید نہیں کہ شیخ سلیمان بھی اُن کے ہمرکاب رہے ہونگے۔

بلکہ بعض اوقات چھوٹے درجہ کے زمیندار بھی، جو بادشاہوں کے اقتدار کے لیے خطرۂ ثابت ہو چکے تھے۔ ان طاقتور مقتدر فرقوں کو بادشاہ کبھی کبھی صرف فوجی طاقت سے ہی دبا سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب اس کی ضرورت پیش آتی۔ اور اکثر اس لیے آتی تھی کہ بادشاہ کو بالآخر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ تو ملک کا امن وامان خراب ہو جاتا، مسلّح مقابلہ ہونے کی صورت میں معصوم اور بے گناہ رعایا کا خون ہو جاتا۔ ان کے اموال کو لوٹ لیا جاتا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو اسیر کر دیا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر چھوٹے بڑے راستے راہزنوں کی ملکیت بن جاتے۔ مسافر اور تاجر لوگ جان و مال کے خوف سے باہر نہیں نکلتے تھے حتیٰ کہ خود حکّام اور حکومت کے کارکن بھی ان خطروں سے محفوظ نہیں تھے۔ یہ صورتِ حال راج ترنگنی کے مشہور مصنّف کلہن پنڈت (بارھویں صدی عیسوی) کے صدہا سال بعد حتیٰ کہ اسلامی دور کے اوائل عہد تک بدستور قایم رہی۔ کلہن نے ایک بادشاہ ہرش کا ذکر کیا ہے (سنہ ۱۰۸۹ء؛ سنہ ۱۱۰۱ء: سنہ ۴۸۲ھ ۔ سنہ ۴۹۵ھ) جس نے ملک کی دولت کو اپنے ذاتی اغراض کی خاطر اس بے دردی سے لوٹ لیا کہ جہاں جہاں کشمیر میں سونے کے بُت مندروں میں پوجا کے لیے رکھے ہوئے تھے اُن کو توڑ کر سونے کو اپنے مصرف میں لے آیا۔ گویا یہ ایک پہلا بُت شکن ہندو بادشاہ تھا اور کلہن نے اسے ترشکا (ترک مسلمان) کہہ کر اپنی ذاتی نفرت ہدف بنا لیا ہے[1]

چوں کہ ایک مفصل اجتماعی اور معاشرتی نیز سیاسی نقشہ پیش کرنا جو شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری سے پہلے کے کشمیری زمانے یا زمانوں سے مربوط ہو، اِس کتاب کے موضوع سے باہر ہے، اس لیے ہم نے بہت ہی خفیف اشارہ کیا ہے۔ یہ ادوار مجموعی طور پر ایسے

---

[1] مفصل سیاسی حالات اور معاشی و اجتماعی زندگی کے مطالعہ کے لیے (اس دور کے کشمیر کے بارے میں) ملاحظہ ہو: مقدّمہ انگریزی (راج ترنگنی مصنّفہ کلہن) سٹائن؛ کلہن نے ہرش کی فوج میں مسلمان فوجی افسروں اور انکی سرپرستی کرنے کی طرف بھی اشارے کیے ہیں (ملاحظہ ہو، مقدمہ انگریزی سٹائن: فٹ نوٹ صفحہ ۳۵۳) راج ترنگنی چھاپ موتی لال بنارسی داس دہلی ۱۹۶۱ء نیز کشمیر انڈر سلطانز مصنّفہ محبّ الحسن: ویلی آف کشمیر مصنفہ والٹر۔ آر۔ لارنس:

تھے جن میں سارے ملک پر غیر خوشحالی چھائی تھی۔ زمینیں اکثر و بیشتر فتنہ و فساد کی وجہ سے بے کاشت رہتی تھیں۔ گویا زراعت اور تجارت دونوں بے رونق تھے۔ حکومتی اداروں میں بھی بادشاہوں کی بے توجہی اور ذاتی عیش و ہوس پرستی کی وجہ سے کافی حد تک نظم و استحکام مفقود تھا جس کے نتیجے میں عام رعایا کے اُمور پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں قوانین، حکومت کا احترام بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور خاص کر صاحب اقتدار طائفے تو ان کی بالکل ہی پیروی نہیں کرتے تھے اور نہ بادشاہوں میں کبھی یا حکومتی اداروں میں بھی اتنی قدرت نہیں تھی کہ حالات کو منظم سطح پر لاتے اور عام فلاکت کو روکتے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی اکثریت، خاص کر نچلے طبقے کے اور کسان لوگ ایک سخت دشوار اور فقر و لاچاری کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے جب کہ بہت چھوٹی سی اقلیت خوشحالی میں بسر کرتی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اِن ادوار کے بعض وقفے ایسے بھی تاریخ کشمیر میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ جب کہ بعض بادشاہوں نے حالات کو سدھارنے اور امن میں خلل ڈالنے والوں، رہزنوں اور ڈاکہ ڈالنے والوں کو شدید سزائیں دینے کے فوجی اقدامات کیے لیکن عام حالت اس سے باہر نہیں تھی جو بیان ہوئی، بادشاہ ملک کے مالک اور کامل اختیارات کے حامل تھے۔ سیاسی اُمور کے علاوہ مذہبی اُمور اور فوجی امور بھی اُسی کے ذمّہ تھے غرض تمام ملکی اُمور اُسی کے احکام اور مشورے کے تحت حل ہوتے تھے۔ اُن کی رانیاں بھی سیاسی اور ملکی اُمور میں شریک رہتی تھیں اور ضرورت کے وقت خود شاہی تخت سنبھالتی تھیں۔

مذہب کے لحاظ سے بھی یہ ادوار کچھ کم کشمکش میں مبتلا نہیں رہے دو بڑے مذاہب یعنی ہندو مت [جسے کشمیر میں شیو مت ہی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کشمیر کے ہندو صرف شیو جی کی عبادت کرتے ہیں۔] اور بدھ مت کی باہمی خصومت اور اختلافات جو سخت تنازع اور فتنہ کی صورت، اختیار کرتے رہے کے نتیجے میں کبھی بُدھ مت کا غلبہ رہا اور کبھی ہندو مت کا کلہن کبھی بدھ مت کے پیرو ہُشکا، جُشکا اور کنشکا نام کے بادشاہوں کو تُرشکا کہتا ہے اور کبھی مہاراجہ اشوک کی تعریفیں کرتا ہے۔ اول الذکر تین مہاراجوں کے دور میں بُدھ مت کافی پھیلا بلکہ بدھ مذہب میں رائج روایت کے مطابق تو کنشکا نے بدھ دھرم سے متعلق تیسری بڑی مجلس کشمیر میں ہی بُلائی تھی۔

کلہن تے مذہب کے بارے میں جو مجموعی تاثر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مذہب میں بھی ایک طرح کی بے نظمی اور بے قانونی تھی ۔ ہندو مت میں فرقہ اور مسلک کے لحاظ سے تعصب آمیز عقیدوں پر کاربند رہنے کی سخت رغبت تھی ۔ مندروں کے پجاریوں کی نمائندگی وہاں کے مُطربوں سے ہوتی تھی ۔ اور شِومت جس کے عبادت گزار کشمیریوں کی بھاری اکثریت تھی محض خرافات اور مضحک عقائد اور رسوم کی نچلی حدود تک آچکا تھا ۔ چنانچہ ان کے اثرات آج بھی کشمیر کے ہندوؤں پر حاوی ہیں ۔ بیرونی دنیا کے بارے میں محدود علم اور خاص کشمیر کی واقفیت اور مبالغہ آمیز حد تک کشمیر ہی کی ستائش تے عجیب طرح کی داستانوں کو جنم دیا جن میں بھوت پریت اور ماورائی موجودات کا غلبہ تھا ۔ ان خیالی داستانوں کی راہ سے جادوگری کے قصے مقبول رہے ۔ اور جادوگری کا رواج قایم ہو گیا ۔ اس کے نتیجے میں ہر طرح کے خرافاتی اور بے بنیاد عقائد کا غلبہ اس گہری شدت کے ساتھ کشمیریوں کے دلوں میں حاوی ہو گیا کہ شاید عام ہندو مذہب کے پیرووں میں سارے ہندوستان میں بھی اتنا نہیں ہوگا ۔ کہتے ہیں کہ کشمیر آنے سے پہلے مارکو پولو نے وسط ایشیا میں ہی یہاں کی جادوگری اور شیطانی طلسم کے قصے سنے تھے ۔ کلہن نے راج ترنگنی میں اس کا ذکر کیا ہے کہ جادو اور طلسم یہاں کس قدر عام تھے کئی بادشاہوں کی موت جادو سے ہوئی اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خود کلہن کو اس پر یقین تھا ۔ پچھلی زندگیوں سے روحانی قدروں کا متاثر ہونا ، کلجگ کے اثرات کرما یا قسمت کی طاقت اور خدائی نفرت پر یقین ، یہ کچھ ایسے عقائد ہیں جن کا رواج کشمیر میں بہت تھا ۔[1]

خرافاتی عقائد کی سخت گرم بازاری کے نتیجے میں ، صحیح شومت پر عمل نہیں ہوتا تھا ۔ مندروں کے بزرگ ، برہمن دیوتاؤں کا روپ دھار چکے تھے ۔ اور ان ہی عقائد کی راہ سے عام سیدھے سادھے لوگوں کو شِو جی کی صحیح تعلیمات اور روحانی مرتبہ حاصل کرنے کے طریقوں بے خبر رکھتے تھے ۔ اس لیے ان کمزور عقیدوں سے لوگوں کی روحانی ضروریات پوری نہیں ہو سکتی تھیں ۔ بدھ مت میں بھی کشمیریوں کے لیے ، جو اب صدیوں سے خوشی ، خوشحالی اور سکون

---

[1] راج ترنگنی مصنفہ پنڈت کلہن (انگریزی مقدمہ از سٹائین صفحہ ۳۱ :-

ذہن وقلب کی تلاش میں تھے تسلی بخش علاج ثابت نہیں ہوا[1]۔ ریچن (لہاچین رگیالبو ریچن) اس کی نمایاں مثال ہے جس کی نہ ہندومت سے تسلّی ہوئی اور نہ ہی بدھ مت سے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام روحانی اضطراب اور بے چینی سارے کشمیر میں پھیل چکی تھی۔

ان ناتسلی بخش مذہبی حالات، جن کی طرف مختصر اشارے کیئے گئے، کے پس منظر میں دین اسلام کا ورُودِ مسعود ایک خوش بختی تھی۔ کشمیر کے مختلف ادیان میں خود ساختہ ناقابل برداشت مزخرفات تھے۔ نئے دین اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کشمیر میں رائج مذہب میں ذات پات تھی۔ دین اسلام نوع انسانی کو تقسیم کر دینے کے غیر فطری اور ظالمانہ روّیہ سے پاک تھا۔ کشمیر کے مذاہب میں کئی خداؤں کا اضافہ ہو چکا تھا جب کہ شومت خود اس کا قائل نہیں تھا، دین اسلام صرف ایک خدائے مقتدر پر یقین رکھتا تھا۔ کشمیر کے مذاہب میں مندر کا پجاری برہمن سب سے برتر تھا اسلام میں معمولی اور عالی کا کوئی فرق نہیں تھا۔

ذات پات کی تفریق کے بارے میں یہ کہنا لازمی ہے کہ بُدھ مت نے اسے کشمیر میں کسی حد تک پیچھے دھکیل دیا تھا کیوں کہ بُدھ مت بھی ذات کی تفریق کا قائل نہیں، اس سے کشمیر میں برہمن ذات کمزور ہو گئی تھی۔ للّ دید، جو بعد میں مسلمان ہو کر للّہ عارفہؒ کے نام سے مسلمانوں میں معروف ہوئی، نے بھی روحانی قدروں کی کمی، بتوں کی پرستش اور خرافات پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور برہمن تعصّب اور ان کے سخت استدلالی روّیہ نے اُسے اپنے فکر وخیال کو بدل دینے پر مجبور کیا[2]۔ کیوں کہ للہ عارفہ کے آخری ادوار کے اَدویت شومت پر اسلامی افکار کا اثر خاصا نمایاں ہے۔ شومت کے رائج عقائد اور مذہبی اختلافات و متضاد اُمور وعملیات اور ذاتوں کی اکثریت سے وہ سخت نالاں تھی۔

---

[1] "مجموعی حیثیت سے بُدھ مذہب اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی۔ اور اُن میں اکثر خرافاتی رسوم داخل ہو گئیں اور دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا"۔ ......
دیکھئے ڈسکوری آف انڈیا" پنڈت جواہر لال نہرو (اردو ترجمہ تلاشِ ہند صفحہ ۲۰۳ :)

[2] کشمیر انڈر سلطانز (انگریزی) محب الحسن صفحہ ۲۳۷ :

یہ تھا وہ پس منظر جو حضرت شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری کے وقت کشمیر میں رائج تھا اگرچہ مسلمانوں کی حکومت کے پچاس سال بیت چکے تھے اور حضرتِ بلبل شاہؒ اور اُن کے بعض رفقائے کار کی، یا بعض اور دینی بزرگوں کی، جو وسط ایشیا سے آئے اور جن کا ذکر اُوپر ہوا، دینی خدمات اور تبلیغ سے بھی یہ مُلک بہرہ ور تھا۔ لیکن مسلمان بادشاہوں کی جو خود نو مسلم تھے یہ حالت تھی کہ مسجد میں نماز سے فارغ ہو کر مندروں میں بھی پوجا پاٹ کے لیے حاضر ہوتے تھے[1] جب بادشاہ یہ کام انجام دیتا تھا تو ظاہر ہے ساری نو مسلم آبادی بھلا اس سے پیچھے رہنے کی کیسے جرأت کرتی[2]۔ سُلطان جب برہمنوں کے ساتھ بیٹھ کر یگیہ یعنی ہندوؤں کے نذر و نیاز کے مراسم میں شریک ہوتا تو نو مسلم آبادی ان مراسم سے کیسے پیچھے رہتی۔ سُلطان جب بیک وقت دو عورتوں کے ساتھ شادی کرتا تھا جو آپس میں بہنیں ہوتیں تو نو مسلم آبادی کہاں تک شریعتِ اسلامی سے آشنا ہوتی۔ سلطان جب کافروں کے لباس میں رہتا تھا تو نو مسلم آبادی کے لباس کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ سلطان جب اَمر معروف اور نہی منکر سے بے بہرہ تھا تو اسلام کی ضعیف اساس پر کھڑی نو مسلموں کی عمارت کی مضبوطی کیسے قائم رہ سکتی تھی۔ دراصل مسلمانوں تک نہ صحیح دین پہنچا تھا اور نہ ہی مسلمانوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ مسلمان جو بھی تھے محض برائے نام تھے اور ہزاروں برس کے ہندو مذہب کی روایات میں اسیر تھے۔ یہ مسلمان بھی تھے لیکن ہندو مذہب کو چھوڑنے سے ڈرتے بھی تھے۔

اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے اور دین اسلام کو استوار بنیادوں پر قائم کر کے

---

[1] واقعات کشمیر ؛ تاریخ حسن جلد اوّل صفحہ ۳۲۳ ؛ [2] مندروں کے پجاریوں کو خوش رکھنے کیلئے: "بموجب استمرار ہر کسی از ساکنان این دیار یک سبد نان و یک گوسفند بریان و یک صاعِ خمر برای کشیشان دیر می آوردند، و ہر کہ نمی داد، بہ ابتلا مبتلا می شد..." [مجبوراً اس ملک کے ہر باشندے کو روٹیوں کی ایک ٹوکری، ایک بُھنا ہوا بھیڑ اور شراب تقریباً تین سیر مندر کے پجاریوں کے لیے لانا پڑتی تھی۔ اور جو نہ دیتا مصیبت میں مبتلا ہوتا...] ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد اول صفحہ ۳۳۴ :

اس دین حنیف کو دائمی صورت دینے کے لیے سال سنہ ۷۸۰ھ یا سنہ ۷۸۱ھ (سنہ ۱۳۷۸ھ یا سنہ ۱۳۷۹ء) میں حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ سات سو[1] رفقاء کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوئے ۔

کشمیر میں سلطان قطب الدین شہمیری نے (سنہ ۷۸۰ھ ۔ سنہ ۷۹۶ھ ۔ سنہ ۱۳۷۸ء ۔ سنہ ۱۳۹۳ء) آپ کے اور آپ کے رفقاء پر مشتمل قافلے کا بڑی گرمجوشی اور سخت ارادت و عقیدت کے ساتھ استقبال کیا ۔ خود پیشوائی میں سلطان مع تمام امراء اور وزراء کے جب کہ تمام فوج صف بستہ کھڑی تھی، حضرت امیر کبیرؒ کو حضرت بلبل شاہؒ کے روضہ شریف سے، جہاں آپ کشمیر میں داخل ہوتے ہی زیارت کے لیے گئے تھے مندر کے قریب جلوس کی صورت میں لے آئے[2] اس مندر کا بنیاد گذار راجہ پروسین تھا جس نے اسے سال سنہ ۱۴۵ بکرمی میں بنایا تھا ۔[3]

---

[1] یہ تعداد بیشتر مقامی مؤرخوں نے لکھی ہے ۔ صرف واقعات کشمیر نے لکھا ہے "قریب ہفتصد کس" [تقریباً سات سو آدمی] ۔ ملاحظہ ہو، واقعات کشمیر صفحہ ۳۶ : [2] احسن التواریخ مولفہ مفتی محمد سعدالدین قلمی نسخہ : [3] تاریخ حسن نے اس کی تفصیل یوں لکھی ہے " سال سنہ ۱۴۵ بکرمی میں راجہ پروَرسین (جو سال سنہ ۱۳۵ بکرمی میں تخت نشین ہوا) نے دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر مہا کالی دیوی کی تعظیم کے لیے کالی شری نام کا بت خانہ بنایا اور اس پر سات لاکھ اشرفیاں چار دانگ والی خرچ کیں (دینار چھ دانگ کا ہوتا ہے اس لیے چار دانگ ۲/۳ ہوتا ہے) مہادیو (شنکر جی) کے ایک سو بیس مجسمے اس میں نصب کئے اور سال سنہ ۷۸۰ھ تک (سنہ ۱۳۷۸ء) یہ مندر خاص و عام اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرجع بنا ہوا تھا ۔ مسلمان ہونے کے باوجود سلطان قطب الدین ہر روز اس میں آکر پرستش کرتا تھا ۔ اسی زمانہ میں شاپور نامی بدھ مسلک کا راہب اس بتکدے کا مجاور تھا جو ریاضت کے بل بوتے پر آسمان کیطرف جا کر نظروں سے غائب ہو جاتا تھا ۔ اُس کے اسی طرح کے عجیب و غریب حالات کو دیکھ کر کشمیر کے لوگ اس کے فرمانبردار اور اطاعت گذار بن چکے تھے اور اس ملک کے باشندوں میں سے ہر کوئی روٹیوں کی ایک ٹوکری اور ایک بُھنا ہوا بھیڑ اور قریب تین سیر وزن کی شراب اس مندر کے پجاریوں کیلئے روزانہ لاتا تھا اور جو نہ دیتا وہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تھا ۔ سال سنہ ۷۸۱ھ میں جناب میر سید علی ہمدانیؒ قدس سرہ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر) ۔

سلطان قطب الدین نے مندر کے قریب جو مسجد بنوائی تھی صُفہ بن جانے تک حضرت امیرؒ نے وہاں قیام فرمایا اور سادات کرام و مبلّغین کا قافلہ علاءالدین پورہ میں موجود کاروان سرائے میں ٹھہرا۔

حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ دین اسلام کے ان ممتاز ترین علماء میں سے تھے جنہیں

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس ملک دل پذیر میں تشریف لائے اور راہب کا قصّہ سنکر تعجب کا اظہار کیا۔ اور اس سے ملنے کو گئے ایک بھاری قد قامت والے آدمی کو دیکھا اور پوچھا کہ تمہارا کام اور تمہاری کیفیت کیا ہے اور تم اسرار سے کہاں تک واقف ہو؟ راہب نے جواب دیا کہ میں ہر لمحہ حق کے پاس ہوتا ہوں اور ہر گھڑی جذبۂ حق میرا مددگار رہتا ہے۔ اور فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر دھوئیں کی مانند آسمان کی طرف چلا گیا اور نظروں سے غایب ہوا حضرت سیّد بزرگوارؒ نے سیّد کبیر بیہقیؒ کو اشارہ کیا اور انھوں نے راہب کو بڑی سختی کے ساتھ واپس زمین پر لایا۔ مندر کے پاس ایک گائے کھڑی تھی حضرت سیّدؒ نے پوچھا کہ یہ گائے حاملہ ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جوگی نے کہا کہ تین ماہ کے سیاہ رنگ کا سفید پیشانی والا بچھڑا پیدا ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے گائے نے اسی وقت ایسے بچھڑے کو جنم دیا جیسے کہ حضرت امیرؒ نے فرمایا۔ جوگی نے اپنے اور کمالات دکھانے شروع کیے لیکن حضرت امیرؒ کے جذبہ و قدرت سے ناکام رہا۔ اور رضائے الٰہی سے بالآخر مسلمان ہو گیا اور شاہ محمد نام پایا۔ راہب نے خود ہی اپنا بُت خانہ ڈھا دیا اور سلطان قطب الدین نے وہاں پر پتھروں کا ایک مربع صُفہ بنوایا اور شمالی کونے پر حضرت امیرؒ کی سکونت کے لیے ایک خاص حُجرہ تعمیر کیا۔ حضرت سیّدؒ نے اس حجرہ خاص میں دو چلّے بھی کاٹے اور تجلی حق سے مشرّف ہوئے اور صفہ پر آپ ایک بڑی تعداد کی جماعت کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز ادا کیا کرتے تھے......"

تاریخ حسن جلد اوّل صفحہ ۳۲۲ - ۳۲۹ ؛ بعض مقامی تذکروں اور تواریخ میں بھی یہی بیان نقل ہوا ہے سوائے واقعات کشمیر کے:

اللہ نے راسخون فِی العلم کہا ہے اور جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل قوم کے پیغمبروں کے برابر کا درجہ دیا ہے۔ یہی تھے وہ علماء اور مجاہدین دین اسلام جنہوں نے اللہ کے دین کو ایمانی حرارت، یقین، پختہ ارادے علم دین کی محکم بنیاد اور معرفتِ حق کے سہارے دنیا کے اجنبی گوشوں تک پھیلا دیا۔ انہی برجستہ ترین علماء اور اولیاء نے اسلامی معجزے کئے اور انسان تمدّن و تہذیب کو ظلمت و فساد سے نکال کر قرآن مجید کے خُدا کے بنائے ہوئے روشن راہوں کی طرف راہنمائی کی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے کشمیر میں وہ کارنامہ انجام دیا جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد ہے۔ مجموعی طور پر تین سال کے عرصے میں ایک ایسے مُلک کو حلقہ بگوش اسلام بنانا جو ہزاروں سال سے ایک ہی مسلک سے منسلک روایات و عقاید میں بندھا تھا، ایک نمایاں کرامت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیر کے لوگ بدھ مذہب کے زیرِ اثر رہ کر بھی اخلاقیات کے زوال اور خیالات و افکار کی پیچیدگی اور فرقہ و گروہ پرستی سے آزاد نہ ہوئے اور قدیم ہندومت (یا شِومت) بھی اپنی اصلی صورت سے ہٹ کر بالآخر برہمن طبقہ کی اجارہ داری بننے کے نتیجے میں عوام کے لیے ایک ناقابلِ تحمل بوجھ بن چکا تھا۔ لیکن بہرحال ہزارہا سال کے بندھنوں سے یک لخت آزاد ہو کر کسی اجنبی دین کو یقین و ارادت کے ساتھ قبول کرنا ایک ناممکن امر تھا۔ اِس حلّ مشکل کے لیے ہزاروں میل دُور سے ایک شخص مُسافرین راہ الٰہی کے سات سو افراد پر مشتمل قافلے کے ساتھ خُدائی امر و معاونت سے اِس ایسے مُلک میں داخل ہوا جس کے عوام میں خود ایسی ہستیوں کی کمی نہ تھی جو ان میں تازہ رُوح پیدا کر کے اُن کو خرافات اور مضحکہ خیز بدعتوں اور رسوم سے آزاد کرتے اور پُوری طاقت کے ساتھ نفس پرستی، مادّیت، شہوت دوستی اور جاہ پرستی کے خلاف احتجاج کرتے۔ ظاہر ہے کہ یقیناً کشمیر کو ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو ایک معمول سے ماوراء یقین و ایمان، جرائت و ایثار اور اعلیٰ ترین علمی، دماغی او قلب و ضمیر کی صلاحیتوں سے کشمیر میں ایک فکری انقلاب لانے کے نتیجے میں اِسے زندگی بخشتا اس کے باشندوں میں سے ہزاروں سال کی اس ذہنی اور فکری زنگ کو مٹا دیتا۔ جو بے معنی رسوم اور ناقابل برداشت بدعتوں اور مسلکی زوال

کی وجہ سے چڑھتی تھی۔ اور اس ذہنی انقلاب کے قبول کرنے والوں میں نئی فکر، نیا یقین، نیا ایمان، نئی حرارت، نئی قوّتِ عمل، نیا اعتماد اور نیا جوش اور نیا اطمینان و سکون پیدا کرنا۔

دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے اللہ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم نے نصیحت کا لفظ استعمال فرمایا ہے[1] اور اللہ تعالیٰ نے بھی دعوت اسلام کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دینے کی تلقین فرمائی ہے[2] شاہ ہمدانؒ جیسے راسخ فی العلم امیر کاروان، اپنے باکمال مُومنین دین اسلام اور خدائے اسلام کو ساتھ لے کر حکمت و نصیحت کے اسلحہ سے لیس، اس ظلمتکدے میں داخل ہوئے۔ یہ سارے مبلغین اسلام، خود دین اسلام کا صحیح نمونہ تھے۔ شریعت اور سنت نبوی کی بہترین مثال تھے۔ اسلامی تعلیمات اور آداب و اوامر کے پابند تھے۔ مخلص، بے لوث اور بے ریا خادم تھے۔ ان کی گفتگو، ان کا رہن سہن، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کی وطن سے دُوری کی قربانی، خویش واقارب سے فراق، ان کا سفر اور قیام، اور ان کی زندگی، ان کی عبادت و ریاضت، اور اِن کی موت، صرف اور خالص ربّ العالمین کے لیے تھی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ اپنے مقصد و مُراد سے پوری طرح نہ صرف واقف تھے بلکہ اِس کا اُن میں کمال شعور تھا۔ انھیں واقعات اور اُن حالات و نظریات اور کشمیر میں رائج فکری نظام کا پوری طرح علم تھا جن سے اُنھیں مقابلہ تھا اور ظاہر ہے دین اسلام کی تبلیغ کی ذمہ داری ادا کرنے کے نتائج سے بے نیازی و بے خوفی ان کے دل میں نقش پذیر تھی۔ آپ کے دل میں دعوت اسلام کی آواز کو حالات کی ناسازگاری نہیں دبا سکتی تھی اگرچہ اس بات کے شواہد کہیں بھی موجود نہیں کہ انھیں حریفوں کی طرف سے کسی قسم کے موانع کا سامنا ہوا۔ عقلِ مصلحت

---

[1] اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃٌ۔ (دینِ اسلام نصیحت ہے) حدیث شریف:

[2] اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے اور ان سے بحث کرو اس انداز میں جو بہتر سے بہتر ہو) سورۃ النحل آیت ۱۲۵۔

اندیش بھی وطن سے سفر کی روانگی سے پہلے بے دخل ہو چکی تھی۔ اور مجاہدین جو اللہ کے دین کو قایم کرنے کی نیت سے آپ کے ہمسفر تھے۔ کامیابی کے امکانات یا حالات کی سازگاری اور ناسازگاری کا اندازہ لگانے سے بالاتر تھے۔ یہ اصحاب قرون اولیٰ کے اُن سر فروشوں اور بلا توقّف طغیان زدہ سمندروں میں کشتیاں دوڑانے والوں کی یاد دلانے والے تھے جن کے بارے میں مفکّر اسلام ڈاکٹر اقبالؒ نے فرمایا ؎

تھے ہم ہی ایک تیرے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی[1]

شاہ ہمدانؒ نے کشمیر کے لوگوں کی ذہنی اور فکری سطح کو تبدیل کرنا تھا۔ وہ مجاہدین اسلام کی جو فوج لے کر آئے تھے ان کے ہاتھوں میں، جیسے کہ خود مقامی برہمن مؤرخوں کو بھی اعتراف ہے، نہ کوئی تلوار تھی نہ توپ۔ نہ تیر تھا نہ کمان۔ وہ محض ایمان اور توحید الٰہی کے دیرپا اور کارگر اسلحہ سے مسلّح تھے۔ اسی نعرۂ توحید سے ان کو اوہام و مزخرفات اور بے اساس رسوم و بدعات کی بنیادیں منہدم کرنی تھیں جو ہزارہا سال سے ایک ظلمت کا پردہ بنکر یہاں کے لوگوں کے دل و دماغ پر چھا چکی تھیں۔ شاہ ہمدانؒ کو ایک ایسا انقلاب لانا تھا جو جاہلانہ تعصّب اور فسق و فجور اور نابرابری کے غیر انسانی اور مصنوعی اصولوں کی بیخ کنی کرتا۔ اور انھوں نے کشمیر میں یہ فکری اور ذہنی انقلاب سادہ تعلیماتِ اسلام، اور بلند اخلاقی معیار اور عام اظہار شفقت سے وجود میں لایا، اور یہی مشعل لیکر آپ نے اپنے ساتھی رفقار، مجاہدینِ راہ خدا کو کشمیر کے ہر قصبے اور ہر گاؤں میں بھیج دیا۔ آپ نے اُن کو ہدایات دیں کہ امانت داری، راست گوئی، وفای وعدہ، حُسنِ سلوک، اخلاقِ حسنہ، حلال خوری، شفقت اور خوش کلامی جو اِس ملک میں مفقود ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں بندہ اور

---

[1] بانگ درا۔ زیر عنوان: شکوہ مؤلفہ ڈاکٹر اقبالؒ۔

آقا کی تمیز ہے۔ یہاں مسلک کے کارفرماؤں کی اجارہ داری ہے، یہاں مسلک میں بھی لاقانونیت ہے، یہاں بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہے۔ یہاں باطل معبودوں کی حکمرانی ہے اور یہاں ہر طرف فسق، گناہ، جُرم اور بے راہ روی کا اندھیرا ہے۔ اس لیے دینِ حق کی لازوال تعلیمات کے نور کو پھیلا دو اور گھر گھر، جا بہ جا، گاؤں بہ گاؤں، شہر بہ شہر۔ اور قصبّہ بہ قصبّہ جا کر اعلان اور تبلیغ کرو کہ بس ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے نہ مستحق ہے اور نہ لائق۔ حکومت بس اُسی کا حق ہے۔ وہی فرماں روا ہے، وہی حاکم ہے وہی سلطان ہے۔ وہی معبود ہے۔ اس کی نظروں میں سب برابر ہیں۔ ہم سب اُسی ایک اللہ کے بندے ہیں۔ اس لیے ہم میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ باطل معبودوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ سب انسانوں کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ ان کو چھوڑ دو اور دوڑ کے چلے آؤ اللہ کی طرف جو سب کا ہے۔ ایک ہے، بس ایک، اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ انکار کر دو اگر کوئی آدمی جو تم ہی جیسا ہے، یہ کہے کہ وہ تمہارا خدا ہے۔ اس کی بغاوت کرو، اور مت مانو اس کی بات کیونکہ وہ مجرم ہے اور اس نے تم سب کو اپنا غلام بناتے کی وجہ سے اور خود عیش کی زندگی گذارتے کے خیال سے، یہ جھوٹی بات گڑھ لی ہے۔ تمہارے بھی حقوق ہیں۔ اس لیے اگر تمہارے حقوق چھین لیے گئے ہیں تو اُسی ایک اللہ کے مقرّر کیے ہوئے احکام کے مطابق اُن کو حاصل کرنا ہے جو اُس نے قرآن مجید نامی اپنی کتاب میں درج کیے ہیں جسے اس نے اپنے قاصد اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ ہم سب کو قرآن مجید اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا ہے۔ اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو کچھ کہا ہے، وہ بھی خدا کے کلام کے عین مطابق ہے، ہم ان قوانین کو نہیں چھوڑ سکتے کیوں کہ یہ سچے قانون ہیں۔ ظالم کوئی بھی ہو اُسے سزا ملے گی۔ رہزن کوئی بھی ہو اُسے جُرم کے پاداش میں سزا بھگتنی ہوگی۔ قصوروار اگر خود بادشاہ بھی ہو تو اسے بھی سزا ملے گی کیوں کہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے جیسے ایک عام آدمی۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہم میں کوئی اونچی ذات یا نچلی ذات کا نہیں۔ سب کا خون ایک ہی رنگ کا ہے۔ سب کے سب ہم ایک دوسرے کے اعضا کی طرح ہیں کیوں کہ پیدائش کے لحاظ سے بھی ہم ایک ہی طرح کے ہیں۔ اس لیے ہم

سب بھائی بھائی ہیں۔ خدائی قانون کی ہی بالادستی جو ہر صورت میں قایم رہے گا۔ بادشاہ بھی بدکاری کرے تو اس کو بھی کوڑے مارتے ہیں، چوری کرے تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتے ہیں کسی کو قتل کرے تو اس کو بھی قتل کرنا ہے۔ اس لیئے ظلمت کدے کے اے اسیرو! نکل جاؤ اب اس اندھیرے سے، اور آجاؤ اُس لازوال روشنی کی طرف جس کا صدیوں سے تمہیں انتظار تھا۔ دوڑو اس انعام الٰہی کی طرف جس سے تم محروم تھے اور جو اب ہمارے توسّط سے اللہ کی رضا کے ساتھ آپ کے دروازوں تک آپہنچا ہے اور جاگنے کی دستک دے رہا ہے۔

یہی وہ تعلیمات تھے جو عقاید و عبادات، اخلاق و معاملات، اجتماعی اور انفرادی حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جب سادہ و عام فہم زبان میں یہ صاف ستھرے پیغامات، اور جامع و ہمہ گیر تعلیمات، ایک راسخ عقیدہ اور اصول کے معنی میں عام لوگوں کے دلوں میں اُتر گئے تو پھر لوگوں کے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کی صورت عمل میں آئی ہر حال میں اطاعتِ امرِ الٰہی اور اپنے امیر کاروان کے حکم کی تعمیل کرنے والے شاہ ہمدانؒ کے رفقاء اور مجاہد اولیاء الٰہی اسلام کی یہ مشعل لے کر کشمیر میں ہر طرف پھیل گئے اور سارے ملک کو انوارِ الٰہی کی روشنیوں میں ڈبو دیا۔ خود حضرت بانی مسلمانی امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ، راسخ علم، محکم ایمان، اخلاق عالیہ اور فقہ و شریعت، طاقتور عقاید اور عظیم القدر و عالی شان اسلامی ادب (عربی اور فارسی) کے اعلیٰ ترین نمونہ تھے انھوں نے بھی مختلف جگہوں کا دورہ کر کے کشمیری نو مسلموں میں، جو اب جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہو رہے تھے، ایمانی حرارت سے ماضی کی باطل پرستی کی بیخ کنی کی۔ جگہ جگہ مسجدیں اور خانقاہیں فی الفور قائم کرادیں۔ خانقاہوں کو دینی علوم سے مربوط کتابخانوں سے مزیّن کرا کے حدیث و قرآن کے چراغوں کو روشن کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کو جو آپ ساتھ لائے تھے، خانقاہوں میں بانٹ دیا اور ختلان اور وسط ایشیا کی دوسری جگہوں سے کتابیں درآمد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے نتیجے میں دینی علوم عام ہونے لگے۔ نو مسلموں کے دماغ سے شکوک و شبہات ذاتی مطالعہ کے نتیجے

ہیں رفع ہو گئے تردّد اور تذبذب کا دور ختم ہو گیا۔ ایمان راسخ ہو گیا۔ اور اگر کہیں کوئی ماضی کی چنگاری باقی تھی وہ خود بخود ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

یہ تعلیمات اہل کشمیر کے لیے وسیع النظری اور مکمّل اصلاح اور ایک نئے روشن مستقبل میں اُمید و آرزو سے معمور زندگی کا پیش خیمہ تھیں یہ مکمل طور پر ایک نئے فکر و سوچ اور انحراف و غلط روی سے مبرّا تعلیم تھی جس نے فطری اور سادہ و آسان طور سے اُن کے دلوں سے شکوک و شبہات دور کرنے کے نتیجے میں ایک نئی روش، نئے طور طریقے، نئی سوچ اور نئے حقیقی اور قدرتی عقائد ذہنوں میں پیدا کیے۔ اب اس نئے دین اسلام کو یقین اور صدق دلی سے قبول کرنے کی وجہ سے اہل کشمیر کی نئی سیاسی، دینی، معاشی، تمدّنی اور تہذیبی قوّت محفوظ ہو گئی خود اہل کشمیر کے طاقتور ایمان اور روحانی قوّت سے اور دین اسلام کی تعلیمات پر کاربند رہنے سے۔

شاہ ہمدانؒ نے اپنا بیشتر وقت کشمیر میں اپنے مجموعی قیام کے دوران بھی مختلف ضلعوں اور پرگنوں میں تبلیغ دین میں صرف کیا۔ آپ مجاہدین رفقار کی دینی مصروفیات و مشاغل کی خود نگرانی فرماتے اور خاص کر مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر کے سلسلہ میں آپ کی فعالیّت ترجیحی تھی۔ کیونکہ اِن ہی خدائی مکانوں سے دینی مواعظ اور تعلیمات کی نشر و تبلیغ ہوتی تھی۔ ان ہی مقدس مراکز میں جمع ہو کر لوگوں کو توحید و رسالت، پند و نصائح اور اخوّت و برادری اور عالمگیر انسانی محبّت کی پاکیزہ ہدایات سے بہرہ ور ہونا تھا۔ اس لیے جہاں جہاں بھی سادات مکرّم اور مبلّغین کرام پہنچے امیرِ کارواںؒ کی ہدایات کے مطابق وہاں مسجدیں تعمیر کی گئیں اور خانقاہوں کی بنیاد پڑی۔

شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری سے قبل صرف ایک خانقاہ کی تعمیر ہو چکی تھی جو سلطان

---

[1] دیہات یا قصبوں میں خانقاہوں کی تعمیر کی ترجیح اس لیے تھی کہ دیہات اور قصبوں میں آج کی طرح ہی بلکہ ہمیشہ سے آبادی کی اکثریت زندگی بسر کرتی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اپنے مجموعی مدت قیام میں حضرت شاہ ہمدانؒ نے سری نگر میں خانقاہ نہیں بنوائی بلکہ مسجد پر ہی اکتفا کر کے سری نگر سے باہر قصبوں میں خانقاہیں بنوائیں جن کی نگرانی خود آپ نے فرمائی۔

صدرالدین رینچن شاہ نے حضرت بلبل شاہؒ کے لیے دارالخلافہ سری نگر میں دریای جہلم کے کنارے پر بنوائی تھی۔ شاہ ہمدانؒ تشریف لائے تو مٹن (اسلام آباد)، شوپیان، اسوپور، وچی (پرگنہ شاورہ) اور ترال میں خانقاہیں بن گئیں اور گاؤں گاؤں میں سادات و مبلّغین کے تبلیغی مراکز قائم ہوئے جنہوں نے ان دیہات میں اور ان کے قرب وجوار میں مسجدیں تعمیر کیں[1]۔

شاہ ہمدانؒ نے اپنے فداکار اور جان نثار اور امانت دار اور صاحب صدق ویقین والے رفقار کی مدد سے خانقاہیں[2] اور مسجدیں بنوا کر نئے دین کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی کا عملی مفہوم کشمیری نومسلموں کو سمجھا دیا تاکہ وہ ایک صالح اور پائیدار معاشرہ کا ہی نہیں بلکہ سارے وسیع عالم اسلام کا اپنے آپ کو ایک غیر منقسم حصہ محسوس کریں۔ نیز یہ کہ مسجدوں اور خانقاہوں میں دینی اور شرعی مواعظ و نصائح سے فیضیاب ہو کر گھروں میں یوں داخل ہوں کہ بہتر عبادت کے نتیجہ میں گھر کو بھی مسجد ہی کی طرح سمجھیں۔ تجارت بھی، قول و فعل بھی، باہمی روابط بھی دین اسلام کے مقررکردہ قوانین شریعت کے مطابق ہوں۔ حرام وحلال کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ عمل میں خلوص نیت اور ریاکاری کے فرق کو جان لیں عبادت یوں ہو کہ اس کا اثر قلب و روح پر نقش ہو جائے۔ نماز کے مفہوم کو سمجھیں کہ کس طرح سے فوراً ہی یہ بغیر کسی مذہبی اجارہ دار کی مداخلت کے، بندے کو اللہ کے پاس پہنچا دیتی ہے۔ اور یہی اس کے لیے معراج ہے۔ نماز بے ریا ہو خضوع و خشوع کے ساتھ ہو صرف اللہ کے

---

[1] کشمیر میں بہت سارے دیہات میں جو دینی بزرگوں یا اولیاء اللہ کے روضے یا مقابر موجود ہیں وہ جہاں صاحب روضہ یا صاحب مقبرہ کا نام معلوم نہ ہو، سیّد صاحب ہی کہلاتے ہیں۔ (کشمیری زبان میں سید حبیب) اور اشارہ ان ہی سادات و مبلغین عظام کی طرف ہوتا ہے جو حضرت شاہ ہمدانؒ یا اُن کے فرزند گرامی حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے ہمراہ دین اسلام کو رواج دینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ (تبلیغی مراکز سے مراد یہی مساجد ہیں)

[2] جن خانقاہوں کا ہیں نے نام لیا ہے بعض مؤرخین نے ان کی تعمیر حضرت میر محمد ہمدانیؒ فرزند ارجمند حضرت شاہ ہمدانؒ سے منسوب کی ہے۔

ڈر سے ہو، تو نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے اخلاق میں بہتری اور بلندی پیدا ہوتی ہے ہمسایوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اخلاقی برتری کے سلوک نتیجے میں میل جول محبّت کا پیدا ہو جاتا ہے عام لوگوں کے ساتھ بھی روابط خوش خلقی کی وجہ سے بڑھ جاتے ہیں۔ آپس میں اعتماد اور باہمی معاملات میں بھی اطمینان اور سُدھار پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ ایک فکری تربیت تھی اور ایک ذہنی انقلاب تھا جو حضرت شاہ ہمدانؒ نے اہل کشمیر میں پیدا کیا۔ اس اہم فکری اور ذہنی انقلاب کی محکم بنیاد پر بعد کے آنے والے دینی معماروں نے وہ عمارت نصب کی جس میں انھوں نے ثباتِ دوام کے رنگ بھر دیئے۔ یہ تعمیر چونکہ مردانِ خدا کے ہاتھوں ہوئی اس لیے زوال سے محفوظ رہی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کے ساتھ جو مامورانِ نشرِ دین الٰہی تھے۔ اُن میں سے ہر ایک فرد خود اُن ہی کی طرح زندگی کے اُمور سے متعلق مختلف فنون میں قدرت رکھتے تھے۔ وہ معمار تھے طبیب تھے۔ تجارت پیشہ تھے، زراعت پیشہ تھے، مہندّس تھے، دستکار تھے، اور علم دین میں مہارت رکھنے کے علاوہ روحانی بلندیوں سے بھی سرافراز تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی تھے خطّاط بھی تھے اور صحاف بھی۔ یہ تربیت اُن کو اس لیے حاصل تھی کہ بیگانے ملک میں اپنی ماموریت یعنی دین اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں اور اسلام کے نظام کو تعمیر کرنے کے دوران اگر کوئی شگاف پیدا ہو اس کو خود بند کر سکیں اور کوئی کمی واقع ہو تو اُسے پورا کریں اور اس کی استواری اور مضبوطی کو یقینی بنائیں۔ اسی لیے یہ حضرات اوّل عالم تھے۔ اور بعد میں پیشہ ور۔ علم ہی کی بنیاد پر شاہ ہمدانؒ نے کلمۂ توحید کا نعرہ دے کر اہل کشمیر کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اور اس وقت کے بالاترین ہندو راہب کو علمی دلائل سے ہی قائل کر کے اُس سے دین اسلام کی حقانیت کا اقرار کروایا۔ اس سلسلہ میں صاحب احسن التواریخ کی یہ عبارت قابلِ ملاحظہ ہے:

> "...... سلطان بمع وزرا و امرا و لشکریانِ صف بستہ، از مقبرۂ سید بلبل شاہ بطور جلوس ہمراہِ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ تشریف کشیدہ بر قرارگاہ راہب، کہ بشکل صُفّہ بود رسید۔ از راہب حقیقتِ حال دریافت

کردند۔ راہب از کمالاتِ خود، کہ در کتب تاریخ مندرج است بیان کردہ حضرت امیرؒ چون از راہب ضعف استعداد یافتہ، بہ ادلّہ ساطعہ و بہ براہین قاطعہ اور مشکت نمودہ خاموش گردانید و راہبِ مذکور، کمالاتِ علیہ عالیۂ میر سیّد علی ہمدانی قدس سرہٗ، مشاہدہ نمودہ، انقیاد و اطاعت فرمودہ، در حلقۂ اسلام داخل شد و مردمان جوق در جوق طائفہ بہ طائفہ اسلام قبول نمودند و این راہب موسوم بہ شاہ محمد شد[1]...."

[.... سلطان (قطب الدین) وزیروں اور امیروں اور صف باندھے ہوئے فوج کے سپاہیوں کے ساتھ جلوس کی صورت میں حضرت سیّد بلبل شاہؒ کے مقبرۂ شریف سے حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کو راہب کے ٹھہرتے کی جگہ پر، جو ایک صُفّہ کی صورت میں تھا لے آیا۔ حضرتؒ نے راہب سے حقیقت حال پوچھی۔ راہب نے جیساکہ تواریخ کی کتابوں میں درج ہے، اپنے کمالات کا ذکر کیا۔ حضرت امیرؒ تے جب راہب میں استعداد کی کمزوری کا مشاہدہ کیا تو آپ نے اُسے روشن دلیلوں اور قاطع براہین و دلائل سے ساکت اور خاموش کردیا اور راہب موصوف تے حضرت میر سیّد علی ہمدانی قدس سرہٗ، کے بلند و برتر کمالات کا ملاحظہ کرکے آپ کی اطاعت اور فرمان برداری قبول کرلی اور اسلام کے دائرے میں آگیا اور لوگوں تے بھی بھاری تعداد میں خواہ وہ کسی بھی طائفہ کے تھے دین اسلام قبول کرلیا اور اس راہب کا نام شاہ محمد رکھ دیا گیا....]

نومسلموں کے جذبات کے احترام میں اور اُن میں اطمینان پیدا کرتے کی خاطر حضرت شاہ ہمدانؒ نے عبادت گاہوں، مسجدوں اور خانقاہوں کی طرزِ تعمیر میں کوئی مداخلت نہیں فرمائی۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم خانقاہوں کی طرزِ تعمیر یہاں بدھ وہاروں کے مشابہ ہے۔ مؤثر اور پائیدار اور اطمینان بخش طریقۂ تبلیغ تھا بھی یہی، کیوں کہ لوگوں نے چونکہ اسلام کو ایک

---

[1] احسن التواریخ مؤلّفہ مفتی محمد صدرالدین۔ قلمی نسخہ (زیرعنوان: خانقاہِ معلّی) :

درست و صحیح دستورِ زندگی اور نظامِ حیات کے طور پر ایک نئے معاشرے اور روشن حال و مستقبل کی اُمید پر قبول کیا، اس لئے حضرت شاہ ہمدانؒ نے ان کے بعض غیر اہم اُمور سے بے اعتنائی فرمائی[1] لیکن شرعی اُمور میں کوئی رعایت اور اعراض نہیں برتا۔ چنانچہ سلطان قطب الدین شہمیری کے نکاح میں جو دو عورتیں باہمی رشتے کے لحاظ سے دو بہنیں تھیں ان میں سے فوراً ہی ایک کو الگ کر کے طلاق دیا گیا۔ ان نہایت معمولی اور غیر اہم چیزوں کی یہ رعایت بھی بذاتِ خود ایک خوبی سمجھی گئی اور اس طرح کی نرم خوئی اور حزم و احتیاط نے سرعت و ثبات کے ساتھ اور بے مثال طور پر دین اسلام کے پھیلنے میں سازگار ماحول پیدا کیا میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ دین اسلام کا شاہ ہمدانؒ کی وساطت سے کشمیر میں رائج ہو جانا ایک خدائی معجزہ تھا کیونکہ بنیادی طور پر تمام اُمور اور سب چیزیں اُسی کی مرضی اور بنائی ہوئی تقدیر سے وجود میں آتی ہے۔ مؤرخین اسلام کا بھی یہی ایمان ہے کہ اسلام کی کامرانیاں اور کامیابیاں معجزے ہیں لیکن دین اسلام کا کشمیر میں داخل ہونا ٹھیک وقت پر تھا یعنی اُس وقت جب کہ یہاں کے راہبوں اور کاہنوں کے ظلم و جور کے بوجھ کے نیچے کراہتی ہوئی قوم اور مطلق العنان بادشاہوں اور زمینداروں اور سرکش و باغی سرداروں کی قائم کی ہوئی ظالمانہ روایات کا مقابلہ سوائے اسلام کی طاقت کے اور کسی چیز سے ہو ہی نہیں سکتا تھا، وہی طاقت، جو بالآخر انہیں ہزار سجدوں سے آزاد کر کے صرف ایک سجدے کی طرف لے آئی اور یکتا پرستی و خدا پرستی

---

[1] مثلاً خانقاہوں کی مقامی طرزِ تعمیر، اوراد فتحیہ کو بلند آواز میں پڑھنے کی اجازت اور کسی اہم قومی مسئلے یا خطرے کے وقت نیز علی الصباح پو پھٹنے کی اطلاع کے لیے خانقاہ میں گھنٹال بجانے کی اجازت۔ یہاں پر یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال ۶۳۰ء میں مکہ فتح کیا اور وہاں کے بتوں کو تحس نحس کر دیا لیکن حجر الاسود کو کعبہ کی دیوار میں بدستور قائم رکھا اور قدیم دستور کے مطابق وہاں کے بعض مراسم حج کو بھی برقرار رکھا۔ ضمناً یہ بھی کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تاجکستان میں جن گھروں میں گھر کے معمّر افراد اوراد فتحیہ پڑھتے ہیں وہ بلند آواز میں ہی پڑھتے ہیں۔ حضرت شاہ ہمدان کے گاؤں کولاب میں بھی یہی رواج آج تک چلا آ رہا ہے۔

کے اطمینان بخش اور سکون آمیز ماحول میں لاکے رکھ دیا جہاں مساوات تھی، عدل وانصاف تھا، نہ آقا اور غلام کی تفریق تھی، اور نہ ہی اونچے ذات والے تھے، اور نہ ہی نیچی ذات کے۔ بس ایک طاقت کا سایہ تھا اور اُسی کے رحمت کی حکم فرمائی تھی اور وہ تھا اللہ! جس کی شفقت اور فضل وعنایت کی دھوپ یکساں طور پر ہر کسی کے اوپر چمکتی تھی۔ یہ دین فطرت یہاں کے نومسلموں کو اسقدر بھایا اور رگ و پے، اور جسم وجان میں ابدیت تک یوں سرایت کر گیا کہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہو کہ شاہ ہمدانؒ کے وطن لوٹنے کے بعد نومسلم اپنے مذہب میں لوٹ گئے ہوں۔ بلکہ بعد میں اسی قوم سے ایسے دینی رہنما اُٹھے جنہوں نے کشمیر میں دینِ اسلام کی حفاظت کے لیے قربانیاں دیں اور آج بھی یہاں ہر غلط تاویل کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اسلام کے خلاف فتنے کا سر کچلنے کے لیے مردانِ راہِ الٰہی سر بکف ہیں۔

* * *

اس فکری اور ذہنی انقلاب کے بعد شاہ ہمدانؒ نے ایک معاشرتی تبدیلی پیدا کی جو اگرچہ دین اسلام کا ایک منطقی نتیجہ تھی لیکن بیشتر تبدیلیاں عملی کوششوں سے وجود میں آئیں۔

اخلاقی نظم وضبط، اور حسب ونسب کے تعصب سے اجتناب اور پاکیزہ انفرادی طرزِ زندگی اگر اس دین کے فطری نتائج تھے لیکن پورے نئے اسلامی معاشرے میں علم وادب کی وسعت اور ترقی، تہذیب وتمدن کی زرخیزی، اور مختلف فنون کی بنیادیں ڈالنے کی مساعی، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑی بارور ثابت ہوئیں اور اِن مخلص اور پاکباز و پاکدل تمدن ساز اور تہذیب گر مجاہدین اسلام کی خشت اوّل نے وہ عمارت وجود میں لائی جسکی شہرت آج بھی عالمگیر ہے۔

دینی تربیت کی اہمیت کے پیش نظر مسجدیں ہی اوّل اوّل تعلیمی مرکز رہیں اسی لیے کبھی مسجد مدرسہ کے نام سے اور مدرسہ مسجد کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔ اور یہ مشترک نام اور باہمی آمیزش سبھی اسلامی ادوار میں جاری رہی چنانچہ زاہدوں کی عبادت گاہیں اور سرائیں اور خانقاہیں بھی تعلیم وتدریس کے لیے مخصوص تھیں۔ گویا تمدن میں مدرسہ

کا مفہوم ایک کلّی اور عام مفہوم ہے جو مختلف اجزا رسے بنتا رہا ہے۔ بعد میں اگرچہ خاص اور مکمل طور پر مدرسے قایم بھی ہوئے لیکن دینی علوم سے عاری نہیں تھے کشمیر میں بھی حضرت شاہ ہمدان نے اوّل اوّل مسجدوں کے ایک حصّے کو مدرسہ کے طور پر استعمال میں لایا ہوگا اور بعد میں شرعی علوم کے تسلی بخش حد تک پھیل جانے کے بعد اُن بزرگانِ دین نے دینی اور یہ مروجہ علوم کے مدرسے مسجد سے الگ کر دیے ہونگے جو بعد میں سکونت پذیر ہو کے رہ گئے۔ خود حضرت شاہ ہمدانؒ اور اُن کے بیشتر رفقا ایران کے ایسے معروف اسلامی مدرسوں سے فارغ التحصیل تھے جہاں علوم قرآن (یعنی قرائت اور تفسیر قرآنی قصوں میں بحث و تمحیص، معجزات قرآن امثال و احکام قرآن) حدیث اور فقہ اور ان کی شاخیں، کلام، ادبی علوم یعنی صرف و نحو، لغت، معانی و بیان، نقد النظم، نقد النثر، قافیہ، بدیع و عروض وغیرہ کی تعلیم کے علاوہ علوم ریاضی اور علم طب، علم منطق، علم جدل، علم بحث و مناظرہ، اصول و مبادی، عرفان پر بحث و تمحیص، فلسفہ کے سیکھنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ حضرت شاہ ہمدانؒ ایک پیشہ ور طبیب نہیں تھے لیکن اس انسان دوستی کے پیشہ سے اُن کو دلچسپی تھی۔ اُن لافانی تصنیف ذخیرۃ الملوک میں انکے جامع الکمالات ہونے کی ایک قاطع دلیل ہے۔ ان کے ساتھی مبلغین جو کشمیر میں رہے اور انکے ساتھ یا اُنکے بعد وطن نہیں لوٹے بھی صاحب تصنیفات تھے اور جن علوم کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے ان میں سے کئی علوم پر انھوں نے کشمیر میں رہ کر کتابیں لکھی ہیں۔

کشمیر میں دینی علوم کو رواج دینے کے لیے مدرسے قائم ہوئے۔ گو اوّل اوّل ان مدرسوں میں قرآنی علوم، تفسیر و حدیث، علم کلام اور آداب و مناسک دینی شامل نصاب درس تھے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ طب سے متعلق علم[1] ابدان کے علاوہ مفید علوم سیکھے

---

[1] منصور ابن احمد نے سلطان زین العابدین کے لیے طب میں کفایت المجاہدہ نام کی کتاب لکھی جو علم طب میں بڑی مشہور کتاب اب بھی مانی جاتی ہے اور طبی مدرسوں میں نصاب میں شامل تھی منصور ابن احمد سلطان کا شاہی طبیب تھا نیز اسی طبیب نے امیر تیمور کے پوتے مرزا پیر محمد کے لیے ایک مصوّر کتاب تشریح دانا لوٹمی) کے نام سے لکھی جو مفید توضیحات [انسانی بدن کی (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

جانے لگے۔ خواہ وہ مطلوب تھے یا نا مطلوب[1] یعنی علم نجومی جو خالص ایک مفید علم ہونے کے لحاظ سے پڑھا جاتا تھا نہ کہ اس سے نجومی حساب کے اندازے لگانے کے لیے کیوں کہ پورے عالم اسلام میں نجومی احکام پر عمل کرنے سے اجتناب کیا جاتا تھا[2]۔ مدرسوں کی اسی ابتدائی بنیاد پر بعد میں کشمیر میں نہ صرف بڑے مشہور مدرسے وجود میں آئے بلکہ دینی اور مروجہ علوم میں دانشگاہیں بھی قائم ہوئیں[3]۔

ایک نو مسلم ملک میں دینی علوم کے مدارس اور خانقاہیں اولیں فرصت میں قائم کرنے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) تشریح کے بارے میں) پر مشتمل تھی۔ ہندوستان کے کئی کتاب خانوں میں جن میں آصفیہ کتابخانہ حیدر آباد، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، رضا لائبریری رامپور اور خدابخش کتابخانہ پٹنہ شامل ہیں میں نے کفایۃ المجاہدہ کے قلمی نسخے دیکھے ہیں۔ مزید اطلاعات کٹلاگ انگریزی مؤلفہ ریو اور برٹش میوزیم کٹلاگ۔

[1] ابتدائی مدرسوں کے بارے میں جو حضرت شاہ ہمدانؒ اور ان کے رفقا نے قصبوں اور دیہات میں قایم کیے۔ اگرچہ تفصیلات دستیاب نہیں لیکن دینی علوم کو وسعت دینے کی خاطر مدرسوں کا قیام ترجیحی بنیادوں پر ہوا گو کہ اوّل اول اس طرح کے مدرسے فوراً ہی مسجدوں میں دائر کیے گئے۔ خانقاہوں کے بارے میں تفصیل اسی کتاب میں آگے آئیگی۔

[2] امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے فرمایا رضی اللہ تعالیٰ عنہ "تَعَلَّمُوْا مِنَ النُّجُوْمِ مَا تَهْتَدُوْا بِهٖ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ اَمْسِكُوْا"۔ نجوم سے بس اتنا ہی سیکھ لو جس سے خشکی اور سمندر میں راستہ مل جائے اور اس سے زیادہ سے رک جاؤ۔ ملاحظہ ہو: ترجمۂ احیاء علوم الدّین، ترجمان مؤیّد الدین محمد خوارزمی بہ کوشش حسین خدیو جم، نشریہ انتشارات بنیاد فرہنگ ایران سال ۱۳۵۱ش صفحہ ۱۰۰ جلد اوّل۔

[3] نوشہرہ میں (سری نگر) سلطان زین العابدین کی قائم کی ہوئی یونیورسٹی؛ بابا اسمٰعیل کی موجودہ ہاری پربت کے شمالی دامن میں قائم کی ہوئی دانشگاہ جہاں بیرونی اسلامی ممالک کے طلبا آکر علوم دین سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد اوّل صفحہ ۳۴۸؛ واقعات کشمیر؛ کشمیر؛ تاریخ کبیر۔ مدرسوں کی بنیاد ڈالے جانے کے بارے میں بعض رفقائے کار اور علماء و فضلا جو حضرت ہمدان شاہ کے ہمراہ تھے، کی علمی مشاغل کے بارے میں الگ باب میں ذکر ہوگا۔

کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ ان ہی علمی مراکز سے ایک نئے تمدّن اور تہذیب کا ظہور ہوا تھا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ خود ایران کے مشہور شہر ہمدان سے تھے اور اُن کے ساتھ جو سادات اور مبلّغین تھے وہ بھی ایران کے مختلف صوبوں، قصبوں، شہروں اور دیہات سے تعلق رکھتے تھے اور ان علاقوں سے بھی جو وسط ایشیا سے مربوط تھے اور جس میں موجودہ افغانستان بھی شامل تھا[لہ]۔ دراصل وسط ایشیا میں وہ سارے مُسلم علاقے جو آج رُوس میں ہیں مع افغانستان کے ایران ہی کہلاتے تھے۔ بہر حال یہ سارے مبلّغین کشمیر میں اسلام کے رواج دہندگان ہونے کے علاوہ ایرانی تہذیب و تمدّن کے نقیب بھی تھے۔ اس مخصوص تمدّن کی ان ہی مدرسوں اور خانقاہوں میں بنیاد ڈالی گئی۔ اور بعد میں رفتہ رفتہ ایرانیوں کی آمدورفت اور مقامی بادشاہوں کی سرپرستی کے نتیجے میں، ایرانی تہذیب و تمدّن، کشمیری تمدن پر اسقدر غالب آگیا کہ بول چال کی زبان کے بغیر پورا کشمیر ایک چھوٹے ایران میں تبدیل ہوگیا۔ گویا حضرت شاہ ہمدانؒ اوّلین فعال اور محرک و مبلّغ دین اسلام ہونے کے علاوہ، اپنے ملک کے تہذیب و تمدّن کے بھی اوّلین سفیر تھے۔

سات سو سادات اور مبلّغین دین اسلام کا قافلہ کشمیر میں جب داخل ہوا تھا تو یہ قافلے والے اپنے ملک کی معاشی سیاسی، صنعتی، زراعتی، فنّی، ادبی، تعمیراتی اور مذہبی اور روحانی روایات کو لے کر آئے تھے۔ یہ خود معمار تھے۔ زراعت پیشہ تھے۔ مختلف فنون و ہنر سے وابستہ تھے۔ مدرّس تھے۔ استاد تھے۔ دینی علوم میں ماہر تھے یعنی فقیہہ تھے۔ محدّث تھے قاری تھے،۔ امام تھے اور روحانی دنیا کے رہبر بھی۔ خود حضرت شاہ ہمدانؒ اِن سب کے پیشوا تھے اور۔ ہادی، وہ تاریخ اسلام میں ایک تاریخی کارنامہ کا فریضہ انجام دینے کے لیے ایک ایسے ہی کاروان کا انتخاب کر چکے تھے جن میں سے ہر ایک فرد ان ہی متذکرہ بالا اوصاف

[لہ] اٹھارویں صدی عیسوی کے اوسط سے جب کہ افغانی نسل کی برتری دوسرے ایرانی یا تُرک نسلوں پر ثابت ہوگئی اور ایک ملک کی سیاسی وحدت قایم ہوئی افغانستان کا نام سارے ملک کو دیا گیا ورنہ اس سے پہلے یہ مغلیہ ہندوستان اور صفوی ایران کے زیر تسلط تھا جب کہ تیموری دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

سے متصّف تھا۔ خود حضرت شاہ ہمدانؒ اِن اوصاف کا ایک اعلٰی نمونہ تھے۔ یعنی وہ معاشرہ کے، سیاست کے فنّ و ادب کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ ایک عامل رہبر بھی تھے۔ روحانی کمالات اور دنیاوی صفاتِ حمیدہ ہیں، جن پر آگے چل کر آپ کو کشمیری قوم کی ہدایت کرنا تھا، آپ اہل کاروان کے مقتدیٰ تھے۔ روحانی عالم میں صاحب کشف وکرامات، قطب الاقطاب، اور رہنمائی عُلومِ ربّانی اور غوثِ آفاق تھے، اور اس عالم ظاہری میں عام آدمی کی طرح ایک کاسب تھے جو ٹوپیاں سینے کے کسب سے رزقِ حلال کمایا کرتے تھے۔ کشف وکرامات جو آپ سے منسوب ہیں اور جن کا ذکر خلاصۃ المناقب میں ہے اُن میں کوئی واقعہ ایسا نہیں جو مبالغہ اور غلو کی حد تک ہو۔ روحانی طاقت دراصل اللہ کی ودیعت ہے اور مناسب موقع و محل پر، اللہ کی مرضی سے، اُس کے دین کی عظمت اور حقانیّت کی تکرار کے اضطرار کے طور پر اس کا مظاہرہ کرنا ناگزیر سے ہے۔ یہ کام بنی اسرائیل کے ہر پیغمبر نے کیا ہے اور تاریخ اسلام میں اللہ کے بعض برگزیدہ علماء اور اولیاء نے بھی[1]۔ اگرچہ حضرت شاہ ہمدانؒ کا کشمیر میں دینی اور

---

[1] ڈاکٹر اقبال جو خود ایک برگزیدہ ولی اللہ اور مانے ہوئے عاشق رسول تھے اولیاء کرام کی روحانی عظمت وکرامت کے سخت معتقد تھے۔ انھوں نے فرمایا ہے ؎

تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی — نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو — یدِ بیضا چھپا بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

(بعض اڈیشن نظر سے گذرے ہیں جن میں چھپا بیٹھے ہیں کی جگہ لیے بیٹھے ہیں درج ہے) ایک اور نظم طلوعِ اسلام میں فرمایا ہے کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟ — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دراصل ایسے ہی تاریخ اسلام کے مومنانِ صاحب نگاہ ڈاکٹر اقبالؒ کے سامنے تھے جن کی توصیف میں انھوں نے یہ شعر کہے اور کس کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ شاہ ہمدانؒ کی معجزہ آسا نگاہ سے کشمیر کی تقدیر ہی بدل گئی۔ ایران کے خداشناس عارف خواجہ حافظ شیرازیؒ خود درویشان راہ حق کی توصیف و ستایش میں رطب اللسان ہے کہ ؎

تمدنی ، تہذیبی اور فکری تغیر و انقلاب لانے کا عمل ، بذاتِ خود ایک معجزہ ہے ، لیکن اس سے پہلے کہ ہم تفصیل سے اُن کے اور انکے رفقاء اور مبلّغین حضرات کے توسّط سے کشمیر میں تہذیبی اور تمدنی اثرات و تغیّرات کا ذکر کریں ، یہاں پر حضرت شاہ ہمدان رح کی روحانی شخصیت کی چند کرامات کا ذکر ناضروری ہے اور ہم یہ بیان اُن ہی مندرجات تک محدود رکھیں گے جو معتبر ترین سند خلاصۃ المناقب میں موجود ہیں ۔

مولانا نورالدین جعفر بدخشی رح فرماتے ہیں کہ جس رات میں نے حضرت امیر کبیر رح کے دست مبارک پر بیعت کی تو :

> ”...... در حالت بیعت چون یک دستِ این فقیر بگرفت درمیان آن دو دست کبیر نورِ ولایت آنجناب ملیع دیدہ شد کہ در ہمگی خانہ مملو گشت و لبس حیرت حاصل آمد از ان ملیعِ عجیب......لہ“

[بیعت کرنے کی حالت میں جب انھوں نے اس فقیر کا ہاتھ پکڑ لیا تو آپ کے ان دو عظیم ہاتھوں میں سے ولایت کا روشن اور درخشان نور ایسے پھوٹتے دکھائی دیا کہ سارا گھر جگمگا اٹھا ۔ اور اس عجیب و غریب نور کو دیکھ کر ہم سب حیران ہو گئے ....“

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) روضۂ خُلد برین خلوتِ درویشان است ما یہ محتشمی خدمتِ درویشان است
گنجِ عزلت کی طلسماتِ عجائب دارد فتح بابش نظرِ رحمتِ درویشان است
دولتی راکہ نہ باشد غم از آسیب زوال بی تکلف بشنو دولتِ درویشان است
آنچہ زر می شود از پرتو آن قلب سیاہ کیمیائیست کہ در صحبتِ درویشان است“

[درویش حضرات کی خلوت ، بہشت برین کا باغ ہے ۔ درویش حضرات کی خدمت کرنا جاہ و حشمت کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ تنہائی کا خزانہ جس میں عجیب و غریب طلسمات پوشیدہ ہیں اس کے دروازے درویش حضرات کی نظرِ رحمت سے ہی کھل جاتے ہیں ، جس دولت کو زوال پذیر ہونے کا کوئی خوف نہیں ، بغیر تکلّف کے وہ دولت صرف درویش حضرات کی رہنمائی کی دولت ہے سیاہ دل جس کے پرتو سے سونا بن جاتا ہے وہ وہی کیمیا ہے جو درویش حضرات کی صحبت میں ہی ملتا ہے ۔

لہ خلاصۃ المناقب :

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ:

"....ای دوست بدان کہ در ایّام صحبتِ با نزہتِ جناب سیادت ہر چہ در خاطرم آمدی آن را بر من آشکارا کردی و اگر مصلحت اظہار آن نہ بودی بہ اشارت تنبیہ فرمودی[1]...."

[....اے دوست جان لو کہ حضرتِ سیادتؒ کے ساتھ پاکیزہ مصاحبت کے ایام میں جو کچھ کبھی میرے دل میں گذرتا اُسے آپ مجھ پر ظاہر کرتے یعنی بتادیتے اور اگر بتادینے یا ظاہر کرنے میں مصلحت نہ ہوتی تو پھر مجھے اشاروں سے تنبیہہ کرتے...."

آپ کے ایک مرید کاکا شیرازیؒ بیان کرتے ہیں[2] کہ جب میں ماوراء النہر میں حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے پہچان لیا کہ غیب سے مجھے یہی آواز اپنے مقام حضور میں اپنے گاؤں میں سنائی دیتی تھی۔ مجھے اُن کی عالی ہمتی کی برکت سے اُن سے علم کا فیض ملا اور انکے کمال کا تو کوئی جواب نہیں پانی پر چلنے کی تو بات ہی نہیں ہوا میں بھی سیر کر سکتے تھے اور سہ

"......این کمال در جنابِ سیادت ظاہر بود، زیراکِ تادیگری با سعی تمام چند قدمی برفتی، حضرتِ سیادت مسافتی قطع کردی، و در وقتِ قرآن خواندن، تا دیگری با سعیِ تمام چند کلمہ بخواندی، جنابِ سیادت بسیار از قرآن خواندی، و این علیہ از شرعتِ روحانیت است[3]......"

[....اور یہ کمال حضرتِ سیادتؒ میں نمودار تھا۔ کیوں کہ جب کوئی شخص کمالِ کوشش سے چند ہی قدم چلتا تو حضرت سیادتؒ ایک لمبا فاصلہ طے کر چکے ہوتے۔ اور قرآن مجید پڑھتے وقت جب کمالِ کوشش کے ساتھ کسی نے ابھی چند ہی الفاظ پڑھے ہوتے، تو حضرت سیادتؒ نے قرآن پاک کا بہت بڑا حصّہ پڑھ لیا ہوتا۔ اور ان کا یہ غلبہ روحانیت میں انکی تیز رفتاری کی وجہ سے تھی...."]

---

[1] خلاصۃ المناقب [2] خلاصۃ المناقب [3] خلاصۃ المناقب۔

مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ بیان کرتے ہیں کہ :

"..... واین فقیر از خدمتِ خواجہ عبداللہ، رحمۃ اللہ، شنود کہ فرمود کہ چون جناب سیادت از منزلِ بدخشان مسافرت نمود بہ جانب خطۂ ختلان، من در آن حجرہ کہ خدمتِ سیادت می بود در آمدم۔ دیدم کہ خدمت امیرؒ نشستہ است پس تأمّل کردم کہ سلام باید کردن آنگاہ باید پرسیدن کہ چگونہ شد کہ از سفر ختلان ایستادہ شدہ اند و خواستم کہ بہ سخن در آیم۔ آن صورتِ امیریہ از چشم من نہان گشت و من در تحیّر افتادم کہ این چہ حال بود کہ نمود و زود ربود...[1]!!"

[..... اور اس فقیر (نورالدین جعفر) نے جناب خواجہ عبداللہ، اللہ ان پر رحمت فرمائے سے سُنا کہ فرمایا انھوں نے کہ، جب حضرتِ سیادتؒ نے بدخشان سے ختلان کا سفر اختیار کیا تو میں اس حُجرے میں آیا جہاں حضرتِ سیادتؒ تشریف رکھتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں میں نے سوچا کہ مجھے پہلے سلام کرنی چاہیئے پھر اس کے بعد پوچھ لینا چاہیے کہ ختلان کے سفر پر جانے سے کیوں ٹھہر گئے ہیں اور میں نے بات کرنا ہی چاہی کہ حضرت امیرؒ کی صورت مبارک میری آنکھوں سے چھپ گئی اور میں حیران ہوگیا کہ یہ کیا ہوا اور یہ حال جلدی زائل بھی ہوگیا......]

مولانا نورالدین جعفر بدخشی حضرت شاہ ہمدانؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں :

"..... حضرت سیادت فرمود کہ وقتی در منزلِ نزول حاصل آمد کہ حجرہ ای بود قفل کردہ۔ گفتم : در این حُجرہ باید گشادن۔ سکانِ آن منزل گفتند کہ: ہر کہ درین حجرہ شب می باشد بلاشک صباح بر جنازہ بود۔ پس التماس نمودم کہ: باید کشادن۔ اجابت کردند و چون پارہ ای از شب گزشت، در کشادہ شد و کنیزکی در آمد شمعی در دست و در عقب آن کنیزک مرآۃ حسناء کاملہ در حُسن، در آمد و بنشست و بتدریج سوی من می آمد تا میانِ من و میانِ آن مرآۃ بقدرِ

---

[1] خلاصۃ المناقب :

ذرائی ماند یا ہنوز کمتر و مرا از حرکت آن مرآۃ بغیرت بجوش آمد و بہ حدّت و حمیّت سوی مرآۃ نظر کردم۔ پس وجودش منتشر گشت مثل ارزن کہ بر زمین پاشیدہ شود با آواز، و ناپدید شد۔ صباح بسلامت مرا دیدند، تعجب نمودند و بہ واسطہ آن بمن اعتقاد کردند و آن اعتقادِ من سبب انتقال من آمد ازان منزل [1]،،

[”... حضرت سیادت نے فرمایا کہ: ایک دفعہ ہم ایک منزل پر اُترے اور وہاں ایک حُجرہ تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ: اس حُجرے کا دروازہ کھول دیا جائے، اس جگہ کے لوگوں نے کہا کہ: جو بھی کوئی رات کو اس حُجرے میں ٹھہرتا ہے صبح کے وقت اس کا جنازہ اُٹھتا ہے۔ پھر تو میں نے تاکیداً التماس کیا کہ دروازہ کھول دیا جائے، وہ مان گئے۔ جب رات کا کچھ حصّہ بیت چکا تو دروازہ کھُلا اور ایک کنیز ہاتھ میں شمع لیے ہوئے داخل ہوئی اور اس کنیز کے پیچھے ایک بے حد خوبصورت عورت جو حسن و جمال کا ایک نمونہ تھی، آرہی تھی، یہ عورت بیٹھ گئی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگی یہاں تک کہ اس عورت کے اور میرے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ گیا بلکہ شاید اس سے بھی کمتر۔ عورت کی اس حرکت پر میری غیرت جوش میں آگئی اور میں نے سخت تُندی اور غیرت کے ساتھ اس عورت پر نگاہ ڈالی۔ پس فوراً اس کا وجود بکھر گیا چینا کے دانوں کی طرح آواز کے ساتھ وہ عورت غایب ہوگئی۔ صبح کو لوگوں نے مجھے بسلامت دیکھا اور اظہار حیرانگی کیا اور اس واقعہ کی وجہ سے وہ میرے معتقد ہو گئے۔ لیکن انکے اسی اعتقاد کی وجہ سے میں اس جگہ سے چل دیا۔]

---

[1] خلاصۃ المناقب: نظم المناقب کے مؤلّف نے بھی یہ واقعہ خلاصۃ المناقب کے حوالے سے لکھا ہے لیکن اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ یہ واقعہ کشمیر کے ٹنگڈار نامی گاؤں میں پیش آیا تھا۔ جو کرنا کے قصبہ میں واقع ہے۔ اور وہاں بہت عمدہ اور دلکش خانقاہ بنی ہے جہاں سے لوگوں اور زائرین کو صبح و شام فیض پہنچتا رہتا ہے۔ یہ واقعہ ابھی بھی وہاں کے لوگوں کی زبان پر مشہور ہے ملاحظہ ہو نظم المناقب زیر عنوان ”ذکر کشتن علی الثانی رضی اللہ عنہ دیو زن را از یک نگاہِ ہیبت در دہی در کشمیر در پرگنہ کرنا و مسمّی بہ ٹنگڈار مشہور است“ نیز ملاحظہ ہو، منقبۃ الجواہر:

حضرت شاہ ہمدانؒ نے ایک بار فرمایا:

"... وقتی در کشتی بودم با جمع کثیر۔ ناگاہ کشتی بشکست و بر تختہ پارہ چند روزی می رفتم۔ وچون نجات یافتم سہ ماہ بایست رفتن تا بہ موضعی رسیدم کہ طعام موجود بود۔[1]"

[... "ایک بار میں ایک کشتی میں لوگوں کی ایک بڑی جماعت میں بیٹھا تھا۔ اچانک کشتی ٹوٹ گئی اور لکڑی کے تختے کے سہارے میں چند دنوں تک چلتا رہا اور جب میں نے نجات پائی تو ابھی خشکی کی راہ سے تین ماہ کا سفر تھا۔ میں ایک گاؤں میں پہنچا جہاں سے مجھے غذا ملی...]

ایک اور دفعہ حضرت امیر نے فرمایا:

"..... ودر دقتی دیگر در کشتی بودم ناگاہ ملاّح را اضطرابی پدید آمد پرسیدم کہ حال چیست؟ جواب داد کہ: درین منزل کہ حالی رسیم قومی است کہ سر ایشان مثلِ سرِ زاغ است و مسکن ایشان درین جائی دریاست، و ہیچ کشتی از ملاقات این زاغ سران، نجات نیافتہ است۔ پس کشتیبانرا۔ را گفتم کہ: مترس کہ خدائے تعالیٰ مارا معین و حافظ است۔ کشتی بان سر بہ قدم این درویش نہاد و نذرہا کرد و آن جمع کثیر کہ در کشتی بودند در تعزبت شدند و نذرہا کردند، و حال آنک زاغ سران بیرون نیامدند و کشتی بہ سلامت از آن منزل کہ خوف بود بگذشت...[2]"

[..... اور ایک بار میں کشتی میں تھا۔ اچانک ملاّح میں بیقراری پیدا ہوئی میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: اس جگہ پر جہاں ہم ابھی پہنچنے والے ہیں ایک قوم رہتی ہے جن کے سر کوے کی مانند ہیں اور وہ اسی جگہ سمندر میں رہتے ہیں چنانچہ کوئی بھی کشتی ان کوّے کے سر رکھنے والوں کے ساتھ دوچار ہونے کے بعد سلامت نہیں رہتی اور بچ نہیں پاتی ہے۔ میں نے ناؤ چلانے والے سے کہا: خوف نہ کرو اللہ تعالیٰ ہمارا مددگار اور حفاظت کرنے والا ہے۔ ملاّح نے اپنا سر میرے قدموں پر ڈال دیا اور نذر و نیاز کی نیت

---

[1] خلاصۃ المناقب؛ [2] خلاصۃ المناقب:

کر لی۔ اور وہ مسافر لوگ بھی جو خاصی تعداد میں سوار تھے سخت غمزدہ ہو گئے اور انھوں نے بھی منتیں مانگیں۔ اور ہوا یہ کہ وہ کوے کے سر ولے باہر آئے ہی نہیں اور کشتی خوف و دہشت کے مقام سے سلامتی کے ساتھ گزر گئی....."]

یہ بیانات خود حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے ہیں۔ اور اس سے پہلے ہم اُن ہی کی زبانی آزمائشوں سے متعلق ان کو شاہی درباروں میں حرام خوری یا نہر خورانی کے پیش آنے والے واقعات کا ذکر کر چکے ہیں جن میں سے ایک ایسے ہی واقعہ کے عینی شاہد خود قدوۃ الاصفیاء حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو کئی بیرونی سفروں میں آپ کے ہمراہ تھے اور اطلاعات کی کمیابی کے باعث کوئی بعید نہیں کہ سفر کشمیر میں سادات و رفقاء و مبلغین کے کاروان میں وہ بھی ساتھ رہے ہونگے۔ آزمائشوں اور ابتلا میں مُبتلا کیے جاتے ہیں، اور بھی اولیاء اللہ تھے جن کو طرح طرح سے آزمایا گیا اور سبھی اللہ کی مدد سے سلامت رہے کیوں کہ اُن کے دلوں میں اللہ کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں تھا اور نہ خوف اور نہ ہی غم[1] اس لیے اسی یقین کامل سے وہ ہر طرح سے سرخرو ہو کر نکلے حضرت شاہ ہمدانؒ ہی کے ایک اور مشہور ہمعصر عارفِ ربانی حضرت شاہ نورالدین نعمت اللہ ولی کرمانیؒ (۷۳۱ - ۸۳۴ھ) کے بارے میں بعض تذکروں میں ایک مُشابہ واقعہ کا بیان ہے جس کو پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ گویا یہ واقعہ ایک ہی بزرگوار کے ساتھ پیش آیا ہے حالاں کہ دونوں بزرگواروں کے ساتھ الگ الگ مواقع پر ہوا ہے۔ اس واقعہ کی حقیقت جو حضرتِ شاہ ہمدانؒ کو پیش آئی، وہ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے، اب اُسی واقعۂ مُشابہ کا حال حضرتِ نعمت اللہ ولیؒ کے ساتھ سُن لیجیے۔ صاحب طرائق الحقایق لکھتے ہیں:

"..... سخن دیگر کہ معروف است و بعضی نسبت دادہ اند بمیانۂ سیّد و امیر تیمور بودہ

---

[1] ڈاکٹر اقبالؒ کے بقول ؎

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر تیرا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم تے

و بعضی گفته اند با شاهرخ میرزا حکایتِ کی خورد بوده مردِ خدا الا حلال۔ اجمالاً آن است که چون رسم جناب سیّد آن بود که از هر جا و هر کس چیزی نیاز می آوردند قبول میفرمود و هر کس دعوت می نمود به غذائی شبهه نمی نمود۔ مردانِ تنگ نظر عیب جو بسلطان وقت به نحو مذمّت این حال را بگفتند۔ وی از جناب سیّد سوال کرد آن جناب فرمود: فَلَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا وَمَا عَبِیْطًا لَا یَکُوْنُ قُوْتُ الْمُؤْمِنِ اِلَّا حَلَالًا ؎

گر بگیرد خون جهان را مال مال
کی خورد مردِ خدا اِلّا حلال

پادشاه از برای امتحان صدق حال جناب سیّد خوانسالار خود را گفت: از مردم به عنف و ظلم فردا گوسفندی را گرفته طبخ نما و جناب سیّد را دعوت کن۔ چنین نمود و در وقت آن طعام را حاضر کردند۔ سلطان و سیّد مشغول شدند و تناول می نمودند۔ شاه به سیّد گفت: این غذا که میل میفرمائید حلال است یا حرام؟ جناب سیّد فرمود بر ما حلال و بر شما حرام است۔ درین گفتگو بودند که صاحب گوسفند تنظّلم آمد و عرض نمود که نذر کرده بودم از پسرم خبر سلامتی برسد گوسفندی برای سیّد نعمت اللہ نیاز برم۔ دیروز خبر خوشی رسید و من گوسفندی را که نذر کرده بودم می بُردم برای سیّد، ملازمان رسیدند و بردند و آنچه الحاح نمودم مفید نیفتاد۔۔۔"[1]

[.....ایک اور بات جو مشہور ہے اور بعضوں نے اسے منسوب کیا ہے کہ یہ واقعہ سیّد نعمت اللہ کرمانیؒ اور امیر تیمور کے درمیان ہوا ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ شاہرخ میرزا کے ساتھ ہوا ہے۔ "مردِ خدا سوائے حلال کے اور کیا کھاتا ہے" والی داستان ہے۔ خلاصہ اس داستان کا یہ ہے کہ چوں کہ جناب سیّد (نعمت اللہ کرمانیؒ) کی عادت یہ تھی کہ جو کوئی اور جہاں سے بھی کوئی آدمی نیاز کے طور پر کوئی چیز لاتا آپ قبول فرماتے تھے اور جو بھی کوئی آپ کی دعوت کرتا اس کی پیش کی ہوئی کسی غذا پر آپ شک نہیں کرتے تھے۔ تنگ نظر اور عیب نکالنے والوں

---

[1] طرائق الحقائق جلد ۳ صفحہ ۴ ـ ۵: نیز ملاحظہ ہو: تذکرۃ الشعراء مولفہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۳۳۵ ـ ۳۳۶: مجالس المومنین کے مؤلف نے بھی تذکرۂ دولت شاہ سے یہی داستان نقل کی ہے۔

نے مذمت کے طور پر یہ بات بادشاہِ وقت تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے جناب سیّد نعمت اللہ کرمانیؒ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: اگر ساری دنیا خون میں غرق بھی ہو جائے جب بھی مردِ خدا کو رزق حلال ملتا رہے گا۔ بادشاہ نے جناب سیّد نعمت اللہ کرمانیؒ کے کلام کی سچائی کا امتحان کرنے کی غرض سے اپنے خانساماں کو حکم دیا کہ ظلم و جبر سے کسی سے بھیڑ چھین لو۔ اور اُسے پکا کر جناب سیّد (نعمت اللہ کرمانی) کو دعوت پر بُلا لاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وقتِ مقررہ پر غذا حاضر کر دیا گیا۔ بادشاہ اور جناب سیّد (نعمت اللہ کرمانیؒ) کھانا کھانے لگے اور مشغولِ کلام بھی رہے۔ بادشاہ نے جناب سیّد سے پوچھا۔ یہ غذا جو آپ کھا رہے ہیں۔ حلال ہے یا حرام؟ جناب سیّد نے فرمایا: ہم پر حلال ہے اور تم پر حرام۔ یہ اسی گفتگو میں تھے کہ بھیڑ کا مالک فریادی بن کر آیا اور عرض کیا کہ میں نے منّت مانی تھی کہ میرے بیٹے کی سلامتی کی اطلاع مل جائے تو میں سیّد نعمت اللہؒ کے لیے ایک بھیڑ نیاز کے طور پر لے جاؤں گا۔ کل مجھے بیٹے کی خوشخبری ملی اور میں نیاز کی بھیڑ جناب سیّد (نعمت اللہ کرمانیؒ) کے لیے لے جا رہا تھا کہ سرکاری ملازم آ پہنچے اور اُسے چھین کر لے گئے۔ میں نے بڑی عجز و زاری کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا....]

جیسا کہ ہم قبلاً دیکھ چکے معمولی سے اختلاف کے ساتھ عیناً یہی واقعہ حضرت شاہ ہمدانؒ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اکثر واقعات جو آزمائشوں سے متعلق تھے حلال و حرام کی پہچان سے مربوط تھے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس شرعی مسئلے کی احکامِ الٰہی اور اوامرِ نبویؐ کے پس منظر میں اسلامی معاشرہ میں کتنی اہمیت تھی۔

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے معنوی کمالات اور ان کی حلال کی روزی کمانے کی دُنیوی زندگی کا سفر ساتھ ساتھ تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں آپ کا پیشہ کلاہ دوزی تھا۔ اور اسی کسبِ حلال سے وہ اپنا رزق کماتے تھے۔ اس پیشے کو اپنانے کے بارے میں خود آن ہی کے الفاظ میں سُنیئے۔ فرماتے ہیں:[1]

"...... و دیگر بار حضرت مصطفیٰ را صلی اللہ علیہ وسلّم، در واقعہ دیدم۔ فرمود کہ

---

[1] ملاحظہ ہو: خلاصۃ المناقب۔

از کسبِ خود باید خوردن ۔ گفتم : کدام کسب ؟ گفت : کلاه دوزی۔ و بعد واقعه عزیزی یک گز کرباس شانه بافت فتوح آورد ۔ و بعده دیگر آمد و انگشتانه آورد و بعده دیگری سوزنی آورد و دیگری مقراض آورد ۔ پس کلاهی بُریدم ۔ چون دوختم نیک نیامد زیرا که وقتی دوخته نبودم ۔ پس شرم داشتم که به بازار برم ۔ لاجرم بیرونِ از شهر بردم و به خاک دفن کردم و به حُجره باز آمدم ۔ و چون زمانی بگذشت عزیزی به حُجرهٔ من درآمد و آن کلاه در دست گرفته ۔ پس پرسید که : این کلاه را شما دوختید ؟ گفتم : آری! تبسّم نمود و گفتم ۔ اگر مرا اجازت فرمائید از راه تبرّک این کلاه که شرفِ دستِ شما یافته است۔ بر سرِ خود تاج سازم ۔ گفتم : اجازت است و آن قطعهٔ باقیه شانه بافت را چند کلاهی بُرید و دوخت و مرا دوختن و بُریدن تعلیم داد بعد از طولِ صحبت گفتم که : مرا خود یقین شد که شما از اولیاء اللہ بودید و لیکن بفرمائید که شما را که خبر کرد به دفن کلاه ؟ گفت : حضرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم !.........!

[.... اور ایک اور دفعہ میں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ میں دیکھا اور فرمایا کہ اپنے کسب سے کھانا چاہیئے ۔ میں نے کہا : کونسا کسب ؟ فرمایا : ٹوپیاں سینے کا ۔ اس واقعہ کے بعد ایک عزیز کرگھے پر بنا ہوا خاصا بڑا کپڑا لے آیا ۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور وہ انگلی میں پہننے کا خول لایا ۔ اس کے بعد ایک اور شخص سوئی لایا اور پھر کوئی اور قینچی لے کر آیا ۔ اس کے بعد میں نے ٹوپی کاٹ لی ۔ جب میں نے اسے سی لیا تو اچھی نہیں بن پائی کیوں کہ میں نے کبھی سینے کا کام کیا نہیں تھا ۔ مجھے شرم آئی کہ ایسی ٹوپی کو بازار میں لے کر جاؤں ۔ میں اسے شہر سے باہر لے گیا اور مٹی میں دفنا دیا اور اپنے حُجرے میں لوٹ آیا ۔ جب کچھ وقت گذر گیا تو ایک عزیز میرے حُجرے میں داخل ہوا ۔ اور اس کے ہاتھ میں وہی ٹوپی تھی ۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ : کیا یہ ٹوپی آپ نے سی لی ہے ؟ میں نے کہا ہاں ! وہ مسکرا دیا ۔ اور کہا ۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو آپ کے مبارک ہاتھوں سے بن جانے کا شرف حاصل ہونے کی وجہ سے اس ٹوپی کو میں بطور تبرّک اپنے سر کا

تاج بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا: اجازت ہے۔ اور وہ جو کرتے کا بنا ہوا کپڑا باقی رہ گیا تھا اُس سے اُس نے چند ٹوپیاں کاٹ لیں اور اُن کو سی لیا اور مجھے سینا اور کاٹنا سکھایا۔ دیر تک اکٹھے بیٹھے رہنے کے بعد میں نے اس سے کہا: مجھے خود یقین ہوا کہ آپ اولیاء اللہ میں سے ہیں لیکن یہ تو فرمائیے کہ کلاہ کو دفنانے کی اطلاع آپ کو کس نے دی؟ کہا کہ: حضرت رسول اکرم نے صلی اللہ علیہ وسلم....]

مولانا نور الدین جعفر بدخشی رح کہتے ہیں:

"..... جناب سیادت فرمود کہ وقتی عزیزی کرباس آورد و التماس نمود کہ کرتہ باید بریدن و دوختن از بہر من۔ و حال آنکہ این درویش نمی دانست، و لیکن غیرت آمد کہ چون گویم کہ نمی دانم پس گفتم: کرباس را گذارد برود تا من بفرصت با آن مشغول شوم۔ لاجرم کرتہ خود را بکشادم، و بہمان طریق کرتۂ او بریدم و دوختن گرفتم....."[1]

[حضرت سیادت رح نے فرمایا کہ ایک بار ایک عزیز کپڑا لے کر آیا اور التماس کیا کہ میرے لیے اس میں سے ایک کرتہ کاٹ کر سی دیجیے حالاں کہ یہ درویش میں اس کام کو جانتا نہیں تھا لیکن مجھے غیرت (شرم) آئی کہ کیسے کہوں میں یہ کام جانتا نہیں ہوں۔ میں نے اُسے کہا: کپڑے کو چھوڑ دو اور جاؤ میں فرصت سے یہ کام کروں گا۔ ناچار میں نے اپنے کرتہ کو کھول دیا اور اُسی طریقے پر اس کا کرتہ کاٹ دیا اور سینا شروع کر دیا.....]

حضرت شاہِ ہمدان رح نے لازمی طور پر اپنے تمام سفروں میں ہاتھ کی کمائی سے گذران کی اور عمر میں سوائے حلال کے آپ کے پاس اور کچھ ہونا کبھی نہیں تھا۔ ہاتھ کی کمائی پر آپ کو سخت اصرار تھا اور اس پر مزید یہ کہ، جیسے ہم نے دیکھا، تبلیغ دین کے لیے جہاد اور اس سے متعلق زحمتوں کا تحمّل کرنا۔ گویا ان صفاتِ عالیہ نے انھیں اپنے ساتھی رفقاء کے لیے ایک نمونہ اور پیشوا بنا دیا۔

اسی صاحبِ نمونہ مقتدیٰ رح کی رہنمائی میں مبلّغین دین اسلام نے کشمیر کے لوگوں کی نظامِ زندگی کی تعمیر کی۔ یہ تعمیر دینی لحاظ سے تو ترجیحی تھی ہی لیکن تمدنی اور تہذیبی لحاظ سے بھی کشمیریوں کے لیے کچھ اہم نہیں تھی۔ مبلّغین سب کے سب ایران سے آئے تھے۔ اور وہ اپنے ساتھ ایرانی تمدن اور تہذیب لے آئے تھے۔ اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ صدیوں تک قایم رہا۔ ظاہر ہے ایرانی اثرات خود بخود یہاں پھیلنے لگے اور یہ اثرات رفتہ رفتہ اس قدر یہاں کی زندگی میں سرایت کر گئے گویا ہم بھی ایران کا ہی ایک حصّہ بن گئے۔

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

۳

تیسرا باب

ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات

آفرید آن مردِ ایرانِ صغیر ‏ ‏ ‏ ‏ با ہُنرہایِ غریب و دلپذیر

(جاوید نامہ۔ حضرت علامہ اقبالؒ)

(۳)

ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات

حضرت شاہ ہمدانؒ اور اُن کے مجاہدین کا کارواں جب کشمیر میں داخل ہوا ہے، یہ زمانہ تیموری عہد تھا۔ تیمور کے حصّے میں اس کی فتوحات کے بعد وہ ایران آیا جو ہنر اور ادبی لحاظ سے سیکڑوں سال سے اپنی ایک انفرادی خصوصیت اور معروفیت کا حامل تھا۔ سمرقند، بخارا، بلخ، ہرات، مرو، طوس، نیشاپور، اور اصفہان وغیرہ ایسے مراکز تھے جو عظیم کتابخانوں اور معنوی خزانوں کے مالک تھے۔ تیمور کی جنگوں کے باوجود ایران کے لوگ اپنی بیش بہا اسلامی، فنّی، اور ادبی میراث سے مستفید ہوتے رہے[1] لیکن اپنے دارالخلافہ سمرقند کی ظاہری اور باطنی زیب و آرائش سے تیمور غافل نہیں رہا۔ اور ایران کے مختلف شہروں سے جہاں کہیں مشہور فنکار، کاریگر، عالم اور ہنرمند کے بے نظیر کاموں کی شہرت اس کے کانوں سے ٹکراتی تھی وہ انہیں سمرقند لے جاتا تھا، اور اس طرح سمرقند تیموری دور میں عالمِ اسلام کا ایک بین الاقوامی مرکز بن گیا۔

تیموری دَور میں سمرقند سے علم و ادب کے چشمے پھوٹتے رہے۔ صنعت و حرفت کی

---

[1] یعنی طاہری دور سے (تیسری صدی ہجری کے اوائل سے)۔

نادر کاریاں دُور دُور تک پھیلتی رہیں اور ان کی تخم ریزی حضرت شاہ ہمدانؒ کی پیشوائی اور ہدایت میں ایرانی سادات و مبلغین کے ہاتھوں کشمیر میں ایسے ہوئی کہ خود ایران اور کشمیر میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ ایران تو تہذیب اور اسلامی تمدّن کی ترقی کے لحاظ سے کبیر تھا ہی شاہ ہمدانؒ اور اُن کے رفقاء کی مساعی سے کشمیر کے ایران صغیر میں بدل جانے کی بنیاد پڑ گئی[1] ایرانی قوم کی تہذیب و تمدّن نے ہمارے لباس، ہمارے رہن سہن کے طور طریقوں، ہماری رسوم و عادات، ہمارے عقاید اور ہماری زبان کو بہت حد تک بدل ڈالا۔

کشمیر کے لوگ لباس کے لحاظ سے نئی ساخت کی چیزوں سے آشنا ہو کر ان کو استعمال کرنے لگے۔ اور یہ لباس اب صدہا سالوں سے رائج ہو کر ہمارے معاشرے کا ایک ناقابلِ تفکیک جزو بن گیا ہے۔ موجودہ وسط ایشیا میں تاشقند، سمرقند، بخارا، تاجکستان وغیرہ کے علاقوں میں ابھی بھی یہ لباس مستعمل ہے۔ ہمارے یہاں بھی یہی لباس رائج ہوا۔ کشمیری پھرن جو فارسی میں پیرہن کی بگڑی ہوئی صورت ہے آج بھی ان علاقوں میں بالخصوص عورتوں میں رائج ہے، اور پورے وسطِ ایشیا کے مسلم آبادی والے علاقوں، شہروں اور دیہات میں، میں نے خود اِن چیزوں کا چشم دید مطالعہ کیا ہے اور کشمیری اور وسطِ ایشیائی اور ایرانی معاشرے میں تمدّن کی یکسانیت کا معائنہ کرنے میں واقعی حیرت ہوتی ہے۔ پھرن، قصاوہ، صدری، شلوار، دستار، پا افزار، پاتابہ، موزہ، جُبّہ آب ایسی چیزیں ہیں جو یکساں نام کے ساتھ کشمیری اور وسط ایشیائی لوگوں میں اب بھی مستعمل ہیں۔ قصاوہ وہی چیز ہے

---

[1] کشمیر کو البتہ ایران صغیر بننے میں سو سال کا عرصہ لگا جبکہ سلطان بڈشاہ زین العابدین کی وفات ہوئی (۸۷۹ھ ۔ ۱۴۷۴ء) اُس وقت تک حضرات سادات اور مبلّغین کے علاوہ ایران کے ساتھ براہِ راست تعلقات پیدا ہونے کے نتیجے میں کشمیری اور ایرانی لوگوں کی آمد و رفت سے کشمیر ایرانی تمدّن کو اپنانے میں بہت آگے بڑھ چکا تھا اور پھر اسکی تکمیل رفتہ رفتہ ہوتی رہی اور ایرانی الاصل مغلیہ بادشاہوں کے عہد میں کوئی بھی کمی باقی نہیں رہی۔

جو کشمیر میں قصابہ کہلاتا ہے گو کہ سرینگر میں اب مفقود ہے لیکن دیہات میں ابھی بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کی ساخت بھی وہی ہے جو وسطِ ایشیا کی ہے[1] پا افزار کو ہم کشمیری میں پوزار کہتے ہیں جو دُور دیہات میں اب بھی غالباً پہاڑیوں پر بسنے والے لوگ مع پاتابہ کے (جسے کشمیری میں پوتو کہتے ہیں) استعمال کرتے ہیں۔ سفر کی تھکاوٹ کو دُور کرنے اور لمبا فاصلہ طے کرنے کے لیے پاتابہ کا استعمال کشمیر میں عام تھا۔ پھرن کی وہ قسم وسطِ ایشیا میں عام ہے جسکے دونوں آستینوں کے کٹے ہوئے بیچ کے حصّوں میں سے عورتیں بازو باہر نکالتی ہیں اور لمبے حصّے کو بڑی سوئی سے اوپر کی طرف الٹ کر باندھ کے رکھ دیتے ہیں، اِن آستینوں کو قُرایہ کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں کشمیر میں اس نوع کے پھرن پہننے کا رواج اُن گھروں میں تھا جو خود کو اشراف کہتے تھے۔ لیکن وسط ایشیا میں جہاں سے یہ کشمیر میں وارد ہوا ہے عام لوگوں اور گھرانوں میں اس کا استعمال ہے۔[2]

---

[1] تاشقند میں ہوٹل رسیا (جو دراصل ایشیا ہے) کے لونج میں ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا کہ سامنے صوفہ پر ایک مرد اور ایک عورت پر نظر پڑی۔ عورت قصاوہ پہنے تھی۔ میں نے دونوں کو اپنے پاس بلا لیا اور قصاوہ کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ قصاوہ ہے اور سمرقند و بخارا میں عام ہے یہ دونوں میاں بیوی سمرقند کے ایک گاؤں قشقہ دریا سے تاشقند آئے تھے کسی کام سے، مرد کا نام سیف اللہ تھا۔ عورت کے سر پر ایک ٹوپی بھی تھی جو بالوں کو چھپانے کے لیے قصابہ کے نیچے پہن رکھی تھی، اور بقول اس کے طاقی کہلاتی تھی۔ کشمیری عورتوں میں بھی اس کا رواج تھا اور طاقی کی جگہ طاقنی کے نام سے مشہور تھی۔

[2] بخارا میں مراد ارغش اور اس کی بیوی نے جن کے ہاں میں مہمان تھا مجھ سے کہا کہ قرآیہ کی آستین کا رواج اس لیے ہوا ہے کہ عورتیں جب مٹی کے چولھوں کے پاس بیٹھی کام کیا کرتی تھیں تو عام پھرن کی آستینیں مٹی اور گرد میں میلی ہو جاتی تھیں اس لیے اس سے بچنے کے لیے یہ آستین رائج ہو گئی۔ مُرادارغش بخارا کے ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک اعلیٰ عہدے دار تھے اور بخارا میں حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند مشکل کشاؒ اور حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ (غجدوان) کے روضہ ہائے مقدس کی زیارت کرتے وقت میرے ساتھ رہے۔

سخت برفباری میں جب کہ باہر سڑکوں پر چلنا یا گلی کوچوں میں نکلنا مشکل ہو جاتا تھا، وسط ایشیا اور ایران کے دور دیہات میں لکڑی کے جوتے (کھڑاوٗں) اور نعلین استعمال ہوتے تھے۔ سخت سردی میں جرابوں کے اوپر بالکل پتلے چمڑے کی پاؤں کی شکل کی چیز پہنتے تھے جو وسط ایشیا میں مخسی اور کشمیر میں مسی کہلاتی تھی۔

مبلّغینِ دینِ اسلام کے آنے کے ساتھ ہمارے کھانے کے برتن بھی بدل گئے۔ اب ہمارے گھروں میں آبخورہ، دیگ، دیگچہ، قاشق، پیالہ، طبق (طباق) سرپوش، طشت، آفتابہ، پاتیل، کاسہ، سماوار، مجمہ، کندہ کاری کیے ہوئے فارسی اشعار والے برتن اور بشقاب کا رواج ہوا۔ آبخورہ (یعنی گلاس) اور آفتابہ (کشمیری میں ناری) کاسہ (کشمیری میں کھوس) طبق (کشمیری میں ترامی۔ لیکن طبق ماز میں یہ لفظ باقی رہ گیا ہے) قاشق (قاشُو) اِن ہی ناموں سے گھروں میں جانے جاتے تھے۔ سماوار جب پہلی بار مبلّغین دین اسلام کشمیر میں اپنے ساتھ لائے تھے تو اُس وقت یہ چائے جوش کہلاتا تھا۔[1]

---

[1] اب روسی لفظ سماوار سے مشہور ہے اور مختلف ہیئت کا ہے۔ اصلی سماوار جو اس وقت تقریباً آفتابہ کی شکل کا ہے اب رائج نہیں ہے بلکہ اب اس کی شکل اُس کپ کی سی ہے جو کھلاڑیوں کو انعام میں ملتا ہے۔ میں تاشقند میں پروفیسر ہاشم آف کے گھر میں مہمان تھا جو ایک گاؤں میں واقع ہے۔ ہاشم کی والدہ خاصی معمر تھیں۔ اُن سے باتوں میں معلوم ہوا کہ سماوار کی شکل بالکل آفتابہ جیسی تھی۔ لیکن کوئلہ وغیرہ کی زحمت سے اور بار بار پھونک مارنے سے بچنے کی وجہ سے روسیوں نے اس کی ساخت بدل ڈالی اور نام بھی بدل دیا۔ اب یہ تیل سے چلتا ہے۔ سما روسی زبان میں خود اور وارِت یعنی اُبلنے والا (یعنی خود بخود اُبلنے والا) کثرتِ استعمال سے ت اُڑ گئی اور سماوار رہ گیا (پاتیل کا لفظ کشمیری میں پتلہ اور کاس یا کاسہ، کھوس ہو گیا ہے۔ کندہ کاری کیے برتن جن میں سماوار، گلاس، مجمہ، بشقاب اور کھانے کے برتن شامل ہیں، اب بھی کشمیر اور ایران و وسطِ ایشیا کے بعض علاقوں میں استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ لیکن اب اس طرح کے برتن بیشتر عجائب گھروں کی زینت

(باقی اگلے صفحے پر)

وسط ایشیا اور ایران کے دور دراز علاقوں دیہات میں شادی بیاہ یا کئی مہمانوں کو مدعو کیے جانے کے موقعوں پر چار آدمی اکٹھے مل کر کھانا کھاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ رسم کشمیر میں خالص وہیں سے درآمد ہوئی ہے۔ [1]

وسط ایشیا میں اور ایران کے دیہات میں ہریسہ پکانے کا موسم سرما میں آج بھی ویسا ہی رواج ہے جیسے پہلے تھا۔ وسط ایشیا اور ایران میں ہریسہ پکانے کی رسم قدیم ہے۔ [2] اور یہ رسم ایرانی وسط ایشیائی ہونے کی وجہ سے کشمیر میں بھی سرائیت

حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ

کے گھر لے گئے، جہاں صاحبِ خانہ اغنیا احمد کے بیٹے کا ختنہ تھا۔ آشپز کھانا پکا رہے تھے۔ روغن جوش اور تلے مرغ اور سبزی کے ساتھ ملا ہوا گوشت اور پلاؤ اور سیخ کباب اُس وقت تک پک چکے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] تاجکستان کے دارالخلافہ دوشنبہ سے کوئی ۳۵ میل دور گلستان نامی گاؤں میں۔ میں خواجہ بہاءالدین مشکلکشاؒ کے خلیفہٴ خاص حضرت خواجہ یعقوب چرخیؒ کے مزارِ مقدس کی زیارت کرنے گیا۔ میرے ساتھ چند اور ساتھی تھے۔ وہاں کے امام صاحب محمد علی طالبان نے اپنے گھر میں میری دعوت کی۔ اُن کا گھر مزار شریف سے آدھا کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ وہاں پہنچے تو کمرے سے باہر جوتے نکالے۔ کمرے میں داخل ہوئے تو گدّے اور دو ایک قالین بچھے تھے۔ دیوار کے ساتھ تکیے لگے تھے، بیچ میں ایک مجمہ میں کشمش، انگور، نباتات کے ٹکڑے اور مٹھائی تھی۔ اس میں سے کچھ لے کر خربزہ اور ہندوانہ آیا۔ اس میں سے بھی کچھ ٹکڑے کھائے اور آخر میں ہاتھ دھونے کے لیے طشت اور آفتابہ آیا۔ دسترخوان بچھا اور کھانا آگیا۔ اور ہم چار آدمی اکٹھے بیٹھ کر ہاتھوں سے کھانے لگے۔

[2] تاریخ بخارا میں لکھا ہے: "ہم بہ روزگار امیر سعید نصر بن احمد بن اسمٰعیل در ماہِ رجب سال بر سیصد و بیست و پنج در بخارا آتش افتاد و جملہ بازارہا بسوخت و آغاز آن از دکان ہریسہ پزی بود بہ دروازہ سمرقند کہ خاکستر از زیر دیگ ہریسہ (باقی اگلے صفحہ پر

ہماری کھانے کی عادات بھی بدل گئیں۔ ہندو مذہب کے اثرات کے پس منظر میں یہاں کے لوگ بیشتر سبزی خور تھے، چنانچہ سبزی خوری نہ صرف یہاں کے بزرگ ریشیوں کی ہی عادت تھی بلکہ عام لوگ بھی سبزی خور تھے۔ اسلام آیا، ہماری عادات بدلیں، اور ان عادتوں میں کھانے کی نفاست بھی ہماری بدلتی ہوئی زرخیز اسلامی ثقافت کا ایک قابل بیان اور لائقِ تحسین حصہ بن گئی۔ ان نفیس اور عمدہ کھانوں کے لائق برتنوں کا ذکر تو ہو گیا۔ اب کھانے کا بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گوشت پکانے کی کشمیریوں کو کوئی خاص مشق نہیں تھی، اس لیے ایرانی آشپزوں نے ایرانی طرزِ خورش عام کردی جو گوشت کی بیشتر اعلیٰ انواع پر مشتمل ہے، اب کشمیر میں: کباب، سیخ کباب، تِکّہ کنتاب، مُرغ، روغن جوش، قورمہ، یخنی، پلاؤ، متنجن، آبگوشت، کوفتہ، برشتہ (رستہ) گُشتابہ عام ہو گئے۔

بعض لوگوں نے اِن کھانوں کو پکانا سیکھ لیا اور بعد میں اسی فَنّ سے منسلک ہو گئے اور آشپز کہلائے۔ جیسے ایران اور وسطِ ایشیا میں کہلائے جاتے ہیں۔ اِن کھانوں میں سے اب ایران اور وسط ایشیا میں چند ہی انواع باقی رہ گئی ہیں، جیسے یخنی، پلاؤ، آبگوشت، کباب اور مُرغ۔ لیکن گھرانوں میں روغن جوش پکاتے ہیں اور سبزی گوشت اکٹھا ایک ساتھ ملا کر پکانے کا رواج بھی ہے۔ جس طرح ہم یہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر مخصوص آشپز (باورچی) طبقہ کے آشپزوں سے کھانا پکواتے ہیں اُسی طرح وسطِ ایشیا اور ایران کے علاقوں میں پکوایا جاتا ہے۔ [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

بن رہے ہیں) سماوار کا لفظ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر یا اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں رائج ہوا اور ماسکو سے کوئی دو سو کلو میٹر دور تولا نامی جگہ پر سماوار پہلی بار بنا اور عام ہو گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] ایران کے بڑے ترقی یافتہ شہروں میں شادی بیاہ کے موقع پر دولھا دلہن ہوٹلوں میں آکر کھانا کھاتے ہیں، خویش و اقارب کے ساتھ لیکن قصبوں اور دیہات میں کشمیری طریقہ ہی رائج ہے۔ بخارا میں امراد ارغش اور اسکی بیوی عالیہ مجھے ایک رشتہ دار (باقی اگلے صفحہ پر)

وسط ایشیا اور ایران کے دور دراز علاقوں دیہات میں شادی بیاہ یا کئی مہمانوں کو مدعو کیے جانے کے موقعوں پر چار آدمی اکٹھے مل کر کھانا کھاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ رسم کشمیر میں خالص وہیں سے درآمد ہوئی ہے۔ [1]

وسط ایشیا میں اور ایران کے دیہات میں ہریسہ پکانے کا موسم سرما میں آج بھی ویسا ہی رواج ہے جیسے پہلے تھا۔ وسط ایشیا اور ایران میں ہریسہ پکانے کی رسم قدیم ہے۔ [2] اور یہ رسم ایرانی وسط ایشیائی ہونے کی وجہ سے کشمیر میں بھی سرائیت

حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ

کے گھر لے گئے، جہاں صاحبِ خانہ اخنیاز احمد کے بیٹے کا ختنہ تھا۔ آشپز کھانا پکا رہے تھے۔ روغن جوش اور تلے مرغ اور سبزی کے ساتھ ملا ہوا گوشت اور پلاؤ اور سیخ کباب اُس وقت تک پک چکے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] تاجکستان کے دارالخلافہ دوشنبہ سے کوئی ٣٥ میل دور گلستان نامی گاؤں میں۔ میں خواجہ بہاءالدین مشکلکشاؒ کے خلیفۂ خاص حضرت خواجہ یعقوب چرخیؒ کے مزارِ مقدّس کی زیارت کرنے گیا۔ میرے ساتھ چند اور ساتھی تھے۔ وہاں کے امام صاحب محمد علی طالبان نے اپنے گھر میں میری دعوت کی۔ اُن کا گھر مزار شریف سے آدھا کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ وہاں پہنچے تو کمرے سے باہر جوتے نکالے۔ کمرے میں داخل ہوئے تو گدّے اور دو ایک قالین بچھے تھے۔ دیوار کے ساتھ تکیے لگے تھے، بیچ میں ایک مجمہ میں کشمش، انگور، نباتات کے ٹکڑے اور مٹھائی تھی۔ اس میں سے کچھ لے کر خربزہ اور ہندوانہ آیا۔ اس میں سے بھی کچھ ٹکڑے کھائے اور آخر میں ہاتھ دھونے کے لیے طشت اور آفتابہ آیا۔ دسترخوانِ بچھا اور کھانا آ گیا۔ اور ہم چار آدمی اکٹھے بیٹھ کر ہاتھوں سے کھانے لگے۔

[2] تاریخ بخارا میں لکھا ہے: "ہم بہ روزگار امیر سعید نصر بن احمد بن اسمٰعیل در ماہِ رجب سال بر سیصد و بیست و پنج در بخارا آتش افتاد و جملہ بازارہا بسوخت و آغاز آن از دکانِ ہریسہ پزی بود بہ دروازۂ سمرقند کہ خاکستر از زیر دیگ ہریسہ (باقی اگلے صفحہ پر

کر گئی ہے، جیسے ہمارے یہاں اس لذیذ خورش کے بنانے والے خاص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہریسہ گر کہلاتے ہیں ویسے ہی ایران میں اور وسط ایشیا میں ہریسہ پز کہلاتے ہیں۔ ہمارے یہاں عادت یہ ہے کہ سردیاں شروع ہونے پر لوگ ہریسہ گروں کی دُکانوں پر علی الصباح جاتے ہیں اور گرم گرم ماحول میں جبکہ دُکان گرم ہوتی ہے گرم مٹکوں سے گرم گرم ہریسہ نکال کر خریداروں کے سامنے لاکر رکھ دیتے ہیں اور وہ تنوری روٹیوں کے ساتھ اسے کھاتے ہیں یا خود گھروں میں بنا کے کھاتے ہیں۔ وسط ایشیا اور ایران کے دور دراز دیہات میں جب ہریسہ بنانے کا خیال آتا ہے تو محلے والے جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی چیز حاصل کرتے ہیں۔ یعنی کسی سے لکڑی، کسی سے مصالحہ، کسی سے تیل یا گھی، چند گھرانوں سے گوشت، کسی سے آٹا یا گندم اور کسی سے کوئی اور متعلقہ چیزیں۔ یہ ساری چیزیں ہریسہ پز کی دُکان پر لاکر اس کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ رات بھر مٹکوں میں بالکل ویسے ہی ہریسہ بناتا ہے جیسے یہاں کشمیر میں بنتا ہے اور

(بقیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) بر داشت و بہ بام بر آورد۔۔۔۔۔" (اور امیر سعید نصر بن احمد بن اسمٰعیل کے عہد میں سال ۳۲۵ھ (۹۳۶ء) میں بخارا میں آگ لگ گئی اور تمام بازار جل گئے اور یہ آگ ہریسہ بنانے والے کی دُکان سے شروع ہوئی۔ دروازۂ سمرقند کے پاس، جہاں ہریسہ کی دیگ کے نیچے سے چنگاری اٹھی اور چھت پر آگئی۔۔۔۔) ملاحظہ ہو تاریخ بخارا، تالیف ابوبکر محمد بن جعفر النرشخی، بتصحیح مدرس رضوی، نشریہ بنیاد فرہنگ ایران ۱۳۵۱ شمسی صفحہ ۱۳۱۔ اور ظاہر ہے کہ اس تاریخ سے بھی آگے ہریسہ بنتا ہوگا۔ تکہ کباب، سیخ کباب، کو بالکل ویسے ہی بناتے ہیں جیسے کہ کشمیر میں یعنی لوہے کی انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں پر سیخ میں گوشت کے ٹکڑے رکھ دیئے جاتے ہیں اور خوب بھونتے کے بعد مصالحہ ڈال کر کھائے جاتے ہیں۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ خریداروں کے سامنے معہ سیخ کے لاکر رکھ دیتے ہیں تاکہ گرم حالت میں کھائیں۔ وسط ایشیا میں عام چائے خانوں میں ابھی بھی کانتی یا تکہ کباب کھائے جاتے ہیں یا ان جگہوں پر جہاں لوگ خاص تعداد میں آتے جاتے ہوں جیسے تفریحی باغات، سیاحوں کی آمد کی جگہیں۔ میں نے تاشقند میں "پارک انقلاب" میں تکہ کباب کھائے اور رنجدوان میں ایک چائے خانہ میں۔

صبح محلے والوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ تاجکستان میں بیشتر گھروں میں ہی بناتے ہیں۔[1] اور جہاں دیہات میں آبادی والے محلّوں میں بنانیکا رواج ہے وہاں موسم بہار کے شروع میں بناتے ہیں، اور باقی علاقوں میں کشمیر ہی کی طرح جاڑا شروع ہونے پر بنایا جاتا ہے۔

نمکین چائے کا رواج تاجکستان میں آج بھی ہے، بدخشان، فرغانہ، بخارا اور کولاب میں نمکین چائے ہی گھروں میں پی جاتی ہے۔ بدخشان میں نمکین چائے دن میں تین بار پینے کی عادت ہے، صبح، اور عصر[2] اور شام کے وقت۔ چائے پینے کی پیالیاں پورے وسط ایشیا اور ایران کے دُور دیہات میں وہی ہیں جن کا استعمال آج سے تیس چالیس سال پہلے ہر کشمیری گھرانے میں تھا اور جو چین پیالی کہلاتی تھی۔[3]

چائے کے ساتھ روٹی کھانے کی عادت بھی ناگزیر تھی۔ ایرانی اور وسطِ ایشیائی روٹیاں کشمیر میں عام ہوئیں اور جب سے وہ اُن ہی فارسی ناموں سے ہمارے کشمیر میں رائج ہیں مثلاً لواس، گِردہ، باقرخانی، تفتان، روغنی، شیرمال، کُلچہ، قندی کلچہ، خطائی، سنبوسہ، نان گوشت اور نان کباب اور نان۔[4]

---

[1] ایران میں بھی گھروں میں ہریسہ کا رواج ہے لیکن اسے اب وہاں حلیم کہتے ہیں اور بجائے آٹا یا چاول ملانے کے وہ گوشت کے ساتھ بینگن ملاتے ہیں اور یہ خورش حلیم کہلاتی ہے۔

[2] وسطِ ایشیا کے دیہات میں میں نے عصر کی جگہ دیگر کا لفظ استعمال ہوتے سُنا جیسے ہم یہاں کشمیر میں دِگر کہتے ہیں (جیسے دِگر نماز) لفظ نمازِ دیگر کا استعمال آج سے ساڑھے آٹھ سو سال پہلے لکھی ہوئی مشہور کتاب چہار مقالہ میں ہے جسے نظامی عروضی سمرقندی نے سال ۵۵۰ھ (۱۱۵۵ء) میں لکھا۔ ملاحظہ ہو چہار مقالہ نظامی عروضی بتصحیح مرحوم ڈاکٹر محمد معین باب شاعری۔

[3] یہ چھوٹے نہ کی اوپر سے کشادہ پیالی ہوتی تھی اور خاصی خوب صورت اور نقشدار یا سادہ قسم کی بھی ہوتی تھی۔ اب کشمیر کے قصبوں اور شہر سے مفقود ہے لیکن گاؤں میں اب بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

[4] ایران اور وسط ایشیا میں لواس، کو لواش کہتے ہیں۔ سنبوسہ، نان گوشت (باقی اگلے صفحے پر)

میووں میں ہندوانہ، خربزہ آلو بخارا، گیلاس، بادام، ناخ، سیب عنبری اور انجیر، ایسے میوے ہیں جو غیر کشمیری ہیں اور وسطِ ایشیا اور ایران سے درآمد ہوئے ہیں آرائشی درختوں میں سرو کا درخت ایران سے وارد ہوا ہے۔ باقی جتنے بھی درخت اور میوے ہمارے یہاں ہیں وہ کشمیری الاصل ہیں اور ان کے اپنے کشمیری ناموں سے صدہا برسوں سے پکارتے جاتے ہیں۔

لباس کو بھی کشمیر میں ایرانیوں اور وسط ایشیائیوں نے کشمیری مسلمانوں کے لیے ایک تشخّص کی علامت قرار دیا۔ مردانہ لباس میں پھرن (پیرہن کی بگڑی صورت) اور کُرتہ اور دستار یا عمامہ اور شلوار، قبا اور عورتوں میں رُوبند، چارقد، لچک دراز جس پر نازک قیطان کا نوار سیتے تھے اور کونوں میں پُھندنے بھی رنگ برنگ ریشمی دھاگوں کے ہوتے تھے اور طاقی، اور پھرن اور بغیر کالر کے کرتہ اور تنگ موری کی شلوار کا رواج تھا۔ پھرن کے گریبان پر عورتیں زردوزی کا کام کرواتی تھیں جو اب بھی رائج ہے۔ اس کے علاوہ جو گھرانے خود کو اشراف کہتے تھے، اُن گھرانوں میں عورتیں سر پر قصابہ (قصاوہ) چڑھاتی تھیں اور جب عورتوں کو دعوت پر جانا ہوتا تھا تو قصاوہ کو زیورات سے آراستہ کیا کرتی تھیں۔ باقی گھرانوں میں جو مختلف پیشوں سے متعلق تھے اُن کی عورتوں میں (قصاوہ یا) قصابہ مختلف ساخت کا ہوتا تھا جو اشراف کی عورتوں کے قصابہ سے ذرا پست ہوتا تھا[1]

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) نان کباب۔ اور نان کے بارے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ وسط ایشیا سے جو وسط ایشیائی تاجر تجارت کا ریشمی مال، فرش اور خشک میوہ جات وغیرہ بڑے قافلوں کی صورت میں سرینگر میں لاتے تھے وہ موجودہ صفاکدل کے ساتھ واقع کاروان سرائے میں اترتے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ بعض تاجر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور وسط ایشیا سے چند پیشہ ور لوگ بھی آ گئے۔ جن میں نانبائی بھی تھے اور یہ سب صفاکدل کے آس پاس ہی سکونت پذیر ہو گئے، نانبائیوں نے ظاہر ہے وسط ایشیائی خورشوں کے علاوہ روٹیوں کی اقسام کو بھی عام کر دیا جن میں خطائی سنبوسہ، نان اور نان کباب اور نان گوشت مشہور ہیں، بخارا میں ۹۲ قسم کی روٹیاں بنتی تھیں اور وہاں سے وسط ایشیا میں برآمد ہوتی تھیں۔

[1] کشمیری میں اسے بون قصابہ کہتے تھے۔

دونوں اصناف کا لباس مؤقر اور قابلِ ملاحظہ بن گیا۔ [۱]

کپڑوں میں جن ایرانی اور وسطِ ایشیائی کپڑوں کا استعمال ہونے لگا اُن میں مخمل، اطلس، زربفت، کمخواب، دارائی، الپاق اور قناویز شامل ہیں۔ [۲]

ان کپڑوں کے علاوہ ایرانی اور وسطِ ایشیائی تاجروں نے چینی ریشم کے گلدار کپڑے بھی عام کردیئے۔ [۳] گلدار قیمتی کپڑوں کا استعمال تو بہرحال شاذونادر ہی تھا۔ لیکن عام گلدار کپڑوں کا استعمال بھی ایک خاص کپڑے کا ہوتا تھا جسے چِھینٹ (کشمیری میں چھیٹ یا چھپٹ) کہتے تھے۔ چھینٹ سازی کے بڑے بڑے کارخانے آج بھی ایران میں موجود ہیں۔

گھریلو فرش میں چکن دوزی کیے گئے گبّے [۴]، نمدے [۵] اور قالین عام ہوگئے۔ ریشمی

---

[۱] چارقد کی جگہ اب دوپٹّے نے لے لی ہے اور رُوبند کی جگہ سراپا بُرقعہ نے لے لی تھی۔ بُرقعہ کا استعمال اب بہت کم ہوگیا ہے۔

[۲] دارائی کو کشمیری میں دریائی کہتے تھے۔ قناویز کپڑا ایران سے ناصرالدین شاہ قاچار بادشاہ ایران (۱۲۶۴ھ تا ۱۳۱۳ھ، ۱۸۴۷ء تا ۱۸۹۵ء) کے عہدِ سلطنت میں رائج ہوا تھا۔ یہ سارے کپڑے گران قیمت تھے اس لیے ان کا استعمال ثروت مند گھرانوں میں ہی ہوتا تھا لیکن لڑکی کی شادی پر تقریباً ہر اوسط کشمیری گھرانہ ان کپڑوں میں سے پھرن شلوار معہ چارقد کے (موجودہ دوپٹّہ) یا کم از کم کُرتہ شلوار سلا کے لڑکی کو دے ہی دیتا تھا۔

[۳] ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں ایران کے چین کے ساتھ تجارتی تعلقات کے پس منظر میں ریشم بافی اور چینی ریشم بافوں کے ایران میں آنے کی وجہ سے یہ ہنر چینی فنِ ریشم سازی کے زیرِ اثر آگئی اور تمام ریشمی کپڑوں پر نقش اور گل کاری مکمل طور پر چینی اسلوب میں عام ہوئی۔ اور تجارتی مال کے ساتھ ایرانی تاجروں نے یہ ریشمی کپڑے کشمیر میں بھی عام کردیئے۔ ویسے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر میں ریشم سازی کا فن بہت قدیم ہے۔

[۴] وسطِ ایشیا اور ایران میں جالکدوزی کو چکن دوزی کہتے ہیں۔

[۵] یارقند کے بنے ہوئے نمدے کشمیر میں بڑے مقبول اور عام تھے یہ نمدے بھی وسطِ ایشیائی اور ایرانی تاجر اپنے ساتھ مع قالینوں کے لایا کرتے تھے اور صفاکدل کی کاروان سرائے میں لاکر فروخت کرتے تھے۔

دھاگے کے کام کیے ہوئے تکیہ پوش، اور مخملی تکیے بھی رائج ہوئے۔ لحاف کا استعمال بھی اصولاً غیر کشمیری ہے اور ایران سے وارد ہوا ہے۔

عورتوں کے زیورات میں جن مزید زیورات کا اضافہ ہوا ہے اُن میں طومار، آویزے، گلوبند، نامہ، حلق بند، بازوبند، پیشانی بند، گوشوارہ، دسوآنہ، خلخال، نیم تاج شامل ہیں۔[1] اِن زیورات میں سے بعض کا استعمال آج بھی ہوتا ہے۔ دسوآنہ یا دستیند، پیشانی بند، بازوبند، گلوبند آج بھی دلہنوں کے لیے زیورات کے طور پر بنائے جاتے ہیں۔ وسط ایشیائی اور ایرانی دیہات میں یہ تمام زیورات مکمل طور پر مستعمل ہیں۔

ایران اور وسط ایشیا نے ہمارے رسوم و رواج کو بھی بدل ڈالا اور کشمیری معاشرے میں نئی رسوم داخل ہوئیں۔

ہمارے یہاں کشمیر میں محرّم مہینے کے دسویں روز محلّے کے بچّے جمع ہوکر گھر گھر کھانا پکانے کی چیزیں جمع کرتے تھے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ دس بارہ بچّے اکٹھے ہوکر طلوعِ آفتاب کے بعد ہر گھر کے صحن میں داخل ہوکر اونچی آواز میں ان سے کسی چیز کا مطالبہ کرتے تھے۔ ایک بچّہ اونچی آواز میں معیّن جملے بولتا تھا۔ اور باقی بچّے اسکی تکرار کرتے یا اس جملے کی مدح و ذم میں کچھ بولتے تھے۔ اگر صاحبِ خانہ کچھ دیدیتا تو اسکی تعریفیں مقفّی جملوں میں کرتے ورنہ اُس کی ہجو میں کچھ نہ کچھ کہہ کر دوسرے گھر کا رُخ کرتے۔ بالآخر بچّے لکڑی، چاول، مصالحہ، پیسہ وغیرہ جمع کرنے کے بعد محلہ میں کسی کھُلی جگہ پر کھانا پکا کر کھاتے۔ یہ رسم بلغور خیر کہلاتی تھی جو بگڑ کر بڈگھر خیر ہوگئی۔ لیکن ایران اور وسط ایشیا میں بلغور خیر کی رسم مختلف ہے۔

ایران اور وسطِ ایشیا کے دیہات میں اگر کسی محلے میں یا کسی کوچے میں یا خود گاؤں میں کوئی طاعون، کوئی وبا، کوئی عام بیماری، یا خشک سالی اور قحط کے آثار بارش

---

[1] طومار ہمارے یہاں تعویذ کی شکل کی وجہ سے تعویذ کے نام سے بھی مشہور ہوا اور رہنگ طومار (یعنی سر کا زیور) کے نام سے بھی مستعمل تھا۔ نامہ ایک قسم تھی گلوبند کی، جسکے نیچے قاشق نما چھوٹے چھوٹے دانے آویزاں ہوتے تھے، اور خلخال کو پازیب بھی کہتے تھے۔

نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جائے تو محلّے کی عورتیں نیت باندھ لیتی ہیں اور وہ اس مصیبت کو ٹل جانے کی خاطر اکٹھے مل کر کھانا پکاتی ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں مسکینوں اور محتاجوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ گویا یہ ایک طرح کا کشمیری مانند نذر و نیاز ہے۔ ایران میں یہ رسم 'بلغور خیر' کہلاتی ہے اور 'آشِ سرِ کوچہ' بھی۔ کیونکہ یہ نیاز کا کھانا رات بھر محلّہ میں کسی کھلی جگہ پر پکایا جاتا ہے لیکن یہ امر لازمی ہے کہ اس نیاز کے لیے کھانے کی چیزیں گھر گھر جا کر گدائی کر کے جمع کی جائیں۔[1]

---

[1] گدائی کرنے کے دوران کشمیر میں جو بچّے (بلغور خیر) 'بڈ گھر خیر' کے سلسلے میں کسی گھر سے کچھ حاصل نہیں کر پاتے تھے تو گھر والوں کی ہجو کرتے تھے مثلاً ھگر تے ھگر، یتھ گھرس گگر (یہ مقفّیٰ جملے خود ہی بناتے تھے یا چونکہ سالہا سال سے سنتے آتے تھے اس لیے انکی تکرار کرتے تھے) ھگر کا لفظ محض گگر کے لیے بناتے تھے ورنہ ھگر کے معنی بھیّہ کے ہیں اور گگر یعنی چوہے۔ اور جب کسی گھر سے انہیں کچھ ملتا تھا تو اُس گھر کے حق میں تعریفی یا دُعائیہ کلمات کہتے تھے، مثلاً۔ ہاری تے ہاری یتھ گھرس یارِ (یعنی اللہ اس گھر کی مدد فرمائے) اور اوپر کے جملے کے معنی ہیں "اس گھر میں چوہوں کی بھرمار ہو۔ یا "توٗسی توٗسی کوٗٹھ ہے توٗسی (یعنی انتظار کرتے کرتے ہمارے گھٹنے سُن ہو رہے ہیں) ہَرا ہرا دان خارا (شالی خروار بھر دے دینا) یُس کرِ حرکت تس کرِ برکت (جو حرکت کریگا اللہ اسکو برکت دیگا) ھوٗ پاھوٗ پاتوٗ میلہ شپاہ! بڈہِ گھرِہ خیر، توٗ میلہ سیر! (ڈھال بھر چاول دو بڑے گھر کی خیر ہو چاول کا ایک سیر دو)

یہ رسم ایران میں بعض دیہات میں اب بھی موجود ہے فرق یہ ہے کہ وہاں یہ رسم محرّم کے دسویں روز کی نہیں ہے بلکہ یہ تب عمل میں آتی ہے جب گاؤں میں بارش نہ ہو اور گندم کی پیداوار کم ہو جانے کا خدشہ ہو۔ ظاہر ہے کہ گاؤں والے پریشان خاطر رہتے ہیں اور وہ اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں، اس بارے میں گاؤں کے بچّے بھی یہ رسم انجام دیتے ہیں اور ہوتا ایسا ہے کہ دس بیس بچّوں کی ایک جماعت اکٹھا ہو جاتی ہے اور یہ گاؤں میں گھر گھر جا کر اُن سے اونچی آواز میں کوئی نہ کوئی چیز مانگتے ہیں۔ ہر صاحبِ خانہ اپنی بساط کے مطابق کوئی نہ کوئی چیز ان کو دیدیتا ہے جیسے لکڑی، آٹا، گندم، چاول روغن اور پیسے، جس گھر سے بچّوں کو کچھ ملتا ہے تو صاحبِ خانہ کا شکریہ (باقی اگلے صفحے پر)

بزرگانِ دین کے نام پر حلوہ پکانے کی رسم خالص ایرانی ہے۔ ایران میں دیگچۂ حضرتِ زہراؓ، سُفرۂ بی بی حورؓ، اور سفرۂ بی بی نورؓ، سفرۂ حضرت ابوالفضلؓ اور سفرۂ حضرت رقیہؓ خاتونؓ پکاتے ہیں اور یہاں کشمیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ، حضرت غوث الاعظمؒ حضرت نقشبندؒ مشکل کشاؒ، اور حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے میلادِ مبارک کے دن کی نیاز یا سُفرہ پکاتے ہیں۔ جس طرح سے ایران میں سفرہ پکانے کی رسم میں روضہ خوانوں کو بُلاتے ہیں اور وہ روضہ پڑھتے ہیں، اسی طرح ہمارے کشمیر میں عقیدت مند لوگ مخصوص نذر و نیاز پکانے کے دن مولود خوانوں یا پیر صاحبان کو گھر میں بلا کر مجلسِ ختم شریف ترتیب دیتے ہیں۔ سفرہ اور نذر و نیاز پکانیکی رسم وسط ایشیا کے شہروں اور دیہات میں اب بھی موجود ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں: "خُونہ گچی، پُر ہمہ چی، خونہ گچی، پُر ہمہ چی" (یعنی، یہ گچ کیا ہوا خوبصورت گھر الٰہی ہر چیز سے بھر جائے) اور اگر صاحبِ خانہ سے کچھ نہ ملتا تو بچے ہم آواز ہو کر کہتے ہیں: "خُونہ گدا ہیچون نداد، خونہ گدا ہیچون نداد" "خُونہ کہ خشک خُشکہ، پُرش گی نیلہ مشکہ، خونہ کہ تنگِ تنگہ، پرش چالِ پلنگہ" (یعنی اس بھکاری گھرانے نے ہمیں کچھ نہ دیا، یہ گھر تو سوکھا سا ہے، گہ اور چوہوں سے بھرا ہے، یہ گھر تو تنگ ہی تنگ لگتا ہے، اس میں شیروں نے غار بنا رکھے ہیں)

اور اگر شوخی میں صاحبِ خانہ اُن پر پانی ڈال دے تو بچے کہتے ہیں: "آبش دادی، تونش بدہ، آبش دادی نولنش بدہ، ترم کردی، خشکش کن" (یعنی پانی دیا، اب روٹی دو، گیلا کر دیا، اب خشک بھی کر دو) اس کے بعد بچے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بڑا یا جو اُن کا لیڈر ہو، وہ اِن سب چیزوں کو بیچ کر اس کے بدلے کھجوریں خرید لیتا ہے، ایک کھجور کی گٹھلی نکال کر اس میں چھوٹا سا کنکر ڈال دیتا ہے اور پھر کھجوروں کو بچوں میں بانٹ دیتا ہے، جس بچے کے حصّے میں کنکر والی کھجور آجاتی ہے، بچے اس کو پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی دوران کوئی بچہ اُس کا ضامن بن جاتا ہے اور کہتا ہے: "اگر تین دنوں کے اندر بارش آگئی تو ٹھیک، ورنہ اس کی جگہ میں مار کھاؤں گا۔" بچے اس کی یہ بات مان لیتے ہیں اور سب گھروں کو چلے جاتے ہیں تین دنوں تک اگر بارش نہیں آتی تو بچے اُس ضامن بچے کو پکڑ لیتے ہیں (باقی اگلے صفحے پر)

جو عورتیں اُمّید سے ہوتی ہیں ایران میں اور وسطِ ایشیا کے دیہات میں وہ روضوں پر جاکر منّت مانتی ہیں اور روضۂ شریف کی جالی میں، کھڑکی میں، دروازوں میں دھاگا باندھتی ہیں اور مراد پوری ہونے پر کھول دیتی ہیں۔[1]

جن عورتوں کو بچّہ نہ ہوتا ہو وہ بھی اسی طرح کی منّت مان کر روضوں پر دھاگا باندھتی ہیں اور تبرّک کے طور پر روضہ سے مٹّی اُٹھا کر لے جاتی ہیں۔ بچّہ ہو جانے پر اُسی روضۂ شریف میں جاکر بھیڑ کو راہِ اللہ میں ذبح کر دیتے ہیں۔ کشمیر میں یہ رسم عام ہے۔

میّت کے رسوم ایران میں ہم سے مختلف ہیں۔ البتہ وسط ایشیا اور کشمیر میں خاصی مشابہت ہے۔ تینوں جگہوں میں میّت کی قبر پر ایک ہموار اور چھلایا صیقل کیا ہوا پتھر جس پر میّت کا نام اور اسکی تاریخِ وفات فارسی شعر یا نثر میں نقش کیا ہوتا ہے، نصب کرتے ہیں۔ یہ رسم کشمیر میں عام ہے۔

ایرآن کشمیر تمدّنی اور تہذیبی اثرات میں، میوہ فروشی کے نغموں کا ذکر لازمی ہے۔ جیسے ایران میں گرمی کے ایّام میں یخ بیچا کرتے ہیں ویسے ہمارے یہاں کشمیر میں بھی بیچتے تھے، دونوں جگہوں میں یخ فروش ایک بڑے تغار کو سر پر لیے گلی کوچوں میں اونچی آواز میں یخ بیچتے تھے اور لوگوں کو راغب کرنے کے لیے یخ کی تعریف میں مقفیٰ جملے یا گیت گاگا کر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور اُسے پیٹنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ رسم پھر نئے سرے سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ داستان میں نے شیراز میں اپنے ایک دوست کے گھر میں سُنی۔ [2] ایران میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بی بی حور اور بی بی نور حضرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان دونوں بیبیوں کے نام پر آج بھی ایرانی گھروں میں نذر و نیاز کی دیگ پکتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] ایامِ حمل میں خراسان اور دیہات کی عورتیں وزنی چیزوں کو اُٹھانے، تیز چلنے خواہ مخواہ ڈر جانے اور چاند اور سورج گرہن کے دن کسی کے ہاتھوں مس ہونے سے اجتناب کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی عورتیں ان چیزوں سے محتاط رہتی ہیں بچّے کو جنم دینے کے چند روز بعد وہاں کی عورتیں گاؤں کے حمّام میں غسل کرنے جاتی ہیں۔ یہ رسم یہاں سرینگر میں بھی تھی اور اب ختم ہوگئی ہے لیکن شاید ہمارے دیہات میں کہیں کہیں ابھی موجود ہوگی [2] یخ فروشی کی آوازیں
(باقی آگے)

بزرگانِ دین کے نام پر حلوہ پکانے کی رسم خالص ایرانی ہے۔ ایران میں دیگچہ حضرت زہراؓ، سُفرۂ بی بی حورؓ، اور سفرۂ بی بی نورؓ، سفرۂ حضرت ابوالفضلؓ اور سفرۂ حضرت رقیہؓ خاتونؓ پکاتے ہیں اور یہاں کشمیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ، حضرت غوث الاعظمؒ حضرت نقشبند مشکل کشاؒ، اور حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے میلادِ مبارک کے دن کی نیاز یا سُفرہ پکاتے ہیں۔ جس طرح سے ایران میں سفرہ پکانے کی رسم میں روضہ خوانوں کو بُلاتے ہیں اور وہ روضہ پڑھتے ہیں، اسی طرح ہمارے کشمیر میں عقیدت مند لوگ مخصوص نذر و نیاز پکانے کے دن مولود خوانوں یا پیر صاحبان کو گھر میں بلاکر مجلسِ ختم شریف ترتیب دیتے ہیں۔ سفرہ اور نذر و نیاز پکانیکی رسم وسط ایشیا کے شہروں اور دیہاتوں میں اب بھی موجود ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں: "خُونہ گچی، پُر ہمہ چی، خونہ گچی، پُر ہمہ چی" (یعنی، یہ گچ کیا ہوا خوبصورت گھر الٰہی ہر چیز سے بھر جائے) اور اگر صاحبِ خانہ سے کچھ نہ ملتا تو بچے ہم آواز ہوکر کہتے ہیں: "خُونہ گدا ہیچمون ندا د، خونہ گدا ہیچمون نداد،" "خونہ کہ خشکِ خُشکہ، پُرِش گی نیلہ مشکہ، خونہ کہ تنگِ تنگہ، پرش چالِ پلنگہ" (یعنی اس بھکاری گھرانے نے ہمیں کچھ نہ دیا، یہ گھر تو سوکھا سوکھا سا ہے، گہ اور چوہوں سے بھرا ہے، یہ گھر تو تنگ ہی تنگ لگتا ہے، اس میں شیروں نے غار بنا رکھے ہیں)

اور اگر شوخی میں صاحبِ خانہ اُن پر پانی ڈالدے تو بچے کہتے ہیں: "آبِش دادی، تو نش بدہ، آبش دادی نونش بدہ، ترم کردی، خشکش کن" (یعنی پانی دیا، اب روٹی دو، گیلا کر دیا، اب خشک بھی کردو) اس کے بعد بچے ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں اور ان میں سے بڑا یا جو اُن کا لیڈر ہو، وہ اِن سب چیزوں کو بیچ کر اس کے بدلے کھجوریں خرید لیتا ہے، ایک کھجور کی گٹھلی نکال کر اس میں چھوٹا سا کنکر ڈالدیتا ہے اور پھر کھجوروں کو بچوں میں بانٹ دیتا ہے، جس بچے کے حصے میں کنکر والی کھجور آجاتی ہے، بچے اس کو پیٹنا شروع کردیتے ہیں۔ اسی دوران کوئی بچہ اُس کا ضامن بن جاتا ہے اور کہتا ہے: "اگر تین دنوں کے اندر بارش آگئی تو ٹھیک، ورنہ اس کی جگہ میں مار کھاؤں گا۔" بچے اس کی یہ بات مان لیتے ہیں اور سب گھروں کو چلے جاتے ہیں تین دنوں تک اگر بارش نہیں آتی تو بچے اُس ضامن بچے کو پکڑ لیتے ہیں (باقی اگلے صفحے پر)

جو عورتیں اُمید سے ہوتی ہیں ایران میں اور وسطِ ایشیا کے دیہات میں وہ روضوں پر جا کر منّت مانتی ہیں اور روضۂ شریف کی جالی میں، کھڑکی میں، دروازوں میں دھاگا باندھتی ہیں اور مراد پوری ہونے پر کھول دیتی ہیں۔ [1]

جن عورتوں کو بچّہ نہ ہوتا ہو وہ بھی اسی طرح کی منّت مان کر روضوں پر دھاگا باندھتی ہیں اور تبرّک کے طور پر روضہ سے مٹّی اُٹھا کر لے جاتی ہیں۔ بچّہ ہو جانے پر اُسی روضۂ شریف میں جا کر بھیڑ کو راہِ اللہ میں ذبح کر دیتے ہیں۔ کشمیر میں یہ رسم عام ہے۔

میّت کے رسوم ایران میں ہم سے مختلف ہیں۔ البتہ وسط ایشیا اور کشمیر میں خاصی مشابہت ہے۔ تینوں جگہوں میں میّت کی قبر پر ایک ہموار اور چھلایا صیقل کیا ہوا پتھر جس پر میّت کا نام اور اسکی تاریخِ وفات فارسی شعر یا نثر میں نقش کیا ہوتا ہے، نصب کرتے ہیں۔ یہ رسم کشمیر میں عام ہے۔

ایران کشمیر تمدّنی اور تہذیبی اثرات میں، میوہ فروشی کے نغموں کا ذکر لازمی ہے۔ جیسے ایران میں گرمی کے ایّام میں یخ بیچا کرتے ہیں ویسے ہمارے یہاں کشمیر میں بھی بیچتے تھے، دونوں جگہوں میں یخ فروش ایک بڑے تغار کو سر پر لیے گلی کوچوں میں اونچی آواز میں یخ بیچتے تھے اور لوگوں کو راغب کرنے کے لیے یخ کی تعریف میں مقفّیٰ[2] جملے یا گیت گا کر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور اُسے پیٹنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ رسم پھر نئے سرے سے شروع ہو جاتی ہے یہ داستان میں نے شیراز میں اپنے ایک دوست کے گھر میں سُنی۔ [2] ایران میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بی بی حور اور بی بی نور حضرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان دونوں بیبیوں کے نام پر آج بھی ایرانی گھروں میں نذر و نیاز کی دیگ پکتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایام حمل میں خراسان اور دیہات کی عورتیں وزنی چیزوں کو اُٹھاتے، تیز چلنے خواہ مخواہ ڈر جانے اور چاند اور سورج گرہن کے دن کسی کے ہاتھوں مَس ہونے سے اجتناب کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی عورتیں ان چیزوں سے محتاط رہتی ہیں بچّے کو جنم دینے کے چند روز بعد وہاں کی عورتیں گاؤں کے حمّام میں غسل کرنے جاتی ہیں۔ یہ رسم یہاں سرینگر میں بھی تھی اور اب ختم ہو گئی ہے لیکن شاید ہمارے دیہات میں کہیں کہیں اب بھی موجود ہو گی [2] یخ فروشی کی آوازیں (باقی آگے)

اُن کو تخ خریدنے کی ترغیب دیتے تھے۔

کشمیر کے لوگوں میں بعض روایتی عقیدے رائج ہیں اور صدہا سالوں سے رائج

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں نے خود اصفہان کے گلی کوچوں سے سنیں جب کہ میں وہاں اپنے ایک دوست کے ہاں مدعو اور مہمان تھا، اسی دوست کے ہاں میں نے سُنا کہ انجیر، مکئی، تُوت، نارنگی وغیرہ بھی ایران کے دیہات اور قصبوں جیسے شیراز، اصفہان وغیرہ میں پیشہ ور لوگ اونچی آواز میں بیچا کرتے ہیں اور ان میوؤں کے حق میں تعریف بھی گا گا کر کرتے ہیں۔ مثلاً: انجیر فروش بولتا ہے: انجیر بُش، میوۂ باغِ بہشت انجیر بُش، شبِ خیراتہ، زندہ ہا یادِ مردہ ہا بکنید، بابا جنّت!" (یعنی، تازہ انجیر ہے، جنّت کے باغ کا میوہ ہے، یہ تازہ انجیر خیرات کی رات ہے، ارے زندو! مُردوں کو یاد کرو! آپکے بابا کو جنّت نصیب ہو) خشک انجیروں کے بارے میں، جنہیں گیلا کر کے کھاتے ہیں اور انجیر خیسانیدہ کہلاتے ہیں، انجیر فروش کہتا ہے: "بخور انجیر! پارہ کُن زنجیر! بخور کہ با گلابہ، زیرش دریائی آبہ، انجیر بخور کُشتی بگیر، زدت زمین ... بگیر!"

(یعنی انجیر کھالو، زنجیر توڑ دو، آؤ کھاؤ کہ عرق گلاب میں ملی ہے، اس کے اندر رس کا دریا ہے، آؤ انجیر کھاؤ اور کشتی لڑو، کوئی تجھے زمین پر دے مارے گا تو..... تم پکڑ لو گے اُسے اسکی برکت سے!)

مکئی کے بارے میں مکئی فروش کہتا ہے: "شیر شدہ بلال! شور شد بلال، شیر با حکمت بلال است بلال، کاکل بہ سر ذرّت، بیا بیا شیرت بدم، خوراکِ کل بزرگونت بدم، بچو میگیرہ بُونہ، براش بخر یہ دُونہ، چوبش بکن ستُونِ خونہ، بزن تو سرش تُرکی مہ خونہ!"

(یعنی، بُھٹّا دودھ کا ہے! بُھٹّا نمکین ہوگیا ہے! بُھٹّا حکمت والا علاج ہے! اس مکئی کے سر پر تاج ہے، آؤ آؤ، تجھے دودھ پلا دوں، تمہارے سبھی بزرگوں کو خوراک کھلا دوں! بچے بہانہ کریں گے اُن کے لیے ایک عدد تو خرید لو! اس کی لکڑی سے گھر کا ستون بنا لو، کسی کے سر پر دے مارو تو تُرکی بولنے لگے گا) (باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں۔ ان میں بعض یقیناً ایسے عقاید بھی ہوں گے جو ضعیف الاعتقادی کی ہماری ہزاروں سال پرانی روایات کی پیداوار ہوں گے اور بعض ایسے بھی جو ایران اور وسطِ ایشیا سے

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) سیاہ رنگ کے تُوت کے بارے میں تُوت فروش پکارتا ہے: "میوۂ حرارت بُرِ توت، صفرا بُرِ تُوت" (یعنی! یہ توت حرارت کو کاٹ دینے والا میوہ ہے توت صفرا کو کاٹ دینے والا میوہ ہے، آجاؤ، لے جاؤ)۔

نارنگی کے بارے میں: "تنگِ طلا نارنگی" (یعنی: نارنگی کیا ہے سونے کا مٹکا ہے، آکر لے جاؤ!)۔ بَخ فروشی جس کا ذکر میں نے کیا، سے متعلق کشمیر میں بھی بیچنے والے اونچی آواز میں گلی کوچوں سے گزرتے اور پکارا کرتے تھے: "واہ بَخ! واہ واہ بَخ! اَکمہٕ وَنہٕ وۄلمکھ یَخَو، سون تہٕ ڈُور جَبر لوٗیہٕ یَخَو" (یعنی واہ بَخ! واہ واہ بَخ! کتنی دور جنگل سے تجھے لیکر آیا ہوں! سونے بالیوں سے تجھے سنوار دُوں اے بَخ!)۔

ہمارے یہاں میٹھی مکئی بھی گلی کوچوں میں بکتی تھی اور مکئی فروش اونچی آواز میں بولتے تھے: "مِشٕر مکائے چھُوہ! دِلدِن پوٗنسَن ملائے چھُوہ" (یعنی آؤ، میٹھی مکئی ہے دو پیسے میں بھر کر ملائی ہے)۔ تُوت کی بھی اسی طرح گلی کوچوں میں تشہیر ہوتی تھی۔ یعنی سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے رسیلے تُوت، سیاہ رنگ کے شیرین توت اور پھر شہتوت (جو ذرا کھٹے ہوتے تھے اور شہتوت فروش اُن کے اوپر نمک مصالحہ چھڑکتا تھا یا بالکل میٹھے ہوتے تھے)۔ اس کے علاوہ پکا ہوا مٹر اور باریک راجماس سُرخ، بھون کے اور خشک کر کے جسے کشیری میں مصالحہ کہتے ہیں، لواس نامی روٹیوں پر گرم گرم کھانے کا رواج اب بھی ہے۔ اور خاص کر علی الصّباح کھاتے ہیں اور بعض بزرگانِ دین کے روضوں پر عُرس کے دن لوگ خود بھی کھاتے ہیں اور گھر کے لیے بھی لے جاتے ہیں۔ گاؤں سے عورتیں خاص قسم کی سبزیاں جو شہر میں دستیاب نہیں تھیں۔ گلی کوچوں سے گزر کر اونچی آواز میں بیچا کرتی تھیں اور ان میں کچھ بچوں کی دلچسپی کے لیے کھانے کے میوے بھی ہوا کرتے تھے: مثلاً کھٹی سبزیاں، جیسے ژوکہٕ ژُنٛز، ژوکہٕ لدٕر، سُنٛز اَگلہ، لیسہٕ وغیرہ، اور کھانے کے میوے جیسے کیٗوٗ، کِنہٕ بٹٕی،

در آمد ہوئے ہوں گے اور ان آخر الذکر عقاید کی یکسانیت حیرت انگیز ہے، ذیل میں ہم چند ایسے خرافاتی عقیدوں کا ذکر کریں گے جو ایران اور کشمیر میں بالکل یکساں ہیں[۱] مثلاً:

> "رات کو یا شام کے وقت ناخن کاٹنا بد شگونی ہے۔ رات کو بالوں میں کنگھی کرنا بد شگونی ہے۔ اگر کسی کی چھت پر بیٹھ کر اُلّو بولنے لگے تو اُس گھر کے لیے یہ ویرانی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) وَیہ بُدُر، وَریہ مول وغیرہ۔ لیکن اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اور ان کی جگہ ٹافی، آئس کریم، اعلیٰ اقسام کے بسکٹ اور چاکلیٹ نے لے لی ہے۔ البتہ دیہات میں یہ سیز باں اب بھی باقی ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا[۱]) میں نے شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی سے جو فارسی رسالہ دانش کے نام سے جاری کیا اس کے ابتدائی شماروں میں تفصیل کے ساتھ میں نے ان مشابہ عقاید کا ذکر کیا ہے، دکھانا یہ مقصود ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری کے بعد ایران اور وسط ایشیا کے لوگوں کے ساتھ ہمارے جو گہرے تعلقات باہمی آمد و رفت اور مقامی سلاطین کی معارف پروری، ہنر دوستی، ادب نوازی اور سیاسی روابط قایم ہو جانے کے نتیجے میں استوار ہوئے ان سے ہماری تہذیب ایرانی اور وسط ایشیائی تہذیب میں یوں مدغم ہوئی کہ پھر تفکیک کرنا ناممکن ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایرانی اور وسط ایشیائی تہذیب و تمدن کا غلبہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہدِ حکومت کے اواخر تک یعنی حضرت شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری کے بعد ایک سو سال تک (۸۷۹ھ ہ ۱۴۷۴ء) تقریباً مکمل ہوا۔ اور جو بھی کمی باقی رہی وہ آپ کے فرزندِ رشید ارجمند حضرت میر محمد ہمدانیؒ اور ان کے رفقاء کی تشریف آوری سے، اور پھر مغلیہ بادشاہوں کی سرپرستی سے اور آخر میں افغان بادشاہوں کی دلچسپی اور مساعی سے پوری ہو گئی۔ افغان دورِ حکومت کا ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء میں خاتمہ ہوا۔ گویا حضرت شاہ ہمدانؒ کی آخری بار ۷۸۵ھ میں تشریف آوری کے بعد سے ساڑھے سات سو سال تک کے عرصے میں کشمیر، مکمل طور پر ایرانی اور وسطِ ایشیائی دین اور تہذیب و تمدن کے تسلط میں رہ چھوٹا ایران بن گیا۔

کی علامت ہے۔ منگل وار کے دن (ایران میں سینچر کے دن) سفر کرنا یا شادی بیاہ کا جشن منانا بدشگونی ہے، اگر کسی کے تلوے میں کھجلی آجائے تو اُسے سفر پر جانا ہوگا۔ اگر کوئی کہیں جانا چاہے اور اُسے چھینک آجائے یا کوئی اور چھینکے یا کسی اور کے چھینکنے کی آواز سنے، تو اُس آدمی کو ذرا ٹھہر کر باہر جانا چاہیئے۔ کھڑے ہوکر پانی نہیں پینا چاہیئے۔ صبح سویرے اُٹھ کر آدمی پانی پیئے تو بیمار نہیں پڑتا۔ اگر آئینہ ٹوٹ جائے یا اوکھلی ٹوٹ جائے تو یہ بدشگونی ہے اور کوئی ناگوار واقعہ ہونے والا ہے۔ رات کے وقت کتّوں کا بھونکنا بدشگونی ہے۔ خواب میں رونا دیکھیں تو خوشی حاصل ہوگی۔ خواب میں ہنستا اور خوش ہوجانا دیکھیں تو یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ خواب میں گھوڑے کو دیکھیں تو یہ ترقی کی علامت ہے۔ خواب میں بیت الخلا کی نجاست دیکھیں تو یہ دولت مند بننے کی علامت ہے۔ دائیں آنکھ پھڑکے تو نیک شگونی کی علامت ہے، اور بائیں آنکھ کا پھڑکنا رنج وغم کی نشانی ہے اس لیے اس پر گھاس کا تنکہ چڑھانا چاہیئے۔ شام کے وقت جھاڑو نہیں پھیرنا (دینا) چاہیئے۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں کھجلی ہونا پیسہ ملنے کی نشانی ہے۔ اگر شام کے وقت یا رات میں مرغا اذان دے تو یہ بدشگونی ہے۔ اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ مر گیا ہے تو یہ اسکی لمبی عمر ہونے کی نشانی ہے۔ اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ اس کے دانت نکل گئے ہیں تو یہ اقارب کے مر جانے کی علامت ہے۔ اگر کوئی شیرخوار بچّہ مسکرائے تو گویا وہ فرشتوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اور جب وہ اُس کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو وہ روتا ہے۔ رات کے وقت آئینہ دیکھنے سے آدمی رنج والم میں مبتلا ہوگا۔ اگر کوئی کوّا کھڑکی یا صحن کی دیوار پر بیٹھ کر بولے تو یہ خوش خبری سننے کی علامت ہے اور مہمان کے آنے کی بھی۔ (کشمیر میں بلبل آکر کھڑکی پر بولے تو یہ مہمان کے آنے کی علامت ہے)

اگر پیر کے جوتے ایک دوسرے کے اوپر آ جائیں تو سفر در پیش ہوگا۔"

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وسط ایشیائی اور ایرانی میووں میں سے غالباً ہندوانہ، خربزہ، آلو بخارا، بادام، ناخ، عنبری سیب کشمیر میں وارد ہوئے ہیں۔ [1]

کشمیر میں گھریلو طبابت اب بھی رائج ہے۔ اگرچہ شاید یہ ہمارے یہاں سینکڑوں سال کی روایت رہی ہے، لیکن ایرانی اور وسط ایشیائی تمدن اور تہذیب کے تسلط کے زیر اثر یہ چیز بھی تبدیل ہو کے رہ گئی اور کشمیری گھریلو طبابت آج بھی وسط ایشیا اور ایرانی گھریلو طبابت کے عین مشابہ ہو گئی۔ گھریلو طبابت دراصل دیہات کے لوگوں میں بالخصوص اپنے آباء و اجداد کے طور طریقوں اور ان کے رسوم و عقائد و عادات پر سختی سے کاربند رہنے کا نتیجہ ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں اس سے بہتر اور منطقی تر اور کوئی چیز نہیں۔ نیز مالی مشکلات اور اقتصادی بدحالی بھی جدید اطباء کی طرف رجوع کرنے میں حائل ہے۔ اس لیے وسط ایشیا اور ایران اور کشمیر کے دور دراز دیہات میں آج بھی جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو وہ ان عمر رسیدہ اور تجربہ کار مردوں بلکہ (عورتوں) کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد سے طبابت سیکھی ہوتی ہے۔ اور جنہیں میدانی و پہاڑی اور جنگلی جڑی بوٹیوں کے نام اور ان کی خاصیتوں کی اچھی پہچان ہوتی ہے۔

مثلاً پھوڑے کے علاج کے لیے کپڑے میں چھوٹا سا سوراخ کر کے اس پر گیہوں کا آٹا، شکر اور انڈے کی زردی کا معجون بنا کر لگاتے تھے اور اس طرح کہ پھوڑے کا سرا کپڑے کے سوراخ سے باہر رہ جائے۔ یا گلِ ہمیشہ بہار کے پتوں کو سوراخ کر کے پھوڑے پر لگاتے تھے۔

ایڑیوں میں رخنے پیدا ہونے پر گرم چربی ملتے تھے اور پھر کسی روز حمام میں جا کر

---

[1] وسط ایشیا میں ناشپاتی کو ناخ کہتے ہیں اور کشمیر میں یہ ناشپاتی کی ایک قسم ہے۔ کشمیر میں ٹنگ، ناخ ٹنگ، فرائشی ٹنگ اور گوشہ بہی ناشپاتیوں کی قسمیں ہیں۔

وہاں ان پر مہندی لگاتے تھے۔

نکسیر پھوٹنے پر، اگر دائیں طرف کے نتھنے سے آتی بائیں ہاتھ کو اوپر اٹھاتے تھے اور اگر بائیں طرف کے نتھنے سے آتی تو دائیں ہاتھ کو اوپر اٹھاتے تھے، یا آدمی کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتے تھے، یا انڈے کے چھلکے کو جلاتے تھے اس کو کوٹ کے اسکی گرد ناک میں ڈال دیتے تھے۔

آنکھ میں درد ہوتا تو انڈے کی سفیدی آنکھ پر رکھ دیتے تھے۔ یا گائے کے گوبر کو آگ میں ڈال کے اس کے اوپر لوہے کی کوئی چیز رکھ دیتے تھے، جب تک یہ سُرخ ہو جاتی تھی۔ سُرخ ہو جانے پر اس کے اوپر تھوڑی سی پھٹکری اور تھوڑی سی افیون رکھ دیتے تھے تاکہ یہ دونوں جل جائیں۔ اسکے بعد ایک انڈے کو توڑ کر اسکی زردی کو الگ کر دیتے تھے اور اسکی سفیدی کو ویسے ہی خول میں نرم آگ کے اوپر رکھ دیتے تھے تاکہ سفیدی خول کے ساتھ ذرا چپک جائے۔ اسکے بعد اسکو ایک ململ کے کپڑے میں ڈال دیتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کو نچوڑتے تھے تاکہ اس کا عرق باہر نکل آئے، پھر لوہے کے اوپر سے جلی ہوئی افیون اور پھٹکری کو اٹھا کر جوہر دانہ کے ساتھ پتھر پر کوٹتے تھے اور انڈے کی سفیدی کے عرق اور پانی کے چند چمچوں کے ساتھ ملاتے تھے اور اس مایع یا دوا کو آنکھ کے اوپر لگاتے تھے گویا ہر روز دو یا تین بار اس کے دو تین قطرے آنکھ میں رُوئی سے ٹپکاتے تھے خراسان کے لوگوں کا دیہات میں اب بھی عقیدہ ہے کہ زندہ سانپ کی دُم آنکھوں پر پھیروا دینے سے آنکھ کا درد رفع ہو جاتا ہے۔ [۱]

سَر درد کو دُور کرنے کے لیے ہلدی اور سونٹھ کو پیس کر پیشانی پر لگاتے تھے یا اگر مزاج کی گرمی کی وجہ سے سَر کا درد ہوتا تو درخت عُنّاب (یعنی بیری کا درخت) کے

---

[۱] ہمارے یہاں کشمیر میں یہ رسم عام تھی۔ اور زندہ سانپ کی دُم آنکھوں پر پھیراتے تھے اور عقیدہ یہی تھا کہ بچّوں کی آنکھوں پر سانپ کی دُم پھیر دینے سے کبھی بھی بچّے کی آنکھوں میں درد نہیں ہوگا۔

پتّوں کو سایہ میں سُکھانے کے بعد اوکھلی میں کوٹتے تھے اور مہندی کی طرح پانی کے ساتھ ملانے کے بعد سر پر رکھ دیتے تھے۔ یا گُل بنفشہ اور گُلِ خطمی کو کوٹتے تھے اور اس کی گردِ کا ضماد بنا کر اُسے آگ پر نیم گرم کر کے سر پر رکھ دیتے تھے۔

حلق میں درد ہوتا تو گُلِ بنفشہ کا ضماد بنا کر حلق پر رکھ دیتے تھے۔

بھڑ کے ڈنک مارنے کے درد کو دُور کرنے کے لیے انگور کے ایک دانے کو پیس کر ڈنک کی جگہ پر مل دیتے تھے یا تیل مَل دیتے تھے یا کسی پتھر پر موٹی سی تھوک ڈال دیتے تھے اور ایک پُرانے جوتے کی ایڑی سے اسے پتھر پر گھسا دیتے تھے اور پھر جوتے کی ایڑی کو جو تھوک کے مایع سے آلودہ ہوتی تھی درد کی جگہ پر مل دیتے تھے۔

خون کی زیادتی یعنی خون کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے حجّام کے پاس جاتے تھے اور وہ مخصوص چاقو سے دو ایک بار زخم لگا کر شاخِ حجامت نامی آلہ سے خون نکالتا تھا یعنی سینگیاں لگاتا تھا۔ کان کے درد کو دور کرنے کے لیے عورت کے پستان کا دُودھ کان میں ڈال دیتے تھے۔ خون نکالنے کے لیے جونکوں کا بھی استعمال ہوتا تھا[1]

ویسے طبابت ایک معزّز پیشہ کی حیثیت سے کشمیر میں اب بھی علومِ اسلامی کے عام ہو جانے اور ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات کے نتیجے میں موجود ہے۔ اسلامی طبابت کی ایرانی طبیبوں نے بڑی خدمت کی ہے۔ خلافتِ اسلامی کے اوّلین ادوار میں یونانی کتابوں کا ترجمہ ہو جانے، طبابت کے بارے میں لکھی گئی کتابوں، شفاخانوں اور طبیبوں کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے ایران میں بالخصوص فنِّ طبابت کی بڑی ترقی ہوئی۔ صاحبِ حکمت پیغمبرِ اسلام صلّے اللہ علیہ وسلم نے چونکہ ہر مسلمان کو راہِ خیر میں کوئی عمل کرنے، مال خرچ کرنے اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اُنکی دستگیری

---

[1] یہ صرف چند نمونے پیش کیے گئے ورنہ گھریلو طبابت کے علاج معالجہ کے طریقے بیشمار ہیں اور بہت سی بیماریوں سے تعلق رکھتے ہیں، آج بھی فصد، حجامت اور جونک لگانے کے طریقے شہر اور دیہات میں رائج ہیں۔

اور مدد کرنے کی تلقین فرمائی ہے اس لیے اسلامی تمدّن میں تمام علوم کے مقابلے میں انسانی ہمدردی کے اس معزّز پیشے نے ترقی کی اور بالخصوص ایران میں اس کو بڑا فروغ ہوا اسلامی طبیبوں نے یونان کے بکھرے ہوئے اور بے ترتیب طِبّ کو مرتّب کیا اور اُسے نظری صورت سے نکال کے عملی اور تجرباتی طِبّ میں تبدیل کر دیا۔ اسلامی اطبّاء نے علم الامراض کو وسعت دی اور بہت سی بیماریوں کو جن سے لوگ بے خبر تھے طبّی دنیا میں شامل کر دیا۔ محمد بن زکریا رازی (وفات ۳۱۱ھ) علی بن عباس اہوازی (وفات ۳۸۴ھ) ابو سہل مسیحی جرجانی (وفات ۴۰۳ھ) ابو علی حسین ابن عبداللہ ابن سینا (۳۷۰ھ ۔ ۴۲۸ھ) ابو بکر یا ابو حکیم اجوینی (یا اخوینی) سیّد اسماعیل جرجانی، ابو منصور موفق ابن علی الہروی وغیرہ جیسے عالمگیر شہرت پانے والے طبیب[1] ایرانی تھے۔

بیماریوں کی شناخت کی کیفیت کو پانے اور جسمانی یا نفسانی علاج معالجوں میں نئی راہیں دریافت کرنے کی کوششیں اور آزمائشات و تجربات کے ذریعہ سے نئی دواؤں کی دریافت کے سلسلے میں ایرانی طبیبوں نے اپنی مجاہدات جاری رکھیں اور اس طرح سے ایرانی طریق علاج ایک انفرادی صورت اختیار کر گیا جس کی بنیاد البتّہ قدیم یونانی طب پر تھی۔ کشمیر کے ساتھ ایرانیوں کے تمدّنی اور تہذیبی روابط کے نتیجے میں کشمیر میں ایرانی طبّ عام ہو گئی اور یہاں کے طبیب بھی حکیم کے نام سے جانے، جانے لگے۔ طبّ کی کتابوں سے استفادہ ہوا اور اس پیشہ کو اختیار کرنیوالوں نے گھروں میں علاج معالجہ کے لیے کمرے مخصوص کر دیئے اور خود ہی دوائیں بھی تیار کروا کے فروخت کے لیے مہیّا رکھیں، حکیموں کے پاس شہر اور دیہات میں لوگ ابھی بھی جا کر علاج معالجہ کرواتے ہیں[2]

---

[1] علم طب کے ساتھ قدیم زمانے میں علم فلسفہ بھی جُڑا ہوا تھا اس لیے ابھی تک طبیب کو بھی حکیم کہتے ہیں اور فلسفی کو بھی ۔

[2] سرینگر اور دیہات میں بعض معمولی سی پوستی بیماریوں کا علاج معالجہ کرنے کی غرض سے لوگ حجّام کے پاس جاتے تھے۔ حجّام چونکہ اصولاً بالوں کی اصلاح (باقی اگلے صفحہ پر)

ایرانی اور وسط ایشیائی تمدّن کے تسلّط کے زیرِ اثر طبابت کے پیشے کے علاوہ کشمیر کے مختلف پیشہ وروں نے مکمل طور پر اپنے پیشوں کو ان ہی دو ممالک کے پیشوں کے تحت ڈھال کر ترقی دی اور بعض نئے پیشوں کو بھی اختیار کیا۔ ان پیشوں میں نجّاری، حمام داری، نقّاشی، کفش دوزی، کلہ پاچہ پزی، دوزندگی (سینے کا کام)، کباب پزی، ہریسہ پزی، حلوہ پزی، شیرینی پزی، گلکاری، زرگری، صحافی، قالی بافی، نقّاشی، خیمہ دوزی، لحاف دوزی، کاغذ سازی، قلمدان سازی، حکاکی، ژندہ دوزی، مسگری، مہرکنی، خرّاطی (لکڑی کو چرخ پر چڑھا کر صاف اور سڈول کرنا)، زہگیری، کمان گری، کلاہ دوزی، روغن کشی، نمدہ سازی (یا نمدہ گری) سوزن کاری، چکن دوزی پشم سازی، کُندن گری، ندّافی، چینت سازی، کوزہ گری، جلد سازی یا جلد گری) ان تمام پیشوں میں کئی پیشے کشمیر میں قدیم الایام سے موجود تھے اور ہیں کیونکہ ان کے نام ہماری کشمیری زبان میں اُصولاً موجود ہیں، لیکن ان میں ایسے بھی پیشے ہیں جو کشمیر میں تھے ہی نہیں اور ایران و وسط ایشیا سے آئے، اور سلاطین کشمیر[1] کی ذاتی توجّہ کی وجہ سے ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرنے اور سینگیاں لگانے کا کام کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں اس لیے وہ تین ناموں سے یاد کیے جانے لگے۔ سینگیاں لگوانے کی حیثیت سے حجّام، بالوں کی اصلاح کرنے کی حیثیت سے سلمان اور پوستی بیماریوں (مثلاً پھوڑے کا مرہم بنانے اور اسے پھوڑے پر لگوانے یا ضماد وغیرہ بنوانے) کا علاج کرنے کی وجہ سے جرّاح اور حکیم کہلائے جانے لگے، لیکن پیشہ ور حکیم ایک الگ معزّز طبقہ ہے اور آج بھی لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں سرینگر میں بھی اور دیہات میں بھی۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) مثلاً تاریخ حسن کے مؤلّف نے سلطان زین العابدین بڈشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ: "سلطان نے اطبّائے کامل اور طبّ کی کتابوں کو بیرونی ممالک سے منگوا کر کشمیر میں جگہ جگہ شفا خانے بنوائے، مسافروں کے لیے سرائیں تعمیر کروائیں اور ہر قوم کے علوم میں تحقیق کروائی۔ دُور دُور علاقوں سے ہر فن کے کاریگر (باقی اگلے صفحے پر)

ایسے پیشوں کو خاصا فروغ ملا۔ اور ان کی بڑی ترقی ہوئی، چنانچہ کشمیر کی پشم سازی جس میں پشمینہ، تافتہ اور شاہ توس بھی شامل ہیں اور جن کے شال عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں، اپنی ساخت میں بے نظیر ہے، چکن دوزی (جالکدوزی) اور سوزنکاری کی اشیاء، جو کشمیری فن کار کے ہاتھ کی ایک کرامت ہے، بے مثال ہے۔ نقّاشی میں بھی کشمیر نے پیپر ماشی نام کے فن کی نقاشی میں سارے عالم میں نام پیدا کیا ہے۔ کشمیری نمدے (چکن دوزی والے یا سادہ) کشمیری شال اونی یا رفل کے (چکن دوزی والے یا سادہ) کشمیری قالین، کشمیری جلد سازی، قلمدان سازی، سوزن کاری کی اشیاء کا اب بھی جواب نہیں ہے۔

اِن پیشوں میں کشمیری فن کاروں نے اپنی لیاقت کے بموجب اور حسبِ استعداد نام بھی پیدا کر لیا۔ لکڑی کے کام پر نقش و نگار اور روشنگری کا کام کشمیر ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور دنیا میں جہاں کہیں بھی دستکاری کی کرامت کی بات ہوگی تو کشمیر پر ہی ختم ہوگی۔ یہ سارے پیشے آج بھی ایرانی اصیل ناموں سے ہی کشمیر میں موجود ہیں خواہ قدیم الایّام والے پیشے ہوں یا ایران اور وسط ایشیا سے وارد ہوئے پیشے۔ [1]

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) بلوا کر یہاں بسائے۔ اور انہیں جاگیر اور عہدے دیئے۔ چنانچہ سمرقند سے صحاف اور کاغذ ساز، قالین باف، جلد ساز، قلمدان ساز، حکاک، مُہر کُن اور دایہ عورتیں بُلوا کر انہیں یہاں آباد کیا اور یہاں سے بھی ہونہار اور نازک خیال لوگوں کی ایک جماعت ایران اور وسط ایشیا کے مختلف ممالک میں بھیجی اور انھوں نے اِن فنون میں تربیت پائی اور واپس لوٹ آنے کے بعد ان فنون کو فروغ دیا۔ تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۸-

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مثلاً نجّار کے لیے کشمیری لفظ چھان ہے، گلکار (راج) کے لیے دِسِل زرگر کے لیے سونُر، حجّام کے لیے ناوِد، نداف کے لیے دُون وغیرہ لیکن چھان، لکھنے میں نجّار ہی کہلائے گا۔ دِسِل کو گلکار ہی لکھیں گے، سونُر کو زرگر اور ناوِد کو حجّام ہی لکھیں گے ایران اور وسط ایشیا میں بعض دکانیں کلہ پاچہ (یعنی سری اور پائے بھیڑ کے) (باقی اگلے صفحہ پر)

قہوہ ایران میں شاہ عباس صفوی کے عہد میں قزوین اور اصفہان میں رائج تھا اور اصفہان کے قہوہ خانے بڑے مشہور تھے اور لوگوں کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے شائقین جن میں اعیان اور درباری عہدیدار، شاعر، اہل قلم، نقاش، سوداگر وغیرہ شامل تھے وقت گزارنے، دوستوں سے ملنے اور خود کو سرگرم رکھنے کے لیے، مثلاً شاعرانہ مناظروں، شاہنامہ کے اشعار سننے، حکایتیں اور کہانیاں سننے اور رقص دیکھنے اور دوسری انواع کی تفریحات سے مخطوظ ہونے کے لیے ان قہوہ خانوں میں جایا کرتے تھے قہوہ خانہ ایک وسیع جگہ ہوتی تھی، اس کی دیواریں سفید اور پاک وصاف ہوتی تھیں۔ اس کے دروازے چاروں طرف سے باہر کے اطراف میں کھُلتے تھے۔ قہوہ خانہ کے اطراف میں طاق نما اور شاہ نشین ہوتے تھے جن پر قالین اور دوسرے اقسام کے فرش بچھے ہوتے تھے بادشاہ بھی کبھی کبھار اپنے مہمانوں یا بیرونی ممالک کے سفیروں کے ساتھ قہوہ خانہ میں آکر قہوہ پیتے تھے۔

کشمیر میں قہوہ خانوں کا کوئی رواج نہیں تھا اور نہ ہی ہریسہ بنانے کی طرح اس کے کوئی ماہر پیشہ ور تھے۔ گھروں میں اس کا خاصا رواج تھا اور اب بھی ہے۔ وسطِ ایشیا اور ایران سے روابط کے نتیجے میں یقیناً قہوہ کا رواج ہمارے یہاں بھی ہوا ہے۔[1]

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) پکانے میں خاصی مہارت کی وجہ سے بڑی مشہور ہیں اور لوگ صرف اُن ہی دکانوں پر جاکر صبح کے وقت ناشتہ میں کھایا کرتے ہیں۔ ہریسہ پزی کے بارے میں قبلاً لکھا جا چکا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کیونکہ قہوہ کا لفظ کشمیری نہیں ہے بلکہ اصل میں عربی ہے جو فارسی زبان کی راہ سے ہماری زبان میں رائج ہے، اگرچہ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ افریقی لفظ ہے اور کافا سے بنا ہے جو قہوہ کا اصلی وطن ہے، لیکن کشمیر میں قہوہ کا ورود ایران کے صفوی دور میں ہی ہوا جبکہ ہندوستان میں مغلیہ عہدِ حکومت شروع ہو گیا تھا۔

ہمارے یہاں کشمیر میں قہوہ بنانے کا طریقہ انفرادی نوعیت رکھتا ہے[1] ابتدا میں یہ ممکن ہے کہ وسط ایشیا میں قہوہ بنانے کا طریق کار وہی رہا ہو جو اب ہمارے یہاں باقی ہے، لیکن اب ایران اور وسط ایشیا میں کافی کو قہوہ کہتے ہیں اور کافی نے ہی مقبولیت کی وجہ سے وہاں قہوہ کی جگہ لے لی ہے۔

فنونِ لطیفہ میں حضرت شاہ ہمدانؒ کا تیموری عہد ایرانی اور وسط ایشیائی تاریخ میں ایک طلائی عہد تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ شاہ ہمدانؒ اور ان کے ہمراہ ایرانی اور وسطِ ایشیائی مجاہد مبلّغین کے کشمیر میں ابتدائی ورود کے عہد میں فنونِ لطیفہ کو فوراً ہی فروغ ملنے کے بارے میں تاریخِ کشمیر خاموش ہے، لیکن مستحکم روابط قائم ہو جانے اور کشمیری اور ایرانی اور وسط ایشیائی ہنرمندوں کے باہمی میل جول اور آمد و رفت نیز خود اُن ہنرمند مبلّغین کی ذاتی کوششوں سے جو کشمیر میں آباد ہوئے، فنونِ لطیفہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔

ایلخانی مغل خود صحرا نورد تھے اور چینیوں کے ساتھ اُن کا پیوند تھا۔ ایلخانیوں نے ایرانی تمدّن کو اپنایا لیکن چینی تمدّن کے ساتھ اُن کا رشتہ منقطع نہیں ہوا اور اس طرح سے چینی ہنر ایران میں وارد ہو گیا اور ایرانی ہنرمندوں کے چینی ہنرمندوں

---

[1] کشمیر میں گھروں میں قہوہ سماوار میں بنتا ہے اور اس کے لیے چھوٹے اندازے کے سماوار پسند کیے جاتے ہیں جو قہوہ سماوار کہلاتے ہیں، چائے بھی الگ نوعیت کی ہوتی ہے جو عام اصطلاح میں بمبئی چائے کہلاتی ہے۔ سماوار میں اندازے کے مطابق پانی ڈال کر بمبئی چائے ڈال دیتے ہیں اور جوش آنے کے بعد اس میں تھوڑی سی دار چینی، چند چھوٹی سبز الائچیاں اور خوشبو کے لیے تھوڑا سا زعفران اور مذاق کے مطابق (چینی) شکر ڈال دیتے ہیں اور جوش میں آنے کے بعد پیتے ہیں۔ اس میں عام طور پر دودھ نہیں ڈالتے اور اگر ڈال دیا جائے تو پھر قہوہ، دودھ قہوہ یا مِٹھ قہوہ، کہلائے گا۔

کے ساتھ براہِ راست روابط پیدا ہو جانے کے نتیجے میں ایرانیوں نے اپنے سلیقے اور ذوق کے مطابق اُن سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ ہمدان رح کے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری اور پھر نویں صدی ہجری میں ایران کی نقّاشی کا مکتب اسی طرح سے وجود میں آ گیا۔

ہمارے یہاں کشمیر میں بھی چینی نقّاشی قدیم ایّام میں چین کے ساتھ براہِ راست رابطہ کے نتیجے میں مؤثر رہی ہے۔ لیکن اسلام آ جانے کے بعد نقّاشی کے اسالیب میں انقلاب آ گیا البتہ یہ اسالیب فطری مناظر اور ریشمی، زردوزی، اور قلاب دوزی کے کپڑوں تک ہی محدود رہے۔ مذہبی یا دینی اوامر کے پیش نظر نقّاشی کشمیر میں اس سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ البتہ چینی اثرات صرف اژدہا کی صورت میں آفتابہ اور سماوار کے دستوں یا چینی پیالیوں کے باہر کے نقوش تک ہی محدود رہے۔

خوشنویسی یا خطّاطی تیموری دور میں قرآن مجید کے نسخوں کی رنگ آمیزی اور نقّاشی سے قلمی نسخوں کی تحریرات اور ان کی ترصیع کاری میں درجۂ کمال کو پہنچی اور خوشنویسی ایک لطیف الہامی فن کی صورت اختیار کر گیا۔ ایرانی اور وسطِ ایشیائی فنکاروں کی بدولت یہ فن شریف کشمیر میں بھی سرائیت کر گیا اور بادشاہوں کی سرپرستی میں فروغ پاتا گیا۔ ہمارے کشمیر کے ملّا محمد مراد کو شاہجہان پادشاہ ہندوستان نے درباری خطّاطوں اور خوشنویسوں کے گروہ میں داخل کر کے اس کی حیرت انگیز فنکاری کے پیشِ نظر زرّین قلم کا خطاب دیا[1] اور اُس کے چھوٹے بھائی ملّا محسن کو شیریں قلم کا لقب ملا۔ محمد رضا مشتاق، ملّا حبیب گنائی اور ملّا حبیب میرِ عدل بھی ہمارے کشمیر کے نادر خطّاطوں میں سے گذرے ہیں۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو: واقعات کشمیر صفحہ ۱۷۰-۱۷۱-؛ ۔ رامپور (یوپی) رضا لائبریری میں کشمیر کے ایک خطّاط کے طغرے اور وصلیاں آج بھی موجود ہیں جو بہترین کام ہے ، اور خوشنویسی کا بہترین نمونہ۔

[2] محمد رضا مشتاق کشمیری فارسی کے نامور کشمیری شاعر جن پر میں نے تین سال تک تہران یونیورسٹی میں تحقیق کر کے ڈی لٹ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، نادر روزگار خطّاط بھی تھے اور معمولاً مولانا رُوم کی مثنوی کی نقلیں لکھ کے اپنا ذریعۂ معاش حاصل کرتے تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت شاہ ہمدانؒ کا عہد (تیموری دور) جلد سازی میں بھی اعلیٰ فن کے نمونہ جات میں عظیم الشان دور تسلیم کیا گیا ہے۔ خوشنویسی کے ساتھ یہ فن بھی قدرتی طور پر کشمیر میں وارد ہوا۔ چمڑے کے باریک کٹاؤ، فنی مہارت اور نقش و نگار، استحکام اور پائیداری میں کشمیر کے ماہر اور پیشہ ور فنکار جلد سازوں کی قلمی کتابوں کی جلدیں آج بھی اہلِ ذوق و ہنر کو حیران کر دیتی ہیں۔ لے

معماری کے سلسلے میں میں نے اس سے پہلے بیان کیا کہ دینی علوم اور شریعت کو فروغ دینے کے سلسلے میں جو مدرسے اور خانقاہ حضرت شاہ ہمدانؒ اور اُن کے رفقائے کار کی تشریف آوری کے ساتھ ہی کشمیر میں تعمیر ہوئے یا فوراً اُن کے عہد کے بعد کے ادوار میں تعمیر ہوئے، اُن کا اسلوب کشمیری رہا اس کے نمایاں گواہ آج بھی موجود خانقاہیں ہیں جنکی چھت بشمول جامع مسجد کسی بھی بدھ وِہار کی چھت کے مشابہ ہے۔ اس کی وجہ کشمیری مسلمان بادشاہوں کی مروّت اور صلح کل کی وہ مصلحت ہے جو اسلامی حکومتوں کا شعار رہا ہے اور جنہوں نے کبھی ظلم اور جبر سے کوئی بھی دینی بات نہیں منوائی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے چھ سو سالہ دورِ حکومت میں کشمیری پنڈت لباس میں، دھرم میں گھریلو بات چیت میں، اپنے مخصوص رسم و رواج میں اور کھانے پینے کی عادات تک میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھ سکے ہیں۔ لیکن بہرحال معماری میں بعض چیزیں وسط ایشیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں نے اُن کے ہاتھ سے لکھی تاشقند میں اور ینٹل کتاب خانہ میں موجود امیر خسرو کی ایک مثنوی دیکھی تھی۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کشمیر میں اپنے ان فنکار اساتذہ کے کرامت آمیز ہنر کا کوئی نمونہ موجود نہیں اور اگر ہے تو یورپ اور غیر ممالک کے کتاب خانوں کی زینت بن چکے ہیں ے غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن؛؛ کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

لے (حاشیہ صفحہ ہٰذا) جلد ساز اب بھی کشمیر میں پیشہ ور ماہر ہیں اور اسی سے اپنی روزی کما لیتے ہیں۔ یہ فن اب آہستہ آہستہ اپنی تزئین کاری کھو چکا ہے جبکہ اسی فنِ شریف کی وجہ سے سرینگر میں "جلدگر" محلہ اب بھی موجود ہے جو قدیم ایام میں نادر روزگار جلد سازوں کا مسکن تھا۔

اور ایران سے ہمارے مکانوں کی ساخت سے مربوط ہوگئیں جن میں دیوان خانہ، محل خانہ، حمّام، جامہ خانہ اور شاہ نشین وغلام گردش جیسی اصطلاحیں اب بھی زبان زدِ عام ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی تعمیرات خواص ہی سے متعلق رہیں لیکن گچ کاری اور دیواروں پر نقش ونگاری کا کام خواص اور عوام دونوں سے متعلق رہا۔ اس کے علاوہ بڑے کمروں کے بیچ میں اُرسی (کشمیری میں وُرسی) یا مکان کے بالائی طبقے پر دالان کی تعمیر (کشمیری میں ڈب) میں بھی اُرسی کا استعمال خالص وسط ایشیائی تقلید ہے۔ شیراز اور اصفہان میں ابھی تک قدیم طرز کے مکانوں میں اُرسی والے مکان موجود ہیں۔ ہمارے یہاں دیہات میں آج بھی اُرسی کا استعمال ہوتا ہے۔

معماری کے سلسلے میں ایک خاص اینٹ کا استعمال بھی کشمیر میں رائج ہوا۔ یہ اینٹ وسط ایشیائی اور ایرانی ساخت کی ہے جسے یہاں کے اینٹ بنانے والوں نے اختیار کیا۔ اس اینٹ کا استعمال بھی خواص سے متعلق رہا بالخصوص یہاں کے بادشاہوں راجوں، مہاراجوں اور صاحبِ ثروت لوگوں کے ساتھ غالباً اس کی وجہ گرانیٔ قیمت رہی ہوگی۔ یہ وہی اینٹ ہے جو ہمیں بڈشاہ کے گنبد پر نظر آتی ہے اور سرینگر میں بھی اس اینٹ کے بنے ہوئے چند ہی مکانات نظر آتے ہیں۔ [1]

تعمیرات ہی کے سلسلے میں مکانوں کے اندر لکڑی کے بارے میں چند نئی اصطلاحیں وجود میں آگئیں۔ اندرونی چھتوں کے اسلوب ایرانی اور وسط ایشیائی ہوگئے۔ مثلاً چھتوں میں، دوازدہ گرد، موج، ہشت پہلو، شش مربع، ہشت مربع، ہشت دوازدہ، نُہ دوازدہ، گرہ شش بندی وغیرہ [2] اور کھڑکیوں میں پنجرہ کاری کا استعمال عام تھا۔

---

[1] سارے وسط ایشیا میں بزرگانِ دین کے تمام روضہ جات اور مساجد اور رؤسا کے مکانات اور بادشاہوں کے محلات میں یہی اینٹ استعمال ہوئی ہے۔ یہ ہمارے کشمیر میں ماہراجی اینٹ کہلاتی ہے، اس کا استعمال کشمیر میں گو بہت زیادہ نہیں رہا لیکن بہر حال استعمال ہوا ضرور۔

[2] شیراز اور اصفہان میں یہ چھتیں قدیم مکانوں میں اب بھی موجود ہیں اور میں نے خود دیکھی ہیں۔

بعض گھروں میں بیرونی دروازے بہت ضخیم اور صدا دار ہوتے تھے، جن کو کھولتے ہی فوراً یہ دروازے اپنی جگہ پر لوٹ کر بھاری آواز پیدا کرتے تھے اور اندر کسی کے آنے کی خبر ہو جاتی تھی[1]

باقی جیسا کہ عرض کیا گیا، خانقاہوں، مدرسوں، مقبروں، روضہ جات اور مسجدوں کی تعمیرات کا اسلوب کشمیری ہی رہا۔ حالانکہ تیموری دور میں دینِ اسلام کو وسعت دینے کے سلسلے میں اس دین کی تعمیراتی علامتوں کو عظمت بخشنے اور خوبصورت بنانے کے بارے میں تمام تر کوششیں صرف کی گئیں چنانچہ سارے ایران اور وسطِ ایشیا میں ابھی بھی اس دور کی مسجدوں کی تزئین کاری اور تعمیر کی عظمت اور مدرسوں کی ساخت کا اسلامی علوم کے ساتھ تناسب کا لحاظ، دیکھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔

سنگتراشی، دھات سازی اور کوزہ سازی میں چونکہ بیشتر حیوانوں اور قدیم آدمیوں کی صورتیں بنانا پڑتی تھیں، اس لیے یہ تینوں فن، اسلامی دور میں یہاں ترقی نہ کر پائے۔

قالین بافی کی تاریخ ایران میں بہت قدیم ہے۔ شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری کے بعد سے یہ فن کشمیریوں نے بھی اختیار کیا اور اس میں انھوں نے ایران کے اساتذہ کی راہنمائی اور اسے خود ایران اور وسطِ ایشیا کے اساتذہ سے ان ممالک میں جا کر سیکھ لینے کے نتیجے میں اس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ شکارگاہ، مناظرِ طبیعت، عمر خیام کی رباعیات کی تجسیم، کشمیری مناظرِ قدرت، مختلف رنگوں کی تصویریں، نیلے رنگ میں سبز زمردی رنگ میں، مستی اور زردی مائل رنگوں میں، ہمارے کشمیر کے قالین باف ہنرمندوں کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں، ہمارے یہاں یہ پیشہ بہت استوار ہے اور کشمیر کے قالین باف بڑی محنت اور ذہانت کے ساتھ قالین بافی کے فن میں جدتیں پیدا کرنے میں اتنی شہرت

---

[1] شیراز کے جس کوچے میں شیخ سعدی شیرازیؒ کا مکان منسوب ہے اُسے میں نے دیکھا ہے۔ اس مکان کا دروازہ کوچے میں ہے جس پر کشمیری طرز کا لکڑی کا کلون (دتوَر) لگا ہے اس کو کھول کر اندر پھر ایک دروازہ ہے جو بالکل یہی دروازہ ہے جسے میں نے آواز پیدا کرنے والا لکھا ہے اور جسے کشمیری میں ٹھس دروازہ کہتے ہیں کشمیر میں قدیم گھرانوں میں اب بھی باقی ہیں۔

پا چکے ہیں کہ الحمد للہ ایران کے بعد دنیا کا بہترین قالین باف شہر ہمارا کشمیر ہی ہے اور کوئی دوسرا ملک نہیں ہے، ہمارے قالین باف ریشمی اور اونی قالین بناتے ہیں اور مسجدوں کے لیے مصلّی طریقے کے قالیچے، بادشاہوں کے محلّات کے لیے، راہروؤں کے لیے، کمروں کے لیے، خیموں میں بچھانے کیلئے اور کمرے کی دیواروں کی زینت کیلئے بڑے بڑے قالین بناتے ہیں، اور غیر ملکوں میں برآمد کرتے ہیں۔

تانبے سونے اور چاندی پر کندہ کاری اور نقاشی میں بھی وسط ایشیائی اور ایرانی اثرات کے نتیجے میں کشمیری فنکاروں نے کمال فن کا مظاہرہ کیا اور اسے معزز پیشہ کے طور پر اپنا لیا۔ آج بھی ہمارے کشمیر میں اس فن کے متعلقہ فنکار اور ہنر مند کندن گر، نقش گر، حکّاک اور مہر کُن کہلاتے ہیں۔ کندہ کاری، اور نقش گری کے حیران کن نمونہ جات اگرچہ اب عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، لیکن ابھی بھی کشمیری گھرانوں میں نقشدار سماواروں طشتوں آفتابوں، آبخوروں، مجموں، سونے اور چاندی کے زیورات میں یہ تعجب آمیز نمونے موجود ہیں۔ آبخوروں اور آفتابوں اور سماواروں میں فارسی کے اشعار بھی کندہ کروائے جاتے تھے، آج بھی یہ ہنر باقی ہے۔[1]

شیشہ گری اور میناکاری، مرصّع کاری اور کاشی کاری (ٹائل بنانے کا فنّ) کے فن کو کشمیر میں عروج نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سارے فن محض چند ثروت مندوں کے مصرف میں آنے کی وجہ سے بہت گراں قیمت تھے اس لیے ان کو ترقی نہیں ہوئی۔

گھریلو استعمال کے لیے حمّام کی تعمیر موسمی مجبوری کیلئے وجود میں آئی، لیکن حمام سازی کا شوق عام نہیں تھا صرف ثروت مند لوگ ہی گھروں میں حمام بنواتے تھے اور اس کے ساتھ ہی

---

[1] سینکڑوں برس سے اِن پیشوں کے اختیار کرنے والے ان ہی پیشوں کے نام سے جانے جاتے ہیں اور ان کی اصیل خانوادگی کے نام اب ان ہی پیشوں نے لیے ہیں مثلاً غلام محمد قالین باف، علی محمد جلد گر، غلام حسن حکّاک، محمد حسین مُہر کن، خواجہ محمد امین کندنگر، غلام نبی نقش گر، غلام محمد چیت ساز، غلام محمد شانہ ساز، غلام محمد روشن گر، علی محمد زرگر غلام محمد علاقہ بند وغیرہ۔

جامہ خانہ بھی بنتا تھا جہاں ذاتی لباس بدل کر پہنا کرتے تھے۔ لیکن عام لوگوں کے استعمال کے لیے محلّہ میں الگ تعمیر کی حیثیت میں یا مسجد کے ملحق ایک آدھ حمام ضرور بنتا تھا جس میں عام لوگ سردیوں کے ایام میں جاکر گرم پانی سے نہاتے تھے۔ اسکا ایک الگ حصّہ عورتوں کیلئے بھی مخصوص ہوتا تھا[1] نمایاں ترین اثر ایرانیوں اور وسط ایشیائی مبلّغوں اور بعد کے مہاجرین کے توسّط سے ہماری زبان اور ہمارے ادب پر پڑا۔ دراصل فارسی زبان کے اثرات حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح کی تشریف آوری سے پہلے ہی کشمیر میں ظاہر تھے اور یہ شمالی ہندوستان میں غزنوی (ترکی) حکومت کے قایم ہونے کی وجہ سے آمد و رفت کے نتیجے میں کشمیر میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی گئی اور بعض لغات کشمیری زبان میں شامل ہوگئیں۔[2]

لیکن سیّد شرف الدّین بلبل شاہ رح اور اُن کے رفقا مبلّغین کی جماعت کی آمد کے زمانے سے فارسی زبان سُرعت سے پھیلنے لگی چنانچہ جب حضرت شاہ ہمدان رح اور اُن کے ساتھی مجاہدین راہِ الٰہی کشمیر میں وارد ہوئے تو فارسی زبان کی اشاعت معمولی ادراک کی حد تک ہوچکی تھی اور گویا قدرت نے اِس طرح دینِ اسلام کی تشہیر کے لیے ذریعہ زبان کی بنیاد پہلے سے ہی فراہم کردی تھی۔[3] ایشیا میں کشمیر ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں اسلام کی تبلیغ فارسی زبان

---

[1] تاجکستان کے دیہات میں اب بھی اس طرح کے حمام استعمال میں ہیں اور میں نے ورزآب نامی گاؤں میں جو ایک خوبصورت صحت افزا مقام بھی ہے یہ حمام خود دیکھا ہے۔

[2] مثلاً دیبیر اور گنجور، سنسکرت میں جو کشمیریوں کی زبان تھی۔ ملاحظہ ہو ترجمہ راج ترنگنی۔

[3] جب حضرت شاہ ہمدان رح کشمیر میں تشریف لائے تو سلطان قطب الدین شہمیری نے انکی ایک منقبت فارسی میں لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

جانم فدای ہر قدم خاک تو بادا یا امیر — رُوحم فدای بر شرف نام تو بادا یا امیر
از آمدنت مشرف اسلام گشتہ خلقِ کشمیر — چشمم فدائی بر آمدن تو بادا یا امیر
خواہم کہ روز حشر شفاعت مرا کنی — ہر چہار عنصر فدائی امرِ تو بادا یا امیر
قطبی اگرچہ کرد گناہان ز حد و عار — آخر مرا نصیب شفاعت تو بادا یا امیر

میں ہوئی۔ اس طرح سے گویا حضرت شاہ ہمدانؒ نہ صرف ایران سے ہمارے لیے نیا دین لیکر آئے بلکہ اپنے مُلک کے اوّلین سفیر کی حیثیت سے وہاں کی زبان اور وہاں کا ادب بھی ساتھ لائے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) اس کے علاوہ بقول مصنف واقعاتِ کشمیر سلطانِ موصوف شاعر بھی تھا اور قطبؔ تخلّص کرتا تھا، اس کی یہ فارسی غزل واقعاتِ کشمیر میں درج ہے:

ای بگردِ شمعِ رویت عالمی پروانہ ای
وز لبِ شیرینِ تو شوریست در ہر خانہ ای
من بہ چندین آشنائی میخورم خونِ جگر
آشنا را حالِ این است وای بر بیگانہ ای
قطبِ مسکین گر گناہی میکند عیبش مکن
عیب نہ بود گر گناہی میکند دیوانہ ای

(ملاحظہ ہو واقعاتِ کشمیر صفحہ ۳۵) (تاریخ حسن میں یہ غزل سلطان زین العابدین کے نام سے منسوب ہے۔ اور ان دو اشعار کے اضافہ کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

ماہِ من گرمی توانی رحم کن بر بے دلان
کز تو ماند این حکایت در جہان افسانہ ای
گشتہ ام دیوانہ و جائی ندارد خانہ ام
شب بہ کوے یار باشم روز در ویرانہ ای

(ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۶)

اگرچہ سلطان صدر الدین رینچن شاہ (سنہ ۷۲۵ھ) کے زمانے سے حضرت شاہ ہمدانؒ کی تشریف آوری (سال ۷۸۱ھ) کے زمانے تک کی فارسی زبان اور فارسی ادب کی کیفیت ہم پر روشن نہیں، لیکن مقامی تاریخوں میں بعض سلاطین کی تاریخ وفات جو پختہ ذہنوں کے نتائج ہیں فارسی زبان کے مضبوط سے مضبوط تر ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ چند نمونے ملاحظہ ہوں " رینچن شاہ کے مشرف بہ اسلام ہونے پر: طلوعِ آفتاب بر دین احمدی (سنہ ۷۲۶ھ) سُلطان شمس الدین شہمیری کی وفات۔ آمدہ شمس باز زیر سحاب (۷۴۳ھ) سلطان علاء الدین کی وفات: بہرِ تاریخ وفات سلطان۔ ہاتفی گفت: "مکانش فردوس" (سنہ ۷۶۱ھ)۔ سلطان شہاب الدین کا تختِ شاہی پر جلوس: ہاتفِ غیب بہرِ سال جلوس گفت: بر گو شہنشہ نامی۔ (سنہ ۷۶۱ھ) سلطان شہاب الدین کی وفات: ز دربار کشمیر چون رخت بست، شہاب و دگر قطب جایش نشست (سنہ ۷۸۰ھ) سلطان قطب الدین شہمیری کی تخت نشینی (باقی آگے صفحہ پر)

آپ کے ساتھی مبلغین جو وادی بھر میں تبلیغ دین کے لیے پھیلتے گئے زبان و ادب کو بھی پھیلاتے رہے۔ بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور ادب کی جڑیں خاک کشمیر کے اندر اس مضبوطی کے ساتھ پیوست ہوئیں کہ کشمیر دوسرا ایران بن گیا اور یہاں کی خاک نے مسلمانوں اور برہمنوں میں وہ فارسی موّرخ، نثر نویس اور شاعر پیدا کیے جن کا فارسی دنیا کے ادب میں لازوال حصّہ ہے اور جنہوں نے فارسی زبان و ادب کو ترقی دے کر فارسی ادبیات اور فارسی زبان کی تاریخ میں کشمیر کو ایران کے پہلو میں لاکر رکھ دیا۔

مورّخین میں تاریخ کشمیر کے سیّد علی، تاریخ کشمیر کے قاضی ابراہیم (یہ تاریخ اب ناپید ہے) تاریخ کشمیر کے حسن بیگ خاکی، تاریخ کشمیر کے خلیل مرجانپوری، تاریخ کشمیر (منتخب التّواریخ) کے نرائن کول عاجز، مجموعۂ تواریخ کشمیر کے بیربل کاچرو، بہارستان شاہی کے نامعلوم مؤلّف۔ واقعات کشمیر کے خواجہ اعظم دیدہ مری، تاریخ کشمیر کے حیدر ملک (چاڈورہ) تاریخ کبیر کے غلام محی الدین مسکین، وقایع کشمیر کے ملّا احمد کشمیری، نظام الوقایع کے ملّا محمد نظام الدین، تاریخ کشمیر کے مولوی ہدایت اللہ متّو، تاریخ شاہان کشمیر (یا شاہنامہ) کے مؤلّفین (ملّا توفیق، سامی، راجح، متین، حسن، نوید اور شایق)

(بقیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) قطب برخاست زروی کشمیر۔ از سر جاہ سکندر بنشست (۷۹۶ھ) یا: شاہ عادل سکندرِ ثانی۔ کہ ازو بیافت سرفرازی تاج، ملک روشن بنور شرع ازوست۔ گرچہ بودہ زظلم چون شبِ داج، بہر تاریخ سالِ سلطنتش۔ عقل گفتا۔ بہ شرع دادہ رواج (۷۹۶ھ) یا شیخ محمد سرائی جو بقول مؤلّف واقعاتِ کشمیر "از صلحای و بلغای وقت بود" کا حضرت شاہ ہمدانؒ کے وصال پر یہ قطعۂ تاریخ: مفخرِ عارفان شہِ ہمدان، کز دمش باغ معرفت بشکفت۔ مظہر نور حق کہ رویش را۔ عاقبت از جہانیان بنہفت: عقل تاریخ سالِ رحلتِ او۔ سیّد ما علی ثانی گفت۔ (۷۸۶ھ) (ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد دوم صفحات ۱۶۶ تا ۱۷۷۔ واقعاتِ کشمیر صفحہ ۳۷)

باغِ سلیمان (تاریخ) کے میر سعد اللہ شاہ آبادی، وجیز التواریخ کے ملا عبد النبی، تاریخ ہادی کے محمد حیات، گلزارِ کشمیر اور گلاب نامہ کے مؤلف دیوان کرپا رام، وغیرہ، تذکرہ نگاروں میں واقعاتِ کشمیر کے خواجہ اعظم دیدمری (واقعاتِ کشمیر تاریخ کے علاوہ ایک فارسی تذکرہ بھی ہے) اسرار الابرار کے بابا داؤد مشکواتی، فتحاتِ کبرویہ کے عبد الوہاب نوری، فتوحاتِ قادریہ کے محمد حسین قادری منطقی، خوارق السالکین کے احمد ابن صبور، تذکرۃ العارفین کے بابا علی رینہ، تذکرۂ اولیائے کشمیر (یعنی تاریخ حسن کی تیسری جلد) کے غلام حسن شاہ کھویہامی، تصوف اور منطق اور مختصر تاریخی واقعات پر لکھی گئی کتابوں کے مؤلفین میں، تحقیقاتِ امیری کے امیر الدین پکھلی وال، لب التواریخ کے بہار الدین خوشنویس، اشجار الخلد، ثمرۃ الاشجار شرح کبریت احمر، فوائد الرضا، فراقنامہ کے خواجہ اعظم دیدمری، تحفۃ الاحباب کے نامعلوم مؤلف، دستور السالکین کے بابا داؤد خاکی، ہدایت المخلصین کے میر بابا حیدر تلملی، راحت الطالبین کے خواجہ حسن قاری، رسالہ تصوف کے خواجہ حبی کشمیریؒ کے مشہور نام اُن سیکڑوں ادیبوں کے علاوہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ فارسی شاعروں میں جو نام آور شاعر ارضِ کشمیر سے اُٹھے، ان میں سید محمد امین منطقی آویسؒ، اعظم دیدمری، اکمل بدخشی، توفیق کشمیری، بلبل کشمیری، (ملا اشرف) حمید اللہ شاہ آبادی، خاکی کشمیری (بابا داؤد) حبی کشمیری (خواجہ حبیب اللہ نوشہری) جویا کشمیری، گویا کشمیری، صرفی کشمیری (حضرت ایشان شیخ یعقوبؒ) مشتاق کشمیری، غنی کشمیری، طغرائی کشمیری، (مشہدی) علوی کشمیری، فصیحی کشمیری، مقبل کشمیری، شعری کشمیری، (محمد حسن) واصل کشمیری، طاہر علوی کشمیری، ملا محسن فانی کشمیری، محمد اسلم سالم کشمیری، ملا ساطع کشمیری، اُن سیکڑوں شاعروں کے سوا ہیں جن کی فہرست درج کرنا یہاں باعثِ تطویل کلام ہو گی[1]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: تذکرۂ شعرائے کشمیر۔ از حسام الدین راشدی (پانچ جلد) اقبال اکاڈمی کراچی پاکستان اکتوبر ۱۹۶۷ء۔ نیز فارسی تذکرے قلمی موجود در کتاب خانہ ہای خدا بخش لائبریری پٹنہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، رضا لائبریری رامپور، اورینٹل لائبریری ٹونک، ریسرچ لائبریری کشمیر، کلچرل اکاڈمی کشمیر، اور آرکاویز حکومت کشمیر۔

مقامی بادشاہوں کی حوصلہ افزائی، قدردانی، ایرانی ادیبوں، شاعروں، تاجروں اور فنکاروں کی کشمیر میں آمد اور کشمیری شاعروں، عالموں، فاضلوں، ادیبوں اور تاجروں کی ایران میں آمد و رفت، سیاسی، اقتصادی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی روابط کی قدامت اور احیاء و تجدید کے نتیجے میں جو اثرات ہماری زبان اور ہمارے ادبیات پر حاوی ہو گئے، اس کی تکمیل کا سلسلہ افغان دورِ حکومت کے آخر تک قایم رہا (سنہ ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۹ء) اگرچہ ڈوگرہ دور (۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۵ء) تا ۱۳۶۷، ۱۹۴۷ء) کے ابتدائی ۵۰ برس تک فارسی کا چلن رہا لیکن اس کا ادبی زوال سال ۱۸۱۹ء سے شروع ہوا، بہرحال فارسی زبان و ادب نے اسقدر حیرت انگیز طور پر ہماری زبان اور ادب کو زیرِ اثر کر لیا کہ گویا فارسی زبان و ادب کے بغیر ہماری نہ کوئی اپنی زبان تھی اور نہ کوئی ادب۔

ہماری کشمیری زبان میں تقریباً اٹھاون فیصد بلکہ ساٹھ فیصد تک الفاظ فارسی ہیں جنہیں ہم روزمرہ اور ادبی زبان میں استعمال کرتے ہیں اور جو ہماری زبان کا جزو لاینفک بن چکے ہیں، اس کے علاوہ ہم مناسب موقع و محل پر فارسی ضرب الامثال اور محاورات بعینہٖ اسی طرح استعمال کرتے ہیں، جس طرح سے ایران اور وسط ایشیا میں استعمال ہوتے ہیں[1]

مثال کے طور پر یہ چند ضرب الامثال اور محاورات جنہیں کشمیری اکثر گفتگو اور مناسب مواقع پر استعمال کرتے ہیں: ٥ آب آمد تیمم برخاست ٥ آب ندیدن موزہ

---

[1] باسواد اور بے سواد دونوں یکساں طور پر ان ضرب الامثال اور محاورات کو مناسب محل پر استعمال کرتے ہیں، فارسی الفاظ کی فہرست تو بڑی ضخیم جلدوں میں مکمل ہو گی لیکن کشمیری زبان میں فارسی الفاظ" کی فہرست کا تحقیقی سلسلہ میں نے کشمیر یونیورسٹی کے فارسی شعبہ کے سالانہ ادبی اور تحقیقی فارسی مجلہ دانش (جو میری سرپرستی میں بحیثیت صدر شعبۂ فارسی پابندی کے ساتھ چھپتا اور شائع ہوتا رہا) میں شروع کیا جو حروفِ تہجی کے لحاظ سے حرف "س" تک چھپ چکا ہے، امید ہے یہ سلسلہ آخر تک قایم رہے گا۔ اس عنوان کے تحت میں نے ضرب الامثال کا بھی ذکر کیا ہے۔

کشیدن • آب چو از سر گذشت یک نیزه و هزار نیزه برابر است • آفتاب آمد دلیل آفتاب •
• آفتابِ کوهی • آنچه شیران را کند روباه مزاج، احتیاج است احتیاج است احتیاج •
• آواز سگان کم نکند رزق گدا را • از حلوه گفتن دهان شیرین نمی شود • اسپ تازی
اگر ضعیف بود، همچنان از طویلهٔ خر به • افسرده دل افسرده کند انجمنی را • اگر بینی که نابینا
و چاه است، اگر خاموش بنشینی گناه است • آن را که حساب پاک است از محاسبه چه باک •
• انگشت بدندان • انگشت بدهان • اوّل طعام آخر طعام • بارِ گردن • ببین تفاوتِ راه از کجاست تا بکجا
• به دریا در منافع بیشمار است، اگر خواهی سلامت بر کنار است • بزرگی بعقل است
نه به سال • پا به رکاب • پای گدا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست • پسر نوح
با بدان بنشست، خاندان نبوتش گم شد، سگِ اصحاب کهف روزی چند، پی نیکان گرفت
و مردم شد • تا تبر بالا شود کنده کند آسایش • ترسم نرسی بکعبه ای اعرابی، این ره که
تو میروی بترکستان است • بخت اگر یاری کند، شیرِ فلک زاری کند، بخت اگر برگردد
اسپ تازی خر گردد • تو بخیر ما به سلامت • جواب ابلهان باشد خموشی • جو فروش
گندم نما • جوینده یابنده • جهان دیده بسیار گوید دروغ • چاه کن را چاه در
پیش • چشمِ ما روشن دل ما شاد • چنان قحط سالی شد اندر دمشق، که یاران فراموش
کردند عشق • چون پیر شدی حافظ از میکده بیرون شو • چون قضا آید طبیب ابله شود۔
• حاجت مشاطه نیست روی دل آرام را • حق به حقدار می رسد • خدا نخواسته • خدا
شری برانگیزد که در آن خیر ما باشد • خشت اوّل چون نهد معمار کج، تا ثریا میرود دیوار
کج • خوشتر آن باشد که سرِ دلبران، گفته آید در حدیثِ دیگران • دروغ گو حافظه
ندارد • دنیا به امید قایم • دوست آن باشد که گیرد دست دوست در پریشان حالی و
درماندگی • دیوار موش دارد و موش هم گوش دارد • دیوانه بکارِ خود هوشیار۔
• ذرّه ای حکومت به از تودهٔ اشرفی • رسیده بود بلائی ولی بخیر گذشت • روبرو
نشستن به از پهلو نشستن • زبانِ خلق نقارهٔ خدا • رهِ راست برو اگرچه
دور است[له] • زیره بکرمان بردن • زیر نگین • زمین جنبد نجنبد گل محمد،

(له اگلے صفحہ پر)

● زمانه سازه ● زمانه سازی ● سالی که نکوست از بهارش پیداست ● سگِ زرد
برادر شغال ● شتر پیر شد و شاشیدن نیاموخت ● صلاح مملکت خویش خسروان دانند ●
● صحبتِ صالح ترا صالح کند، صحبتِ طالح ترا طالح کند ● طمع را سه حرف است و هر سه
تهی ● طوقِ لعنت ● عاقل را اشاره کافی است ● عمرِ نوح ● فرصت غنیمت ● فیلش
بیاد هندوستان افتاد ● قدرِ زر زرگر بداند، قدرِ جوهر جوهری ● قدرِ عافیت کسی داند
که به مصیبتی گرفتار آید ● قلم گفتا که من شاهِ جهانم ● تو کار زمین را نکو ساختی که با آسمان[۲]
نیز بپرداختی ● کاسب حبیب الله ● کند هم جنس با هم جنس پرواز، کبوتر با کبوتر باز با باز
● کس نگوید که دوغِ من ترش است ● گزشت آنچه گزشت ● گرگ باران دیده ●
● گنج قارون ● گندم از گندم بروید جو ز جو ● از مکافاتِ عمل غافل مشو ● لیلی را به چشمِ
مجنون باید دید ● ما هنوز اندر خمِ یک کوچه ایم ● مرا بخیر و ترا بسلامت ● مدّعی سُست
گواه چُست ● مردِ میدان ● میانِ عاشق و معشوق رمزیست ● کرام الکاتبین را هم
خبر نیست ● نقصان مایه و شماتت همسایه ● نمک حلال ● نمک حرام ● نویسنده داند
که در نامه چیست ● گویم مشکل وگرنه گویم مشکل ● نه هر زن زن است و نه هر مرد مرد،
● خدا پنج انگشت یکسان نه کرد ● نیم حکیم خطرهٔ جان ● نیم ملّا خطرهٔ ایمان ● نیم نانی گر
خورد مردِ خدای، بذلِ درویشان کند نیمی دگر، هفت اقلیم ار بگیرد پادشاه، همچنان،
در بند اقلیمی دگر ● هر جا گل است، آنجا خار است ● هر چه از دوست میرسد نیکوست
● اگر حنظل خوری از دستِ خوشخوی، به از شیرینی از دستِ ترشروی ● هر چه بادا باد۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۱ے اس کے ساتھ کشمیر میں دوسرا مصرعہ بھی استعمال ہوتا ہے: زنِ بیوہ مکن اگرچہ حور است، بعض کہتے ہیں۔ زنِ پیوہ مکن اگرچہ حُور است (زنِ پیوہ کے معنی مجھ پر مجہول رہے ہیں کیونکہ پیوہ کے معنی پید اور جانور اور اُس کیڑے کے ہیں جو کپڑوں کو خراب کر دیتا ہے ممکن ہے کہ پیہ با ہو یعنی چربی والا، چربی والی۔ واللہ اعلم۔

[۲] ۲ے بعضوں کی زبانی سُنا: قاز با قاز ـ

ہر چہ باد اباد، کشتی در آب انداختیم ● ہر چہ در کان نمک رفت نمک شد ● ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسی ● ہر کسی را بہر کاری ساختند ● ہر کمالی را زوالی ● ہفت شہر عشق را عطّار گشت، ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم ● ہم خرما ہم ثواب ● ہنوز دہلی دور است ● یادش بخیر ● یار زندہ صحبت باقی ● یار بد بدتر از مار بد ● یار غار ● یک جان دو قالب ● یک بام و دو ہوا ● یک انار و صد بیمار ● یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور۔

یہ میں نے سیکڑوں ضرب الامثال و محاورات میں سے چند ایک بطور نمونہ پیش کیے۔ ان کے علاوہ آج بھی ہمارے نکاح نامے اور دعوتی رقعہ جات فارسی زبان میں ہی چھپتے ہیں[1]

ابھی بیس سال پہلے تک سرکاری عدالتوں سے جو سمّن جاری ہوتے تھے وہ فارسی زبان میں ہی ہوا کرتے تھے اور محکمۂ مال میں رجسٹریوں کے اندراجات فارسی عنوان کے تحت ابھی بھی موجود ہیں۔

ہماری مسجدوں اور خانقاہوں میں نعتیں اور منقبتیں اکثر و بیشتر فارسی کی ہی مقبول ہیں اور ان ہی کو ہم اونچی آواز میں پڑھا کرتے ہیں۔ مولانا جامی کی نعتیں جو سالہا سال سے کشمیر میں مقبول ہیں لوگوں کو حفظ ہیں اور سبھی انہیں عاجزی و انکساری اور ذوق و شوق کے ساتھ مسجدوں کے علاوہ خود اپنے گھروں میں مجالس میلاد میں پڑھتے ہیں اور میلاد خوانوں سے بھی پڑھواتے ہیں۔ مولانا نامیؒ کی یہ نعتیں:

(۱) تو جان پاکی سر بسرنی آب و خاک ای نازنین
(۲) اے واضح والضحیٰ جبینت
(۳) یا رسولِ ہاشمیؐ یادا فدایت جانِ من!
(۴) وصلی اللہ علیٰ نورٍ کزو شد نورہا پیدا ؛ (۵) گر بہ بینم رُخِ زیبائے رسولِ عربیؐ

---

[1] نکاح نامے ابھی بھی خوشنویسوں سے فارسی میں لکھواتے ہیں اور کتب فروشوں کے پاس چھپے ہوئے نکاحنامے اور دعوتی رقعے بھی (فارسی میں) فروخت کے لیے میسّر ہیں۔

(۶) جہان روشن است از جمالِ محمدؐ　　(۷) کی بود یارب کہ رو در طیبہ و بطحا کنم
(۸) اے دل و دیدہ خاک نعلینت　　(۹) ز مہجوری بر آمد جانِ عالم
(۱۰) تنم فرسودہ جان پارہ ز ہجران یا رسول اللہؐ　　(۱۱) عارض است این یا قمر یا لالۂ حمرا است این
(۱۲) یا من بدا جمالک فی کل ما بدا　　(۱۳) روحی فداک ای صنمِ ابطحی لقب
(۱۴) یا شفیع المذنبین[1] بار گنہ آوردہ ام　　(۱۵) اَحِنُّ شوقًا الیٰ دیارٍ لَقیتُ فیہا جمالَ سلمیٰ

امیر خسروؔ کی یہ نعت : خط سبز و لب لعل و رُخِ زیبا داری

اور　　:　　ای چہرۂ زیبای تو رشکِ بُتانِ آذری

قدسیؔ کی یہ نعت ؎ مرحبا سیّدِ مکّی مَدَنِیُ العربیؐ
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ المتخلّص بہ معینی سے منسوب یہ نعت :

در جان چو کرد منزلِ جانانِ ما محمدؐ !

حضرت امام زین العابدینؓ کی یہ نعت عربی زبان میں ؎

اِنْ نِلْتُ یَا رِیحَ الصّبا یَوْمًا اِلیٰ اَرْضِ الْحَرَم :: بَلِّغ سلامی رَوضۃً فیہا النبی المحترم

یا عربی زبان میں فریاد : یا حبیب الالٰہ خذ بیدی، مالعجزی سواک مستندی

یہ تمام نعتیں کسی نہ کسی وقت دن میں نماز کی ادائیگی کے بعد درود و صلوٰۃ کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں اور جیسا میں نے بیان کیا ان نعتوں میں سے اکثر نعتیں کشمیر کے مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ یہ فارسی نعتیں غیر کشمیری عاشقانِ رسولؐ کی ہیں۔ ہمارے فارسی گو مقامی عاشقانِ رسولؐ کے نعتوں کا تو شمار ہی نہیں۔ مثلاً حضرت مولانا شیخ یعقوب صرفیؒ کشمیری کی یہ نعتیں :

---

[1] بعض مسجدوں میں یا الٰہ العالمین سننے میں آیا ہے، یہ نعت شریف مولانا جامیؒ نے روضۂ نبویؐ پر حاضر ہونے کے وقت دربارِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کی تھی، یہ نعت سات بندوں پر مشتمل ہے جس میں ایک بند یہ ہے کہ "یا شفیع المذنبین بار گناہ آوردہ ام۔

۱۔ افتتاح الکلام بسم اللہ ۲۔ دل بندۂ محمدؐ و آلِ محمدؐ است
۳۔ دلبرم ہاشمی و مُطّلبی و قرشی ۴۔ گفتی حدیثم آمدہ جان بخش چون مسیح
۵۔ مبارک بسر سیّاحی کہ پوید وادی صحرا

ملاّ احمد بیچھاڑہ کی یہ نعت : سیّدا روی والضحیٰ داری، موی واللّیل اذا سجیٰ داری

خواجہ محمد اعظم اعظم کی یہ نعت : دیدہ جای تو یا رسول اللہؐ، جان فدای تو یا رسول اللہ

بینوا کی یہ نعتیں : ۱۔ اے شہِ دو جہانؐ سلام علیک :: خاتم مرسلاںؐ سلام علیک
۲۔ ای رسولِ خداؐ سلام علیک :: شاہِ ہر دو سراؐ سلام علیک
۳۔ پردہ بردار یا رسول اللہؐ :: بہرِ دیدار یا رسول اللہؐ
۴۔ ای رخت دلکشا زبدر دُجیٰ ::
۵۔ مرحبا اے پیک باد صبحدم

جنید کی یہ نعتیں : ۱۔ دل مقام تو یا رسول اللہؐ :: جان غلام تو یا رسول اللہؐ
۲۔ دین قرآن تو یا رسول اللہؐ :: دُر بیان تو یا رسول اللہؐ

عبید کی یہ نعتیں : ۱۔ جانِ من باد فدایت یا رسولؐ ::
۲۔ اے ز انبیا ربودہ بکنت بنی سبق
۳۔ مدح تو نیست طاقتِ ہر ناطقِ فصیح

اِن کے علاوہ بیشمار اور فارسی نعتیں ہیں جو مجالسِ حال و قال میں پڑھی جاتی ہیں[1]

---

[1] بعض فارسی نعتوں کے درمیان اُسی رَدیف و قافیہ میں کشمیری شعر سمائے گئے ہیں جن سے تاثیر دوگنی ہوگئی ہے، مثلاً یہ فارسی نعت محمد حسن شعری کی: وقت آن شد کہ جلوہ فرمائی، باغ دلہای ما بزیبائی۔ چہ شود گر نقاب بکشائی، بیدلان را جمال بنمائی۔ عاشقان را نظارہ ای بخشی، خستگان را دمی بنخشائی جانِ ما را بہ چہرہ شاد کنی، دل ما را بہ غمزہ بربائی :: در دوِ چشمم بجز تو بینائی، لیس یا سیّدی و مولائی :: غیر از تو کسی نمی دانم، کہ تو مقصود و ملجائی مائی۔ دآدی لد اَمتی چھ خستہ گنتھ :: اشفعُ یا سیّدی و مولائی :: چون کتی ناخن شفاعت تیز، گرہ از کار بستہ کشائی۔ سوی مجلس اَنو دماہ تشریف :: اُمتس چانہ عشقہ زیبائی ::

مثال کے طور پر پیش کی گیئں اِن چند فارسی نعتوں کے علاوہ بزرگانِ دین کی مدح میں جو منقبتیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور مسجدوں میں ان حضراتِ عالیہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے عرس شریف کے ایام متبرکہ میں بالخصوص خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں ان کی چند مثالیں یہ ہیں :

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مدح میں:

بآلِ پاک و ده یارِ میشّر، که باشد مقتدا بعد از پیمبرؐ، امیر المومنین صدیقِ اکبرؓ

حضرت فاروق اعظمؓ کی مدح میں :

پس از صدّیقِ اکبرؓ بود ای دل، امام برحق و مقبولِ کامل، امیر المومنین فاروقِؓ عادل

حضرت عثمان ذوالنّورینؓ کی مدح میں:

پس از شیخین امام اہلِ عرفان، بمہر و مکرمت دریای احسان، امیر المومنیں عثمانِؓ عفّان

حضرت علی مرتضیٰؓ کی مدح میں :

مرتضیٰ ابرجِ ولایت رامہ، مرتضیٰ ملک ہدایت راشہ، کرم اللہ تعالیٰ وجہہ

اِن چاروں یارانِ رسولؐ کی اکٹھی مدح :

مصطفیٰ ماہ و صحابہ انجم ، ہمہ پُر لولوی لالا قلزم
شافع جنّ و پری و مردم ، کرده در راهِ خدا خود را گُم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت امام حسنؓ کی مدح میں :

کیست مہر سپہر عزّ و علا ، حسن آن نور دیدۂ زہراؓ

حضرت امام حسینؓ کی مدح میں :

پرده بردار یا امام حسینؓ ، بہر دیدار یا امام حسینؓ

یا

شاه شہیدانِ رضا شہزادۂ کونین حسینؓ
محبوبِ محبوبِ خدا شہزادۂ کونین حسینؓ

حضرت غوث الاعظمؒ کی شان میں :

مددی ای شہِ بغداد خدارا مددی ⁘ مطلعِ مہرِ کرم حضرت غوث الثقلین
بیکس و بی یاورم یا غوث الاعظم المدد ⁘ غم زدل سر زده سر حلقۂ پیران مددی ⁘
غوث الاعظم بہ منِ بے سر و سامان مددی ⁘ سرتاجِ پیران پیر مین سلطان عبدالقادر است ⁘

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں :

خلفِ خواجۂ بطحاست علی ثانی ⁘ عصیانِ من شد بے عدد ⁘
یا شاہِ ہمدانؒ المدد ⁘ عاصی و مجرم و گنہگارم ⁘

حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی شان میں :

حبذا آن خواجۂ ہمت بلند ⁘ مصدرِ خیرِ اتم خواجہ بہاء الدین است

حضرت خواجہ اسحاق ختلانیؒ کی شان میں منقبت :

مخزنِ رازہای پنہانی ، معدنِ فیض ہای پنہانی
جانشینِ امیر ہمدانی خواجہ اسحٰق شاہِ ختلانی

حضرت خواجہ بہاء الدین گنج بخش کشمیری کی شان میں :

ای دلت گنجی ز اسرارِ اُحد گنج فیضت عام بر ہر نیک و بد
گنج بخشیِ تو بی حد و عدد المدد یا قطبِ عالم المدد

حضرت نور الدین علمدارِ کشمیرؒ کی شان میں :

با جرمِ کثیر رو سیاہی بر درگہِ چون تو پادشاہی
این نالہ ہمی زنند باآہی یا حضرتِ شیخ یک نگاہی

حضرت سیّد حسن بلادر رومیؒ کی شان میں :

بے نوا و مضطرم یا حضرتِ سیّد حسن بیکس و بے یاورم یا حضرتِ سیّد حسن

حضرت امیر سیّد احمد کرمانیؒ کی شان میں :

مصدرِ فیضِ فضل و ربّانی مظہرِ لطف و جودِ سبحانی
کیست ؟ بشنو اگر نمی دانی سیّدِ احمد امیر کرمانی

حضرت محبوب العالم سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رح کی شان میں :

غریب و مستمند و خستہ حالم ؛
نظر یا حضرت محبوب العالم

فارسی زبان و ادب کے ساتھ باوجود اس کے حتمی زوال کے حضرت شاہ ہمدان رح اور اُن کے مبلّغ رفقاء کی بنیاد گزاری کے زمانے سے افغان دورِ حکومت کے اختتام تک جس زور و شور کے ساتھ کشمیر میں اس کی ترقی ہوئی اس کے پیشِ نظر گو اب یہ اپنے جوش و خروش سے اُتر آئی ہے لیکن دلچسپی کسی حد تک ابھی بھی باقی ہے، اس دور میں فارسی زبان کے بڑے کہنہ مشق اور صاحبِ اسلوب شاعر گزرے[1] اور آج بھی کشمیر میں ایسے لوگ موجود ہیں جو فارسی میں شعر کہتے ہیں لیکن وہ خود کو پردۂ اخفا میں ہی رکھنا پسند کرتے ہیں۔ فارسی زبان و ادب سے دلچسپی قائم رکھتے ہیں کشمیری مسلمان بچّے اب بھی ٹڈل اسکول کے درجے سے یونیورسٹی کے تحقیقی درجوں تک فارسی پڑھتے ہیں اور اپنی مقدور بھر تحقیق سے کام لیتے ہیں۔[2]

---

[1] زِنتی پورہ کے مرحوم سیّد شمس الدین غمگینؔ اور محلہ پائدان نوہٹّہ سرینگر کے مرحوم سیّد شمس الدین حیرتؔ کاملی اور محلہ خانقاہ معلّیٰ کے سید مبارک شاہ فطرتؔ بڑے ہی اچھّے اور صاحبِ اسلوب فارسی شاعر تھے جو قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے، غمگینؔ اور فطرتؔ دونوں سے میری ملاقات رہی ہے، لیکن حیرتؔ سے میری ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ ابھی حال ہی میں فطرتؔ کا انتقال ہوا اور میں ان کے جنازے میں شامل تھا، پچاسی ۸۵ سال سے زائد عمر پائی تھی۔ اللہ تینوں حضرات کی مغفرت کرے! آمین۔

[2] کشمیر یونیورسٹی میں ایم' اے کے بعد فارسی میں ایم فل اور پی، ایچ، ڈی بھی ہوتی ہے، صدر شعبہ اور پروفیسر کی حیثیت میں میری راہنمائی میں کئی لیکچراروں اور طلبا و طالبات نے ایم فل اور پی، ایچ ڈی حاصل کی۔ کشمیر کا جو فارسی زبان و ادب میں ضخیم حصّہ ہے اسکے پیشِ نظر میں نے (۱) کشمیری دَور میں فارسی زبان و ادب (۲) چک دور میں فارسی زبان و ادب (۳) مغلیہ دور میں فارسی زبان و ادب (دو حصّوں میں) (۴) افغان (باقی آگے)

فنونِ لطیفہ میں کشمیر کی موسیقی بھی بے حد متاثر ہوئی۔ ہمارے کشمیر میں رائج سازوں میں

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) دور میں فارسی زبان و ادب (۵) سکھ دور میں فارسی زبان و ادب۔ اور (۶) ڈوگرہ عہد میں فارسی زبان و ادب پر ایم فل اور پی، ایچ ڈی کے لیے مقالات لکھوائے اور اس کے علاوہ فارسی مثنوی کا ارتقاء کشمیر میں، کشمیر میں فارسی تاریخ نویسی اور انفرادی فارسی شاعروں مثلاً صرفی کشمیریؒ اور حبّی کشمیریؒ پر پی ایچ ڈی کے سلسلے میں میری راہنمائی میں کام ہوا۔ بعض اہم تذکروں پر بھی کام ہوا جن میں باباعلی رینہؒ کا تذکرۃ العارفین بڑا اہم ہے، اس کے علاوہ جدید فارسی شاعروں مثلاً فروغ فرخزاد اور فریدون توللی پر ایم فل ڈگری کے حصول تک کی سطح پر کام ہوا ہے، اس وقت میری رہنمائی میں کشمیر میں فارسی تذکرہ نویسی اور کشمیر اور تصوّف اسلامی اور فریدون توللی پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد کے فارسی ادب پر بھی ایم فل کی ڈگری کے حصول تک کی سطح تک میری راہنمائی میں تحقیقی کام ہوا ہے۔ اور شعبہ میں تحقیقی کام کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ شعبہ میں جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے فارسی زبان میں دانش کے نام سے ایک علمی اور تحقیقی اور ادبی رسالہ میری راہنمائی میں شائع ہوا ہے جس کے سالانہ شمارے برابر نکلتے رہتے ہیں۔

پچھلے سال صدر شعبہ کی حیثیت سے میں نے حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی تھی جس میں حضرت شاہ ہمدانؒ پر فارسی اور اُردو زبانوں میں مقالے پڑھے گئے اور کشمیر کے چیف منسٹر نے میری تجویز پر کشمیر یونیورسٹی میں شاہ ہمدان کرسی قایم کرنے کا اعلان کیا اور یہ کرسی انشاءاللہ ایک انسٹی ٹیوٹ میں بدل جائے گی اور حکومت کشمیر کی طرف سے اس سلسلے میں مالی اخراجات کی منظوری بھی، یونیورسٹی کے حق میں دی جا چکی ہے۔ اسکے علاوہ میری ذاتی مساعی اور فارسی زبان و ادب کے ساتھ بے نظیر دل چسپی اور بے لوث خدمت کیے جانے کے نتیجے میں میں نے شعبۂ فارسی میں خانۂ ایران نئی دلّی کی طرف سے غنی کشمیری گولڈ میڈل اور ایک مخیّر کشمیری علی شاہ کی طرف سے (بقیہ آگے صفحہ پر)

ایرانی سازوں اور آوازوں اور نغموں کا اس قدر اضافہ ہوا کہ کشمیر کی اصیل موسیقی میں ہم پابندی کے ساتھ صرف ایک ہی باقی ماندہ صنف یعنی چھکری سنتے آئے ہیں۔

ایران میں قدما اس بات پر اعتقاد رکھتے تھے کہ حکماء نے بارہ برجوں کی بنیاد پر بارہ مقامات اصول و ارکان موسیقی کے لیے وضع کر لیے تھے یعنی : راست، اصفہان عراق، کوچک، بزرگ، حجاز، بوسلیک، عشّاق، حُسینی، زنگولہ، نوا، رہاوی۔

فن موسیقی کے بعض علماء نے ان بارہ اصلی مقامات کو چوبیس شعبوں میں (ہر مقام کو دو شعبوں) تقسیم کیا ہے :

زاولی۔ اوج۔ ماہور۔ عشیران۔ نوروز خارا، نوروز صبا۔ پنجگاہ۔ مبرقع۔ راہوی۔ مغلوب۔ نیشابور، نیریز۔ رہاب۔ بیاتی۔ ہمایون۔ سہ گاہ۔ حصار۔ محیر۔ دوگاہ۔ عزال۔ نوروز عرب۔ نوروز عجم۔ چہارگاہ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) سلطان العارفین گولڈ میڈل دائر کروائے جو بالترتیب ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ اور ایم فل میں فرسٹ کلاس طالب علم کو ہر سال دیئے جاتے ہیں شعبۂ فارسی میں میری ذاتی مساعی سے ایک ایسا کتاب خانہ قائم ہو گیا ہے، جس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ ایک رنگین ٹیلیویژن اور ویڈیو کاسٹ بھی میں نے ایرانی سفیر سے ہدیہ کے طور پر شعبۂ فارسی کے لیے حاصل کیا، جس سے طلبہ و اساتذہ اور محققین فارسی فلموں سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ سال ۱۹۵۲ء سے گورنمنٹ کالجوں میں فارسی پڑھانے کے بعد میں سال ۱۹۶۳ء سے سال ۱۹۸۹ء کے اگست مہینے کی آخری تاریخ یعنی ۳۱ اگست تک فارسی زبان و ادب پڑھانے کے بعد کشمیر یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہوا ہوں۔ گویا مجموعی طور پر میں نے ۳۸ سال تک (بشمول سال ۱۹۵۲ء) فارسی زبان و ادب کی خدمت کی اور اس عرصے میں میں نے سارے وسط ایشیا، ایران، روس، اور امریکہ و لنڈن کی یونیورسٹیوں میں جانے، استفادہ کرنے اور فارسی زبان و ادب سے متعلق تقریریں کرنے اور تحقیقی مقالات لکھنے کا مفید کام کیا۔ الحمد للہ! مرادم بود نقشی باز ماند :: کہ ہستی را نمی دیدم بقائی :: کہ تا صاحبدلی روزی بہ رحمت :: کند بر شمس الدین احمد دعائی ::

قدمار نے ہر ایک درجہ اور دائرہ کا ایک نام رکھ لیا جو آج بھی رائج ہیں :
پگاہ ، نیم ہیاتی ، نیم حصار ، عشیران ۔ نیم عجم ، عراق ، نیم ماہور ، راست ، زنگولہ ، راہوی ، دوگاہ ، نہاوند ، سہ گاہ ۔ بوسلیک ، چہار گاہ ، صبا ، عزال ، نوا ۔

لیکن ایران میں ذیل میں درج بارہ مقام زیادہ معروف رہے ۔
عشاق ، نوا ، بوسلیک ، راست ، عراق ، اصفہان ، زیرافکند ، بزرگ ، زنگولہ ، رہاوی ، حسینی اور حجازی ۔

سسٹم یا دستگاہ معمولاً کئی جنسوں سے ترکیب پاتے ہیں اور ان کی حدیں ایک یا دو دور تک ہوتی ہیں ۔ ایران میں دستگاہوں کی تعداد میں اختلاف رہا ہے اور ان کی تعداد نو یا سات یا پانچ جانی جاتی ہے ۔ بعض بیاتِ اصفہان اور ہمایوں کو ایک ہی مانتے ہیں اور بعض ماہور اور راست پنجگاہ کو ایک ۔ ضمناً اصطلاح میں بھی اختلاف اور تبدیلیاں موجود ہیں ۔ مثلاً حسینی کو شورِ نہفت اور عشاق کو ماہور ہی کہتے ہیں ۔ اکثر موسیقی کے فن پر لکھی گئی کتابوں کے مطابق موسیقی میں بارہ اصلی مقامات ، چوبیس شعبے ، سات دور ، سات دستان ، تئیس لحن اور ترلیسٹھ گوشے رائج رہے اور مندرجہ ذیل سات دستگاہ :-

ماہور ، ہمایون ، چہار گاہ ، شور ، سہ گاہ ۔ نوا ، اور راست پنجگاہ ،
ان دستگاہوں کا طریقۂ اجرا معمول کے مطابق یوں ہے :

پہلے دستگاہ کے تعارف کے طور پر موسیقی بجتی ہے اور اس کے بعد چہار مضراب ، جو ایک شیریں آواز اور ضربی آواز اور دستگاہ کے آغاز کے لیے ایک طرح کی مشق اور ساز کا پوری طرح چاق ہونے کے لیے اطمینان کرنے کا طریق کار ہوتا ہے ، کا اجراء ہوتا ہے ، اس کے بعد گانا ہوتا ہے ۔ اور تمام گوشوں کو بجانے کے بعد ، جن کا دستگاہ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے ، گیت ، جو زیادہ تیز حرکت اور انتقال کا محتاج ہوتا ہے ، گاتے بجاتے ہیں اور آخر میں رنگ پر پہنچا جاتا ہے جو ایک پُر مسّرت ، موزون ، ضربی اور حرکت و رقص کا موجد ہوتا ہے اور نغمہ نواز کی مہارت

اور آہنگ ساز کے محسوس کیے جانے والے سوز کے ایجاد سے سننے والے مجذوب و بیخود ہو کے رہ جاتے ہیں۔

ہماری موسیقی مندرجہ بالا مقامات اور دستگاہوں سے غالب اور نمایاں طور پر متاثر ہوئی۔ اور ایک خاص صنف جسے ہم صوفیانہ کلام کی موسیقی اور نغمہ گری سے جانتے ہیں سینکڑوں برسوں سے صوفیانہ اور درویشانہ حال و قال کی مجلسوں کی زینت رہی۔ اس موسیقی میں مختلف مقاموں میں جن کا اوپر ذکر ہوا، ہمارے موسیقی دان اور موسیقی شناس کشمیری فنکاروں نے نام پیدا کیا اور اس طرح سے اس فن کو زندہ رکھا۔ صوفیانہ کلام میں جسے میں روحانی موسیقی سے تعبیر کرتا ہوں، مختلف تالوں میں بیشترِ فارسی غزلیں یا قطعات و رباعیات گائی جاتی ہیں مثلاً:

مولانا جامی کی یہ غزل:

طرف باغ و لب جوی و لب جام است این جا ؞ حُسنِ خویش از رُوی خوبان آشکارا کردہ ای ؞
عارض است این یا قمر یا لالۂ حمر است این ؞ (دو یک تال میں)

سلطان قطب الدین شہمیری کی یہ غزل:

ای بگرد شمع رویت عالمی پروانہ ای ؞

خواجہ حافظ شیرازی:

ساقیا برخیز در دہ جام را ؞ بلبلی برگ گلی خوش رنگ در منقار داشت ؞
دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ؞

شمس تبریزی: عزم آن دارم کہ مہمانت کنم ؞

مولانا جامی کی یہ غزل: نرگس اندر باغ حیران از نگاہ چشم تو (راستہ تال فارسی میں)

گر آن بیوفا عہدِ یاری شکست ؞

مولانا جامی کی یہ غزل: تو جان پاکی سربسر نی آب و خاک ای نازنین
(مقام نوا، شعبۂ نوروز خارا)

قدسی کی یہ غزل : دارم دلی امّا چہ دل صد گونہ حرمان در بغل
(مقام تلنگ راگنی ہندول دسہ تال فارسی)

احمد جامی کی یہ غزل : امروز شاہ شاہان مہمان شدہ است مارا
خواجہ حافظؔ شیرازی کی یہ غزل :

عیشم مدام است از لعل دلخواہ (مقام حصار)
دلدار گفتا بکنیتی گفتم دُعا گوی شما (غزل منسوب بہ حافظؔ)

مولانا جامی کی یہ غزل ؎ چشم نرگس در سحر بر روئے گل دیدن گرفت
(مقام اصفہان شعبۂ زنگولہ)

مثال کے طور پر اوپر بیان شدہ اِن چند نمونوں کے علاوہ بطور نمونہ یہ فارسی قطعات بھی صوفیانہ موسیقی میں شامل ہیں اور مجلسوں میں گائے جاتے ہیں :

۱۔ آمدی جلوہ کنان با سرو پاساز دگر ؛ غمزہ با نازِ دگر عشوہ باانداز دگر
ہر شب از شوق تو چون شمع شبستان دارم ؛ گریہ با چشمِ دگر نالہ باآوازِ دگر
(مقام بہیاس راگنی ہندول)

۲۔ بگلشن سعی دارد باغبان دیوار بستن را ؛ ازین غافل کہ گل در پیش دارد بار بستن را
ندادی جانِ شیرین از پئی سنگین دلان ہرگز ؛ اگر فرہاد می دانست نقش کار بستن را
(دو یک فارسی)

۳۔ من عاجزم من عاجزم تو عاجزان را یاوری ؛ من بیکسم من بیکسم تو بیکسان را یاوری
اوّل توی آخر توی ظاہر توی باطن توئی ؛ آنجا توی اینجا توی ہر کس تو داری داوری
من در بلا گشتم بسی دستم نمی گیرد کسی ؛ من گمرہم من گمرہم تو گمرہان را رہبری
(دو یک فارسی)

۴۔ در جوانی حاصل عمرم بنادانی گزشت ؛ آنچہ باقی ماندہ بود در پریشانی گزشت
خدایا تخم نیکی من نکشتم در جہان ؛ نوبت پیری رسید و وقت دہقانی گزشت
(دو یک فارسی)

٥۔ چشم مستی عجبی زلفِ درازی عجبی ؞ می پرستی عجبی فتنہ طرازی عجبی
جان و دل با سرِ زلفِ تو پیامی دارد ؞ گفتگوی عجبی راز و نیازی عجبی
از ازل تا بابد مرغ دل افتد بہ سجود ؞ طاقِ ابروِ عجبی خستہ نوازی عجبی
بو العجب حسن و جمال و خط و خال و گیسو ؞ سرو قدی عجبی قامت نازی عجبی
بہر قتلم چو کشد تیغ شوم سر بہ سجود ؞ او بہ نازی عجبی من بہ نیازی عجبی
(مقام نیریز شعبۂ بزرگ)

٦۔ خود جلوہ کردی در جہان خود بودہ ای خود بودہ ای
ہم آشکارا و ہم نہان خود بودہ ای خود بودہ ای
گہ در لباس دلبری گہ عاشقِ چشمِ تری
انسان گہی گاہی پری خود بودہ ای خود بودہ ای
(مقام سہ گاہ شعبۂ حجاز)

٧۔ دل بُرد زمن فتنہ گری عشوہ نمائی ؞ زرّین کلہی کج کمری تنگ قبائی
او خندہ زنان میگذرد بیخبر از من ؞ من گریہ کنان می کنم از دور نگاہی
(مقام مبرقع شعبۂ راست)

٨۔ خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است ؞ چون کوی دوست ہست بصحرا چہ حاجت است
ای پادشاہِ حسن خدا را بسوختیم ؞ گاہی نگفتہ ای کہ گدا را چہ حاجت است
اربابِ حاجتیم زبانِ سوالِ چیست ؞ در حضرتِ کریم تقاضا چہ حاجت است
(یک فارسی)

٩۔ گرچہ من لیلیٰ لباسم دل چو مجنون بینواست ؞ سر بصحرا می زدم لیکن حیا زنجیرِ پاست
عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ ؞ پختہ مغزانِ جنون را کی حیا زنجیرِ پاست
(دو یک فارسی)

١٠۔ دلبر چو طبیب آمد رنجور چرا باشم ؞ ساقی چو حبیب آمد مخمور چرا باشم
آن خسرو شیرین لب بے کام ذ زبان گویا ؞ خود گفت کہ نزدیکم من دور چرا باشم

آن ابن یمین بر دل چوں طور تجلی کرد ؞ با این دل صد پارہ چون طور چرا باشم

(سہ تال کشمیری)

۱۱۔ مدہ پندم کہ من در سینہ سودای دگر دارم ؞ زبان خلق در گفتار دل جائی دگر دارم
طبیبا خویش را زحمت مدہ من بہ نخواہم شد ؞ کہ من اندر سر شوریدہ سودائی دگر دارم

(دُوبیکِ فارسی)

۱۲۔ خلعتِ ناز بغیر از تو کرا می زیبد ؞ خط ترا خال ترا حُسن ترا می زیبد
گر کنم نالہ و فریاد دل آزردہ مشو ؞ بر درِ اہلِ کرم شورِ گدا می زیبد

(مقام اساوری)

۱۳۔ ای عفو تو از خطای ما بیش ؞ لُطفِ تو ز التجای ما بیش
خوان نعم و نوال جودت ؞ زاندازۂ اشتہایِ ما بیش
انعامِ نوازشِ تو ای شاہ ؞ از حوصلۂ گدائی ما بیش

(فارسی مخیرُ)

۱۴۔ ای دل ز جاہ و مال و زر بگذر ز جانان یاد کن ؞ در خدمتِ سلطان مرو درگاہِ سُبحان کُن
بر ملک و دولت دل منہ قایم نہ شد بر ہیچکس ؞ اسکندر و نوشیروان جمشید و دارا یاد کن
۱۵۔ آموخت مارا آن زلف و گردن ؞ زنار بستن بُت سجدہ کردن
آن تارِ گیسو بر گردنِ او ؞ ہر کس کہ بیند خونش بہ گردن

متذکرہ فارسی مقامات و شعبہ جات سے مملو کشمیری روحانی موسیقی بہ اصطلاح صوفیانہ کلام، دراصل تزکیۂ نفس اور شفقت و مہربانی اور انسان دوستی اور عبادتِ خداوندی کے احساسات کو رواج دینے اور ان کو طبع انسانی میں برانگیختہ کرنے کے مقصد سے تشکیل پایا ہے۔ یہ روحانی موسیقی جو بیشتر، جیسا کہ اوپر کے فارسی غزلیات و قطعات کے نمونوں سے ظاہر ہے، تیموری دور میں عام تھی اور اس کے بعد سے رفتہ رفتہ ہماری موسیقی پر حاوی ہوئی[1] اور کشمیر میں تصوف

---

[1] غالباً چھکری ہماری موسیقی کی اصیل نوع ہے۔ اس میں ایک گروہ چھ یا پانچ آدمیوں کا (بقیہ آگے صفحہ پر)

اور تصوف سے مربوط مختلف مکاتیب کے مرشدانِ راہِ حق کی راہنمائی میں تشکیل پانے کے نتیجے میں یہی موسیقی کشمیر میں تدریجاً مقبول رہی کیونکہ کشیدہ اور طولانی آوازوں کو پسند کیا گیا نیز چونکہ یہ موسیقی اللہ اور اُس کے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف و ستایش اور حضرت رسول کی ذاتِ اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک روحانی عشق کا وسیلہ ہے اس لیے صوفیانہ اور درویشانہ مجلسوں میں باوقار، پختہ اور شریف و ملہم الحان کے ساتھ اسکی مقبولیت عام ہوگئی۔ لے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہوتا ہے اور ایک رباب، ایک سارنگی، ایک مٹی کا گھڑا، یا دو سارنگیاں یا تین سارنگیاں (جو افراد کی تعداد پر منحصر ہے) ساز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ایک استاد یا رہنما ہوتا ہے جو غزل شروع کرتا ہے اور باقی اُس کے پیچھے اُس کی اقتدا کرتے ہیں۔ ساز بجا بجا کر۔ چھکری میں صرف کشمیری گانے خوش الحانی سے گائے بجائے جاتے ہیں۔ ایک اور نوع تھی بچہ نغمہ کے نام سے جو، اب ناپید ہے۔ چھکری میں ایک خوبصورت بچے کو جس کے بال عموماً لمبے ہوتے تھے، رقاص کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، وہ بھی گاتا تھا، اور رقص بھی کرتا تھا۔ رقص کے وقت وہ کمر سے نیچے تک ایک خوشنما رنگ دار پیشواز کی طرح کا لباس پہنتا تھا اور کمر سے اوپر ایک مخمل، اطلس یا زربفت کی صدری (واسکٹ) پہنتا تھا۔ بچے کا رقص دراصل کشمیری عورتوں کے رقاصہ کی حیثیت میں مہیا ہونے اور ان کی عدم موجودگی کا بدل تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ سو سال قبل چند ایک مشہور نسوانی رقاصائیں تھیں جو ایک خاص تربیت کے تحت خاص مجلسوں میں ہی بڑے مؤدب و مہذب اور منظم ماحول میں رقص کرتی اور گاتی تھیں اور یہ حافظہ کہلاتی تھیں۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) لے ایران میں ہماری موجودہ کشمیری ایرانی روحانی موسیقی یا صوفیانہ کلام کا اب کہیں کوئی وجود نہیں۔ دراصل ایران کے مخصوص جغرافیائی اور سیاسی حالات کے پیشِ نظر اُن کی قدیم تمدنی روایات ان میں اب ناپید ہیں اور ان ایرانی روایات کو جن سے ہم متاثر ہیں ہمنے وفاداری کے ساتھ محفوظ رکھ لیا ہے۔ میرے کئی ایرانی دوست اپنے قدیم تمدن کی (باقی اگلے صفحے پر)

لیکن کشمیری زبان میں صوفیانہ اور درویشانہ غزلیات مہیّا ہونے کی وجہ سے جو ہمارے کشمیری بزرگانِ دین اور صوفی شعراء کے نتائجِ قلب کی پیداوار ہیں ہماری صوفیانہ موسیقی (روحانی موسیقی) کے اساتذہ مقامی یا ہندی موسیقی کے راگوں اور آوازوں سے بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے فارسی کلام کے ساتھ ساتھ صوفیانہ کشمیری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کلاسیکی موسیقی یا کشمیری ایرانی رُوحانی موسیقی یا صوفیانہ کلام کو بعض مجلسوں میں سنکر نہ صرف یہ کہ حیران ہو گئے بلکہ زرخیز اسلامی دُور کی اس میراث کی محرومی پر کفِ افسوس ملتے رہے۔ اب وہاں طولانی آوازوں کا استعمال نوحہ خوانی اور عزاداری کی مجلسوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎۱ ہندوستانی اصطلاح میں لحن اور آواز کو سُر کہتے ہیں۔ سُروں کی تعداد سات ہے۔ کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھا۔ سرگم ان ہی سات کو مجموعاً کہتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے نزدیک راگ کُل چھ ہیں اور ہر راگ کے ساتھ پانچ راگنیاں مربوط ہیں: بھیروں، مالکوس، ہندول، سرب راگ، میگھ راگ، دیپک، چھ راگوں کے نام ہیں۔ ہر راگ کی راگنیوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے لیکن اساتذہ کے نزدیک اب جو ثابت ہے وہ یوں ہے۔

بھیرُوں کی راگنیاں: بھیروی، راگ کلی، کوجری، کھت، گندھار، ساوری۔

مالکوس کی راگنیاں: باگیسری، توڑی، دیسی، سوہا، تکھری، ملتانی۔

ہندول کی راگنیاں: پوریا، بسنت، للت، پنچم، دھناسری، ماروا۔

سرب راگ کی راگنیاں: گوری، پوربی، گورا، تردن، مالسری، جیت سری۔

میگھ راگ کی راگنیاں: تذتات، گوند، سدا سارنگ، بدھنس، ساونت، سورتھ۔

دیپک کی راگنیاں: چھابانت، ہمیر، کلیان، گدارا، بھاگ، ایمن

بھیرویں کی راگنیوں کو بعضوں نے یوں تقسیم کیا ہے۔ اوّل بھیرویں۔ اسے سرورت میں صبح کے وقت گاتے ہیں، دوم بیراری، اس کا وقت سرورت میں دن کا آخر ہوتا ہے، سوم تذتات، اسے سرورت میں دن کے اوّل حصّے میں گاتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کلام بھی فارسی اور ہندی راگوں اور مقامات میں گانا شروع کر دیا، چنانچہ اکثر و بیشتر جب روحانی موسیقی یا صوفیانہ کلام میں فارسی غزل گائی جاتی ہے تو اس غزل کا اختتام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور بعضوں کے نزدیک دن کے درمیان میں۔ چہارم سندھوی، اسے سرورت میں دن کے اواخر میں گاتے ہیں، پنجم اسگال۔ اسے بھی سرورت میں دن کے اواخر میں گاتے ہیں۔

مالکوس کی راگنیاں: اوّل توڑی، اسے سرورت میں دن کا ایک پہر چڑھنے کے بعد گایا جاتا ہے۔ دوم، گوری۔ اسے سرورت میں دن کے اواخر میں گایا جاتا ہے۔ سوم کنگلی یا کنگری۔ اسے سرورت میں صبح کے وقت گاتے ہیں۔ چہارم، گھنپاوتی، اسے سرورت میں نصف رات کے بعد گاتے ہیں۔ پنجم: کوکب۔ اسے سرورت میں آخر شب میں گاتے ہیں۔

ہنڈول کی راگنیاں: اوّل رام کری یا رام کلی، بسنت رُت میں صبح کے وقت گایا جاتا ہے۔ دوم، دیساکھ۔ اسے بسنت رُت میں دن کے شروعات میں گاتے ہیں۔ سوم، للت، اسے بسنت رُت میں صبح کے وقت گاتے ہیں۔ چہارم، بلاول یا برادری اور اسے بسنت رُت میں دن کے اوائل میں گاتے ہیں۔ پنجم: بیت منجری: اسے بسنت رُت میں نصف شب میں گایا جاتا ہے۔

دیپک کی راگنیاں: اوّل دیسی، اسے گریکھم رُت میں دن کے دوسرے پہر میں گاتے ہیں۔ دوم، کامود، اسے گریکھم رت میں رات کے دوسرے حصّے میں گاتے ہیں۔ سوم نٹ، اسے گریکھم رُت میں دن کے اواخر میں گاتے ہیں، چہارم: کیدار، اسے گریکھم رُت میں نصف رات میں گاتے ہیں۔ پنجم، کاتھر، اسے گریکھم رُت میں رات کے اوّل حصّے میں گایا جاتا ہے۔

سرب راگ کی راگنیاں: اوّل، مالسری، اسے ہم رُت میں دن کے تیسرے پہر گاتے ہیں۔ دوم، ماروا: اسے ہم رُت میں دن کے اواخر میں گایا جاتا ہے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

عموماً کشمیری غزل کے دو ایک شعروں پر ہندی راگ یا مقام پر ہوتا ہے۔[1]

ایرانی موسیقی شناسوں کی طرح ہماری صوفیانہ موسیقی یا صوفیانہ کلام یا روحانی موسیقی کے اساتذہ بھی ایرانی روحانی موسیقاروں کی اقتدا میں معیّن اوقات میں ہی مختلف مقامات کو گاتے تھے اور جواب اس فن شریف میں بس چند ایک کشمیری استاد ہی باقی رہ گئے ہیں وہ اس قدیم ورثے میں ملی ہوئی روایات کے پابند ہیں۔ رہآوی کو صبح سے طلوع آفتاب

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) سوم دھن سری، اسے ہم رُت دن میں کے اواخر میں گاتے ہیں، چہارم، بسنت، اسے بسنت کے دنوں میں نصف دن کے وقت گاتے ہیں، پنجم اساوری اسے دن کے ایک پہر چڑھ آنے پر گاتے ہیں۔ میگھ راگ کی راگنیاں: اول یانگ اسے برسات میں نصف رات میں گاتے ہیں۔ دوم، ملآر، اسے برسات میں نصف رات میں گاتے ہیں (اور اب اسے برسات میں ہر وقت گاتے ہیں) سوم گوجری، اسے برسات میں دل کے اوّل پہر میں گانے ہیں۔ چہارم بھوپالی، اسے برسات میں رات کے اول پہر میں گایا جاتا ہے۔ پنجم، دیسکار، اسے برسات میں رات کے اواخر اور دن کے اوائل میں گاتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] ہندی اور ایرانی مقامات میں کشمیر میں عام طور پر یہ مقامات رائج ہیں: چارگاہ، رام کلی، بہباس، بھیروی، دیوگندھارا، بلاول، عراق، نوروزِ صبا، توڑی، جھنجھوٹی، حسینی، سندھوری، اساوری، جرونتی، لاچاری، نوا، سارنگ، تلنگ، عشیران، نوروزِ عجم، زنگولہ، نوروزِ عرب۔ پہلوی، للت، دھناسری، شہنازہ، بہار، غزال، جنگلا، اوداسی، سیری، پوربی، کوری، سہ گاہ، کوہی، گھبری، کلیان، پنجگاہ۔ نٹ کلیان، راست کشمیری، ملہار، راست فارسی، نیریز، دیوگری، ادانہ، بھاگر، بھاگ، کانہرا، دوگاہ، کھمانچہ، بیات، رہاوی، سورٹ، سوہانی۔ پیرچ۔

تک، حسینی کو دن کا ایک پہر ڈھلنے تک، نیمروز عراق کو ظہر (دوپہر)، راست کو ظہر کے بعد، کوچک کو عصر، بوسلیک کو جب سورج زردی مائل ہوجائے، عشاق کو شام سے رات کے ایک پہر گذرنے تک، زنگولہ کو اس کے بعد، حجاز کو اس کے بعد، بزرگ کو نصف رات کے وقت، نوا کو نصف شب اور اصفہان کو رات کے آخر میں گاتے ہیں۔[1]

ایرانی سازوں کے نام جن کا ہمارے اصیل کشمیری سازوں میں اضافہ ہوا یہ ہیں:
اصول، دف، نَے، سورنا، (سورنے) تنبک (یا ڈُنبک) طبل، طنبور، رباب[2] چنگ، سنتور۔ سہ تار، دوتارہ[3] ساز، ویسے ایران اور وسط ایشیا میں جو ساز رائج تھے ان کی فہرست میں ذیل میں اس لیے درج کررہا ہوں کہ شاید کشمیر میں اسلامی دور کی موسیقی کے اوائل میں بعض ساز ان میں سے، علاوہ ان سازوں کے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، استعمال میں رہے ہوں۔

عود۔ بربط۔ مزہر، ارغنون، شاہین۔ چنگ، آصف، کنارہ، کوبہ، رود، سنج یا صنج۔ کوس، عربال، رباب۔ کبر، چنگرک، مغرفہ، مزمار، کران، کیثار یا قیثار، بوق، کرنای، سرنای، نَے، مصافق یا مصفقہ، طنبور، عیر، شبابہ، سفاقش، شیزان۔ صفارہ، طبل، ڈھل، عرطبہ، قصابہ، اصول، غوف۔ زنگ، درای۔

---

[1] بعض اساتذہ اس بات کے معتقد ہیں کہ رہاوی کو صبح سے طلوع آفتاب تک راست کو اوّل روز سے دن کے ایک پہر چڑھ آنے تک، نیمروز عراق کو ظہر، ظہر کے بعد بوسلیک، عشّاق کو سورج کے زردی مائل ہونے تک، اس کے بعد اصفہان اور آخر شب میں حسینی کو گاتے ہیں۔

[2] رباب کو کمانچہ بھی کہتے ہیں۔ رباب مراکشی رباب تیونیسی، رباب عراقی، رباب الجزائری، رباب مصری، رباب ترکی مشہور رباب ہیں۔ افغانستان کا رباب کشمیری رباب سے ملتا ہے۔ وسطِ ایشیا میں جو رباب میں نے دیکھے ہیں وہ بعینہ گویا کشمیری رباب تھے۔

[3] دوتارہ: دوتاروں کا سہ تار کی شکل کا ہوتا تھا، لیکن چھوٹا۔

فنجان ساز، جرس، کاسات، طاسات، چغانہ۔ نزل، چہار پارہ (چا لپارہ) دائرہ، شانہ، قدوم، دُنبک، یا دنبلک یا دُمبرک یا تنبک۔ سپید نای۔ نیچہ۔ نیشہ یا بیشہ۔ نی انبان۔ سیاہ نای، طوطک (توتک) موسیقار۔ شبپور۔ صفیر (سوت سوتک) قانون، سنتور نفیر، مشتہ چینی، ساز، کمانچہ۔ تار۔ یک تارہ۔ دوتار، سہ تار، چہار تار۔ شش تار، شش خانہ، ستای، چگور، دمامہ، گاودم۔ نقّارہ، روئین خُم، کنگرہ، جفت ساز، راست ساز، یک و نیم ساز۔ قوال۔ شیشک (شبزک) دودک، جلاجل، مربع ناقوس، قینارہ، قبز، شیشل، عنقا، تعلیم، دریچ۔ ابواللہو۔ رودخانی۔ شہرود (شاہرود) توغان۔ شدرغو یا شترغو، شلنگ، تختہ، اوزان، توپوز رُومی، روح افزای نی خُرد۔ طرب رُود۔ ششتای، ساز دولاب۔ یکتای نزنای، دہرود، مہری اگری، مغنی۔ نزہت۔ زنبورہ، غزک یا غجک۔ نی لیک، خرمہرہ، انغوزہ۔ نفارہ زنامی، شاخ، شاشتنہ، شعیرہ، نای شاہ۔ نای سرہنگ، نای شہریاری۔ نای محسن، نای منصور۔ نای بزم۔ نای ہفت بند یراع، خرنای، زمارہ، طبل مصری، طبل مخنثان یاکوبہ، طبل گردان۔ قاشقک۔ بورغو، کلاہ چینی۔ مثلث۔ زنگولہ۔ نای عراقی، نفیرہ، نقارۂ کوزناہ یا قصم، دبداب یا طبل المرکب، عرکل۔ طار، تنبال، بندیر، چوبک زن، روئین طاس، طبلک باز، سردم، دف، بلبان، جنجیق، نای داود، آئینہ پیل، مندل، گورکا، شندف، سباز فولاد، جام، ون، مستق۔ مقرعہ، خم مسین، پی پا۔ تحفۃ العود، پاترہ، باتوغن، چنگ دہنی، رموز، سنقاقس، سوریانی، غژ، عیر، کران، مدیلان، لعازیف، غیطہ، تنفیرہ، نبیرہ۔

کشمیر میں شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مجاہد مبلّغ رفقار کے زمانے سے ایران میں رائج دینِ اسلام، شرعی علوم اور ایرانی اور وسط ایشیائی تہذیب و تمدن کی جو بنیادیں اُن کی مساعی سے ڈالی گئیں اور مقامی بادشاہوں کی ذاتی سرپرستی حوصلہ افزائی، تیز ایران، وسط ایشیا اور کشمیر کے فنکاروں، ماہروں، تاجروں، شاعروں، ادیبوں، عالموں، دینی بزرگوں کی باہمی آمد و رفت کے نتیجے میں جو مختلف ادوار

میں ان کو فروغ ملا، ترقی ہوئی اور یہ جو بڑی عملی سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ افغان دور کے اختتام تک جاری رہی۔ اُن کا میں نے تقریباً ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے اور کسی حد تک یہ روشن کر دیا ہے کہ کس طرح کشمیر، وسط ایشیا، اور ایران کے دین اور تمدن اور تہذیب کے بڑے گہرے اثرات سے متاثر ہو کر ایک چھوٹے سے ایران میں تبدیل ہو گیا۔ یہ اثرات شاہ ہمدانؒ کے عہد سے آج تک کشمیر میں محسوس طریقے پر نمایاں ہیں، چونکہ اس کتاب کے تفصیلی انداز میں وسط ایشیائی اور ایرانی اثرات کو پیش کرنا خارج از عنوان ہے، لیکن پھر بھی آئندہ محققین کے لیے جو اس اہم تاریخی اور تمدنی موضوع پر تحقیقی کام کرنے کے شوقین ہوں، میں نے ایک معمولی سی کوشش کر کے بنیاد سی فراہم کر دی ہے جو یقیناً کسی نہ صورت میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے[1]

لیکن اس سے پہلے کہ میں ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات کے باب کو ختم کروں چند اور باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو کشمیر اور وسطِ ایشیا و ایران کے باہمی ربط و میل جول کے نتیجے میں بعض مشترک پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۔ ایران میں بعض پیشہ ور طبقوں میں غالباً تفریح کے طور پر ایک الٹی زبان کا کبھی گاہ بگاہ استعمال ہوتا ہے تا کہ کوئی اور انکے اسرار سے یا بات چیت سے واقف نہ ہونے پائیں[2] یہ زبان آج بھی تہران کے بعض قدیم خاندانوں کے لوگوں، خاص کر عورتوں میں خاص موقعوں پر بولی جاتی ہے۔

---

[1] میری اطلاعات کا مقصد البتہ شاہ ہمدانؒ کے عہد سے افغان دور کے اختتام تک ہی ہے یعنی سنہ ۷۸۵ھ سے ۱۲۶۲ھ تک جس عرصہ میں مختلف ادوار میں ایرانی اور وسط ایشیائی تمدن اور تہذیب کشمیر میں ہر پہلو سے اتنی سرائیت کر گئے کہ کشمیر ایرانِ صغیر بن گیا۔ البتہ اس کی بنیاد شاہ ہمدانؒ اور ان کے رفقائے کار کی آمد سے پڑی۔ جو زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مستحکم اور مضبوط ہوتی گئی۔

[2] اس غیر معمول کی زبان کو ایرانی زبان (فارسی) میں کُوتر یا کُوترا کہتے ہیں اور یہ وہ زبان ہے جس میں دو آدمی یوں آپس میں بات کریں گے، جسے تیسرا سمجھ نہ سکے۔ اسے زبانِ شکستہ بھی کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو فرہنگِ معین جلد ۳ صفحہ ۳۶۴۲ -

اور ایران کے کئی صوبوں میں بھی اس زبان کو کبھی کبھی استعمال میں لایا جاتا ہے اور پورے ایران میں زبانِ زرگری کے نام سے مشہور ہے، اس زبان کو بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ جیسا کہ مجھے ایران میں بعض دوستوں سے معلوم ہوا، مادری زبان کے درمیان میں بعض الفاظ میں ایک یا چند حروف کا اضافہ کیا جانا ہے مثلاً یہ کہ ز کے حرف کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اس طرح سے پیرہن کو پِزِیرِہ زِنُ یا سگ کو سَ زِگَ زُ یا دختر کو دُزِخ زِتَ زِرُ یا دوست کو دُوزِسُ زِت کہتے ہیں۔ یہ زبان ہمارے کشمیر کے بعض مخصوص پیشہ ور طبقوں مثلاً زرگروں، نجاروں، گلکاروں میں اب بھی رائج ہے اور اُلٹی زبان کہلاتی ہے۔ ایران میں مطربوں، ناٹک دکھانے والوں اور گانے بجانے کے پیشہ وروں میں بھی رائج تھی چنانچہ آج بھی وہاں دیہات میں ان پیشوں کے افراد اس زبان سے واقف ہیں۔

کشمیر میں زرگروں، نجاروں اور گلکاروں کے علاوہ نمدہ سازوں، جالکہ دوزوں، چکن دوزوں، زری اور کلابتون دوزوں میں بھی اس کا آپس میں کم کم رواج تھا۔ کشمیر میں اس زبان کا کوئی خاص طریقہ یا دستور ترکیب نہیں تھا، لیکن زَ اور گَ کے حروف کا جملوں کے بیچ میں لاکر بھی بولنے کا ایک طریقہ تھا۔ مثال کے طور پر اگر کشمیری میں یہ کہنا ہوتا کہ: "ژِ یہ کمۍ وۄنی یورُین؟" (یعنی تم سے یہاں آنے کو کس نے کہا) تو اُلٹی یا زرگری زبان میں کہتے کہ: "ژِ یرگ کَر کمۍ وَو رگونی یر گورُیرگن؟"

یا ایک اور طریقہ الفاظ کو معکوس یا اُلٹا کر بولنے کا تھا۔ مثلاً: پگاہ چھِہ ہوٹلس منز چائے" (یعنی، کل ہم ہوٹل میں چائے پئیں گے) اسے یوں کہتے: "گپاہ مچھو ٹوہلس منز یاچ"۔ گلکار اور نجاروں کی اُلٹی زبان کے چند نمونے:

لکڑی: کِسُر۔ آب: زَل۔ خریدار مل گیا: دَھنی زُڈیوے۔ عورت: وِہِنا نھ۔ گلکار: گجلُ۔ نجار: ژھنیر ھ۔ کام: پٹل۔ مزدور: گڈر۔ مچھلی: زَل کرٔ۔ گوشت: اَوج۔ شراب: زَل کھوچ۔ چرس: پکنیول کھوچ۔ چاول: رنگہٕ۔ پکے ہوئے چاول: زبہٕ۔ رس: زنیٹھ۔ دودھ: چھتہٕ۔

قہوہ ؛ ڈِہل ؛ تمباکو ؛ پَینٛٹوٗل ؛ ایک ؛ ہنٛٹوٗک ؛ دو ؛ وِہنگ۔ تین ؛ وُرٛن : چار ؛ سٔر ؛ کیا تم وہاں گئے تھے؟ ژٕہ زڈیو کیھٕ تور؟ ؛ کوئی بات چیت کی؟ ؛ نیاہ پَیاہ کرٕۂ نِتھ؟ کشمیر میں اس طرح کی زبان "پھرِہ گَتھ" کہلاتی ہے۔

۲۔ ایران اور کشمیر دونوں ملکوں میں شدید برف باری ہوتی ہے۔ جب موسم کی پہلی برفباری ہوتی ہے۔ تو ایران میں دوست احباب اظہارِ مسرت کے طور پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے اور اس سلسلے میں ایک رسم کے تحت ان کے گھر میں کسی نہ کسی بہانے سے دعوت کھاتے تھے، ایک رسم جو ہمارے یہاں کشمیر میں بھی آج سے تیس چالیس سال پہلے تک رائج تھی یہ تھی کہ جوں ہی جاڑے کی پہلی برفباری ہوتی تو ایک دوست اپنے دوسرے جگری دوست کو مندرجہ ذیل فارسی ادبیات کسی کے ہاتھ لفافہ میں گویا ایک خط کی صورت میں بند کر کے بھیج دیتا اور وہ بے خبری میں اس خط کو لے لیتا اور خط لیتے ہی گویا دعوت کھلانے کی شرط اس کے ذمہ ہو جاتی۔ ابیات معمولاً یہ ہوتے تھے۔

برف نو افتاد ؛ صد مبارکباد ؛ کوچہ ہا گِل شد ؛ دیدنِ روی یار مشکل شد ؛
برفِ نَو افتاد ؛ صد مبارکباد ؛ آنچہ شرط است ؛ زود باید داد ؛

اور چونکہ برفباری میں ہربہ کھلانے کا رواج عام تھا اس لیے کسی شدید برفباری کے روز وہ دوست جس کے ذمہ شرط عائد تھی تمام دوستوں کو اپنے گھر پر ہریسہ کھلاتا اور پھر اس کے بعد کشمیری نمکین چائے بھی پلاتا تھا۔ اب یہ رسم دیگر اور زرّین رسموں کے ساتھ مدفون ہوگئی ہے اور ایران میں بھی مفقود ہے۔

۳۔ مُرغ کے سینہ میں دو شاخوں والی ایک ہڈی ہے۔ ایران میں ایک رسم تھی دوست جب اس ہڈی کو مرغ سے نکال کر کھانے کے دسترخوان پر رکھ دیتے تو شرط یہ ہوتی کہ دونوں میں سے اس ہڈی کو اپنی طرف کھینچنے میں اگر کسی ایک دوست کے حصّے میں شاخ کا حصّہ مع اس ہڈی کی بنیادی حصّے کے آجائے تو وہ شرط جیت جاتا اور دوسرے دوست کے حصّے میں جو باقی دوسری شاخ کا معمولی سا حصّہ آجاتا وہ ہار جاتا اور اسے دعوت کھلانی پڑتی جس میں البتہ ایک پکوان مرغ کا ضرور ہوتا کشمیری

میں اسے کوہ کر، شرط کہتے تھے (یعنی مُرغ کھلانے کی شرط) ایران میں اِسے جناغ بستن یا جناغ شکستن کہتے ہیں[1]

ایک اور طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ جناغ کو اپنی طرف کھینچتے وقت دونوں کے ذہن میں شرط بندی ہوتی تھی اور ہڈی ٹوٹنے کے بعد جب ایک آدمی دوسرے کے ہاتھ میں کوئی چیز دیتا تو لازماً اُسے کہنا ہوتا تھا کہ : "مرا یاد است" (یعنی مجھے یاد ہے) اور اگر یہ جملہ نہ کہتا تو دوسرا فوراً کہہ دیتا ۔ "مرا یاد و تُرا فراموش" (یعنی، مجھے یاد ہے اور تو بھول گیا) اور اس جملے کو کہنے سے وہ شرط جیت جاتا ۔

۴۔ بعض ذاتی عادات میں ناس کا استعمال خاصا مشترک رہا ہے ۔ ناس کا استعمال اب بھی وسط ایشیا میں ہے[2] اور کشمیر میں اب بھی دیہات میں کہیں کہیں عورتوں اور مردوں میں اس کا استعمال ہے، سرینگر شہر میں ناس کا زیادہ تر استعمال پیرصاحبان کرتے تھے اور خوشنما چھوٹی شیشیوں یا گاہے، چاندی کے چھوٹے ڈبّوں میں رکھتے تھے اور ناک کی راہ سے اس زردی رنگ مائل گرد کو چڑھاتے تھے ۔ ناس کو دانتوں پر بھی ملتے تھے ۔

۵ ۔ غالباً ہمارے یہاں کشمیر میں جاڑوں کی سخت اور شدید سردی، برفباری اور یخبندی کی وجہ سے انفرادی حیثیت میں جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے مقامی وسیلہ حرارت، جو کانگری کے نام سے مشہور ہے، قدیم ایّام سے موجود ہے ۔ ہر کشمیری الاصل گھرانے میں آج بھی قدیم روایت کے تحفّظ میں ہر فرد کانگری کا استعمال کرتا ہے اور یہ مٹی کے ایک گول برتن کے باہر مختلف جھاڑیوں بالخصوص گلاب کی جھاڑیوں کی تیلیوں

---

[1] اصفہان میں ایک دعوت پر جناغ بندی کا یہ منظر میں نے خود دیکھا تھا ۔ یہ ایک خصوصی دعوت تھی جس میں مجھے اپنا میزبان دوست آقا رضا انجینئر اپنے ہمراہ لے گیا تھا :: جناغ کو جناق بھی کہتے ہیں ۔

[2] دوشنبہ یونیورسٹی میں (تاجکستان) میں نے طلبہ کو ناس استعمال کرتے دیکھا اور گویا یہ سگرٹ نوشی کا بدل تھا ۔ ناس ہمارے یہاں اُردو میں نسوار کہلاتی ہے اور تمباکو سے بنتی ہے وسط ایشیا میں ناس کو ناس ہی کہتے ہیں ۔ ناس فارسی لفظ ہے ::

سے پیشہ ور ماہرین کے ہاتھوں سے ایک خوشنما صورت میں بُنتی جاتی ہے اور اس مٹی کے برتن کو (جسے کشمیری میں کونڈل کہتے ہیں) درختوں کو جلا کر حاصل کیے ہوئے کوئلوں سے بھر کر اوپر چند انگارے ڈال دیئے جاتے ہیں اور پھر اسے پھیرن کے نیچے رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ اس انفرادی طریق حرارت کے استعمال کے علاوہ کشمیر میں ایران اور وسط ایشیا ہی کی طرح کبھی کرسی کا بھی استعمال رائج تھا، اور یہ گھر میں مجموعی وسیلۂ حرارت کا طریق کار تھا۔ کرسی[1] چار پایوں کا ایک لمبا سا تختہ ہے جو ایک میٹر یا اس سے زیادہ لمبائی کا لکڑی کا تختہ ہوتا ہے اور اس کے نیچے ایک بڑی سی انگیٹھی رکھ دی جاتی ہے جس میں دہکتے ہوئے انگارے ہوتے ہیں اور سخت جاڑے میں گھر کے لوگ ایک علیحدہ کمرے میں اس کرسی کے ارد گرد میٹرس ڈال کر اُن پر بیٹھ جاتے ہیں اور کرسی کے تختہ کے اوپر ارد گرد سبھی افراد خانہ لحاف گھٹنوں پر ڈال دیتے ہیں اور اس طرح سے اپنے جسم کو گرم رکھتے ہیں۔ ایرانی اور وسط ایشیائی دیہات میں تخت کے بغیر کمرے میں ایک گڑھا کھود کے رکھ دیتے ہیں اور جاڑوں میں اسی گڑھے میں دہکتے ہوئے انگارے ڈال کر چاروں طرف افرادِ خانہ لحاف اپنے گھٹنوں پر ڈال کر بدن کو گرم رکھتے ہیں اور بہار آنے پر اس گڑھے کو مٹی سے پھر بھر دیتے ہیں۔ کشمیر میں اس کے استعمال کی طرف غنیؒ کشمیری کا یہ شعر ایک صریح اشارہ ہے ؎

چو کرسی جای گرمی ہر کہ در خلوت سرا دارد ؛؛ نمی جنبد ز جا ہر چند آتش زیر پا دارد[2]

(یعنی، جس کسی کے گھر میں کرسی کی طرح کوئی گرم جگہ میسّر ہو، وہ اپنی جگہ سے ہلتا نہیں، ہر چند اس کے پاؤں تلے آگ بھی ہو۔ آتش زیر پا ایک محاورہ بھی ہے جسکے معنی اضطراب، بے چینی اور

---

[1] تہران میں آج کل بھی بعض گھروں میں کرسی کا استعمال سخت سردیوں میں ہوتا ہے میں نے اپنے قیام ایران میں جاڑے کے ایام میں خود اپنے ایک عزیز دوست سید صادق نقیبی کے گھر میں کرسی کا استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ اور میں بھی بدن کو گرم کرنے کے لیے اُن میں شامل ہوا۔ وسط ایشیا اور ایران کے دیہات میں کرسی کا استعمال عام ہے۔

[2] ملاحظہ ہو: دیوان غنی، مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۵۸۔

بیقراری کے ہیں) مُغلیہ دور کے میرالٰہی (پادشاہ جہانگیر کے عہد میں) جو کشمیر میں حضرت شیخ بہاء الدین گنج بخشؒ کے مزار میں اُن کے روضۂ شریف کے باہر مغرب میں مدفون ہے. (تاریخ وفات ۱۰۶۴ھ/ ۱۶۵۳ء) نے بھی کرسی کے بارے میں کہا ہے۔ ؎

تا میتوان ز عرش چو کُرسی جُدا مباش :: آتش بفرق ریز و مکن اختیار برف [1]

(یعنی، کرسی کی طرح عرش تخت سے جہاں تک ہو سکے، الگ نہ رہ :: سر پر آگ ڈال دے لیکن برف کو اختیار نہ کر)

۶ - ایران، وسط ایشیا اور کشمیر تینوں ممالک میں عیار درویشوں کا ایک طبقہ وجود میں آیا جو بال بڑھا کر یا قلندروں کی طرح بال کٹوا کر گلے میں ہزار موٹے دانوں کی تسبیحیں یا نقلی پتھروں کے دانوں کی، یا فوطے کے رنگین موٹے دانوں کی مالائیں ڈال کر، ہاتھوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں پہنے، اور پاؤں تک لمبے کُرتے (اور کشمیر میں موٹے کپڑے کے پھرن) پہنے گھروں میں "یا ہو! یا حق! یا علی! وغیرہ بلند آواز میں کہتے ہوئے داخل ہوتے تھے اور اور سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد مردوں اور عورتوں کو غیب کی باتیں بتا کر اُن سے مختلف چیزیں مثلاً چاول، نمک، شکر، پیسہ اور کپڑے وغیرہ اینٹھ لیتے تھے، اور چند مہینوں کے بعد پھر ان ہی "اسامیوں" کے گھروں میں نازل ہو کر ان سے پھر چیزیں وصول کر لیتے تھے، اب کم از کم سرینگر سے عیّاروں کی یہ ٹولی مفقود ہو چکی ہے، لیکن دیہات میں ان کا نزول اب بھی جاری ہے۔ کشمیر میں یہ لوگ سید مکار کہلاتے تھے اور نام سے صاف ظاہر ہے کہ اوّل اوّل اس طرح کے لوگ اپنے آپ کو سیّد یا سادات ظاہر کر کے لوٹ لیتے تھے اور ان کی اصلیت نمایاں ہونے کے بعد مکّار کا لفظ سید کے ساتھ صحیح معنوں میں منسلک کر دیا گیا۔

یہ طبقہ اس طبقے سے الگ ہے جو کشمیر میں کُولی فقیر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ کولی خانہ بدوشوں کا طائفہ ہے جو گویا ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایران میں یہ ٹوکریاں بنا کر بیچتے ہیں اور فال گیری اور چوری کا کام بھی کرتے ہیں۔ کئی زبانوں سے واقف

---

[1] دیوان غنی حاشیہ صفحہ ۵۸۔ میر الٰہی ہمدان سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں زندگی گزاری، غنی کشمیریؒ نے انکی وفات پر یہ تاریخ لکھی ؎ بُرد الٰہی ز جہان گوئے سخن (۱۰۶۴ھ) ::

ہیں کشمیر میں جو کوئی فقیر آتے ہیں وہ فارسی زبان سے آشنا ہوتے ہیں اور بھیک مانگ کر جاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔

۷۔ تصوفِ اسلامی کے پھیل جانے کے نتیجے میں درویشوں اور فقراء کے گروہ وجود میں آگئے۔ انہوں نے اپنی جداگانہ راہیں اختیار کیں اور بعضوں نے تو ترکِ دُنیا عملاً اختیار کیا اور غار نشین ہو گئے۔ بعضوں نے غار نشینی، چلّہ کشی و خلوت کے مراحل طے کر کے خانقاہوں، صومعوں اور زاویوں کو مسکن بنایا، اُن ہی زاویوں کی ایک صورت تکیہ کے نام سے مشہور ہوئی، ایران، وسط ایشیا اور کشمیر میں تکیے اب بھی ہیں۔ اصولاً، تکیہ فقراء کی جگہ تھی جہاں انہیں کھلانے کا کام بھی ہوتا تھا۔

ابتداء میں تکیہ میں فقراء جمع ہوتے تھے، وہیں رہتے تھے، عرفان و آگہی کی باتیں کرتے تھے اور مخیّر لوگ آ کر ان کو کھلاتے پلاتے تھے۔ بعد میں رفتہ رفتہ مدہوشی کی کیفیت کو ترجیح مل گئی اور چرس و افیون کا استعمال ہونے لگا۔ اب تکیہ کا مالک جو تکیہ دار (کشمیری میں تکیہ دَر) کہلاتا تھا خود چرس و افیون مہیّا کرنے اور اس[1] طرح کی کمائی سے وہ اپنے اخراجات پورے کرنے لگا۔ بعض لوگ جو بے عیال تھے وہ تکیہ میں ہی رہا کرتے تھے، اور دن بھر روحانی موسیقی سے شغف رکھتے تھے۔ کبھی کبھار روحانی موسیقی

---

[1] تہران یونیورسٹی میں میرے ایک شفیق استاد ڈاکٹر سیّد صادق گوہرین، جو میرے اُستاد و رہنما تھے اور کلاس میں فارسی گرامر پڑھاتے تھے، مولانا رومؔ اور ان کی مثنوی کے متخصّص تھے (اور ابھی الحمدللہ حیات ہیں) انھوں نے ایک روز کشمیر کے تکیوں کے بارے میں مجھ سے استفسار کیا، کیونکہ کشمیر کے تکیوں کے بارے میں انھوں نے قبلاً سنا تھا، میں نے جب ان کو تفصیل سنائی تو بڑے خوش ہوئے اور فرمایا، تم تو جیسے ایرانی تکیوں کی بات کر رہے ہو اور کہا ہمارے ایران میں بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ بعد میں میں نے بالکل ویسا ہی تکیہ اصفہان میں دیکھا، جیسا کہ میں نے بچپن میں سرینگر میں سراج بازار زینہ کدل میں واقع امد شاہ (احمد شاہ) کا اور دلال محلہ سرینگر میں کریم شاہ (المعروف بہ کریما کرچ) کا تکیہ دیکھا تھا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے پیشہ ور فنکار خود ہی تکیوں میں جاکر روحانی کلام سناتے اور چلے جاتے۔ جس علاقہ میں تکیہ ہوتا، وہاں کے صاحبِ حیثیت لوگ یا عام لوگ بھی بعض صبح یا شام کو تکیہ والوں کے لیے کھانا بھیج دیتے تھے۔ تکیہ کے ساکن لوگ بڑے منظم، کم گو، اور مرنجان مرنج قسم کے پاک دل اور پاک باز لوگ ہوتے تھے۔ سوائے دینی آگہی اور عرفان کے اور کوئی بات تکیہ میں نہیں ہوتی تھی، گویا ایک پاکیزہ ماحول تھا، جو غیر متعلق لوگ محض دیدار کے لیے تکیہ میں جاتے تھے، وہ بھی تھوڑی دیر بیٹھ کر متاثر ہو کر چلے جاتے تھے۔ تکیہ بڑا صاف ستھرا ہوتا تھا اور اس کے لوگ خود ہی اس کی صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے اور خود کو تکیہ کے خدمتگذار تصوّر کرتے تھے۔[۱]

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ)

اور آج یہ دونوں تکیے بند پڑے ہیں۔ چرس، افیون اور بھنگ کا رواج آج بھی ایران، وسط ایشیا اور کشمیر میں چوری چھپے بعض عادی لوگوں میں موجود ہے (تکیہ در) یا تکیہ دار جو چرس اور افیون تکیہ میں مہیا کرتا تھا اسکے لیے اُسکے پاس حکومت کی طرف سے اجازت نامہ ہوتا تھا۔ ایران میں چرس اور افیون کا استعمال زیرِ زمین طور پر اب بھی ہے تہران کے ایک بزرگ دوست محمد رضا جلالی نائینی جو بڑے عالم و فاضل آدمی ہیں اور معروف قانوس شناس بھی ایک روز مجھے اپنی موٹر کار میں تہران سے باہر اپنے ایک دوست کے ہاں لے گئے، جہاں ہم مدعو تھے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا۔ میزبان جو ایران کے چند ثروت مند ترین آدمیوں میں سے تھے، انہوں نے ایک مخصوص کمرے میں پاجاموں کا ایک ڈھیر سا رکھوا دیا تھا، چیدہ اور خاص احباب آکر ایک شلوار اٹھا کر پاس والے کمرے میں پتلون تبدیل کر کے شلوار پہن کر آجاتے اور بیٹھ جاتے۔ ملازم انگاروں سے بھری ایک چھوٹی سی انگیٹھی انکے سامنے رکھ دیتا اور ایک چلم اور ایک کاغذ میں لپٹی تھوڑی سی افیون یا چرس (ہر دوست کے لیے الگ الگ انگیٹھی ہوتی تھی) اور پھر وہ عصر تک مشغول رہتے۔ البتہ بیچ میں کوئی کھانے پر بھی منہ مارتا، اگر اسکی رغبت ہوتی۔ کشمیر میں بھی سنا ہے کہ اس طرح کی خاص مجلسیں اب بھی بعض گھروں میں ہوتی ہیں اور پابندی کے ساتھ ہوتی ہیں:—

[۱] چرس اور افیون تکیہ میں چلم اور حقّے کے ذریعے سے استعمال ہوتا تھا۔ چلم میں جو گویا حقہ پر ایک ٹوپی سی ہوتی تھی چرس تمباکو کے ساتھ ملا کر رکھ دیتے تھے

(باقی اگلے صفحہ پر)

۸۔ آخر میں بچوں میں دو ایک مقبول کھیلوں کے ذکر پر میں اس باب کو ختم کرتا ہوں۔

ایران اور وسطِ ایشیا کے بچوں[1] میں اور ہمارے کشمیر کے بچوں میں ان دو[2] مشترک کھیلوں کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ ایک یہ ہے کہ ایک بچہ آنکھیں بند کر دیتا ہے اور باقی بچے چھپ جاتے ہیں۔ چھپنے والے بچوں میں سے کوئی اُسے اُن کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے بلاتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) اور کش لگا کر ہُو کی آواز کے ساتھ دوسرے بغل میں بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف بڑھا دیتے تھے یا حقّہ پر چلم رکھ کر تمباکو اور چرس ملا کے پیتے تھے اور عام طور پر لمبے کش لگانے کے نتیجے میں چلم میں سے شعلے اُٹھتے تھے، افیون بھی چلم کے ذریعے سے ہی استعمال ہوتی تھی، حقّہ تیار کرنے کے لیے تکیے میں ایک یا دو آدمی ہوتے تھے اور وہی چلم آمادہ کر کے لوگوں کے سامنے لا کر رکھ دیتا تھا۔ اس کا حقّہ بھی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ کبھی حقّہ کا برتن قلعی والے سادہ تانبے کا ہوتا تھا یا کبھی تانبے پر کندہ کاری کیا ہوا، اور کش لگانے کی نَے کی دو شاخیں ہوتی تھیں (ایک وہ نَے جس پر چلم رہتی تھی اور دوسری مُنہ سے کش لگانے کی) وہ بھی اس نے بڑی محنت سے آراستہ کی ہوئی ہوتی تھیں اور حقّہ بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ اس طرح کا تمباکو وغیرہ پلانے والا کشمیری میں لگڑی کہلاتا تھا اور اُن دنوں میں بھی اسکی صورت نظر آتی تھی جب لوگ نفرہ نچ کے لیے بادام کے شگوفوں کو دیکھنے کی خاطر کوہ ماران قلعہ کے دامن کے ارد گرد واقع باغوں میں نکل آتے تھے اور یہ لگڑی اپنی روٹی روزی کمانے کی خاطر ان باغوں میں جا کر لوگوں کو اسی خوبصورت حُقّہ (کشمیری میں ججیر) سے تمباکو پلاتا رہتا تھا اور وہ اُسے اپنی حیثیت کے مطابق اس کا معاوضہ نقدی میں دیتے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں وسط ایشیا، ایران سے علیحدہ ہو گیا اور اس کی مذہبی اور سیاسی وجوہات تھیں۔ میں نے بچوں کے کھیلوں کی صرف مشابہت کا ذکر کیا ہے اور یہ نہیں کہا ہے کہ یہ کھیل ایران اور وسط ایشیا سے کشمیر میں آئی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو اور غلط بھی یا کشمیر سے ہی وہاں پہنچی ہوں۔ بہرحال یہ اور کچھ اور تمدنی روابط کے نتیجے میں وجود میں آنے والے تاثرات (بقیہ آگے صفحے پر)

اگر کسی کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا تو اُسی جگہ سے وہ اس کی کمر پر سوار ہو جاتا ہے اور اُسے اپنی جگہ پر لے آتا ہے اور اب اس کی باری آنکھیں بند کرنے کی آجاتی ہے۔ ایران اور وسطِ ایشیا میں اسے چشم بندک کہتے ہیں۔ کشمیری بچوّں میں بھی یہ کھیل اپنے مخصوص نام سے مقبول ہے اور "ژُرہ ژھیپہ" کہلاتی ہے۔ دوسرا کھیل الک دولک کہلاتی ہے جو اُردو زبان میں گلی ڈنڈا اور کشمیری میں لٹھکیچ پُچ لَوٹھ کہلاتی ہے اور اس میں بھی ایران اور کشمیر میں کمر پر سواری دینے کی شرط ہوتی ہے۔ گول چھوٹے پتھروں کے دُور سے ایک دوسرے کے اوپر مارنے کی کھیل بھی ایران اور کشمیر کے بچوّں میں مشترک ہے اور اسکی شرط بھی کمر پر سواری دینے کی ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تحقیق طلب ہیں۔ البتہ جو ایرانی اور وسط ایشیائی تمدّن اور تہذیبی اثرات کشمیر میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے زمانہ ورود سے رونما ہوئے ان کا میں نے مختصراً ذکر کیا ہے اس امید کے ساتھ کہ آئندہ کے کشمیری علماء اور محققین ان کو اور زیادہ وسعت اور علمی تحقیق کے ساتھ پیش کریں گے ؛؛

چوتھا باب

شاہ ہمدانؒ غنی کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ
(بالِ جبریل، حضرت علامہ اقبالؒ)

(۴)

علّامہ اقبالؒ کو کشمیر سے عشق تھا اس لیے کہ وہ کشمیری تھے اور کشمیر اُن کا وطن تھا۔ غنیؒ ۔ ملّا محمد طاہر غنیؔ کشمیری، بھی اصیل کشمیری تھے اور دونوں کی نظروں میں کشمیر کی مٹی مقدّس تھی جس سے ذرّہ بھر تجاوز ہونا بھی ان دونوں حسّاس اور پاک باطن فرزندوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا حضرت شاہ ہمدانؒ کشمیریوں کے روحانی پیشوا اور مربّی ہیں اور باوجود اس کے کہ وہ نسلاً کشمیری نہیں لیکن کشمیر ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی روحانی، دینی، تہذیبی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی تربیت کرنے کی طرف آپؒ کی بیشتر توجّہ مبذول رہی اور کشمیر میں تشریف آوری کے بعد کشمیر سے ظاہری دوری کے باوصف بھی یہ ملک آپؒ کی ظاہری و باطنی توجّہ سے اوجھل نہیں رہا اور آج بھی وہ گویا ہم میں موجود ہیں۔ زندہ و پائندہ۔ اس لیے ہم کشمیر کے لوگ قلباً آپؒ کو محسنِ کشمیر مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علّامہ اقبالؒ کشمیریوں کے دُکھ درد کے مداوے کی خاطر کشمیریوں کے اس روحانی باپ اور محسنِ اعظم کی ہی طرف رجوع کر کے ان سے درماں طلب کرتے ہیں۔

غنیؔ کشمیریؒ اور علّامہ اقبالؔ کا درد مشترک تھا۔ اگرچہ دونوں کے زمانوں میں تقریباً تین سو سال کی دُوری تھی۔[1] دونوں کشمیر کی زبون حالی، پائمالی اور غلامی کے جگر فگار مظالم کے مناظر کو دیکھ کر خون کے آنسو رُویا کرتے تھے، دونوں کی رُوحیں عالمِ بالا میں بیقرار تھیں جہاں باہمی درد و الم کے نتیجے میں دونوں حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں بے قابو

---

[1] تاریخ وفات غنی کشمیری۔ سال ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ عیسوی۔
تاریخ وفات علّامہ اقبالؔ۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء۔

ہو کر کشمیر کے غم میں نڈھال تھے۔ اس سے پہلے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی علامہ اقبالؒ اور غنی کشمیری کی زبان سے کشمیریوں کی سیاسی رہبری اور پیغام بصیرت کی طرف تفصیل سے اشارہ ہو، ضروری ہے کہ اول ہم غنی کشمیری اور ان کے عہد میں کشمیر کی حالتِ زار کو بیان کریں تاکہ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آئے کہ علامہ اقبالؒ نے غنی کشمیری کے ساتھ حوضِ کوثر پر حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں کس حال میں ملاقات کی اور کشمیر کے ان دونوں قابلِ افتخار بیٹوں نے اپنے روحانی باپ اور محسنِ اعظم سے کشمیر کے دُکھ کے درماں کے لیے کیا نسخۂ جاوید حاصل کیا۔

غنی کشمیریؒ نے آرام و آسائش کی زندگی نہیں دیکھی۔ اس کی زندگی پر قریب قریب آلام و مصائب کا ویسا ہی غلبہ رہا، جیسے کہ میرزا غالبؔ کی زندگی پر رہا۔ ان دونوں شاعروں کی حیات کا پس منظر اور حوادث و واقعات بہت حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔

دونوں کے کلام میں غمِ دوراں کا تذکرہ ہے اور انسانی حیات کے مسائل اور کشمکشوں کی ناکامی کا ذکر بھی، غنیؒ کو ایامِ طفولیت میں ہی مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور گھر سے بے گھر ؎

چشمِ تا وا کردہ ام بر خاکِ غم افتادہ ام ؛ ہمچو طفلِ اشک در ایام ماتم زادہ ام

(جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے تب سے غم والم کی خاک پر پڑا رہا ہوں۔ گویا آنسو کے قطرے کی طرح میں ماتم کے دنوں میں پیدا ہوا)

اور اِن تین شعروں میں تو اس نے زندگی کی تین منزلوں، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا مکمل حال بیان کر دیا ہے ؎

معذورم ار ز خانہ نہ باشد خبر مرا　　آمد چو اشک پیش بطفلی سفر مرا
آزردہ ام ز دیدنِ مردم، عجب مدار　　گر اوفتاد مردمِ چشم از نظر مرا
کس وقتِ نزع بر سرم از بیکسی نبود　　شرمندہ ام ز عمر کہ آمد بسر مرا

(اگر مجھے گھر کی کوئی خبر نہیں تو میں معذور ہوں کیونکہ بچپن میں ہی آنسو کی طرح مجھے سفر اٹھانے پڑے۔ لوگوں کو دیکھ کر میں آزردہ خاطر ہو جاتا ہوں، اس لیے تعجب کی

(۴)

علّامہ اقبالؒ کو کشمیر سے عشق تھا اس لیے کہ وہ کشمیری تھے اور کشمیر اُن کا وطن تھا۔ غنیؔ ۔ ملّا محمد طاہر غنیؔ کشمیری، بھی اصیل کشمیری تھے اور دونوں کی نظروں میں کشمیر کی مٹی مقدّس تھی جس سے ذرّہ بھر تجاوز ہونا بھی ان دونوں حسّاس اور پاک باطن فرزندوں کے لیے نا قابلِ برداشت تھا حضرت شاہ ہمدانؒ کشمیریوں کے روحانی پیشوا اور مربّی ہیں اور باوجود اس کے کہ وہ نسلاً کشمیری نہیں لیکن کشمیر ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی روحانی، دینی، تہذیبی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی تربیت کرنے کی طرف آپؒ کی بیشتر توجّہ مبذول رہی اور کشمیر میں تشریف آوری کے بعد کشمیر سے ظاہری دوری کے باوصف بھی یہ ملک آپؒ کی ظاہری و باطنی توجّہ سے اوجھل نہیں رہا اور آج بھی وہ گویا ہم میں موجود ہیں۔ زندہ و پائندہ۔ اس لیے ہم کشمیر کے لوگ قلباً آپؒ کو محسنِ کشمیر مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علّامہ اقبالؒ کشمیریوں کے دُکھ درد کے مداوے کی خاطر کشمیریوں کے اس روحانی باپ اور محسنِ اعظم کی ہی طرف رجوع کر کے ان سے درمان طلب کرتے ہیں۔

غنیؔ کشمیریؒ اور علّامہ اقبالؔ کا درد مشترک تھا۔ اگرچہ دونوں کے زمانوں میں تقریباً تین سو سال کی دُوری تھی۔[1] دونوں کشمیر کی زبون حالی، پائمالی اور غلامی کے جگر فگار مظالم کے مناظر کو دیکھ کر خون کے آنسو رُویا کرتے تھے، دونوں کی رُوحیں عالمِ بالا میں بیقرار تھیں جہاں باہمی درد والم کے نتیجے میں دونوں حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں بے قابو

---

[1] تاریخ وفات غنی کشمیری۔ سال ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ عیسوی۔
تاریخ وفات علّامہ اقبال۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء۔

ہو کر کشمیر کے غم میں نڈھال تھے۔ اس سے پہلے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی علامہ اقبالؒ اور غنی کشمیری کی زبان سے کشمیریوں کی سیاسی رہبری اور پیغام بصیرت کی طرف تفصیل سے اشارہ ہو، ضروری ہے کہ اول ہم غنی کشمیری اور ان کے عہد میں کشمیر کی حالتِ زار کو بیان کریں تاکہ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آئے کہ علامہ اقبالؒ نے غنی کشمیری کے ساتھ حوضِ کوثر پر حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں کس حال میں ملاقات کی اور کشمیر کے ان دونوں قابلِ افتخار بیٹوں نے اپنے روحانی باپ اور محسنِ اعظم سے کشمیر کے دُکھ کے درماں کے لیے کیا نسخۂ جاوید حاصل کیا۔

غنی کشمیریؒ نے آرام و آسائش کی زندگی نہیں دیکھی۔ اس کی زندگی پر قریب قریب آلام و مصائب کا ویسا ہی غلبہ رہا، جیسے کہ میرزا غالبؔ کی زندگی پر رہا۔ ان دونوں شاعروں کی حیات کا پس منظر اور حوادث و واقعات بہت حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔

دونوں کے کلام میں غمِ دوراں کا تذکرہ ہے اور انسانی حیات کے مسائل اور کشمکشوں کی ناکامی کا ذکر بھی، غنیؒ کو ایّام طفولیت میں ہی مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور گھر سے بے گھر ؎

چشمِ تا وا کردہ ام بر خاکِ غم افتادہ ام ؛ ہمچو طفلِ اشک در ایّام ماتم زادہ ام

(جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے تب سے غم والم کی خاک پر پڑا رہا ہوں۔ گویا آنسو کے قطرے کی طرح میں ماتم کے دنوں میں پیدا ہوا)

اور اِن تین شعروں میں تو اس نے زندگی کی تین منزلوں، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا مکمل حال بیان کر دیا ہے ؎

معذورم ارز خانہ نہ باشد خبر مرا ۔۔۔ آمد چو اشک پیش بطفلی سفر مرا
آزردہ ام ز دیدن مردم، عجب مدار ۔۔۔ گر اوفتاد مردم چشم از نظر مرا
کس وقت نزع بر سرم از بیکسی نبود ۔۔۔ شرمندہ ام ز عمر کہ آمد بسر مرا

(اگر مجھے گھر کی کوئی خبر نہیں تو میں معذور ہوں کیونکہ بچپن میں ہی آنسو کی طرح مجھے سفر اٹھانے پڑے۔ لوگوں کو دیکھ کر میں آزردہ خاطر ہو جاتا ہوں، اس لیے تعجب کی

کوئی بات نہیں اگر میری آنکھوں کی پُتلی نظر سے محروم ہے، موت کے وقت بیکسی کی وجہ سے میرے سرہانے پر کوئی نہ تھا۔ میں اپنی عمر سے شرمندہ ہوں جو میرے سر پر آ گئی)

مجموعی طور پر غنیؔ کشمیری نے اپنے اشعار میں جس غم کا اظہار کیا وہ ایک ایسے ہی ماحول کا نتیجہ تھا اور اس میں وہ حسرتیں اور ناکامیاں شامل ہیں جن سے اُس کی زندگی عبارت تھی غنیؔ اندرونی اور بیرونی عواطف و احساسات اور حوادث و واقعات سے جراحت دار ہو چکا تھا جس کی ٹیس اور کسک سے مجبور ہو کر اس نے غمِ حیات کا اظہار کر ہی دیا۔ خاموشی اختیار کرنے کی اس میں قدرت نہیں تھی اور نہ تاب۔ کہتا ہے ؎

ما را چو شمعِ مرگ بود خامشی غنیؔ   اظہارِ زندگی بزبان می کنیم ما

(غنیؔ! شمع کی طرح خاموش رہنا میرے لیے موت ہے۔ اس لیے زندگی کا اظہار میں زبان کے ذریعے سے ہی کر رہا ہوں)

از کسی پنہان نمیداریم راز خود چو شمع   ہر چہ در دل ہست ما را بر زبان می آوریم

(شمع کی طرح میں اپنا راز کسی سے چھپاتا نہیں۔ میرے دلمیں جو کچھ ہے اُسے میں زبان پر لے آتا ہوں)

کسی کہ زندہ باظہارِ زندگی باشد   دمی کہ گشت ز دعویٰ خموش، گویا نیست

(جو شخص زندگی کا اظہار کرنے سے ہی زندہ ہو۔ جونہی وہ اپنے دعویٰ سے خاموشی اختیار کرے گا تو وہ نابود ہو جائے گا)

بچپن سے ہی ستم ہائے روزگار کا ایک صیدِ زبوں بن جانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ بلوغ کے زمانے تک غنیؔ کی طبیعت میں عزم و استقلال اور مزاج میں کسی حد تک انانیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی یہ انانیت دراصل انسانی عظمت کی قدر و منزلت سے الہام لیتی ہے۔ وہ عظمت آدم کا سخت قایل تھا اور خودداری و خودی کا شناسا۔ خود شناسی اور معرفتِ نفس کے پیشِ نظر ہی وہ گھر میں رہ کر گھر کو اندر سے بند کیا کرتا تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تو اُسے کُھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کہتا تھا کہ گھر کی حقیقی متاع تو میں ہوں جب میں گھر میں موجود نہیں تو مکان کی اہمیت ہی کیا ہے؟[1] خود شناسی کے اس جذبے نے

---

[1] علامہ اقبالؔ نے پیامِ مشرق میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

غنیؒ کو اپنے زمانے کے ناخوشگوار اور مصنوعی زینت و آسائش سے معمور ماحول سے متنفر کر دیا تھا۔

غنیؒ کا زمانہ طبقاتی نظام کا زمانہ تھا جسے ایک غیر کشمیری شہنشاہیت نے جنم دیا تھا۔ غیر کشمیریوں کی کشمیر کو قدموں تلے پامال کرنے کی مذموم و ملعون حرکت کے احساس نے غنیؒ کو دبی زبان اور ابہام میں لپٹی صداقتوں کو آشکارا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس میں اپنے کشمیر کی زبوں حالی دیکھنے کا تحمّل نہ تھا۔ جاگیردارانہ اور مطلق العنان شہنشاہیت اور حکومت کے اولیائے امر، متموّل لوگ، بے ضمیر اور صاحبِ اقتدار حاکم، طاقت و تونگری اور جاہ و حشمت کے کس بل سے غریب، بے بضاعت اور سیدھے سادے عوام پر ظلم توڑتے تھے۔ کشمیریوں کو بے بال و پر بنا دیا گیا۔ نوآبادی نظام کو مستحکم تر بنانے کے مقصد سے غریب اور بیکس کشمیریوں کو بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا گیا اور یہ سب کچھ بالخصوص اُن حکّام کے توسّط سے ہوا جو مرکز سے یہاں متعین ہو کر آئے، وہ اکثر عیش پرست تھے، جابر تھے اور استبداد کے عامل۔ بعض ایسے حکّام ذاتی عناد کی خاطر بھی مظالم توڑتے تھے۔ غیر کشمیری حکّام کی زور زبردستیوں کے بارے میں بعض مقامی تاریخوں میں اشارے موجود ہیں۔ ۱؎ بیگار لے کر کشمیریوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

غنی آن سخنگوی بُلبُل سفیر
نوا سنجِ کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشتی
چو رفت از سرا، تختہ برا واگذاشتی
یکی گفتنش ای شاعر دل رسی
عجب دارد از کار تو ہر کسی
بپاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر
فقیر و برا قلیم معنی امیر
ز من آنچہ دیدند یاران رواست
درین خانہ جز من متاعی کجاست
چہ آن محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازین ہیچ کاشانہ نیست،

(کلیاتِ اقبال فارسی کتاب خانہ سنائی تہران صفحہ ۱۴۰) اس باب میں غنی کشمیری کے جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ میں نے دیوانِ غنی مطبع کانپور سال ۱۹۳۱ء سے لیے ہیں۔ ۱؎ (اگلے صفحے پر)

فقر و مذلت کی زندگی عام سی ہو گئی تھی۔

ایک روشن فکر اور حساس وطن دوست شاعر جب اس طرح کے ماحول کا مشاہدہ کرے تو اُس کے رگ و پے میں شدتِ احساس کا کرب اور درد امڈ آتا ہے اور وہ اپنے دردناک اور مرگ بار زمانے کی یادیں اگلی نسلوں کے لیے پائیدار نقوش کی صورت میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اجتماع میں رہ کر ہر بڑا شاعر اپنے ماحول میں محو ہو جاتا ہے اور اس کا وجود اپنے ماحول کے دائرے میں رہ کر اپنے وطن، اپنے تمدن اپنی تہذیب اور وطنیت کی بوباس کی ایک شاہکار علامت بن کر ابھر آتا ہے، جب وہ اپنے وطن کے سُنہرے اور دلآویز محیط میں فساد کی رخنہ، اندازی کا مشاہدہ کرتا ہے تو معاشرے میں فساد اور رخنہ پیدا کرنے والوں کے خلاف نبرد آزمائی کرنے پر اُتر آتا ہے لیکن تلوار سے نہیں بلکہ ایک چیخ سے، ایک فریاد سے ؎

بہ بزمِ دردمندان زار نالیدن ہوس دارم
چو نَے خواہم کہ در فریاد باشم تا نفس دارم

(دردمندوں کی مجلس میں زار زار رونے کی تمنا ہے، میں بانسری کی طرح فریاد میں رہنا چاہتا ہوں جب تک دم باقی ہے)

اس طرح کے بہت سے حساس محبِ وطن شاعر اور سخن سرا ہیں جن کی فریاد ایک تاریخی حقیقت بن چکی ہے اگرچہ وہ مورخ نہیں مطلق العنان اور صاحبِ جبروت شہنشاہوں کے عہد کے مورخ بیشتر خوفِ جان سے لرزاں تھے اس لیے ان کی تحریروں پر آج کے نقادوں کو تامل ہے لیکن ابہام میں لپٹے ہوئے یا "در حدیثِ دیگران" والے دردناک بیانیہ اشعار زمان و مکان کی حدود سے آج بھی بالاتر ہیں۔

غنیؔ کشمیری[7] کے فکر و فن، اس کی زندگی اور شخصیت پر اپنے عہد کے ناسازگار اور فاسد ماحول کا غم غالب ہے۔ اس کے خیالات اکثر و بیشتر اسی محور کے گرد

لے (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تاریخ کشمیر، حسن: واقعات کشمیر۔ خواجہ اعظم نیز کئی اور فارسی تواریخ جو کشمیر میں لکھی گئی ہیں۔

گھومتے ہیں، اس کے تجربات اور اس کی کیفیات، کشمیر کے کثیف سیاسی اور معاشی حالات سے سخت متاثر ہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری وہ غیر کشمیری مقامی حکومت پر ڈال کر اُن کے خلاف عملی جدوجہد کرنے کا قائل ہو گیا اور برملا طور پر اس نے اپنے ہم وطنوں کو غیروں کے خلاف نبرد آزما ہونے کی دعوت دی، کہا ہے ؎

درمعرکہ صد زخم رسد گر بہ تن ما   زان بہ کہ بود داغ سپر بر بدن ما

(اگر ہمارے جسم کو جنگ میں سینکڑوں زخم بھی لگ جائیں   اس سے بہتر ہے کہ کسی کا سپر استعمال کرنے کا داغ ہمارے بدن کو لگے)

برخیز و بجنگ خصم شمشیر ببند   بر تیر نظر بسان زہگیر ببند
در رزم ز اسباب فراغت بگذر   پر را بکش از بالش و بر تیر ببند

(اٹھو اور دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے تلوار باندھو۔ زہگیر کی طرح نظر تیر پر رکھ ایام جنگ میں آرام و آسایش کو چھوڑ دے اور سرہانے سے پَر کو نکال کر اسے تیر پر لگا دے)

رمز و کنایات اور ایہام و ابہام کے لبادے میں لپٹے ہوئے اس طرح کے شعروں میں تجربوں کی صداقت ہے اور عام انسانی واردات اور ذہنی کیفیتوں کی جلوہ گری بھی۔

غنی کشمیریؒ کے عہد میں کشمیر میں جو استعماری ماحول تھا اور جذبۂ کشمیریت کو جس طرح سے ختم کرنے کی کوششیں جاری تھیں ان کا ذکر اس نے اپنے کلام میں یوں کیا ہے :

۱۔ سادہ اور سادگی پسند اور شریف کشمیریوں کو پیسے سے خریدنے کی کوشش کی جاتی تھی :

بہ ریزش زر بہ پارہ خود درآور سادہ لوحان را   بیفشان سیم و زر چندان کہ بردارند داماں را

(سادہ لوح لوگوں کو بخشش کے ذریعے سے اپنے قبضے میں لے آؤ۔ اور اُن پر اتنا سونا چاندی نچھاور کر دو کہ سیر ہو جائیں)

۲۔ زمانے کی ناامنی اور حکومت کا خوف و ہراس :

دہر ناامن چناں گشتہ کہ چون مردم چشم   تا در خانہ نہ بندم نبرد خواب مرا

(زمانہ اس قدر بے امنی کی حالت میں ہے کہ آنکھ کی پتلی کی طرح جب تک گھر کا دروازہ میں بند نہ کرلوں، مجھے نیند نہیں آتی)

۳۔ حکّام کا جور اور ظلم و زبردستی، اور غریب و نادار اور بیکس و بے سہارا لوگوں کا استعمار ہے

سخت دلبستگی داشت ببالم صیّاد   تا نہ شد بالش او پُر ز پرم، خواب نہ کرد

(شکاری کو میرے پروں کے ساتھ بڑی سخت دلچسپی تھی، جب تک میرے پروں سے اس کا سرہانہ بھر نہ دیا گیا، اُسے نیند نہیں آئی)

کُدام باز ندانم در آشیان بندی است   کہ ہست حکم بپر کاہ بالِ مُرغان را

(معلوم نہیں یہ کون باز اپنا گھونسلا بنا رہا ہے کہ (چھوٹے چھوٹے) پرندوں کے پروں کو نوچ ڈالنے اور انھیں گھاس کے تنکوں کی جگہ استعمال کرنے کا حکم جاری ہوا ہے)

صیّادِ ما چو ترکش پُر تیر می کند   در یک قفس اسیر کند صد پرندہ را

(ہمارا شکاری جب ترکش کو تیروں سے بھر دیتا ہے تو سینکڑوں پرندوں کو ایک ہی قفس میں زندانی بنا دیتا ہے)

ز پہلوی ضعیفان است گرمی پشتِ سرکش را   پرِ کاہی کہ بینی بالِ پرواز است آتش را

(متکبّر حاکم کو کمزوروں کی کمزوری سے ہی قوّت ملتی ہے۔ گھاس کے تنکے ہی آگ کو اُڑنے کی طاقت بخشتے ہیں)

۴۔ خود کشمیر میں کشمیریوں کے لیے رزق کی تنگی جس رزق پر غیر کشمیری حصّہ دار بن گئے ہیں ہے

رُوزیِ ما می شود آخر نصیبِ دیگران   طالعِ برگشتہ ہمچون آسیا داریم ما

(بالآخر ہماری روزی روٹی غیروں کے حصّے میں چلی جاتی ہے۔ ہماری قسمت چکّی کی طرح بالکل پھری (اُلٹی) ہوئی ہے)

۵۔ بدمست حاکموں کی ریاکاری اور اُن کی مال و دولت کی حرارت کی خرابکاری ہے

تا سرش از بوی می شد گرم خمہا را شکست   ہیچکس در دورِ ما چون محتسب بدمست نیست

(شراب کی بُو سے جب اس کا سر گرم ہوا تو مٹکے توڑ دیئے۔ ہمارے زمانے میں محتسب جیسا اور کوئی آدمی بدمست نہیں)

۶۔ خوف وہراس اور جبر و دہشت کی حکمرانی ؎

چون بال کشایم ؟ کہ درین صیدگہِ دہر   ازدحامِ ہمہ رُوی زمین سینۂ باز است

(کیسے پرواز کروں ؟ کیونکہ زمانے کی اس شکارگاہ میں   ساری زمین، جال بچھ جانے کی وجہ سے، باز کا سینہ بن چکی ہے)

اس عمیق سیاسی شعور کے نتیجے میں غنی کشمیریؒ نے، دُنیا میں، جسے غم آباد کا نام دیا ہے، ایک زبردست انقلاب برپا ہو جانے کی تمنّا کا اظہار کیا ہے، جہاں تک میرے ذاتی مطالعہ کا تعلق ہے، میں نے خالص سیاسی معنی میں انقلاب کے لفظ کا استعمال کسی بھی ایک فارسی گو کشمیری شاعر کے کلام میں مشاہدہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ایسا کشمیری فارسی گو شاعر میری نظر سے گزرا ہے جس کے کلام میں ملّی اور قومی بدحالی سے متاثر ہو کر عوام میں انقلابی شعور پیدا کرنے کی خصوصیت پائی جاتی ہو۔ اس لحاظ سے بیشک ملّا محمد طاہر غنی کشمیریؒ کشمیر کا پہلا قومی شاعر ہے، انقلاب پیدا کرنے کے سلسلے میں غنیؔ نے کہا ہے ؎

انقلابی بہ غم آبادِ جہان میخواہم   شاید این طالعِ برگشتۂ من برگردد

(دُنیا کے اس غم آباد میں مجھے انقلاب برپا ہو جانے کی تمنا ہے، شاید میری پھری ہوئی قسمت لوٹ آئے)

غنیؔ! در ملک دُنیا انقلابی آرزو دارم   کہ خاک از گردشِ گردوں غُبارِ آسیا باشد

(غنیؔ! دُنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا ہونے کی آرزو رکھتا ہوں کہ گردشِ آسمان سے اس کی مٹّی چکّی کے گرد و غبار میں بدل جائے)

جنّتِ کشمیر کا اصیل ساکن ہو کر بھی غنیؔ نے منظر نگاری سے کام نہیں لیا اس لیے کہ اِس روشن فکر اور صاحب بصیرت دردمند کشمیری شاعر کو فطرت بھی اجنبی متاع نظر آنے لگی تھی اور وہ فطرت کو بھی محرم راز نہیں جانتا تھا کشمیریوں کی

پسماندگی، مظلومیت، زبوں حالی اور بے چارگی کا احساس غنیؔ کے دل و دماغ پر حاوی اور غالب رہا، اس لیے اگر کہیں خال خال منظر فطرت کا ذکر کیا ہے تو اس میں بھی تحت الشعور میں اصل مقصد کا ابلاغ ہی اس کے مدِّ نظر رہا۔[1]

علامہ ڈاکٹر اقبالؒ کو غنی کشمیریؒ کے بغیر اسی عمیق ذہنی یگانگت اور ملّی دردمندی کی یکسانیت کی بنا پر، اپنے روحانی سفر میں اور کوئی دردمند کشمیری نہیں ملا۔ صاف ظاہر ہے کہ حضرت علّامہؒ فقط اور فقط اس بارے میں غنیؔ کشمیری سے ہی متاثر تھے اور کشمیریوں کے عمومی اضمحلال و تظلّم کے شدید غم و اندوہ میں عمر بھر مبتلا رہنے کے غنیؔ کے جذبے کے بہت معترف تھے، حضرت علامہؒ جیسے صاحبِ نظر مفکّر اور کشمیر دوست سیاسی رہبر کے علم میں یہ حقیقت بھی تھی کہ غنیؔ کشمیری کے بغیر اس پورے وسیع عرصے میں کوئی بھی شاعر اُس خاک سے نہیں اُٹھا جس نے کشمیریوں کی غلامی کے دل آزار درد و کرب کو محسوس کر کے اس مظلوم و بے بس کشمیری قوم کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہو۔ غنیؔ کا درد بھی وہی تھا جو بعد میں حضرت علامہؒ کا ہوا۔ غنی نے بھی خود شناسی، خودی اور احساسِ عظمتِ ذات کا درس دیا اور حضرت علّامہ کا بھی تجدید و احیایِ عظمتِ آدم کے بارے میں یہی درسِ خودی عقیدہ و ایمان میں بدل گیا۔ غنیؔ دنیا میں انقلاب برپا ہونے کا آرزو مند تھا اور حضرت علامہؒ بھی اپنے لافانی پیغام کے توسّط سے انسانی ذہن میں انقلاب پیدا کرنے کے آرزومند، جو ایک نئی دُنیا اور ایک نئے نظام کی تشکیل۔

---

[1] افسوس ہے کہ غنیؔ کشمیریؒ کو ابھی تک روایتی انداز میں ہندوستانی فارسی اسلوب کے ایک پیش رو شاعر کی حیثیت سے ہی پرکھا گیا ہے، اس کی یقیناً ہندوستانی فارسی اسالیب کی ادبی تاریخ میں اپنی ایک اہمیت موجود ہے لیکن ایک عظیم شاعر جسکے کلام کی کوئی مقصدیت ہو کی حیثیت سے غنیؔ کشمیریؒ کو دنیا کے سامنے پیش کیا جانا باقی ہے، میں نے غنیؒ کے کلام کا۔ اسی معنی سے عمیق مطالعہ کر کے اس کو کشمیر کے پہلے آزادی خواہ ملّی شاعر کی حیثیت سے اس کے کلام کا حوالہ دیکر پیش کرنیکی اوّلین کوشش کی ہے۔

کا باعث بن جائے ۔

کشمیر کی آزادی یا غیروں کی غلامی کے شکنجوں، جن کے اثرات سے کشمیریوں کی اخلاقی، تمدنی، تہذیبی اور سیاسی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، سے رہا ہونے سے متعلق غنیؔ کشمیری کا نظریہ کیا تھا، اس سے پہلے کہ ہم اسے کشمیریوں کے محسنِ اعظم حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں حوضِ کوثر پر حضرت علامہ اقبالؒ کی مجلس ملاقات میں خود شاہ ہمدانؒ اور غنیؔ کی زبان میں حضرت علامہؒ کے توسط سے جان لیں، ضروری ہے کہ ہم حضرت علامہؒ کے اُس سیاسی ماحول کو بھی مختصر طور پر جان لیں جو اُن کے عہد میں کشمیر میں دائر تھا اور جس کے نتیجے میں کشمیریوں کی زندگی وبالِ جان بن گئی تھی تاکہ یہ جان کر حضرت علامہ اور غنیؔ کشمیریؒ کے اشتراکِ فکر و ذہن تک بھی رسائی ہو سکے ۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت علامہؒ اپنے وطن عزیز کشمیر سے بے پناہ عشق رکھتے تھے اور اس لیے اس کی ظاہری حُسن کی وسعتوں کی طرح اس کے رہنے والے ہموطن کشمیریوں کے حق میں بھی آزادی و خوشحالی کی وسعتوں میں زندگی گزارنے کے "متمنی" تھے ۔ لیکن حضرت علامہ کے عہد میں کشمیر کے شریف و نجیب باشندے ڈوگرہ مہاراجوں کے ظلم و تشدد کا شکار تھے، انہیں ہر طرح سے پامال کیا جا رہا تھا، ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے وادئ کشمیر کو انگریزوں سے پچھتر لاکھ روپے کی حقیر رقم کے عوض خرید لیا تھا اور اس کی پوری نسل میں یہ عقیدہ سرایت کر چکا تھا کہ چونکہ اس ناجائز سودا میں انہوں نے کشمیریوں کے جان و مال، کشمیر کے کھیت و باغات اور ندی نالوں اور پہاڑوں اور کشمیر کے زمین و آسمان کو مع اس کے چاند ستاروں کے خرید لیا ہے، اس لیے وہی اس ملک کے خداوندِ مطلق ہیں، مطلق العنان حاکم ہیں اور سوال و جواب سے بالاتر قاضی القضاۃ بھی ہیں۔ گمراہی اور کجروی پر مبنی اُن کے اس عقیدے نے انہیں کشمیریوں پر مظالم توڑنے پر اُکسایا۔ ہر ظالم حکمراں کی طرح انہوں نے بھی مظلوم کشمیری رعایا کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیا، کشمیر کی زرخیز زمینوں کو اپنے خاندان کے رشتہ داروں، درباریوں دیوانوں اور خاص الخاص اُن چند مسلمان سوز غیر ڈوگرہ کشمیری برہمن شاہی خادموں

میں بانٹ دیا جو کشمیریوں کو روندنے میں پیش پیش تھے۔ کشمیری فنکاروں اور صنعت گروں، دستکاروں اور ہنرمندوں کے فنون و شاہکار، کشمیر کے ظاہری اور فنّی جمال کی تشہیر کا دنیا میں برابر کا ایک واسطہ تھے لیکن ان کے تخلیق کار فقر و فاقہ کی زندگی میں مبتلا تھے۔ ان فن پاروں کی خرید و فروخت ایک خاص طبقہ کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے حیرت انگیز ثروت ذخیرہ کر لی تھی۔

کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن تعلیم یافتہ مسلمان ہزاروں میں ایک آدھ ہی تھا اور اگر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل بھی کر پاتا تب بھی سرکاری ملازمت اس کے لیے ایک خواب سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔ افلاس و غربت، ناداری اور جہالت خاص طور پر مسلمانوں کے حصّے میں تھی اس لیے کہ عمداً ان کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دروازے اور راستے مسدود کر دیئے گئے تھے اور جوان نسل بھی مختلف پیشوں کو ہی اختیار کرنے پر مجبور تھی کاروکسب سے جو اوّل درجے کی پیداوار مسلمان ہاتھوں سے نکلتی تھی وہ معمولی: روزانہ یا ماہانہ اجرت و مزدوری کے عوض میں ان سے خرید لی جاتی تھی اور اسی معمولی سی اجرت پر اکثریتی فرقہ کے لاتعداد کنبے راضی بہ رضائے حق رہ کر خاموشی اور صبر و سکون سے زندگی گذارتے تھے۔

مسلمانوں پر بالخصوص جو مظالم ہوتے اس کی ڈوگرہ حکومت سے قبل کی حکومت کے عہد میں ایک روایت چلی آ رہی تھی سکھوں نے سال ۱۸۱۹ء (۱۲۳۴ھ) میں کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال دیوان موتی رام صوبہ دار مقرر ہوا۔ اور کشمیری پنڈت بیربل در اُس کا مشیر۔ مسلمانوں کی سرینگر میں واقع مشہور جامع مسجد کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اذان موقوف ہوئی اور گاؤکشی کی پاداش میں پورے قبیلے کو قتل اور جائیداد کو نیلام اور خاندان کے افراد کو مٹا دیا جاتا۔ پتھر مسجد جو سرینگر میں واقع ہے، کو تنزول سرکار میں شامل کر لیا گیا اور خانقاہِ معلّیٰ کو شہید کرنے کے لیے توپ خانہ بھی بھیجدیا گیا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ حسن، جلد دوم صفحہ ۷۵۷، - ۷۵۹ ۔

ایک اور صوبیدار سردار ہری سنگھ (سال ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۲۰ء) نے اُن تمام مسلمان علماء، وفضلاء اور بزرگوں کی جاگیریں ضبط کرلیں جو اُن کو مغلیہ بادشاہوں نے اُن کی علمی برتری کے صلے میں دی تھیں۔[1]

اگرچہ ڈوگرہ عہد (سنہ ۱۸۴۶ء تا سنہ ۱۹۴۷ء = سنہ ۱۲۶۲ھ تا ۱۳۶۷ھ) میں مسلمانوں کی عبادت گاہیں محفوظ تھیں لیکن مجموعی طور پر یہ پوری صدی اکثریتی فرقہ کے لیے بالخصوص ذہنی اور جسمانی غلامی کی بدترین صدی تھی، اکثریتی فرقہ بے بس تھا۔ اُن کے ذہنوں تک سے آزادی کا تصوّر مٹا دیا گیا۔ اُن کے ذہنی استعداد اور اُن کی قابلیت اور ذہانت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اور حکّام نے اس بات کی اپنے تابعدار اور نمک خوار خیرخواہ طبقے کے افراد کی وساطت سے خوب تشہیر کرادی کہ اکثریتی فرقے کے افراد ناقابل لوگ ہیں۔ گویا اس طرح سے جس کشمیر کو جنّت ارضی کہا گیا ہے وہی کشمیر جو کشمیریوں کا اپنا گھر تھا اُن کے لیے دوزخ بن گیا تھا۔ اور یہ اُن ڈوگرہ راجوں مہاراجوں کی ارادی طور پر کشمیریوں کو پامال کرنے کی وجہ سے تھا جو اصولاً غیر کشمیری تھے اور جنہوں نے کشمیر کو پچھتر لاکھ روپے کے عوض میں خرید لیا تھا۔[2]

ڈوگرہ مہاراجوں نے اکثریتی فرقہ کی زبوں حالی اور افلاس میں اضافہ کرنے کی جو کوششیں کیں اور جس طرح سے انھوں نے خود اپنے متعصّبانہ کردار سے اسے پامال کیا اور بالخصوص مسلمان رعایا کو جن شکنجوں سے گزار دیا ان میں سے اکثر واقعات کے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ بھی ایک ہمعصر کی حیثیت سے عینی شاہد تھے اور کشمیریوں کی ذلّت کی یہ غلامی اور بے بسی اُن کے لیے ناقابلِ تحمّل تھی۔[3]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۷۵۹۔ [2] اس زمانے میں ہزارہ بھی کشمیر میں شامل تھا لیکن چونکہ ہزارہ کے غیور لوگوں نے اس عہدنامہ یا بیعنامہ کی سخت مخالفت کی اسلیے متاعِ خرید میں شامل نہیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد دوم صفحہ ۸۱۰)

[3] حضرت علامہؒ نے کشمیریوں کی تحریک آزادی کی حوصلہ افزائی میں قلمی، قدمی، سخنی اور اشکی سے بھرپور حصّہ لیا ہے جس کے لیے کشمیری قوم اُنکی سپاس گزار رہے (باقی اگلے صفحہ پر)

غنی کشمیریؒ اور حضرت علامہؒ کے کشمیر کے بارے میں یہی ذہنی اور جذباتی اشتراک ہمنوائی کا باعث ہے۔ دونوں محبِ وطن خاموش نہ رہ سکے۔ ڈھائی صدی سے زائد عرصہ پہلے کی غنی کشمیری کے کراہنے کی صدائیں حضرت علامہؒ کی فریادوں میں ضم ہوئیں اور حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) (چونکہ اس کتاب کا مقصد تحریکِ آزادی کی داستان لکھنا نہیں اس لیے اس بارے میں تحریک حریت کشمیر (دو جلد از رشید تاثیر) روئیداد تاریخ سکھاں و افغانستان از سلامت علی، گلاب سنگھ از راجہ رام شرما، مس گورنمنٹ ان کشمیر از رابرٹ تھروپ۔ کشمکش از چودھری غلام عباس خاص طور پر مطالعہ کرنے کے لیے مفید ہیں) حضرت علامہؒ نے کشمیر اور کشمیریوں کی غلامی اور تہی دستی اور بیچارگی و پستی کے غم میں شاہ ہمدانؒ سے عملی و دینی اور سیاسی راہنمائی طلب کرنے سے پہلے ساقی نامہ (پیامِ مشرق ۱۹۲۲ء) نام کی نظم میں اپنے سوزِ دل کا اظہار کر کے کہا تھا ؎

کشیری که با بندگی خو گرفته   بتی می تراشد ز سنگِ مزاری
ضمیرش تهی از خیالِ بلندی   خودی ناشناسی ز خودِ شرمساری
بریشم قبا خواجه از محنتِ او   نصیب تنش جامهٔ تار تاری
نه در دیدهٔ او فروغ نگاهی   نه در سینهٔ او دل بیقراری
ازان می فشان قطره ای بر کشیری   که خاکسترش آفریند شراری

(کشمیری جسے غلامی کی عادت پڑ گئی ہے مزار کے پتھروں سے بت تراش رہا ہے، اس کا ضمیر بلند خیالی سے خالی ہو چکا ہے۔ وہ خود کو نہیں پہچان سکتا بلکہ اپنے آپ سے شرماتا ہے اس کی مشقتوں سے امراء ریشمی لباس پہنا کرتے ہیں اور خود اس بدبخت کے نصیب میں پھٹے پرانے کپڑے ہیں، نہ اسکی آنکھوں میں روشنی کی کوئی چمک ہے نہ ہی اُس کے سینے میں بیقرار دل ہے۔ خداوندا! کشمیری کے دل پر اُس شراب کے قطرے ڈالدے جس کی برکت سے اسکی راکھ میں پھر سے چنگاریاں پیدا ہوں) کشمیری کے دل میں ان ہی چنگاریوں کے پیدا ہونے کے طریق کار کی خاطر حضرت علامہؒ نے حوض کوثر پر کشمیریوں کے روحانی پیشوا حضرت

(باقی اگلے صفحہ پر)

علامہؒ جب بھی کشمیر کی زبوں حالی اور کشمیریوں کی غلامی کی کیفیت کی طرف متوجہ ہوتے تو اپنی منظوم و منثور تحریروں سے بلکہ حکومتِ وقت کے ایوانوں میں بھی آزادیٔ کشمیر کے حق میں عملی جدوجہد کا ثبوت دے کر مسلمانانِ کشمیر کے لیے بالخصوص اور کشمیریوں کے لیے بالعموم خود یقینی اور استحکام کے جذبات پیدا کرتے ۔

کشمیریوں کی مظلومی، تباہ حالی، ذلت کی غلامی، حکمرانوں کی فرقہ وارانہ بغض و حسد اور کینہ پروری پر مبنی حکومت کی سفاکیوں کے مناظر وہ حادثات تھے جو دراصل غنی کشمیریؒ اور حضرت علامہؒ کے مشترک زخم تھے اور جن کا مداوا حضرت علامہؒ نے کشمیریوں کے محسنِ اعظم حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے فکری معراج کے سفر میں جنت الفردوس کی طرف جاتے ہوئے حوضِ کوثر پر ملاقات کے دوران ان کی طرف سے غنی کشمیریؒ کی زبانی کشمیریوں کے لیے بیان کیا ۔

جاوید نامہ میں حضرت علامہؒ اس کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کے کنارے سے ایک درد بھری آواز سنائی دی کہ :

جمع کردم مشت خاشاکی کہ سوزم خویش را
گل گمان دارد کہ بندم آشیان در گلستان

(میں نے تو خود کو جلانے کے لیے مٹھی بھر خاشاک جمع کی ۔ پھول یہ خیال کرتا ہے کہ میں باغ میں گھونسلہ بنانے کی تیاریاں کر رہا ہوں)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ غنی کشمیریؒ کی موجودگی میں ملاقات کی اور اس طریق کار کا نسخہ کشمیریوں کے لیے ان کے ہاں سے لے آئے ۔ بعد میں حضرت علامہؒ نے ارمغان حجاز میں "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض" کے زیرِ عنوان تیسری نظم میں کشمیر جیسے ایران صغیر نامی ملک کی بدحالی اور استعمار اور کشمیریوں جیسے شریف و نجیب اور چرب دست و تر دماغ قوم کی پامالی سے عمیق طور پر متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ سے ظالم حکمرانوں کا بدلہ لینے اور مکافات کی التجا کی ہے: آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر ؛ کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ ؛ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

(ملاحظہ ہو پیام مشرق اور ارمغانِ حجاز)

مولانا رومیؒ، جو اس رُوحانی سفر میں حضرت علامہؒ کے راہبر تھے، نے حضرت علامہؒ سے کہا کہ "یہ درد بھری آواز کشمیر کے رنگین نوا شاعر ملّا محمد طاہر غنیؔ کی آواز ہے جو ظاہر و باطن دونوں صورتوں میں غنیؔ (بے نیاز) ہے اور اس آواز کو وہ اس سید والا مرتبت حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں بلند کر رہا ہے جو ؎

سیّد السّادات سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ امم

(سیدوں کے سید ہیں، عجم کے سالار ہیں
جن کا ہاتھ امتوں کی تقدیر کا معمار ہے)

تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت

(امام غزالیؒ نے جو اللہ ہو کا درس پڑھا۔ وہ معہ ذکر و فکر کے ان ہی کے خاندانی بزرگوں سے حاصل کیا تھا)

مُرشدِ آن کشورِ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطین را مشیر

(اس جنت نظیر ملک کے روحانی پیشوا ہیں
اور امیروں، درویشوں اور سلطانوں کے مُشیر ہیں)

خطّہ را آن شاہ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین

(سمندر جیسے سخاوت مندانہ ہاتھوں والے اُس شہنشاہ نے خطّۂ کشمیر کو علم عطا کیا، صنعت و حرفت عطا کی اور تہذیب و دین عطا کیے)

آفرید آن مردِ ایرانِ صغیر
با ہنرہای غریب و دلپذیر

(اس شخص نے ایک چھوٹا ایران، عجیب و غریب اور دلپذیر فنون و ہنر کی صورت میں وجود میں لایا)

یک نگاہِ او گشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہی بدہ

(اس کی ایک نظر سے سیکڑوں گرہیں کھُل جاتی ہیں۔ اٹھو اور اپنے دل میں اس کے تیر کو جگہ دو)

غنیؔ سے اِس درد بھری آواز کو اور حضرت شاہ ہمدانؒ کی مدح میں یہ کلام سننے کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ، اپنے روحانی مرشد مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی خدمت میں غنیؔ کشمیری کی موجودگی میں حاضر ہوتے ہیں اور خیرِ کثیر و کوثر کی اُس پاکیزہ مجلس میں جو سوال و جواب ہوتے ہیں، ان کی تفصیل سوال و جواب ہی کی صورت میں یوں ہے:

حضرت علامہؒ: آپ سے میں اللہ تعالیٰ کے اس راز کی مصلحت جاننا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے فرمان برداری کا خواستگار ہے لیکن ساتھ ہی شیطان کو بھی پیدا کیا بدی اور برائی کو مرغوب اور دلپذیر بنایا اور ہم سے نیکی کے عمل کی خواہش کی۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ فرمائیں کہ آخر یہ کیا افسون نگری ہے؟ بدنشین، قمار بازی یعنی کیا مطلب رکھتی ہے؟ (شیطان جیسے بدنشین قمار باز کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟) مٹھی بھر خاک کا آدمی اور پھر یہ گردشِ فلک؟ آپ ہی فرمائیں کیا ایسا اُسے زیب دیتا ہے؟ آخر ہمارے سارے امور اور ہمارے سارے خیالات اور ہماری ساری محنتیں کیوں ضایع اور افسوس خوردہ ہو جاتی ہیں؟

حضرت شاہ ہمدانؒ: جو شخص اپنے آپ سے باخبر ہوگا اور اپنے آپ کو جانتا ہوگا وہ تو بدی سے بھی نیکی ہی کو وجود میں لے آتا ہے، شیطان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا آدمی کے لیے باعثِ وبال ہے لیکن شیطان (بدی) کے ساتھ لڑنا آدمی کے لیے باعثِ جمال ہے (بدی کو اپنانا آدمی کے لیے زوال ہے، لیکن اس کی مخالفت کرنا آدمی کے لیے ایک افتخار ہے) آدمی کو بدی پر حملہ آور ہونا چاہیے تو ایک تلوار ہے اور بدی سنگ فساں ہے۔ بدی کے خلاف تو جس قدر لڑے گا اُسی قدر تیری مردانگی کے جوہر روشن تر ہوتے جائیں گے، جب تک بدی کی سان سے تیری تلوار نہیں ٹکراتی تمہاری دلاوری کی دھار تیز نہیں ہوگی اس لیے تجھے شیطان سے برسرِ پیکار رہنا ہوگا۔ تیز ہو بلکہ تیز تر تاکہ تمہاری ضرب سخت سے سخت تر پڑے، ورنہ دونوں دنیاؤں میں تم بدقسمت ہی رہو گے اس لیے جب تک تمہاری جان باقی ہے شیطان (بدی اور ظلم) سے لڑو

حضرت علامہؒ: اس آسمان کی چھت کے نیچے آدمی آدمی کو کھا جاتا ہے (ظالم مظلوم کو پامال کر کے اُسے نیست و نابود کر دیتا ہے) اور ایک قوم دوسری قوم پر غالب آ جاتی ہے، میری جان تو اسپند کے دانوں کی طرح خطۂ کشمیر

کے مظلوم کشمیریوں کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر آگ میں جل رہی ہے اور میرے دل سے درد مند نالے منڈلا رہے ہیں۔ ایک زیرک اور دانشمند اور حسین و جمیل قوم ہے۔ یہ کشمیری قوم جس کی ہنرمندی دنیا بھر میں مشہور و معروف ہے لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق اس کی صفات کے یہ ساغر خود اس کے اپنے ہی خون میں ڈول رہے ہیں اور بے بسی کے ساتھ صبر و سکون پر راضی ہو گئی ہے، میری نے میں اس قوم کی اسی بے بسی کے نالے مضمر ہیں، جب سے یہ قوم خود شناسی کے جذبے سے خالی ہو گئی ہے تب سے خود اپنے ہی وطن میں اجنبی بن گئی ہے۔ اس کی محنتوں اور مشقتوں کی اُجرت و مزدوری غیروں کے تصرف میں ہے گویا اس کے ندی نالوں کی مچھلیاں تک دوسروں کے کانٹے کے دائرۂ اختیار میں ہیں۔ قافلے منزلوں کی طرف قدم بہ قدم بڑھ رہے ہیں۔ لیکن کشمیری قوم بدستور اپنے عمل میں سُست کمزور غیر متاثر اور ناپختہ ہے، عرصۂ دراز تک غلامی کی ظلمتوں میں رہ کر اس کے جذبات مر چکے ہیں اور اسکی رگوں کا خون تک ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ لیکن حضرات! ایسا بھی نہیں ہے کہ کشمیری قوم ہمیشہ ایسی ہی تھی اور ہمیشہ سے ہی اس نے اپنی پیشانی غیروں کی چوکھٹ پر جھکائی ہے۔ کسی زمانے میں یہ قوم ایک صف شکن قوم تھی، ایک زبردست، غالب، جانباز، بہادر اور باحوصلہ قوم بھی تھی۔

اللہ تعالیٰ اس قوم کی سرزمین پر خاصا مہربان ہے اور اسے جنت نظیر مناظر سے آراستہ کیا ہے، آپ اس کے پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کا مشاہدہ کریں آپ اس کے چناروں کی آگ کی طرح دہکتی ہوئی شاخوں کو دیکھیے! موسمِ بہار میں تو اس کے پتھروں سے گویا لعل و جواہر کی روشنیاں پھوٹتی ہیں اور اس کی خاک سے رنگوں کے طوفان اُٹھتے ہیں۔ پہاڑوں اور میدانوں اور دشت و دمن میں بادل کے ٹکڑے کسی ندّاف کی کمان سے نکل کر اُڑتے ہوئے روئی کے گالے جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ خود میں نے اس کے

پہاڑوں اور جھیلوں اور غروب آفتاب کے مناظر میں اللہ تعالیٰ کو بے حجاب دیکھا ہے۔

ایک دن میں اس سرزمین کے باغ نشاط میں نسیم کی ہوا کی طرح گھوم رہا تھا اور خوشی و مسرت کے جذبات میں اپنے اس مرشد رومیؒ کی طرح نے کی لے میں گنگنا رہا تھا کہ درخت کی ٹہنی پر ایک چھوٹا سا پرندہ چہک چہک کر پکار رہا تھا کہ "اس حسین و خوبصورت وادی کی بھلا کیا قدر و قیمت؟ لالے اور نرگس کے پھول آتے ہیں، پھوٹتے ہیں، نوروز کی ہواؤں سے کھل بھی جاتے ہیں۔ چاندنی کی روشنی سے بھی سفید تر نسترن کے پھول ان پہاڑوں اور دامنوں پر ہزاروں سال سے کھلتے آئے ہیں۔ سالہا سال سے گلاب کے پھول آئے اور گئے لیکن ہماری اس مٹی سے کوئی دوسرا سلطان شہاب الدین[1] نہیں اُٹھا۔"

مرغِ سحر کے سوز بھرے اس نالہ و فریاد سے میری رُوح تڑپ اٹھی اور ایک نیا ولولہ اور ایک نیا اضطراب پیدا ہوا اور اسی اثناء میں ایک اور دیوانۂ کشمیر کو فریاد کرتا ہوا سنا جس کی درد بھری فریادوں نے مجھے بے صبر اور

---

[1] سلطان شہاب الدین کشمیری (۷۶۱ھ ۔ ۱۳۵۹ء - ۱۳۷۸ء) جس نے فتوحات کا ایک سلسلہ شروع کر کے کشمیر کو طاقتور ترین ممالک کی صف میں شامل کر دیا۔ پکھلی کنر سواد، لداخ، تبت، کاشغر، گلگت، پشاور، کابل، بدخشان، ملغان، غور، غزنی، قندھار، ہرات اور دہلی یہ سب سلطان موصوف کے زیر اقتدار تھے، شراب اور عورت سے متنفر تھا اور غیر عورتوں کو بھی اپنی قوم کی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ رانی لکشمی بائی اس کی محبوب رانی تھی اور کوہ ماران (جو ہاری پربت بھی کہلاتا ہے) کے ارد گرد دامن میں اس رانی کے نام پر لکشمی نگر کا شہر آباد کیا تھا سلطان بیشتر فوج کشی اور تسخیر ممالک کی طرف متوجہ رہتا تھا اور اس طرح سے کشمیر اور کشمیری قوم کی دلاوری اور دلیری کا شہرہ اُسی سلطان کے توسط سے دُنیا بھر میں ہوا۔ ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد ۲ - واقعات کشمیر۔

بے ہوش کر دیا وہ کہہ رہا تھا کہ

"مجھے تنہا چھوڑ دیجیے اور مجھ سے مست بھرے گیتوں کی اُمّید نہ رکھیے
پھولوں کی ان ٹہنیوں کی دلکشی و دلربائی کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیے
یہ محض طلسم ہے رنگ و بو کا۔ تو کہہ رہا ہے کہ لالہ کے پھولوں سے شبنم ٹپکتی ہے۔ غافل ہے وہ جو نہر کے ساحل پر رو رہا ہے، یہ جو تو نے ابھی نالہ و فریاد سُنی، یہ پرندے کی زبانی نہیں تھی، بھلا اس مٹھی بھر پروں والی ننھی جان سے اس طرح کی سوزناک فریادیں کب اُٹھ سکتی ہیں۔ یہ در اصل ہمارے کشمیر کے ایک دردمند شاعر غنی کی رُوح کشمیریوں کا ماتم سُنا رہی تھی جو اُن کی موت کی آرزو پر نوحہ خواں تھی اور تجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی کہ:

"اے صبح کی ہوا! اگر جنیوا[1] کی طرف سے تمہارا گزر ہو تو میری طرف سے وہاں مجلسِ اقوام[2] میں جا کر کہہ دو کہ دہقان اور کھیت، ندیاں اور باغ تک بِک گئے، ایک قوم بِک گئی اور کتنی سستی بِک گئی"[3]

---

[1] سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر جو لمان کے ساحل پر واقع ہے، اقوام متحدہ کا مرکز پہلے اسی شہر میں تھا اور اقوام متحدّہ پہلے لیگ آف نیشنز کہلاتا تھا، حضرت علامہؒ کا اشارہ مجلس اقوام میں اسی لیگ سے ہے جنیوا کا شہر قدیم عجائب گھروں اور ایک قدیم یونیورسٹی کا شہر ہے اور دنیا کی مشہور گھڑیوں کے کارخانوں کا مرکز بھی ہے یہ بین الاقوامی ریڈ کراس کا دفتر اسی شہر میں واقع ہے۔

[2] مجلسِ اقوام یعنی لیگ آف نیشنز جو پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی صلح برقرار کرنے کے مقصد سے وجود میں آئی اور ۲۸ جون سال ۱۹۱۹ء میں اس کی بنیاد جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں پڑی۔ یہ لیگ عہدنامۂ وارسا کے مطابق بنی اور اس عہدنامہ کا پہلا حصّہ باب ۲۶ تک اسی لیگ آف نیشنز سے متعلق ہے اور یہ حصّہ اقوام متحدّہ کا اساس نامہ کہلاتا ہے، اقوام متحدہ دو قسموں کے ممبروں پر مشتمل تھا۔ بنیادی اعضاء اور وہ اعضاء جنہیں بعد میں مستقل اعضا کے طور پر قبول کیا گیا۔

[3] انگریزوں کی طرف سے ڈوگرہ راجا گلاب سنگھ کو کشمیر ۷۵ لاکھ روپے کے عوض فروخت کرنے کی طرف اشارہ ہے، مشہور ہے کہ گلاب سنگھ کہا کرتا تھا کہ میں نے کشمیر کو مع اس کے لوگوں کے خرید لیا ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ: سُن لو میرے فرزند! میں تمہیں ایک باریک راز سے آگاہ کرتا ہوں۔ جسم سراپا مٹّی ہے اور جان (رُوح) ایک والا مرتبہ اور بلند قدر و قیمت والی چیز! جسم کو رُوح کی بالیدگی کے مصرف میں لے آنا چاہیئے اور اس طرح سے پاک اور خاک میں فرق اور آگاہی ہوگی۔ اگر تم جسم سے کوئی ٹکڑا کاٹ دو گے تو یہ ٹکڑا ہمیشہ کے لیے جسم سے الگ ہوگیا لیکن رُوح جب کچھ پانے کی جلوہ گری میں مصروف عمل رہے تو وہ لوٹ آتی ہے۔ روح کا جوہر اور اسکی اصلیت دراصل کسی چیز کے مشابہ ہے ہی نہیں، جسم کے قفس میں بند ہو کر بھی یہ بند نہیں، اگر تم اسے روک کر رکھو گے تو یہ تمہارے جسم میں مرجائیگی لیکن اگر تم اسے نثار کر دوگے اور اعلیٰ و ارفع مقصد پر قربان کردوگے تو پھر یہ ایک قوم کیلئے روشنی کا مینار بنجائیگی۔ روح معلوم ہے کیا ہے؟

اے میرے جوان مرد فرزند! جان دینی کیا چیز ہے۔؟ میرے جوانمرد فرزند! جان دینی یعنی اللہ کی ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ ہو جانا، پہاڑوں کو جان کے سوز و حرارت سے پگھلا دینا۔ جلوہ گری کی مستی میں مصروفِ عمل ہونا معلوم ہے کسے کہتے ہیں؟ خود کو پانا، خود آگہی، خودی اور خود شناسی، یہ تو گویا راتوں کو ستارے کی طرح روشن ہونا ہے۔ خود ناشناسی، خود ناآگہی اور خود کو نہ پانا، اور اپنی خودی اور عظمت و برتری سے بے خبری کے معنی ہیں اپنی نابودی، اور خود شناسی اور خود آگہی کے معنی ہیں اپنی گم گشتہ ذات کو واپس اپنی ذات میں لے آنا۔ اور اس طرح سے اپنی ضعیف و مردہ ذات میں فولادی خاصیت پیدا کر کے اسے طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنا دینا۔

جو شخص اپنی خودی اور معرفتِ نفس کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ مادّی آلائشوں سے برتر اور دنیوی حرص و طمع سے بے نیاز ہو کر بدن کی خواہشوں اور جسم کے زندان کو پھلانگ کر آزاد ہو جاتا ہے اور پھر زمان و مکان کو مسخّر کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔ گویا وہ شخص جو جادہ گری میں مصروف اور متوالا بن کر اپنی زندگی بسر کرتا ہے، اُس کی نظروں میں تو زخم کھانا ہی شیریں ترین چیز ہے۔

وہی سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرتا ہے اور اُن پر غالب آجاتا ہے۔ ایسے ہی شخص کی نظروں میں جان ہوا کی طرح ارزان ہوجاتی ہے، وہ حق کے لیے جان فروش اور جان باز بن جاتا ہے، موت سے نہیں ڈرتا۔ قید و بند اور زندان کی سختیوں اور آزمایشوں سے خائف نہیں ہوتا بلکہ زندان ہی اس کے آگے لرزتے ہیں۔ اس کے تیشے کے ضرب سے سنگین چٹانیں پاش پاش ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دُنیا سے اپنا حصّہ اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرلیتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ جان سے گزرجانے کے حقیقی جذبے کی برکت سے ہی وہ جان کا مالک ہے ورنہ اس کی جان دو ایک سانسوں کی مہمان ہے۔ جس نے اپنی جان کو اعلیٰ اور بلند مقصد کے لیے قربان کرنے پر یقینِ کامل پیدا کرلیا وہی زندہ ہے، مرتا نہیں: جس نے یہ رمز باریک نہیں سمجھ لیا وہ ہمیشہ کے لیے مرجاتا ہے۔

حضرت علامہؒ:

نیکی اور بدی کی حکمت و مصلحت سے تو آپ نے مجھے واقف کردیا، اب اے پیرِ دانا! ایک اور نکتہ میرے لیے واضح کردیجیے۔ آپ تو حقیقت بین مرشدوں کے مُرشد ہیں [1] اور پادشاہوں کے محرمِ اسرار بھی ہیں۔ یہ فرمائیں کہ ہم تو غریب اور نادار لوگ ہیں اور حکمران ہم سے باج و خراج وصول کرلیتے ہیں۔ آخر تخت و تاج کے اعتبار کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟

حضرت شاہ ہمدانؒ: مشرق اور مغرب میں بادشاہت کی بنیاد معلوم ہے کیا ہے؟ یا قوموں کی رضا ہے یا جنگ و جدل یعنی یا قومیں اپنی مرضی سے کسی کو اپنا حکمران

---

[1] حضرت شاہ ہمدانؒ کی روحانی عظمت کی طرف اشارہ جس کے بارے میں ایک اور جگہ حضرت علامہؒ نے فرمایا ع یک نگاہ او کشاید صد گرہ۔

[2] حضرت شاہ ہمدانؒ کی مشہور تصنیف ذخیرۃ الملوک کی طرف اشارہ ہے۔

بنا لیتی ہیں اور یا کوئی بہ زورِ شمشیر قوموں پر حاکم ہو جاتا ہے۔ اے میرے فرزندِ والا مقام! میں آشکارا طور پر تجھے بتاتا ہوں کہ دو آدمیوں کے سوا اور کسی کو خراج دینا حرام ہے۔ یا اُس شخص کو جس کی شان اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ہو[1] اور حق و صداقت ہی اس کی دلیل و برہان ہو، یا اُس شخص کو جو ایک تند و تیز طوفان کی طرح ممالک کو مسخّر کرنے والا، جنگوں میں جان باز، کشور کُشا اور قاہر اور ایّامِ امن و سلامتی میں رعایا کے لیے شفیق اور نرم خُو ہو۔ جو دمِ جستجو گرم اور دمِ گفتگو نرم ہو۔ پاک دل ہو، پاکباز ہو۔ صاحبِ جلال بھی ہو اور صاحبِ جمال بھی۔ شمشیر کی طرح جنگوں میں سخت اور گرم، لیکن رعایا کے ساتھ حکمِ خدا اور رسولؐ کے مطابق ریشم کی طرح ملائم اور نرم۔ حرب و ضرب میں بے خوف لیکن رعایا کے لیے با خوف۔

ایران اور ہندوستان کو خریدا جا سکتا ہے لیکن بادشاہی کو نہیں خریدا جا سکتا۔[2] حکمرانی صرف وہاں کے لوگوں کا حق ہے۔ اے با ذوق و ہنر فرزند جوان! شیشہ گروں کی دُکانوں سے جامِ جم جیسی چیز کہاں ملتی ہے اور اگر ملے گی بھی تو وہ محض ایک معمولی سا شیشہ ہو گا اور شیشے کی خاصیت سوائے

---

[1] اشارہ ہے اس آیتِ کریمہ کی طرف: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" (سورۃ النّسآء۔ آیت ۵۹) یعنی: "اے ایمان لانے والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو۔ اور اُن کا بھی جو تم میں اہلِ حکومت (اقتدار) ہیں۔" یعنی جو مسلمان ہیں اور اللہ و رسول کے اطاعت گزار ہیں۔

[2] حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ایران کو ہندوستان کو یا ایران کی زمین کو خریدا جا سکتا ہے لیکن وہاں کی حکمرانی اور بادشاہت جو فقط اور فقط وہاں کے لوگوں کا حق ہے اسے نہ کسی وطن فروش کے ہاتھوں بیچا جا سکتا ہے نہ ہی کسی آدمی کے ہاتھوں خریدا جا سکتا ہے۔

ٹوٹ جانے کے اور ہے ہی کیا؟ جامِ جم آزادی کی روشنی ہے اور شیشہ گری قوم کی کم طاقتی۔ قوم فولادی بن جائے تو آزادی چھین سکے گی ورنہ قوم ٹوٹ جانے کی حالت میں ہی رہے گی۔ اس لیے شیشوں کو توڑ دو اور جامِ جم حاصل کرو۔ جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ ہے ؎ (ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات) شاہین بن جاؤ اور اپنی فضاؤں کو مسخّر کر لو۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی بصیرت افروز اور جوش و خروش سے پُر عملی و متحرّک فرمایشات سے مُلّا محمد طاہر غنی کشمیریؒ کا حوصلہ اور بڑھا اور اُس نے مرشدِ معنی نگاہ اور پیشوای والاجاہ حضرت شاہ ہمدانؒ کے حضور میں فرمایشاتِ عالی کی شہ پا کر حضرت علامہؒ سے کشمیر اور کشمیریوں کی مدّتوں کی غلامی کے داغ و ننگ سے رہائی پانے کی اُمّید کرتے ہوئے کہا:

غنی کشمیری

ہندوستان کو آزادی کا جذبہ کس نے دیا؟ شکاری کو صیّادی کا ہُنر کس نے سکھایا؟ ممولے کو شاہباز سے لڑنے کا ڈھنگ کس نے سکھایا؟ کنجشکِ فرومایہ کو شاہین سے تبرد آزمائی کی تعلیم کس نے دی؟ وہ تو کشمیری ہی ہیں، وہی زندہ دل برہمن زادگانِ کشمیر جن کے چہروں کی رعنائیوں کے آگے سُرخ لالے کے پھول بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں [1] وہی تیز بین اور

---

[1] یہ اشعار اُس وقت لکھے گئے جب کہ ابھی حضرت علامہؒ ہندوستانی نیشنل کانگریس کے لیڈروں بالخصوص اپنے ہموطن کشمیری دوست پنڈت جواہر لال نہرو کی معاونت اور بے تعصبی اور فرقہ پرستی سے اُن کی نفرت کے اوصاف کے بل بوتے پر ان سے کشمیر اور مظلوم کشمیریوں اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں انصاف کا رویّہ برتنے کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں پنڈت نہرو اور حضرت علامہ کے درمیان، بلکہ کانگریس اور ان کے درمیان وسیع اختلافات پیدا ہو گئے۔ ڈاکٹر اقبالؒ ہر اُس لیڈر کو بہی خواہ مانتے تھے جو کشمیر اور مظلوم کشمیریوں کے حق میں کوئی بھی بات کرتا تھا۔ بہرحال غنی کشمیری کی زبان سے کشمیری برہمن زادوں یعنی پنڈت موتی لال نہرو (باقی اگلے صفحہ پر)

پختہ کار اور سخت کوش رہنما جن کی نگاہوں سے فرنگی حکمران کانپ اُٹھتے ہیں یہ سیاسی رہنما تو آخر ہمارے کشمیر ہی کی مٹّی کے ہیں اور یہ درخشاں ستارے تو اصل میں ہمارے کشمیر کے آسمان سے ہی طلوع ہوئے ہیں۔ خاکِ کشمیر کو اگر تم بغیر کسی چنگاری کے سمجھتے ہو تو لمحہ بھر کے لیے اپنے اندر جھانک کر دیکھو کہ آزادی کا یہ سوز جو تم میں شعلہ ور ہے یہ آیا کہاں سے ہے؟ بہار کی ہواؤں کی طرح مُردہ زمین میں زندگی کا خون دوڑانے والا یہ نفس تم میں آیا کہاں سے ہے؟ یہ وہی کشمیر کی یادِ بہار ہے جس کے اثر سے ہمارے پہاڑوں میں بھی رنگ و بو ہے۔ آزادی کا ولولہ ہندوستان کی غلام قوم میں کشمیریوں نے ہی پیدا کیا۔

اتحاد و اتفاق سے ہی انقلابِ عظیم وجود میں آسکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک دن جھیل ولر[1] کی ایک لہر دوسری سے کیا کہہ رہی تھی؟ ـــ کہہ رہی تھی کہ ہم لہریں اس سمندر میں کب تک ایکدوسرے کے ساتھ ٹکراتی رہیں۔ اُٹھو، ذرا ساحل کی طرف چلیں اور دیکھیں کہ خود ہم سے پیدا ہوئی وہ ندی جس کا زور و شور، وادی اور کوہ و دمن میں سُنائی دیتا ہے کس طرح سے پتھروں اور سنگلاخوں سے ٹکراتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اور پہاڑوں تک کی بیخ کنی کرتی جاتی ہے، یہ ہماری جوان ندی جو شہر و دشت کو پامال کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے آخر ہمارے ہی دودھ کی پلی ہوئی ہے۔ کسی غیر کی پروردہ نہیں۔ تو پھر ہم

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) اور اُن کے فرزند جواہر لال نہرو کے حق میں جو تعریفی کلمات نکلے ہیں وہ اس حد تک صحیح ہیں کہ ہندوستان کی زبوں حالی، غلام لوگوں میں آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کا ولولہ ان ہی ذہین کشمیری رہنماؤں نے پیدا کیا۔

[1] سرینگر کے شمال میں پینتیس ۳۵ کلومیٹر کی دوری پر بہت بڑی جھیل جس کے کنارے سوپور قصبہ آباد ہے۔

کیوں خود ساحل کے حدود میں رہ کر اپنے وجود کو مٹا دیں؟ ساحل کی حدوں میں زندگی گزارنا گناہ ہے۔ ساحل ہماری ترقی میں سنگِ راہ ہے۔ ساحل کے ساتھ موافقت ابدی موت ہے۔ پانی میں صبح و شام کروٹیں بدلنا زندگی نہیں، بلکہ آگے بڑھ کر اور ساحل کو توڑ کر کوہ و دشت میں دوڑنا، پھرنا، بڑھنا اور جوش و خروش کے ساتھ دہاڑتے ہوئے آگے چلنا ہی زندگی ہے۔ مرحبا اُس لہر پر جو ساحل کو توڑ کر آگے بڑھی۔

اے زندگی کی گہرائیوں میں اُترنے والے اور مشرق کو زندگی کے تلاطم اور حقیقی مقصد سے آشنا کرنے والے کشمیری نژاد اقبالؔ! اے جگر سوز آہوں کے حامل اقبالؔ جن سے تم خود کو بھی جلاتے ہو اور ہم کو بھی! اے مُرغِ چمن کو نالہ و فریادوں سے آشنا کرنے والے اقبالؔ! کہ تیرے پاک آنسوؤں سے سبزہ کی تروتازگی قائم ہے!۔ اے اپنی نفاستِ طبع سے آرزوؤں کے پھول کھلانے والے اقبالؔ! کہ تجھ سے امید کی کرنیں پھوٹنے لگی ہیں اور کاروانوں کے حُدی خوانوں کی گھنٹیاں تمھاری آواز سے بج رہی ہیں؛ آخر تم کشمیریوں سے کیوں نااُمید ہو؟ کشمیریوں کے دل اُن کے سینوں میں مرے نہیں ہیں۔ برف کی سِلوں کے نیچے بھی اُن کی چنگاریاں بجھی نہیں ہیں۔ ظُلم کے زمہریری ماحول میں بھی انھوں نے وفا شعاری، بیباکی اور انقلاب پسندی کی آگ اور حرارت کو محفوظ رکھا ہے۔

ذرا صبر سے کام لو اقبالؔ! تم دیکھ لوگے کہ کسی اسرافیل کی آوازِ صُور کی منّت لیے بغیر ہی یہ دلیر قوم مُردہ قبروں سے جاگ کر اٹھے گی، جلد ہی وہ وقت آ رہا ہے جب یہ مظلوم قوم غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کے رکھ دیگی۔

اے صاحبِ نظر اقبالؔ! غم نہ کر۔ تو خشک و تر کو اپنی فریاد و نوا سے جلا کر راکھ کر دے۔ ایک مومنِ درویش کے سوزِ دل سے آسمان کی چھت کے نیچے بستیاں ہمیشہ ویران ہوگئی ہیں اور ایک مردِ مومن ہی سلطنت کو جس کی بنیاد ظلم پہ

پر ہوتی ہے اپنے نفس کے جلال سے ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ امّتوں کی تقدیر نوا اور پیغامِ آزادی سے تشکیل پاتی ہے۔ مردِ مومن کی نوا سے ہی قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ تمہاری نوا اور تمہارے جگر سوز پیغام اگرچہ دلوں میں کانٹوں کی طرح چبھ جاتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اب بھی تمہاری ذات اور تمہارا پیغام کسی نے نہیں سمجھا۔ بظاہر جو تم کہہ رہے ہو شعر گوئی کے پردے میں کہہ رہے ہو لیکن تمہارا درد، تمہاری نوا اور تمہارا پیغام شاعری سے بالاتر ہے اور شعر گوئی سے ماوراء۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اِس وقت جو تم ہمارے سامنے ہو، جا کر اپنی ان ہی درد بھری نواؤں سے جنّت میں آشوب پیدا کر دو۔ اور وہاں اپنے مست و مدہوش کر دینے والے تازہ کلام سے اضطراب پیدا کرو۔

غنی کشمیری رح کی فرمائش کی تعمیل میں حضرت علّامہ رحمۃ اللہ علیہ نے سراپا انقلاب کی آئینہ دار غزل حضرت شاہ ہمدان رح اور غنی کشمیری رح کو سنائی۔ اِس غزل میں حضرت علّامہ رح نے اپنے پیغام کی روح پیش کی ہے۔ اور گویا اسلامی نکتۂ نظر سے انقلاب آفرینی کا دستور العمل ہے۔

حضرت علّامہ رح :

درویشی اور فقر کی مستی کو اپنا لے اور ہر دم اور ہر لحظہ فقر و درویشی کی شان و شکوہ اور عظمت و جلال میں پختگی پیدا کرتا رہ ـــ مقابل میں جمشید کی سلطنت و ملوکیت بھی ہو اُسے مٹا دے، اور حکومتِ الٰہیہ قایم کرنے کی جد و جہد کر۔ ملوکیت کو مٹانے سے پہلے نیابتِ الٰہی کی صفات پیدا کرنا بنیادی شرط ہے۔ اور یہ صفات فقر و درویشی اور بے نیازی کی شان و شوکت سے ہی حاصل ہوں گی۔ جب یہ شکوہ و جلال پختگی کے ساتھ وجود میں آجائیں گے تب ہی مردِ مومن ملوکیّت کی بیخ کنی کرنے کے اہل بن جائے گا اور اس کے نتیجے میں مساوات اور عدل کی اسلامی حکومت قائم کر پائے گا۔ نوعِ انسان کو انسان

کاشتکار ہونے سے نجات دے گا اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرا کے صحیح معنوں میں نائبِ حق کی حیثیت سے انسان کو اُس کا صحیح مقام لوٹا دے گا۔ مجھ سے جب پوچھا گیا کہ یہ دنیا جس میں ملوکیّت نے ظلم و جور اور جبر و استبداد سے ایک پوری قوم کو غلام ابنِ غلام بنا کے رکھ چھوڑا ہے، تمہارے لیے سازگار ہے تو میں نے کہا نہیں، قطعاً نہیں۔ تو مجھ سے کہا گیا کہ ایسی دنیا کو مٹا ڈال۔ اور فرمانِ الٰہی کے مطابق کی حکومت کو قائم کر۔ افسوس تو یہ ہے کہ خانقاہوں کی وہ رسم اُٹھ گئی، جہاں فدایانِ اسلام کو نیابتِ الٰہی کا درس دیا جاتا تھا۔ آج کوئی شایستہ راہ نما وہاں نظر نہیں آتا جو حضرت شاہ ہمدان رح کی طرح کشمیری قوم کو ظلم و ستم کو مٹانے اور حق کو قایم کرنے کے لیے جہاد کی تلقین فرمائے۔ ایسے حالات میں لازمی ہے کہ رقص و سرود کے رسیا اور لذّات و شہوات کے پرستار دُنیوی سیاسی رہنماؤں کو نظر انداز کر کے صاحبانِ دل کا دامن پکڑ کر اُن کے حضور میں رہا جائے اور اُن ہی کی فرمایشات پر عمل کیا جائے۔

اے لالۂ صحرائی[۱]! تم اکیلے ہی اندر ہی اندر نہیں جل سکتے۔ اِس سوزِ دروں میں تجھے قوم کو شریک کرنا ہی پڑے گا۔ اور اس آگ کو اُن کے دلوں میں منتقل کرنا ہوگا تاکہ ان کی قلبِ ماہیت ہو اور وہ سراپا انقلاب بن کر ظلم کو مٹا ڈالنے کے اہل بن جائیں۔ تو ان کے سوزِ دل سے واقف ہے کہ غلامی اور ذلت و خواری میں صدیوں سے مبتلا رہ کر اُن کا دل اس اندوہ کی آگ میں کس طرح سے جل رہا ہے کہ وہ کب آزاد ہو کر آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔ تو ہی ان کے خون میں حرارت و حدت پیدا کر سکتا ہے۔ اگر یقین

---

[۱] لالۂ صحرائی! مراد ہے خود اقبال رح جو کشمیریوں کی غلامی سے آزاد ہوتے کے غم و اندوہ میں اکیلے ہی آگ میں اندر ہی اندر جل رہا ہے۔

نہ ہو تو دُنیا کے پیکر کو چاک کر کے آزما لے۔ تیری مجاہدانہ درس و تلقین سے کشمیری قوم آزادی کے عشق میں سلطنت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالے گی مگر شرط یہ ہے کہ ایک مخلص اور بے لوث رہنما جو اِن کی سادگی و شرافت کا استحصال نہ کرے انھیں میسّر ہو جائے۔ عقل کی روشنی سے منزل نمایاں ہو جاتی ہے لیکن عشق کے بغیر منزلِ مراد ہاتھ نہیں آسکتی اور اس کے لیے کسی صاحبِ دل عارف و مردِ خدا کا دامن پکڑ لینا ناگزیر ہے۔ عقل سے حکومت مل سکتی ہے لیکن حکومت کرنے کا طریقِ کار عشقِ خداوندی سے معلوم ہوتا ہے اور اس کے لیے عقل کو عشق کے تابع رکھنا ہوگا اور یہ عشق بھی مردِ خدا کی راہنمائی سے ہی میسّر ہو سکے گا جبھی نیابتِ الٰہی کا مقصد پورا ہو گا۔

میں نے اپنے دل کے یہ داغ خونِ جگر کی صورت میں آنکھوں سے بہادیئے۔ اب اے قومِ کشمیر! لعلِ بدخشان کی میری اس کانِ بے بہا سے چند لعل اٹھا کر انہیں اپنی انگوٹھی کی زینت بنا۔ یہ جو میں نے جدوجہد کی تعلیم تجھے دی ہے اِسے ابدی آزادی کے حق میں دستورالعمل بنادے تاکہ دین و دنیا کی سرخروئی تجھے نصیب ہو!

حوضِ کوثر پر حضرت شاہ ہمدانؒ اور غنی کشمیریؒ اور حضرت علّامہؒ کی باہمی گفتگو کا خُلاصہ یہ ہے کہ تینوں حضرات اہالی کشمیر کی زبون حالی سے سخت متأثر ہیں اور کشمیریوں کو غلامی سے نجات پانے کے لیے دعوتِ عمل دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں علّامہ اقبالؒ نے جو غزل غنی کشمیریؒ کی فرمایش پر شاہ ہمدانؒ کے حضور میں سنائی اس میں تاکیداً انہوں نے یہ پیغام دیا کہ ؎

در میکده ها دیدم شایسته حریفی نیست   با رستمِ دستان[1] زن با مغبچه ها کم زن

---

[1] مولانا رومؒ نے بھی مردِ کامل کی راہبری کا ذکر اپنی ایک مشہور غزل میں کیا ہے اور مردِ کامل کو رُستمِ دستان اور شیرِ خدا سے مشابہ کر کے اُنکی آرزو کی ہے ؎

زین همرہانِ سست عناصر دلم گرفت ؛ شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

عقل است چراغ تو در راہگذاری نہ   عشق است ایاغ تو با بندہ ی محرم زن

یعنی کسی رستم دستان کا ہاتھ پکڑ لے اور مرد مومن صاحب دل کی راہنمائی اور درس و تعلیم پر عمل کرے۔ یہ دونوں شعر کشمیریوں بالخصوص کشمیری مسلمانوں کے حق میں تلقین ہے کہ وہ حضرت شاہ ہمدانؒ کے عملی مجاہدات اور تعلیمات کی روشنی میں جہاد کریں، حق کے لیے، غلامی سے نجات پانے کے لیے اور مٹا ڈالیں اس حکومت کو جس کی بنیاد محض ذاتی عداوت، فرقہ پرستی، انتقام جوئی، ظلم، استبداد اور غلام بنانے کی کثیف ذہنیت پر رکھی گئی ہو۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی تعلیمات کا غائر مطالعہ کرنے اور اُن کی سیرت و کردار اور مجاہدانہ عملی زندگی کے پس منظر میں حضرت علامہؒ نے فقط حضرت شاہ ہمدانؒ کو اہالی کشمیر کا مذہبی اور سیاسی راہبر تسلیم کیا ہے اور کشمیریوں کو ان کے پیغام سے مطلع کر دیا ہے کہ فقط جہاد ہی غلامی سے نجات کی حتمی صورت ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کا فلسفۂ جہاد اُن کے بعض ارشادات سے واضح ہو جاتا ہے جن کا ذکر حضرت علامہؒ نے ان اشعار میں کیا ہے[1]:

اصل شاہی چیست اندر شرق و غرب   یا رضای اُمتان یا حرب و ضرب
فاش گویم با تو ای والا مقام   باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اُولی الامری کہ مِنکُم شانِ اوست   آیہ ی حق، حجت و برہان اوست
یا جوان مردی چو صرصر تُند خیز   شہر گیر و خویش باز اندر ستیز
روز کین کشور کشا از قاہری   روز صلح از شیوہ ہای دلبری
می توان ایران و ہندوستان خرید   پادشاہی را ز کس نتوان خرید
جام جم را ای جوان باہنر   کس نگیرد از دکان شیشہ گر
ور بگیرد مال او جز شیشہ نیست   شیشہ را غیر از شکستن پیشہ نیست[2]

---

[1] جاوید نامہ : در حضور شاہ ہمدانؒ۔ ان اشعار کا ذکر اسی باب میں ترجمہ کی صورت میں کر دیا گیا ہے۔

[2] یہ فلسفۂ جہاد حضرت علامہؒ نے جیسا کہ قبلاً بیان ہوا، حضرت شاہ ہمدان رح کی تحریرات کا غائر مطالعہ کرنے کے نتیجے میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ شاہ ہمدانؒ کے یہ ارشادات پس منظر میں ربانی (اگلے صفحہ پر)

حضرت شاہ ہمدان رح بنیادی طور پر ایک خوش حال کشمیر دیکھنے کے آرزومند ہیں جو ظلم و استبداد سے عاری ہو اور جہاں مادّی ترقی کے ساتھ دینی فروغ بھی شاملِ حال رہ کر اخلاقی بلندی اور روحانی عظمت کی گرم بازاری ہو۔ جہاں آدمی دوسرے کا غلام بن کر نہ رہے۔ بلکہ آزاد بن کر زندگی گزارے۔

ایک مردِ مومن جو اللہ کے بغیر کسی دوسرے کو حقیقی حاکم اور فرماں روا تسلیم ہی نہ کرتا ہو وہ کسی دوسرے کو کیسے اپنے اوپر حاکم مان سکتا ہے اور خاص کر جب کہ حاکم، رعایا کو اپنے ذاتی خاندان کے افراد سمجھنے کے بجائے دشمن جانتا ہو اور ان کی بیخ کنی کرنے کے مقصد سے اُن پر طرح طرح کے عذاب اور مظالم ڈھاتا ہو۔ حضرت شاہ ہمدان رح کے دستور العمل کے مطابق جب اس طرح کے ماحول میں جہاں حاکم رعایا کو محکوم بنانے کے درپے ہو، جہاں ان کا مال ان کی جان اُن کی عزّت و آبرو محفوظ نہ ہو، جہاں اُن کی صدیوں کی اخلاقی روایات انکی تہذیب ان کا تمدّن اور اُن کے تشخّص کو بھی مٹا دینے کی سازشیں ہو رہی ہوں۔ جہاں پُرفریب مال و دولت کے خزانے اس غرض سے لُٹا دیئے جاتے ہوں کہ قوم کے جنگجویانہ اور پُرجوش و خروش جذبات کو ہمیشہ کے لیے سُلا کر اُن کا خون ٹھنڈا کر دیا جائے، تو پھر انقلابی اقدامات کرنے کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے، ظالم جب ظلمت کے درپے ہو، حق اور انصاف، عدل اور مساوات کی راہ میں رُکاوٹ ہو، مظلوموں کو بیدردی کے ساتھ پاؤں تلے روندتا ہو، خود اپنے لیے اور محض اپنے اقربا اور خاندان کے لیے محلات کی تعمیر اور عیش و نوش کے سامان مہیّا کرنے کو ہی حکومت کرنے کی غرض و غایت سمجھتا ہو، وطن فروش ہو اور صرف اپنا ہی نفس اس کی نظروں میں وطن ہو، تو پھر جنگ و جہاد کرنا فرض بن جاتا ہے اور جنگ و جہاد سے ہی مظلوموں کو آزاد کیا جا سکتا ہے، بدی اور بدی کے اثرات کو مٹایا جا سکتا ہے۔[۱] وطن کے غدّاروں کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہے۔ ظلمت کو مٹا کر نور کی فرمانروائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اہالیِ کشمیر کی زبوں حالی سے متاثر ہونے کے نتیجے میں صادر ہوئے ہیں لیکن دراصل یہ فلسفہ، حرب و ضرب ہر مظلوم کے لیے ہر زمان و مکان میں قابلِ عمل ہیں اور زمان و مکان کی محدود بندشوں سے بالاتر ہے (حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] ہندوؤں کے اوتار شری رام نے بھی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہو سکتی ہے اور عدل و انصاف پر مبنی حکومتِ الٰہیہ یا سلطنتِ الٰہی کو قایم کیا جا سکتا ہے، اس بلند ترین مُراد کو پانے کی راہ میں مجاہد قتل بھی ہو جائے تو وہ اُس کے لیے ایک ابدی سعادت ہوگی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے غنی کشمیریؒ اور حضرت علّامہ اقبالؒ کی موجودگی میں اہالیِ کشمیر تک یہی پیغام پہنچایا ہے کہ معاشرہ جب مسخ ہو جائے، حکمراں اپنے نفس سے باہر نہ آئے، حکمراں ہوس پرست ہو، اپنی ہی قوم کو غیر سمجھتا ہو، ہر طرح سے استحصال کر رہا ہو، قوم کی شناخت تک کو بھی اپنی آنکھوں سے مٹتا دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہوتا ہو، قوم کے افراد کو ظلم و جبر سے پامال کر رہا ہو، تو پھر اگر قوم اس ماحول کو جبراً نہ بدل ڈالے تو وہ قوم شیشے کی طرح ٹوٹ جائے گی اور صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گی، اس لیے کشمیریوں کو اصلاح کے لیے بر سرِ پیکار رہو جانا چاہیئے اور شترِ بے مہار حکمران کو آگے نہیں بڑھنے دینا چاہیئے، بلکہ جہاد و جنگ سے ایک فلاحی کشمیر کی تعمیر کی منزلِ مُراد متعیّن کر لینی ہوگی۔ ظلم و ستم کو مٹا دینے کی بس یہی ایک صورت ہے۔

جہاد ہی باطل کی قوّتوں کا قلع قمع کر کے رکھ دے گا اور یہی وہ آخری راستہ ہے جس سے انسان انسان کی غلامی سے نجات پائے گا۔ اسی سے اللہ کا حکم نافذ ہوگا۔ اسی سے اللہ کی حکومت، عدل و انصاف اور مساوات و برابری کی حکومت، شریعت عدل کی حکومت، اخلاقی عظمتوں کی حکومت، روحانی اقدار کی حکومت، اور دُنیوی خوش حالی اور ترقی کی حکومت قایم ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) بدی کو مٹانے کی غرض سے راوَن کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی جب دھوکے سے راوَن نے شری رام کی وفادار بیوی سیتا کو اغوا کیا تھا۔ راون پر فتح پانے کی خوشی میں دسہرہ مناتے ہیں، جسے عام طور پر بدی پر نیکی کی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہندو قوم آج بھی ہزار ہا سال سے ہر سال خوشیاں مناتی ہے۔

خود علّامہ اقبالؒ کا نظریۂ جنگ و جہاد بھی حضرت شاہ ہمدانؒ کے فلسفۂ جنگ و جہاد کے عین مطابق ہے۔ حضرت علّامہؒ کی تالیفات کے مطالعہ سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ (البتہ قرآنِ کریم کے ارشادات کے پسِ منظر میں) جنگ دو صورتوں کی ہوتی ہے، ذاتی محافظت کی اور اصلاح و فلاح کی۔ جب کسی ملک میں دوسری صورت کی جنگ لڑنے کی فضا یا ماحول سنجیدگی کے ساتھ وجود میں آچکا ہو اور قوم سخت پامالی اور بدحالی کے نتیجے میں زمین بوس ہو چکی ہو تو پھر اصلاح و فلاح کی بحالی کے لیے جنگ اور جہاد فرضِ عین بن جاتا ہے۔

زمین کی بھوک اور جغرافیائی حدود کو وسعت دینے کے لیے جنگ لڑنا دینِ اسلام میں حرام ہے، اصلاح اور عدل و مساوات کی بحالی کی راہ میں شہید ہو جانا مردِ مجاہد کی شان ہے اور اس کا مطلوب و مقصود![1] چنانچہ جبری طور پر دینِ اسلام کو پھیلانے کی غرض سے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

ڈاکٹر اقبالؒ کا نظریۂ جہاد اور جنگ ایک قوم کے لیے اخلاقی فریضہ بھی بن جاتا ہے جب ایک سازش کے تحت اس قوم کی ماضی کی عظمتوں کو ملیامیٹ کر دینے کی تدابیر کی جاتی ہوں۔ حضرت علّامہؒ کے نزدیک انسانی قوّت جو ہزارہا برس کی ریاضت و مشقّت کے بعد موجودہ معیار تک پہنچی ہے، بہرحال ناپائیدار ہے اور غیر مستحکم۔ اس لیے انسانی بقا کے لیے ماضی کے عبرتناک واقعات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ قوم کو اُن قوّتوں سے اپنی بقا کے لیے مدد لینی ہو گی جو آج تک اس کے استحکام کے ذمّہ دار اور ضامن رہی ہیں اور یہ قوتیں جنگ و پیکار سے ہی مستحکم رہ سکتی ہیں۔

غنیؒ کشمیری کا جنگ و جہاد کے بارے میں اگرچہ کوئی فلسفہ نہیں تھا، لیکن جیسا کہ قبلاً بیان کیا جا چکا ہے اپنے زمانے کے اُس ماحول سے خوش نہ تھا جس کا مقصد شرافت مند اور سیدھے سادے مزاج کشمیریوں کو دائمی غلام بنانا تھا۔ ایک عام کشمیری لیکن

---

[1] شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن ∴ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی (بالِ جبریل)

سریع الاثر اور سخت حساس اور باغیرت کشمیری ملّی شاعر کی حیثیت سے اُس نے سخت کوش اور ماضی کی دلیر اور جرأت مند کشمیری قوم کو یہی درس اور تعلیم دی کہ

برخیز و بجنگِ خصم شمشیر ببند　　بر تیرِ نظر بسانِ زہ گیر ببند
در رزم، ز اسبابِ فراغت بگذر　　پر را بکش از بالش، و بر تیر ببند[1]

غرض غنی کشمیریؒ اور حضرت علامہؒ نے حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے پیام کو کشمیریوں تک اس عبارت کی صورت میں پہنچا دیا ہے کہ صدیوں سے عذاب سہنے کی ان میں جو عادتِ ثانیہ ہے اُسے توڑ دینا چاہیے اور عذاب دینے والے ظالموں، جابروں، خود خواہوں، ریاکاروں، وطن فروشوں، نفس پرستوں اور ہوس کاروں کے خلاف، جو خود کو حکمران یا سیاسی راہنما کہلاتے ہیں۔ ایک اخلاقی فرض کو نبھانے کی حیثیت سے اُٹھ کر جنگ کرنی چاہیئے اور ہمیشہ کے لیے غلامی اور بدحالی کی ننگ کو مٹا کر آزادی کی روشنی اور خوش حالی کا نُور پھیلانا چاہیئے۔

بے ضمیر حکمرانوں کے شر کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنا چاہیئے بلکہ بدکرداری اور ظلم و استبداد کو روا رکھنے کے صلے میں اُن نفس پرستوں کو زندگی کے حق سے محروم کر دینا ہی واحد علاج ہے کیونکہ قوم کے لیے اس طرح کا حاکم اور لیڈر ایک فاسد اور زہریلا عضو ہے جسے ختم کر دینا ہی قوم کے حق میں مفید ہو گا۔ ہر سچے اور بہی خواہ کشمیری کا فرض ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے لیے تلوار اٹھا کر ظالم حکمران کے خلاف جنگ کرے اور تب تک چین سے نہ بیٹھے جب تک کشمیری قوم کو اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں۔ اور ان کا پاک وطن غاصبوں کے کثیف وجود سے خالی نہ ہو جائے۔

---

[1] اس رباعی کا ترجمہ قبلاً ہو چکا ہے۔

پانچواں باب

عِلم و عِرفان اور تعلیمات

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را بر دل زنی یاری بود

(بالِ جبریل، حضرت علامہ اقبالؒ)

(۵)

علم و عرفان اور تعلیمات

دینِ اسلام میں تحصیلِ علم پر جس قدر تاکید اور ضرورت کی طرف توجّہ دی گئی ہے وثوق سے کہا جا سکتا ہے اور کسی مذہب میں نہیں دی گئی ہے۔ دینِ اسلام کے سچے رسول جناب محمد مصطفٰے صلّے اللہ علیہ وسلّم پر جو پہلی آیت اللہ تعالیٰ نے نازل کی وہ تعلیم اور علم سے ہی متعلق ہے [1] اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو ایک تعلیم یافتہ، مہذّب، علومِ مروّجہ اور علومِ دین سے مزیّن اور قلم کے رتبے اور اس کی قدر و قیمت پہچاننے والی قوم کی حیثیت میں اُبھارنا چاہتا ہے، اور یہ دینِ فطرت مسلمانوں کو جہالت اور غفلت کی ظلمتوں میں سے نکال کر نور و روشنی میں ان کی پرورش کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ تا کہ قوم میں تعلیم و تعلّم، درس و تدریس اور فہم و ادراک کی عمومیت سے اللہ کے دین میں ہر مسلمان رسوخ پیدا کر کے ایک صالح اور عقلمند فرد بن پائے۔

ظاہر ہے مسلمان قوم میں جو مسلمان عقل و شعور اور فہم و ادراک سے محروم رہیں گے نہ صرف ان کا وجدان ضعیف الحسّ اور شعور نیم مُردگی کی حالت میں پڑا رہے گا بلکہ وہ دینِ اسلام کی نورانی صفات اور اس کی دائمی خوبیوں سے بھی بے نصیب رہیں گے۔ نہ خدائے ذوالجلال کی عظمتوں کا ادراک کر پائیں گے اور نہ ہی کائنات کی حقیقتوں کا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کا ایک طبقہ ایک

---

[1] سورۃ علق۔ آیت ۱ تا ۵۔

قابلِ قدر اور معزّز طبقہ قرار دیا ہے، اور ان کی علم و فضیلت کے پیشِ نظر اپنی وحدانیت اور عدل و راستی پر فرشتوں کو اور علماء کو ایک ہی درجہ پر رکھا ہے۔[1]

چونکہ اسلام کا اصل مقصد، جیسا کہ بیان ہوا، جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر انسان کی علم و ادراک کے نورانی ماحول میں تربیت کرنا مقصود ہے تاکہ وہ کائنات میں خود کو سمجھے، کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کو جان لے اور علم و عقل کی روشنی میں اپنے تمام باطنی اور خارجی اور مادّی و روحانی ذرائع کو منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے کام میں لائے، اس لیے علم کی قوّت سے ہی وہ نیابتِ الٰہی کا اصلی اور حقیقی فریضہ ادا کرنے کے اہل بن سکتا ہے۔

اِس علمی اہمیت کے پیشِ نظر، دینِ اسلام کے عظیم المرتبت اور صاحبِ علم لدنی رسولِ اکرم صلّے اللہ علیہ وسلّم نے خیرِ کثیر یعنی علم کو حاصل کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے، اور عالموں کی قدر دانی بھی کی ہے، اور فرمایا ہے کہ اگر چین تک کی بھی مسافت طے کرنا پڑے تو وہاں سے علم حاصل کر لو کیونکہ علم کے حاصل کرنے اور اس کی جستجو میں جو شخص راستہ چلتا ہے اللہ تعالیٰ جنت تک جانے والے تمام راستے اس کے لیے آسان بنا دیتا ہے۔[2] اور خیرِ کثیر کی تعلیم دینے والے عالموں کے لیے اور اس کے ملائکہ اور زمین و آسمان کی ساری مخلوق حتیٰ کہ چیونٹیاں بھی اپنی بلوں میں اور مچھلیاں سمندروں میں دُعا کرتی ہیں[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ " اللہ جس کے لیے بہتری چاہتا ہے اُسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔" اور " لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو عمل کے لحاظ سے بہتر ہیں بشرطیکہ دین میں سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔"

گویا اسلام میں دین کی سمجھ، بصیرت اور علم کا نور، فکر و تدبّر کی قابلیت، اور علمی سوجھ بوجھ کی اہلیت، علم کے معانی کے زُمرے میں آتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے

---

[1] سورۂ آل عمران۔ [2] صحیح مسلم شریف۔ [3] ترمذی۔ اس حدیث مبارکہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ علوم کو اللہ کی رضا اور اللہ کے بندوں کے لیے مفید و نفع بخش ہونا چاہیے جبھی تمام خشک و تر کی مخلوق عالموں کے لیے دُعا گو ہے۔

قرآن کریم نے حکمت سے یاد کیا ہے۔

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ نے مکتب میں جو مروّجہ علم حاصل کیا اُس سے قطع نظر انھوں نے اپنے روحانی مُرشد طریقت سے یہی حکمت حاصل کی جسکا ذکر اوپر ہوا اور بعد میں اپنی استعداد اور نور بصیرت کے مطابق اس میں اضافہ کرتے رہے۔ اوّلین مرشدِ طریقت، شیخ شرف الدین محمود مزدقانی رحمۃ اللہ علیہ، جن کا انتخاب اس حیثیت سے شاہ ہمدانؒ کے حق میں خود رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا، کا مکتب اور حلقۂ درس و تربیت، حضرت شاہ ہمدانؒ کے لیے بہترین ماحول کا اور صحیح سمت متعین کرنے والا مکتب تھا۔ اسی اوّلین کشف قلوب والی درسگاہ میں ان کی عملی قوتیں ظاہری اور باطنی بلکہ مادّی اسباب و وسائل کے اکتشاف اور اُن سے تمتّع حاصل کرنے کی اہم قوتوں کی صورت میں اُبھریں، اور ان قوتوں کو شاہ ہمدانؒ نے آئندہ حیات میں ایک صحیح اور مستقیم راہ پر مصروفِ عمل رکھا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے اللہ کی کتاب قرآن مجید کو مکمل طور پر سمجھ لیا تھا اور انھوں نے اللہ کی مخصوص عنایت اور اپنی ذاتی توجہ و بصیرت سے دنیا اور آخرت دونوں سے انتفاع پایا۔ دنیوی علوم بھی قرآن ہی سے حاصل کر کے دنیاوی خصوصیات کی اہمیت اُجاگر کی، اور دینی علوم بھی قرآن مجید سے حاصل کر کے وہ عرفان نفس اور معرفتِ الٰہی کے بلند ترین درجے تک پہنچے۔

شاہ ہمدانؒ نے علم و حکمت میں سطحی دائرۂ مطالعات سے نکل کر غور و فکر اور تدبّر و ادراک کی وہ بصیرت اور نگاہ حاصل کی جس سے وہ 'راسخون فی العلم' کے زُمرے میں آگئے۔ نباتات و حیوانات اور دوسری مخلوقات میں غور و فکر والی بصیرت و نگاہ، اور خالقت و مخلوقات کی عظمت کے گہرے شعور و ادراک کی راہ سے بھی، آپ نے خالقِ کائنات کی عظمت اور اس کے جلال و شوکتِ کبریائی کو پایا۔ اس طرح کا مطالعہ قرآن مجید کے ارشادات کے عین مطابق تھا۔ قرآن مجید نے فرمایا ہے:

(۱) (اے مخاطب) کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے مختلف رنگوں کے پھل نکالے

اور (اسی طرح) پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں (بعضی) سفید (بعضی) سُرخ کہ اُن کی بھی رنگتیں مختلف ہیں (اور بعضی نہ سفید نہ سُرخ بلکہ) بہت گہرے سیاہ اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ اُن کی رنگتیں مختلف ہیں۔ خدا سے اُس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں، واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے"[۱]

(۲) "بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں، اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لیکر اور بارش کے، پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے، اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقیّد (اور معلّق) رہتا ہے، دلائل (توحید کے) موجود ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل (سلیم) رکھتے ہوں"[۲]

(۳) "اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو زندہ ہونے کا وقت بنایا وہ ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی امید دلا کر دل کو) خوش کر دیتی ہیں۔ اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک و صاف کرنے کی چیز ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چارپایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کر دیں اور ہم اس (پانی) کو (بقدر مصلحت) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ لوگ غور کریں...."[۳]

---

[۱] سورۂ فاطر۔ آیت ۲۷۔ ۲۸ (اُردو ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رح)

[۲] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۶۴ (اردو ترجمہ " " ")

[۳] سورۂ الفرقان۔ آیت ۴۸۔ ۵۰ (اردو ترجمہ " " ")

(۴) " اور اُسی کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب و لہجے اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا ہے، اس میں دانشمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" [۱]

(۵) " یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اُتاری ہے۔ یہ برکت والی ہے تاکہ لوگ اسکی آیات میں غور و خوض کریں۔ اور جو عقل رکھتے ہیں وہ اس سے سبق لیں۔" [۲]

(۶) " اور جس کو حکمت دی گئی اُس کو بہت بھلائی دے دی گئی۔" [۳]

(۷) " اللہ نے مومنین پر بڑا احسان کیا کہ اُن میں خود اُن ہی میں سے ایک رسول بھیج دیا جو اُن کو اُس کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" [۴]

(۸) " تو پھر کیوں اُن کی ہر جماعت سے کچھ ایسے لوگ نہ نکلے کہ دین میں سمجھ حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنی قوم کو آگاہ کرتے۔" [۵]

(۹) " اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرنا جو علم سے بے بہرہ ہیں۔" [۶]

(۱۰) " اہلِ نار اور اہلِ جنت باہم برابر نہیں، جو اہلِ جنت ہیں وہ کامیاب لوگ ہیں (اور اہلِ نار ناکام) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا اور ان مضامین عجیبہ کو ہم لوگوں کے (نفع کے) لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔" [۷]

(۱۱) " یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں۔" [۸]

---

[۱] سورۂ روم آیت ۲۲ (اردو ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)۔ [۲] سورۂ صٓ آیت ۲۹۔
[۳] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۶۹۔ [۴] سورۂ آل عمران آیت ۱۶۴۔ [۵] سورۂ توبہ آیت ۱۲۲۔ [۶] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۱۸۔ [۷] سورۂ حشر۔ آیت ۲۱-۲۲۔
[۸] سورۂ العنکبوت۔ آیت ۴۳۔

(۱۲) "کیا انھوں نے اس بات پر جو ان سے کہی جا رہی ہے، غور نہیں کیا؟"[1]

(۱۳) "کیا وہ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر قفل لگے ہیں؟"[2]

اِن چند منتخب ارشاداتِ خداوندی کے علاوہ، علم اور علماء کی اہمیت و تقدّس اور عظمت و رفعتِ مرتبہ پر رسولِ اکرم صلے اللہ وسلم نے فرمایا:

(۱) اُس عبادت میں کوئی خیر نہیں جس میں فہم نہ ہو اور اُس علم میں کوئی خیر نہیں جس میں سمجھ بوجھ نہیں۔ اور اس قرآن خوانی میں کوئی خیر نہیں جس میں کوئی تدبّر نہیں۔"

(۲) "لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو عمل کے اعتبار سے بہتر ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔"

(۳) "دو گروہ ہیں کہ اگر وہ درست ہوں تو امّت درست ہے اور اگر وہ بگڑ جائیں تو امت بگڑ جائے، حکمران اور علماء۔"

(۴) "جو شخص علم کی طلب میں نکلا تو وہ تب تک اللہ کے راستے میں ہے جب تک لوٹ نہ آئے۔"

(۵) "حکمت ایک مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، جہاں وہ پائے اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔"

(۶) "دو آدمیوں کے سوا کسی اور سے حسد کرنا جائز نہیں۔ ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا تو اُس نے راہِ حق میں خوب خرچ کیا اور دوسرا وہ جسے اللہ نے حکمت عطا کی تو وہ اس کے ذریعے فیصلے کرتا اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔"

(۷) "عالم کو عابد پر ستّر درجہ فضیلت حاصل ہے اور ہر دو درجوں کے درمیان تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی مسافت ستّر سال کی ہے اس لیے کہ

---

[1] سورۂ مومنون - آیت ۶۸ - [2] سورۂ محمدؐ - آیت ۲۴۔

شیطان لوگوں کے اندر بدعتوں کو رائج کرتا ہے تو عالم اسے دیکھ کر لوگوں کو ان سے روکنے کی سعی کرتا ہے جبکہ ایک عابد اپنے رب کی عبادت میں متوجہ رہنے کی وجہ سے ان بدعتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا اور نہ ہی ان بدعتوں کی اُسے واقفیت ہوتی ہے۔"

(۸) "ایک عالم ہزار عابدوں کے مقابلے میں شیطان پر بھاری ہے۔"

(۹) "افضل ترین عبادت دین کا علم اور سمجھ بوجھ ہے۔"

(۱۰) "کم علم بہتر ہے اس کثیر عبادت سے جو جہالت کے ساتھ ہو۔"

(۱۱) "اے ابوذر! صبح ہوتے ہی تم اللہ کی کتاب سے ایک آیت سیکھ لو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم سو رکعت نماز پڑھ لو۔ اور یہ کہ روزانہ علم کا ایک باب حاصل کرو چاہے عمل کرو یا نہ کرو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ایک ہزار رکعتیں ادا کرلو۔"

(۱۲) "علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے زیادہ ہے۔"

(۱۳) "کوئی کمانے والا اس علم کی فضیلت سے بہتر کوئی چیز نہیں کما سکتا جو ایک عالمِ دین کو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے یا اسے گمراہی سے پھیر دیتا ہے اور کسی انسان کی دین داری صحیح نہیں ہوسکتی جب تک اس کی عقل صحیح نہ ہو۔" [1]

اِن قرآنی فرامین اور اِن احادیثِ مقدّس کی روشنی میں حضرت شاہ ہمدان رح نے جنہوں نے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، مغز اور رُوحِ قرآن کا ادراک کیا تھا، علم کے تمام دروازے پوری کوشش اور سعیِ پیہم سے کھول دیئے اور دور دراز ممالک میں سفر کیے بند دریچوں کو کھول دیا۔ عالمِ انسانیت سے رشتہ جوڑا اور معرفتِ نفس اور عرفانِ الٰہی کی راہیں بھی اپنے لیے استوار کیں۔

شاہ ہمدان رح نے قرآن مجید سے کسبِ نُور کیا۔ اور یہی نُور آپ زندگی کے ہر راستے پر لیکر

---

[1] یہ تمام منتخب احادیث ترمذی، اصبہان، بخاری، طبرانی، بزاز اور ابن ماجہ سے ماخوذ ہیں۔

چلے اور ابدی نور کی اسی مشعل سے آپ نے دور اور لمبے سفروں میں ظلمتوں کو چاک کر کے ارشاد و ہدایت کی روشنی پھیلائی۔ آپ نے علم کو ہر اُس چیز کے لیے کام میں لایا جو خیر کا واسطہ بن سکتا تھا، کیونکہ آپ کا مطالعہ محض فقہ و تفسیر اور کلام و منطق تک ہی محدود نہیں تھا وہ دنیوی علوم سے بھی مستفید ہوئے۔ ان کا بھی غائر مطالعہ کیا اور ان کے نتائج سے بھی عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی تک ہدایت پائی۔ گویا کائنات میں موجودات و مخلوقات کی فطری عظمت کی وساطت سے خالق کو پہچان لیا۔ شاہ ہمدانؒ کی نظروں میں زندگی کی حقیقتوں کے انکشاف میں زندگی کے علوم کا مطالعہ بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ دینی علوم کا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بیشتر تصانیف میں دُنیوی اور اُخروی بھلائی کے علوم کی طرف فکر انگیز اور اصیل اشارے کیے ہیں خاص کر ذخیرۃ الملوک میں۔ خود ذخیرۃ الملوک ہی حضرت شاہ ہمدانؒ کی علمی برتری اور تفوّق کی ایک قاطع اور بیّن دلیل ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کے تبلیغِ علم کی مساعی میں جغرافیائی حدود کی پابندی نہیں تھی، چونکہ ایک کم نظیر عالمِ دین کی حیثیت سے آئندہ زندگی میں آپ کو ایک عالمگیر دعوت کو کئی ممالک میں عام کر دینے کی خدمت انجام دینی تھی، اس لیے علم و آگہی، فکر و نظر اور تحقیق و تدبّر سے آپ نے خود کو مالا مال کر دیا۔ اور جہاں جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو علم و معرفت سے آگہی بخشی اور حقیقت یہ ہے کہ ان ہی علمی اور استوار دینی بنیادوں پر ان ممالک کے نو مسلموں نے علوم کی اپنی تمام بلند قامت عمارتوں کو کھڑا کیا۔ گویا حضرت شاہ ہمدانؒ کے تحصیلِ علم میں مقصد کی پاکیزگی اور نصب العین کی بلندی زیرِ نظر تھی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے دینی اور دُنیوی علوم میں جو تخصّص پایا اس کی وجہ سے وہ جاہ طلب نام نہاد علماء کے محسود بنے رہے۔ اگرچہ یہ فقہاء اور علماء اپنی ریا کاری اور ظاہر داری کے باوجود شاہی درباروں کے راتبہ خوار بھی تھے لیکن حضرت شاہ ہمدانؒ کی علمی برتری کے آگے اُن کا وجود بکھر جاتا تھا۔ اور خود ان ہی کی دعوت پر جب وہ شاہی درباروں میں مخصوص دینی مباحث کے سلسلے میں حضرت شاہ ہمدانؒ کو مدعو کرتے اور قطعی دلائل و بیّن شواہد و براہین سے خفیف ہو کر رہ جاتے تو فوراً ہی گاہے اپنے گمراہ سرپرست بادشاہوں اور

امیروں کی معاونت سے زہر دے کر اُن کو جان سے مار ڈالنے کی تدبیریں کیا کرتے تھے[۱] لیکن حضرت شاہ ہمدانؒ ان مراحل سے سلامتی سے گزرے اور اپنے عالمانہ صدق کلام اور مستحکم دینی اخلاص اور نورِ بصیرت سے عظمت و تابانی پاتے رہے۔ آپ کی تصانیف و تالیفات میں نہ شک و تردید کا شائبہ ہے اور نہ ہی ناباوری کا کوئی عنصر۔ نہ پیچیدہ فلسفیانہ گتھیاں ہیں اور نہ ہی غیر یقینی مباحث کے خارزار۔

جب آپ حقیقتِ دین کی بات کرتے ہیں تو اپنے زورِ بیان سے ایک بے داغ و بیکران نیلے اور صاف و شفاف آسمان کی طرح حقیقت کو روشن اور درخشاں حالت میں سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں۔

بات آخرت کی ہو یا محشر کی، ایمان کی ہو یا عبودیت کی، گناہ و ثواب کی ہو یا عذاب و عتاب کی، ولایت و امارت کی ہو یا معنوی عالم کی، دل کی ہو یا روح کی، تجلی و عرفان کی ہو یا ذات و صفات کی حقیقتوں کی، تزکیۂ نفس کی ہو یا طاعتوں کی، شاہ ہمدانؒ حسنِ بیان اور صدقِ کلام سے یقیناً اُن فلسفیوں، مادہ پرستوں اور بے دینوں کو بھی شک و تردید کی ظلمتوں سے نکال دیتے ہیں جو بالعموم اپنے ہی بے ترتیب و بے بنیاد اور باطل اوہام و خیالات کے تانے بانے سے اپنے گرد بنے ہوئے جال میں پھنسے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی تحریرات میں نازک دینی نکات اور مسائل کی توضیحات کے ضمن میں اسلوبِ بیان کی روشنی کے ہمراہ نہ ناامیدی و مایوسی ٹپکتی ہے اور نہ ہی کوئی تلخی۔ بس دینِ اسلام کی سادگی اور اسکی حقانیت کے انوار کی تابانی کا ہی مشاہدہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا نہ بددین بن جاتا ہے اور نہ ہی ناامید ہوتا ہے۔ گویا حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے علمی نتائج سے ان کی جو صورت پڑھنے والوں کے ذہن پر نقش پذیر ہوتی ہے وہ ایک پاک و مطہر انسانی رُوح کی ہے جو نور کی طرح بے داغ اور سارے عالم کو منور کرنے والی ہے۔

---

[۱] اس طرح کی زہر خورانیوں کا ذکر اگلے ابواب میں ہوا ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے جیسا کہ آپ کی کثیر التّعداد تصنیفات و تالیفات[1] سے ظاہر ہے بڑی کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ آپ مفسّر بھی تھے، فقیہہ بھی، متکلّم بھی تھے، فلسفی بھی، عارف بھی تھے، صوفی بھی، درویش بھی تھے اور ولی اللہ بھی، شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، آپ کی سبھی تصانیف اِن تمام ارفع اوصاف کی منزلوں کے تجربے ہیں اور آپ کے خلّاق ذہن کے قدرتِ بیان پر ایک روشن دلیل بھی۔ عارفانہ شرح، صوفیانہ مباحث متصوّفانہ اصطلاحات، حقائق توبہ، توحیدِ الٰہی، قلبی واردات، امر و نہی، منطق، کلام، فقہ، حقیقتِ دین، اخوّت، باطنی امراض، عالم علوی، عالم سفلی، قیافہ شناسی، طبیعت شناسی، نفسیات، معرفتِ حقیقی، احوال و مقامات، خصائصِ انسانی، فضیلتِ عقل شرح فصوص الحکم، حقیقتِ نور، حقیقتِ ایمان، ضبطِ نفس، سیر و سلوک، مکارمِ اخلاق، شرح نفس و روح، وغیرہ کے مضامین و عنوانات یعنی جملہ تصانیف میں آپ ایک اصیل محقّق اور زبردست عالم دُنیا و دین کی صورت میں صورت میں جلوہ نما ہیں نہ کہ ایک مقلّد کی صورت میں۔ آپ کی تحریرات میں اگرچہ ضرورت کے مطابق عقل و بُرہان سے بھی وضاحت موجود ہے لیکن تحت الشّعور میں اوائل ایام مکتب سے آپ کے قلب و دماغ میں ایمانی یقین و شعور، مضبوطی کے ساتھ سرائیت کر چکنے کی وجہ سے، ان تحریرات میں سوقیانہ اور خشک و لاحاصل فلسفہ کا نشان تک نہیں۔ ہر تحریر روشن ہے صدق و یقین سے مالامال ہے اور قانع کرنے والی دلیلوں سے مزیّن، متکلّموں، یا فقیہوں اور اہلِ کلام یا ریا کار نام نہاد عصری علماء کے ساتھ شاہی درباروں میں مناظرات و مباحث کی مجلسوں میں آپ کے آلاتِ حرب و ضرب یہی ایمانی یقین اور صدقِ کلام، صمیمیّت، سادگی، قاطع دلائل و براہین، حلم و بردباری اور عمقِ نظر کے ساتھ تبحّر تھا جس سے آپ کی علمی برتری کا سکّہ رائج رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت شاہ ہمدانؒ نے علم کو جاہ و مرتبہ کی دستاویز نہیں بنایا بلکہ احکام و اوامر

---

[1] تصانیف پر الگ باب ملاحظہ فرمائیں۔

ارشاداتِ ربّانی اور احادیثِ متبرکہ کے پیشِ نظر علم سے وہی کام لیا جو صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین، نے دینِ اسلام سے لیا اور اپنے وطن اور بیرونی ممالک میں اس کے نور سے گھر گھر کو منوّر کیا۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کی حیاتِ مبارک کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ آپ اپنے زمانے کے مصروف ترین شخص تھے۔ آپ کی ساری زندگی مطالعۂ علمِ دین، کشفِ حقایق، دینی درس و تدریس اور پند و موعظت، سیر و سیاحت، اشاعتِ دین اور علوم دین، تبلیغ و دعوت اور محدود دُنیوی مشاغل میں گزری اور اس کے باوصف بھی آپ کثیر التّعداد کتابوں اور رسائل و آثار کے مؤلّف اور مصنّف تھے اور یہ ساری تصانیف و تالیفات اُن تمام عصری اختلافات سے عاری ہیں جو علمی رقابتوں یا گروہی نظریات مثلاً باطنیہ، اشاعرہ، معتزلہ اور فلسفیوں کی سالہاسال سے نظریاتی کشمکش کی وجہ سے رائج تھیں، آپ نے اپنے آپ کو ان مخمصوں سے آزاد رکھا اور بیشتر سعادتِ دنیوی اور نجاتِ اُخروی سے مربُوط افکار و عناوین سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اس سعادت کی تحصیل کے لیے راہ بھی متعیّن کی یعنی علم و عمل۔ صالح عمل اور دینی علم کے ہمراہ دنیوی علم، جس سے ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس کائنات کو سمجھ کر اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کر سکے [1]

قرآنی احکام اور احادیثِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دانش طلبی و حوصلہ افزائی اور تشویق کے نتیجے میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے علم کو کمال توجّہ و شوق سے اخذ کرنے اور اس کو شایع کرنے کے جوش و خروش نے انکی سرکردگی میں

---

[1] ذخیرۃ الملوک میں شاہ ہمدانؒ ولی اکمل اور عارف کامل مطلق کے علاوہ ایک دواساز، ایک طبیب، عالمِ طبیعت، عالم نجوم، عالم ابدان اور ماہر فنونِ صناعت، جغرافیہ دان، سیاح، تاریخ نویس، فلسفی، اہلِ کلام، اہلِ حکمت، سیاستدان، جامعہ شناس ادیب اور شاعر اور قیافہ شناس کی حیثیت میں اُبھرتے ہیں۔

علمی اور دینی تحریک کو وجود میں لایا جو ہمارے کشمیر میں عملی رنگ میں نمودار ہو کر اپنی انتہا کو پہنچی۔ یہی وہ علمی اور دینی تحریک تھی جس کی بنیاد ایمان اور صالح عمل پر تھی اور یہ دونوں شریعت اور سنت نبوی ص کے تابع تھے۔ حضرت شاہ ہمدان رح نے اپنی علمی اور دینی خدمات سے اہالی کشمیر میں سنت و شریعتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا درس دے کر یہاں کے مختلف انساب و قبائل کے لوگوں کو ایک عالمگیر انسانی اخوت و برادری کے دیرپا رشتے میں جوڑ دیا اور یہ اُن ہی کی تعلیمات کا صدقہ ہے کہ کشمیر کا مقام اخلاق اور اخوت اور انسانیت اور رحمدلی کے فرائض کو نبھانے میں ساری دنیا میں بلکہ ہندوستان میں بھی افضل و برتر ہے۔

ایک مکمل عالم دین، دینی اور دنیوی علوم میں راسخ اور پاکباز و پاک دل مبلغ اسلام کی حیثیت سے حضرت شاہ ہمدان رح نے اپنے متعدد سفر جہانگردی اور سیر دانی الارض کے فریضہ سے قطع نظر ان ممالک میں حتی المقدور حد تک شریعت دین اسلام کے انوار پھیلائے اور جہاں قبلاً ہی اس عالمگیر روشنی کی تابانی پہنچ چکی تھی وہاں اس کی دھیمی روشنی کا تصفیہ کر کے اسے تاباں تر بنا دیا۔ اس عملِ صالح کو انجام دینے کی غرض سے آپ نے مثالی مجاہدوں کی وہ جماعت اپنے حلقۂ درس و وعظ میں تیار کر لی جو حد درجہ با ارادہ تھے۔ صحیح اسلامی کردار کی دلکشی اور خوبی و جمال کا نمونہ تھے۔ اسلام کی حقانیت کے پرستار اور باطل سے متنفر تھے۔ حق کی سربلندی اور دین اسلام کی کامرانی کے جذبے سے سرشار تھے، جو آپس میں رحیم و شفیق تھے لیکن باطل کے شہوت رانوں کے لیے سخت اور قاہر تھے، جو نظام مصطفٰے ص کو برپا کرنے میں صحابہ کرام رض کا سا ذوق و شوق رکھتے تھے، جو شجاع تھے، خدا ترس تھے، نیک دل تھے اور طبعاً نیک فطرت والے تھے جن کے دلوں میں آیاتِ الٰہی پر غور و فکر کی مُہر ثبت تھی اور جن کی پیشانیوں پر اور جن کے چہرے اور بُشرے پر دینی علوم اور دُنیاوی مروّجہ علوم کی فطانت و دانشمندی کے آثار کی چمک تھی۔ یہ مبلغین کی وہ جماعت تھی جنہیں اپنی ذاتی توجہ میں حضرت سید السادات اور معمار تقدیر اُمم جناب امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح نے ایک معتدل اور قابلِ عمل تربیت دے کر ایک منظم اخلاقی قانون کے پابند بنا دیا جو روح و جسم کے درمیان ایک اعتدال پر قائم تھا، یعنی روحانی تربیت کے علاوہ اُن کو جسمانی تربیت سے بھی بہرہ ور

ٹیلوں اور ندی نالوں اور دریاؤں، ریگستانوں اور دشوار گزار پہاڑوں کے گرم و سرد ہواؤں کے طغیان میں گزارتے ہوئے جب اللہ والوں کی یہ جماعت وادیٔ کشمیر کے نشیب زار میں اُتری تو معمارِ تقدیرِ امم شاہِ ہمدانؒ نے چھوٹے منظم گروہوں میں ان کو وادی کے دور دراز قصبوں اور دیہات میں اسلام کی روشنی کو تاریک دلوں میں اُتارنے کے لیے بھیج دیا اور خود سرینگر کے شہر میں رہ کر ذاتی طور پر اپنے چند مجاہد ہمراہیوں کی معیّت میں اس دینی فریضے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

معتبر اقوال کے مطابق سات سو مجاہدین جن میں سیّد بھی تھے اور غیر سیّد عبادت گزار بندگان و اولیائے الٰہی بھی، نے جگہ جگہ دینی مدارس قایم کیے، قرآن خوانی کے مکتب جاری کیے، مسجدیں تعمیر کیں، اور خانقاہیں بنا کر ان میں ذکر و اذکار اور عبادتِ الٰہی کے علاوہ مواعظ دینی کا بھی اہتمام کیا۔ گھر گھر اور گاؤں گاؤں میں خالص قرآنی احکام اور فرامین احادیث کے عین مطابق نئے دین کی خوبیوں اور اوصاف کی تبلیغ کی اور ہدایت کا پیغام پہنچایا۔

انسانوں کے درمیان، رنگ، نسل، خاندان، زبان اور ذات کی برتری کی بلندی و پستی کو مٹانے کا پیغام، برابری اور مساوات کا پیغام شاہ و گدا کے ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے اور بیٹھنے کا پیغام، انسان کے اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی غلامی سے رہائی پانے اور آزاد ہو جانے کا پیغام، یہ امتیازات جو کشمیر میں ہزاروں سال سے حکم چلا رہے تھے اور معاشرے کو اپنے قدموں تلے روند کر بیشتر آبادی کو نڈھال اور پامال کر کے اُن کو چوپایوں کی طرح ظلمتوں میں دھکیل چکے تھے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آناً فاناً مٹ گئے اور کشمیریوں نے محبت و اخوّت اور برادری و مساواتِ باہمی برابری اور ہزاروں سجدوں سے آزاد ہو کر ایک ہی ذاتِ خداوندی کے سجدے کے روح پرور اور دلپذیر اسلامی پیغام کو لبیک لبیک کہہ کر قبول کر کے ہزارہا سال کی غلامی و خواری اور پستی و ذلت سے نجات حاصل کی۔ انہیں اسلام ملا جس نے اُن کو انسانی سطح پر یکساں انسانی تفوّق، احترام، عزّت، وقار، تحفّظ، ملکیت، حقوق اور ترقی کا حقدار قرار دیا۔ اور ان کو بادشاہ تک بننے کا حق دیا بشرطیکہ وہ متّقی اور صالح و پرہیزگار ہوں۔ ہزاروں سال کی تاریخ میں کشمیر میں اسلام آنے سے پہلے

کیا تھا اور اس جسمانی مشقّت میں اُن کو مختلف ضروری صناعتوں سے بھی روشناس کیا تھا تاکہ آئندہ کے متعدد انفرادی اور اجتماعی تبلیغی سفروں میں جماعتی خدمتِ دین میں کوئی خلا اور رخنہ نہ رہے، بے خوابی کی عادت تو اُن کو راتوں کی عبادت میں تھی ہی، لیکن گھوڑ سواری، تیراکی، جنگی فنون سے شناسائی، درس و تدریس اور مواعظِ حسنہ کی تشویق، مطالعۂ کتب اور خطّاطی، معماری اور طبابت، دارو سازی اور زراعت میں تخصّص ہونے کے فنون و مہارتوں سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے دنیا کے مختلف ممالک میں جو سفر کیے اُن کے بارے میں اجتماعی یا گروہی تبلیغ دین کی فعالیتوں کی اطلاعات ہماری دسترس میں نہیں ہیں لیکن انفرادی حیثیت میں جہاں جہاں گئے وہاں ذاتی دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ وقت کے سربرآوردہ علماء سے ملاقات کر کے دینی مباحث کی روشنی میں اسلام میں رخنہ پرور افکار کو مٹانے کی سعیٔ بلیغ کی جو بذاتِ خود ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ لیکن اپنے وطن سے دُور کشمیر کے ملک میں حضرت شاہ ہمدانؒ ان ہی داعیانِ الی اللہ مجاہدین کے سرفروشوں کو اپنی ذاتی سرداری اور نگرانی میں لے آئے جن کے سروں میں حق کی خاطر لڑنے کا حوصلہ تھا، جو فقط رضائے الٰہی کے لیے گھروں کو خیرباد کہہ چکے، جو صبر و استقامت کا نمونہ تھے اور عزم و استقلال کے مثالی پیکر۔ جیسا کہ بیان ہوا، حضرت شاہ ہمدانؒ نے کشمیر میں ذہنی، دینی، تمدّنی اور تہذیبی، معاشی و اقتصادی انقلاب لانے سے پہلے اپنے ساتھی مجاہدین کے سینوں میں اس انقلاب کا نظریہ اپنی درس و تدریس کی خانقاہ اور مکتب میں اُتار کر انہیں کشمیر میں لانے سے پہلے نظریاتی مجاہد بنا دیا تھا نہ کہ مادّی، انقلاب کے اس نظریے کی بنیاد خالص قرآن پر تھی، قرآنی اوامر پر تھی، قرآنی تعلیمات پر تھی اور اوامر و احکام احادیثِ رسول پر صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لیے حب بہ اللہ کو دوست رکھنے والی جماعت اپنے وطن سے روانہ ہوئی تو دلوں میں حبِّ دین اور عالمگیر انسانی اخوّت و برادری کی اسلامی تعلیمات اور توحید الٰہی کا پیغام پھیلانے اور باطل اور اس کے نتیجے میں پھیلی ہوئی تاریکی کو نور و روشنی میں بدل دینے کے جذبے کو لے کر نکلے، ہزاروں میل کا راستہ وسط ایشیا کے میدانوں جنگلوں

ٹیلوں اور ندی نالوں اور دریاؤں، ریگستانوں اور دشوار گزار پہاڑوں کے گرم و سرد ہواؤں کے طغیان میں گزارتے ہوئے جب اللہ والوں کی یہ جماعت وادیٔ کشمیر کے نشیب زار میں اُتری تو معمارِ تقدیرِ امم شاہِ ہمدانؒ نے چھوٹے منظم گروہوں میں ان کو وادی کے دور دراز قصبوں اور دیہات میں اسلام کی روشنی کو تاریک دلوں میں اُتارنے کے لیے بھیج دیا اور خود سرینگر کے شہر میں رہ کر ذاتی طور پر اپنے چند مجاہد ہمراہیوں کی معیت میں اس دینی فریضے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

معتبر اقوال کے مطابق سات سو مجاہدین جن میں سیّد بھی تھے اور غیر سیّد عبادت گزار بندگان و اولیائے الٰہی بھی، نے جگہ جگہ دینی مدارس قایم کیے، قرآن خوانی کے مکتب جاری کیے، مسجدیں تعمیر کیں، اور خانقاہیں بنا کر ان میں ذکر و اذکار اور عبادتِ الٰہی کے علاوہ مواعظِ دینی کا بھی اہتمام کیا۔ گھر گھر اور گاؤں گاؤں میں خالص قرآنی احکام اور فرامین احادیث کے عین مطابق نئے دین کی خوبیوں اور اوصاف کی تبلیغ کی اور ہدایت کا پیغام پہنچایا۔

انسانوں کے درمیان، رنگ، نسل، خاندان، زبان اور ذات کی برتری کی بلندی و پستی کو مٹانے کا پیغام، برابری اور مساوات کا پیغام شاہ و گدا کے ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے اور بیٹھنے کا پیغام، انسان کے اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی غلامی سے رہائی پانے اور آزاد ہو جانے کا پیغام، یہ امتیازات جو کشمیر میں ہزاروں سال سے حکم چلا رہے تھے اور معاشرے کو اپنے قدموں تلے روند کر بیشتر آبادی کو نڈھال اور پامال کر کے اُن کو چوپایوں کی طرح ظلمتوں میں دھکیل چکے تھے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آناً فاناً مٹ گئے اور کشمیریوں نے محبت و اخوت اور برادری و مساواتِ باہمی برابری اور ہزاروں سجدوں سے آزاد ہو کر ایک ہی ذاتِ خداوندی کے سجدے کے روح پرور اور دلپذیر اسلامی پیغام کو لبیک لبیک کہہ کر قبول کر کے ہزارہا سال کی غلامی و خواری اور پستی و ذلت سے نجات حاصل کی۔ انہیں اسلام ملاحیس نے اُن کو انسانی سطح پر یکساں انسانی تفوّق، احترام، عزّت، وقار، تحفّظ، ملکیت، حقوق اور ترقی کا حقدار قرار دیا۔ اور ان کو بادشاہ تک بننے کا حق دیا بشرطیکہ وہ متّقی اور صالح و پرہیزگار ہوں۔ ہزاروں سال کی تاریخ میں کشمیر میں اسلام آنے سے پہلے

یہ تصوّر موجود ہی نہیں تھا، اور بے بس رعایا نسل در نسل غلامی میں بڑھتی اور مرتی جاتی تھی۔ لیکن حضرت شاہ ہمدانؒ کی اسلامی دعوت جو ایک نظریاتی اور اصولی دعوت تھی، تعصّب اور عصبیت سے عاری تھی۔ اس خالص اسلامی دعوت میں علاقائی، وطنی، لسانی، طبقاتی اور معاشرتی برتری یا پستی و تعصّب کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سرداری اور ذات کی برتری کا حق مٹا دیا گیا۔ خاندان و نسب کے بلند تر ہونے کے غرور کو پامال کر دیا گیا اور وادی کے طول و عرض میں ظلم و استبداد کی ظلمتوں کو ہٹا کر آزادی، خوشی و خوش حالی، انسانی برابری اور اخوّت و محبّت کی فضا قایم کر دی گئی۔ اخلاقی قدریں محفوظ کر دی گئیں اور خود حضرت شاہ ہمدانؒ اور اُن کے رفقاء مبلغین، جو بلند ترین انسانی اخلاق کے اعلیٰ ترین نمونے تھے، نے اخلاقیات کی تکمیل کے لیے سعیِ بلیغ کی۔

یہ ایک حیرت انگیز انسانی، اخلاقی، فکری اور نظریاتی انقلاب تھا جو حضرت شاہ ہمدانؒ کی ذاتی نگرانی میں کشمیر میں برپا ہوا۔ ہزار ہا سال کے مستحکم و کہنہ بیخ روایات و اوہام والے ملک میں یک لخت ایک نئی فکر کے دانے کی بالیدگی کے ساتھ آشیان گاہ بن جانا کرامات نہیں بلکہ معجزہ ہے۔ اس نئی فکر کو قبول کرنے میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی تشہیر و اشاعت میں کسی طرح کا کوئی دباؤ ہوتا تو کشمیر خانہ جنگی کا خطرناک مرکز بن جاتا۔ در اصل یہ عزیمت و استقامت کے علاوہ، خلوص نیت کے ساتھ انسانی بہبودی اور امن و سلامتی اور اخلاق و شرافت، اور کشمیر گیر اخوّت و محبت کی بحالی کی جد و جہد تھی جس کے بحال کرنے والے خدائی مجاہد، خود مثالی اور شرافت مند کردار کے نمونے تھے، یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام کے بیج جو شاہ ہمدانؒ نے بوئے ساتھ ساتھ، بلا کسی توقّف و درنگی کے ایک تناور درخت کی صورت میں سرسبز ہوئے اور یہ سبزی فضل و عنایاتِ خداوندی سے قایم ہے حضرت شاہ ہمدانؒ کی مجاہدانہ تبلیغ اور جد و جہد اس قدر محبت آمیز اور سایہ دار تھی کہ خود مسلمان ہونے کے بعد یا بعضوں کے اپنی ہی قدیم روایات یا مذہب پر قایم رہنے کے بعد کسی بھی ایک ادیب یا مورّخ نے حضرت شاہ ہمدانؒ اور اُن کے رفقائے کار پر جبر و ظلم یا دباؤ اور سختی کی تہمت یا الزام نہیں لگایا، بلکہ وہ بھی مقامی مسلمانوں ہی کی طرح آج بھی خانقاہ شاہ ہمدانؒ

کی چوکھٹ پر حاضری دیکر انکساری کے ساتھ اپنی جبینِ نیاز کو جھکاتے ہیں۔

مختصر طور پر حضرت شاہ ہمدانؒ کی اِن دینی مجاہدانہ سرگرمیوں اور تبلیغی فعالیتوں سے مُراد اِس حقیقت کو عیاں کرنا ہے کہ آپ نے اسلام کے ایک کم نظیر عالمِ دین کی حیثیت سے اپنے دینی علم کی فراست و برتری کو خالص اپنی ذات کے حق میں جاہ و منصب کی تحصیل کے لیے سند نہیں بنایا اور نہ ہی اپنے علمی اور دینی تجربوں کو کتابوں میں مقیّد کرنے پر اکتفا کیا بلکہ آپ نے اپنے جدِّ بزرگوار حضرت رسولِ اکرم صلّے اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مقدّس کے مصداق کہ: "میری امّت کے عالم بنی اسرائیل کے پیغمبروں جیسے ہوں گے"....

... بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح دینی تبلیغ کی اور اس راہ میں معجزے کیے، یہ معجزے آپ کے علمِ دین کی وسعتوں، حالات و نظریات اور واقعات، اور مذاہب و ہمعصر فکری رجحانات کی اطّلاعات کی فراہمی اور ذاتی علم کے نتیجے تھے اور اپنے رفقائے کار کو ان سے باخبر رکھتے ہوئے اپنی تبلیغی فعالیت کے خاص مرکز کشمیر میں صراحت لہجہ اور روشن بیانی اور دلنشین مواعظِ حسنہ کے ساتھ یہ معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ گویا حضرت شاہ ہمدانؒ اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد کرنے کے لیے صدرِ اسلام کے صحابۂ کرام کی طرح مجاہدین دستے کے سرگروہ کی حیثیت میں میدانِ عمل میں آ گئے۔

گھر بار کو ترک کیا، اہل و عیال کو چھوڑا، موقتی طور پر ہجرت کی، وقت کی اور محنت کی قربانی دی۔ اور جان و مال کو بھی قربان کرنے کے ارادے سے نکلے اور اس نیت سے کہ دُور دراز ملک میں شجر و حجر کی پرستشِ باطل اور پیٹ کے بل رینگنے "حیوانوں کی تمسخر آمیز "خدائی" کو حقیقی معبودِ وحدہٗ لاشریک کی فطری عبادت میں بدل دیں، عالم بے بدل ہونے کے علاوہ حضرت شاہ ہمدانؒ نے عملی میدان میں وہی کچھ کیا جو صحابۂ رسولؐ نے کیا اور تابعین نے کیا۔ عالم کی حیثیت سے بھی آپ نے دینی عمل سے کام لے کر اپنے نتائج و ثمرات علمِ دین کو تحریرات و مکتوبات اور شعری و نثری آثار کی صورت میں مسلمانانِ عالم کے سامنے پیش کیا اور عالم باعمل اور متحرّک مجاہدِ اسلام کی حیثیت سے بھی وہ کارنامہ کر دکھایا جو اسلامی تاریخ میں ایک روشن باب ہے۔ ایک مجاہد عالم باعمل ہونے میں حضرتِ شاہِ ہمدانؒ

کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ اس عمل میں منفرد اور یکتا ہیں اور غالب !

* * *

مردِ میدانِ عمل اور دینی مجاہد اور مبلّغ اعظم اور ایک عالِم بے بدل ہونے کے ساتھ حضرت سیّد السّادات امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ ایک صاحب کمال عارفِ الٰہی تھے اور معرفتِ خداوندی میں آپ نے ایسی رفعت و عظمت پائی کہ آپ دُنیائے اسلام میں برگزیدہ ترین اور مقبول ترین اولیائے کبار میں شمار ہوتے ہیں۔

عرفان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے معنی کائنات کی حقیقتوں کی معرفت و شناخت اور کائنات میں جاری و موجود اللہ کی تجلّیات اور اُس کی صفات کا ادراک ہے اس لیے معرفت و عرفان خدا تعالیٰ ہی کی حکمت و قدرت کامل سے حاصل ہو سکتا ہے۔

آدمی کائنات کی ہر چیز میں اس کے خالق کی قدرتوں، حکمتوں اور صنعتوں کا مشاہدہ کر کے اُس کے وجودِ مقدّس کو تمام ذرّوں میں پاتا ہے اور یقین حاصل کرتا ہے کہ کائنات اور اسکی سبھی موجودات خدائے لاشریک ہی کی تخلیق ہیں، اُسی کے فرمان پر مصروفِ کار ہیں اور اُسی کی بندگی کی مُہر اُن پر لگی ہے، اُسی ایک خدائے لایزال سے فیضیاب ہوتے اور وجود پاتے ہیں۔

حکمت اور معرفت یا عرفان ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ ایک واقعی حکیم اور حقیقی عارف میں کوئی فرق نہیں۔ حکیم کائنات کی اشیاء کی حقیقت کا تلاش کرنے والا ہوتا ہے اور عارف بھی اسی کی جستجو کرتا ہے، معرفت کا بلند ترین درجہ توحید ہے۔ جو خود کو پہچان لے وہی خدا کو بھی پہچان لے گا، خود کو پہچاننے کے لیے ایک مستحکم و مضبوط قدرتِ ادراک، کافی تربیّت پانے، غور و فکر اور سخت مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہے اور ذاتی بصیرت اور فطری ہوش و ذکاوت بھی ہمراہ ہو، ورنہ جو فطرت میں ہی کُند ذہن اور ناسمجھ ہوں اُن کے لیے کسی بھی صورت میں خود شناسی اور خدا شناسی اور اس کے نتیجے میں عرفان کی بلندیوں تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔

عرفان حقیقت میں وہ پہچان و شناخت یا معرفت ہے، جو ایک روحانی کیفیت پر انحصار رکھتا ہے، اور یہ کیفیت ایسی ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس میں آدمی پر

یہ احساس چھا جاتا ہے کہ اُسے وجودِ مطلق کے ساتھ بلا واسطہ براہِ راست تعلّق پیدا ہوا ہے اور یہ احساس واقعی ایک روحانی حال ہوتا ہے جس کی توصیف کرنا محال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مطلق کے ساتھ عارف کا رابطہ کسی دلیل و بُرہان سے نہیں، بلکہ ذوق و وجدان سے ہوتا ہے۔

تصوّف البتّہ عرفان سے مختلف ہے، تصوّف ایک مدرسہ ہے اور مکتب۔ جس میں آدمی اپنی ذات کی تعلیم و تربیت کے لیے داخل ہوتا ہے، اور آداب و احکام اور شرائطِ لازمہ کی پابندی سے تکمیل کرتا ہے، جب کہ عرفان اس مکتب سے فارغ ہو جانے کے نتیجے کے حاصل ہونے کا نام ہے، اس لیے ہر عارف صوفی ہوتا ہے، جب کہ ہر صوفی عارف نہیں ہوتا۔

صوفی تصوّف کے تربیتی مکتب میں رسوم و آداب اور ضروری شرائط کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے تاکہ خود کو کمال کی منزل تک پہنچانے اور حقیقتوں کے ادراک اور کائنات کے اسرار کی معرفت و شناخت یا عرفان کے لیے آمادہ کرے اور حیوانی دُنیا کی پستیوں سے نکل کر انسانی درجوں کے بلند ترین مرتبے پر پہنچے۔ اس راہ کو تصوّف کی اصطلاح میں سلوک اور اس راہ پر چلنے والے کو سالک اور ان تمام آداب و رسوم و شرائط و قواعد کے مجموعے کو جن کی پابندی سالک پر لازمی ہے اور جو درحقیقت بشری نفس کے تصفیہ کی راہ اور بلند انسانی مرتبے تک پہنچنے کی راہ ہے، طریقت کہتے ہیں۔

اِس راہ کا سفر چونکہ ایک معنوی اور روحانی سفر اور درحقیقت نفس کا سفر پستی سے کمال کے حصول کی منزل، اور انسان کے خلقت سے جُدا ہو کر خالق کی طرف عروج کرنے کا سفر ہے اس لیے اس سارے راستے اور سفر میں سامنے آنے والی منزلیں اور مرحلے بھی سب کے سب روحانی اور معنوی ہیں۔ اور یہ فکری، نفسانی، صفاتی اور طبعی تغیّرات کے منازل ہیں جو سالک کو حاصل ہوتے ہیں اور اگرچہ ممکن ہے کہ ان مرحلوں کے ناموں اور ان کی تعداد میں مشایخ و مرشدین کے ذوق و مشرب کے مطابق فرق ہو لیکن مقصد اور نتیجہ سب کا ایک ہی ہوتا ہے، سب مراحل میں پہلا مرحلہ آدمی کی ذاتی غفلت اور ناچیزی کا مرحلہ ہوتا ہے اور آخری مرحلہ توحید کو پانے کا مرحلہ جس میں آدمی کا دل اور اسکی

آنکھیں عظمتِ الٰہی کی رؤیت اور اپنی انتہائی عاجزی کی طرف کھل جاتی ہیں اور وہ اللہ کے جلوے کو تمام اشیاء عالم میں، راہ میں پڑی مٹّی میں موجود ذرّوں سے لے کر آسمانی ستاروں اور دور کہکشانوں تک، انتہائے بصارت تک دیکھتا ہے، پاتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور دیکھ لیتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کچھ نہیں اور ہستی کے تمام ظواہر اُسی ذاتِ کریم اور اُسی کی حکمت و قدرت اور علم کے آفتاب کے جلوؤں کا پرتو ہے اور یقین بلکہ عین الیقین سے پکار اٹھتا ہے ؎

کہ یکی ہست و ہیچ نیست جز او
وحدہٗ لا الٰہ الّا ہو

گویا معرفت و عمل میں صوفی کا مقصد سلوک ہے حق کی راہ میں، اور اس کی یہ راہ ریاضت بھی ہے اور کشف و شہود بھی۔ اس کا پہلا قدم توبہ ہوتا ہے تاکہ اس کی روح اور اس کا دل صاف و مطہّر ہو جائے اور اللہ کے ساتھ رابطہ ہو جانے کی قابلیت پیدا کرے۔

اس کے بعد مجاہدہ آتا ہے، نفس کے ساتھ مجاہدہ جو آدمی کو دنیوی شہوتوں لذّتوں اور خواہشوں اور دنیا کی دل فریب رنگینیوں کی طرف راغب کرتا ہے اور اُسے اللہ کی راہ سے دور رکھتا ہے، مجاہدے کی شرط یہ ہے کہ یہ ایک کار آزمودہ پیر اور تجربہ کار رہبر کے ارشاد و اشارات و رہبری کے تحت عمل میں لایا جائے جسے صوفیوں نے مرشد یا شیخ کا نام دیا ہے۔ اور سالک مرید اُس کے ہاتھوں میں ایسے ہو جیسے کہ ایک غسّال کے ہاتھوں میں میّت ہوتی ہے۔ بغیر کسی ارادہ و اختیار کے۔

یہی شیخ و مرشد ہے جو سالک کو اپنی استعداد اور قوّت کے مطابق ریاضت اور مجاہدہ میں سرگرم کار رکھتا ہے۔ اور طویل روزہ اور طویل خاموشی، فکر و غور و خوض، محاسبۂ نفس، نفس کشی وغیرہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اگر سالک ریاضت و مجاہدے میں واقعتاً صمیمیت اور صدق و خلوص قایم رکھنے میں کامیاب ہوا تو وہ کمال کے مراتب کی طرف بڑھے گا۔ ریاضت و مجاہدے سے صوفی سالہا سال کے بعد طریقت کی منزلوں کو جو مقامات کہلاتے ہیں، طے کرتا ہے۔ توبہ سے ورع کے مقام میں آتا ہے اور وہاں سے فراغت پانے کے بعد زہد کے مقام میں جاتا ہے، زہد کے بعد فقر، پھر صبر اور پھر توکّل اور اسکے بعد آخری مقام رضا میں آتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان مقامات میں مشایخ کے

نزدیک فرق ہے[1] لیکن مقصد اور غایت ایک ہی ہے اور وہ ہے براہ راست وصل حق کے ساتھ جو کمالِ انسانی ہے اور اس کی انتہائی روحانی معراج ۔

ظاہر ہے کہ یہ کمال سوائے اسکے حاصل نہیں ہوگا کہ آدمی گفتار و کردار اور دانش و معرفت میں کامل بن جائے اور یہ کاملیت بھی اُس کے شریعت، حقیقت اور طریقت میں مکمل ہونے کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے ، امام غزالیؒ نے عرفانِ الٰہی اور جہانِ آفرینش کے اسرار کی بصیرت پانے کے لیے فطری دانش و خرد اور ذاتی ذہانت اور بصیرت کے شرائط کا ذکر بھی کیا ہے ، لیکن تمام عارفوں اور صوفیا کا یقین یہی ہے کہ دُنیاوی عجائبات اور دنیاوی خوبصورتی اور دنیوی اسرار و رموز نیز حقیقتِ حق کے پانے کی استعداد فقط انسان کے دل میں ہے اور حضرت امام غزالیؒ نے بھی احیاء علوم الدّین میں نیز کیمیائے سعادت میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : "اس کتاب میں جہاں ہم دل کا نام لیں گے اس سے مراد گوشت کا وہ ٹکڑا نہیں ہے جو اس ملک اور شہادت کی دنیا میں ہمارے ساتھ ہے اس کی کوئی وقعت نہیں یہ تو حیوانوں میں بھی ہوتا ہے ، اس کے دوسرے معنی ہیں ربّانی لطیفہ اور روحانی سِر اور یہی انسان کی حقیقت ہے جسے یہ دل پاتا اور پہچانتا ہے "

دل کا یہ مقام دراصل عشق و محبتِ الٰہی کہلاتا ہے جو حقیقت میں معرفت کا نتیجہ ہے اور جب تک، جیسا کہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں، آدمی کسی کی یا کسی چیز کی معرفت کو حاصل نہ کرے اور اس کی خوبی اور خوبصورتی سے واقفیت نہ پائے تب تک وہ اُس سے محبّت نہیں کر سکے گا ۔ اس لیے جو شخص یا عارف یا صوفی عشقِ الٰہی کا دم بھرتا ہے اس کا دعویٰ

---

[1] خواجہ عبداللہ انصاریؒ کے نزدیک مقامات کی تعداد ایک سو ہے اور وہ ہر ایک مقام کی دس حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلی منزل کو یقظہ اور آخری کو توحید جانتا ہے ۔ احیاء العلوم میں حضرت امام غزالیؒ نے مقامات کی تعداد نو بتائی ہے اور محبّت کو آخری مقام کہا ہے، خواجہ فریدالدین عطارؒ نے "منطق الطیر" میں راہِ عرفان کی وادیوں کی تعداد سات بتائی ہے اور ساتویں وادی کو فقر و فنا کا نام دیا ہے ۔

تب ہی ایک حقیقت ہو گی جبکہ واقعتاً حق کی شناخت و معرفت اسے حاصل ہوئی ہو گی اور اُس نے سب چیزوں میں اور سب لوگوں میں خالق دوجہاں کی حکمت اور اس کی لازوال قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ کیا ہو گا، اس لیے خدا شناسی کا مقصد لازوال قانونِ قدرت اور شناختِ اسرار و تجلیاتِ حق سے ہے جو دنیا کے ہر ذرّے میں موجود ہیں اور دُنیا کی ہر چیز میں حق کی حکمت و قدرت پوشیدہ ہے۔

البتہ یہ معرفت و شناخت ہر کسی کے بس کی بات نہیں وہ اپنی استعداد، فکر و نظر کی بلندی اور ہوش و خرد اور بصیرت کے مرتبے کے مطابق ہی ادراک کر پاتا ہے، لیکن بصیرت جس قدر وسیع اور فکر و نظر جس قدر درست و رسا، اور علم و معرفت میں جس قدر اضافہ ہو گا اُسی قدر دُنیا کو زیادہ عظیم، خالقِ دنیا کو زیادہ بزرگ اور اپنے آپ کو زیادہ حقیر و عاجز پائے گا اور وہ، جیسا کہ سب ہی عارفوں نے کہا، خود کو درمیان میں موجود نہیں پائے گا بلکہ فانی اور مٹا ہوا پائے گا۔ اس لیے اس رتبے تک رسائی کے لیے خود شناسی کو لازم قرار دیا گیا ہے اور خود شناسی کے لیے کمالِ معرفت اور استعداد اور ادراک اور بصیرت کا ہونا لازمی ہے۔

ایک حقیقی عارف کو پہچاننے کے لیے ہمیں ایسے عالم کو بھی دیکھنا ہو گا جو کسبِ علم اور دانش کی تحصیل کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی تکمیل اور نفس کی تربیت بھی کر رہا ہو اور کتابوں کو لکھنے کے ساتھ ساتھ کون و مکان کی کتاب پر بھی تحقیق و تلاش کر رہا ہو اور جو دل و دماغ کی تربیت کو ایک ہی ساتھ عمل میں لا رہا ہو اور اپنی "تلاش و کوشش اور تحقیق و جستجو میں حقیقت کے اکتشاف کی غرض و غایت رکھتا ہو، گویا دنیا میں اللہ تعالیٰ کے اسرار و تجلیات کے مطالعہ کی اوّلین سیڑھی سے وہ کون و مکان کے خالق اور اس کے اسرار و تجلیات کے مالک کی ذات سے عشق و محبت پیدا کرتا ہے۔

اگرچہ عشق و محبت کی منزلوں کو طے کرنا اور آخر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصل ہو جانا بغیر شریعت و طریقت کی پابندیوں کے ایک بظاہر دشوار امر ہے لیکن قرآن مجید میں فانی انسان کا خداوند بزرگ کے ساتھ پیوند پیدا ہونے کی طرف صریح اشارے موجود ہیں۔ قرآن مجید میں میثاق کا ذکر ہے جو صوفیوں کے نزدیک محبت کا عہد نامہ ہے

انسان اور اللہ کے درمیان۔ قرآن پاک میں امانت کا ذکر ہے جسے لوگوں پر اتارا گیا۔ زمین اور آسمان اسے اٹھا نہ سکے اور اسکی ذمّہ داری قبول نہیں کی لیکن انسان نے اسے قبول کیا کیونکہ وہ ظلوم وجہول تھا۔[۱]

مومنین کے لیے قرآن مجید میں دیدار کا بھی ذکر ہے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار۔[۲] اس کے علاوہ اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور جس طرف بھی اپنے چہرے کو آدمی پھیر دے گا اُس طرف خدا موجود ہے اور اس بارے میں قرآن مجید میں بھی اس کی گواہی موجود ہے[۳]

ان سے عیاں ہو جاتا ہے کہ اللہ آدمی سے دور نہیں۔ اس کا فرزندانِ آدم سے عہد ہے، وہ اور اُس کا وجود ہر جگہ محسوس ہوتا ہے، وہ گردن کی رگ سے بھی، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔[۴] انسان کے زیادہ نزدیک ہے اور اس فاصلے کے باوجود بھی جو فانی اور محدود وجود اور اُس باقی رہنے والے اور نا محدود وجود کے درمیان ہے، اس کے دیدار کی آخرت میں اُمید کی جاسکتی ہے اور اس دُنیا میں بھی ہر جگہ اس کے ساتھ تعلق قایم ہو سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے ہر صاحب دل یہی آرزو رکھتا ہے کہ اپنے خدا کو ہمیشہ اپنے ہمراہ رہتا دیکھے اور ہمیشہ اُس کے ساتھ عشق رکھے۔ خدا اور آدمی کے درمیان جو یہ محبت ہے اور قرآن مجید میں جس کی طرف اشارہ ہے[۵] اس عشق کا مولد و منشار ہے اور یہ عشق معشوق کے حکم کی عاشق سے مکمل تعمیل کا طالب ہے۔

---

[۱] قرآن مجید۔ سورۂ احزاب آیت ۷۲۔ اس بارے میں حافظ نے کہا ہے:

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

[۲] سورۂ القیامۃ آیت ۲۲۔

[۳] سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۵۔

[۴] سورۂ ق آیت ۱۶ اور سورۂ البقرہ آیت ۱۸۶۔

[۵] سورۂ المائدہ آیت ۵۴۔ اور سورۂ آلِ عمران آیت ۳۱ ۔

اور اُسی معشوق پر توکّل اور اعتماد چاہتا ہے، اور ان ساری باتوں کی جڑ قرآن مجید میں ہے اور اس سے باہر نہیں۔[1]

احادیثِ نبویؐ میں اللہ اور مؤمن کے دل کے درمیان تعلق ہونے کے اشارے موجود ہیں اور ان میں مثلاً ایک حدیثِ قدسی ہے کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زمین و آسمان میں میری گنجایش نہیں لیکن بندۂ مومن کے دل میں میرے سمانے کی گنجایش ہے، اور ایک حدیث قدسی یہ بھی ہے کہ جب میں اپنے بندے کے ساتھ محبت کرتا ہوں تو میں اس کی آنکھیں، اس کے کان اور اس کا منہ بن جاتا ہوں، چنانچہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے، مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے بولتا ہے۔ اس طرح کی احادیث جو مجموعی احادیث ہیں اور بھی کئی طرح سے موجود ہیں، ایک سند ہے اُن مومنوں کے لیے جو عشقِ الٰہی اور محبّتِ حق کو ہی اپنا مقصد و مراد بنا چکے ہیں۔

محبّتِ الٰہی یا عشقِ الٰہی کے لیے دل کا تصفیہ یا دل کی پاکیزگی ہونی چاہیئے جو شریعت و طریقت کے لوازم کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے، جس کے لیے مرشد یا شیخ کی رہبری اشد ضروری ہے اور مرشد اوّلین فرصت میں مرید کو یا سالک کو کبر و رعونت اور دُنیوی آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے اسے سخت اور صبر آزما کاموں میں مشغول رکھتا ہے اور جب مُرید کی خود بینی خود فراموشی میں مکمل طور پر بدل جاتی ہے تب مرشد سالک کو آگے بڑھنے کے لایق سمجھکر اس کی مزید رہبری کرتا ہے۔

صوفیا نے نفس کی تربیت اور رعونتِ نفس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ریاضتیں کی ہیں اور مشقّتیں اٹھائی ہیں، بھوک اور گدائی کی منزلوں سے گذرے ہیں۔ بیت الخلاء صاف کیے ہیں، کتّوں کے ساتھ صحبت رکھی ہے اور انتہائی عاجزی و انکساری اور افتادگی سے مُرشد کے احکام کی تعمیل میں ایک وہ زندگی بھی ایام تربیت میں گزاری ہے

---

[1] ہم اس بات کا مطلق قایل نہیں کہ اسلامی تصوّف پر اسلام سے باہر دیگر مذاہب جیسے زردشتی یا عیسائی یا بُدھ مت یا ہندو مت مذاہب کا کوئی اثر ہے۔ اسلامی تصوّف اپنے مزاج اور طریق میں محض اسلامی ہے اور کچھ نہیں۔

جو بظاہر پست اور خواری کی زندگی تھی لیکن ریاضت و مشقّت کی اس سخت بھٹّی سے نکل کر وہ سونا بن گئے اور وہ مراتب پائے کہ اُن کی نظریں اُمتوں کے لیے تقدیر ساز بن گئیں[1]

حضرت شاہ ہمدانؒ ایک صوفی تھے اور عارف بھی اور عارف بھی ایسے کہ مشہور عُرفاء میں آپ کا نام شامل ہے۔ قبلاً بیان ہو چکا ہے کہ مرشد حضرت شیخ شرف الدّین محمود مزدقانیؒ نے، جن کا انتخاب خود حضرت رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا، آپ کو کن صبر آزما آزمائشوں سے گزارا، اور آپ نے ذوق و شوق میں اُن تمام خانقاہی اور متصوّفانہ ریاضتوں مشقّتوں اور سخت و شدید پابندیوں کو، جن میں بیت الخلاء کی صفائی کرنا، جنگل سے لکڑی لانا، دور جگہوں سے پانی کے مٹکے بھر بھر کے لانا، بڑے بڑے پتھروں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، ماتھے پر مٹی کے ڈھیلوں کو رگڑ رگڑ کر مرشد کے لیے آمادہ رکھنا اور پھر کڑاکے کی سردیوں کے ایّام میں یخ کو توڑ کر وضو کرکے ذکر و اذکار کی پابندی کے ساتھ اور طویل فاقوں کے ساتھ تربیت شامل تھی، قبول کیا۔ مرشد کے حکم سے آپ کی ریاضتوں میں رقص بھی شامل تھا[2] رقص و سماع کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی غذا ہے جو

---

[1] تصوّف و عرفان پر میری یہ بہت مختصر سی تحریر، کشف المحجوب ہجویری، نفحات الانس جامی طرائق الحقائق معصوم علی شاہ، طبقات الصّوفیہ خواجہ انصاری، اور مرصاد العباد نجم الدّین دایہ اور ارزش میراث صوفیہ از عبدالحسین زرّین کوب کے مطالعات سے ماخوذ ہے۔

[2] ...". و با این تربیت در وقت سماع صحن خانقاہ را بسر رقص میکردم و در ہر ہفتہ دو بار سماع می فرمود...." ("... اور اس تربیت کے ساتھ سماع کے وقت میں خانقاہ کے صحن میں سر کے بل رقص کرتا تھا اور ہر ہفتہ میں دو بار سماع کا حکم ہوتا تھا۔ فرمودۂ شاہ ہمدانؒ بنقل از خلاصۃ المناقب")۔ نیز شاہ ہمدان نے فرمایا: "و این فقیر از جناب سیادتؒ شنود کہ فرمود کہ در بدایت ارادت ہر کہ عاشق سماع نہ باشد از وی ہیچ کاری نیاید...." (اور اس فقیر نے حضرت سیّدؒ سے سُنا کہ آپ نے فرمایا تربیت پانے کے اوائل میں جو شخص سماع کا عاشق نہ ہو اُس سے کچھ نہیں ہو سکتا....")

مقرر اور معیّن ہے اور جب تک غذا نہ ملے کوئی حرکت نہیں ہو سکتی۔ یہ غذا خوشی و نشاط کی صورت میں خوب صورتی اور خوش آوازی کی شکل میں سلطانِ دل کو مہیّا کی جاتی ہے جس سے دل حرکت میں آجاتا ہے اور اس میں ایک جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے، جب تک یہ غذا ملتی رہتی ہے دل سکون و آرام میں رہ سکتا ہے۔ غذا مرٹ جائے تو سلطانِ قلب آگ کی مانند جلنے لگتا ہے بلکہ آگ کی حرارت اور سوزش میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ آگ کی سوزش اور حرارت کیا ہے ؟

یہ در اصل اُس کے دیدار کے سمندر میں محو و فنا ہو جاتا ہے اور جب عاشق بحرِ شہود میں غوطہ زن ہو جاتا ہے تو خُدائے وَدُود کے کنارے سے ہی بالآخر لگ جاتا ہے۔ گویا اس سلطان کے جسم کے لیے ساری دوا دارو اُسی شہنشاہِ جان سے مہیّا ہوتی ہے اور اس طرح سے عاشق شفایابی کے عالم میں داخل ہو کر صحت مند ہو جاتا ہے اس کی تپش، حرارت اور سوزش مٹ جاتی ہے، اور وہ اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے۔ سلطانِ دل خوش ہو جاتا ہے، اس کے تابع جسم کے اعضاء بھی مسرور ہو جاتے ہیں، روح بھی اپنی جگہ پر لوٹ جاتی ہے اور جسم کی حرکت آہستہ آہستہ دھیمی پڑ کر جوشِ تب اور سوزش سے خالی ہو جاتی ہے۔ اور عاشق رو بہ صحت ہو جاتا ہے۔

در اصل روح بھی دل پر عاشق ہے اور دل کے ساتھ یک جان ہونے کی آرزو میں تڑپتا رہتا ہے۔ دل کے بغیر اُسے قرار نہیں ہوتا اور دل کو ہی اپنا غمگسار جان کر اس کے لیے مضطرب رہتا ہے۔ اس لیے روح اگر دل کو سماع و نوا میں مشغول پاتا ہے تو روح بھی وفا شعار عاشق کی طرح دل کا ساتھ دیکر رقص میں آجاتا ہے اور ظاہر ہے دل اور روح دونوں کی اس کیفیت سے انسان جولانی میں آجاتا ہے اس کی روح اپنے اصلی وطن کو یاد کرتی ہے اور اس کیفیت کے دوران وہ جسم و بدن کی ظلمتوں سے دُور لامکان کی طرف پرواز کرتی ہے اور اپنے محبوبِ جاودانی کے ساتھ ذوق و شوق سے وصل کی آرزو میں روان ہوتی ہے اس بُلبل کی طرح جو گل کو دیکھتے ہی نالہ و فغان کرنے لگ جاتی ہے۔

دِل گُل کی مانند ہے اور جب وُہ بلبل کی آواز سنتا ہے تو یہ بھی فریاد و فغان کرنے لگتا ہے۔ گل جب چہچہانے لگے تو بھلا باغ خوشی و نشاط میں کیوں رقص میں نہ آئے ؟ اسی طرح دل اور روح دونوں فریاد و فغان میں آکر متفق ہو جاتے ہیں، دونوں جمالِ مطلق

میں مستغرق ہو جاتے ہیں، بے شک و ریب، اور بے نقص و زوال! صاحب حال آدمی جسکے دل و روح پر یہ حال طاری ہو جائے، جس کا دل اور جس کی رُوح اس کیفیت میں وصلِ جانان کی راہ پر روانہ ہو چکے ہوتے ہیں، اگر اس حال میں وہ اپنے سر کو پتھروں پر بھی مارے اور اس کا سر پھٹ بھی جائے اسے اس تباہی کا مطلق کوئی احساس نہیں ہوگا اور نہ کوئی خوف چنانچہ اس کے جسم سے خون کی ندیاں بھی اگر جاری ہو جائیں جب بھی وہ مدہوشی اور بے اختیاری کے عالم میں اس سے بے خبر ہوگا۔ سماع کا نتیجہ یہی اور سماع کا باعث یہی ہے۔

یہ حالت اور کیفیت اہلِ سماع یعنی اہل شجاع پر ہی طاری ہو جاتی ہے۔ اندھے لوگ ہی اس سے انکار کرتے ہیں۔ بھلا وہ نور و روشنی کو کیا جانیں۔ اندھے کو نور کی کیا پہچان اور چمگادڑ کی طرح بھلا وہ آفتاب کو کیسے جان سکتا ہے، مردِ سماع ہی بلاؤں میں مبتلا رہتا ہے۔

یہ سماع واقعی مشکل ترین درد ہے کیونکہ اس درد کا زخم کسی بھی مرہم سے شفایاب نہیں ہوتا۔ سوزش و حرارت کی وجہ سے یہ درد بڑھتا ہی رہتا ہے۔ جب تک معشوق اپنے دیدار کی طبابت سے اس زخم کی دوا نہ کرے یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ محبوب کی بس ایک ہی نگاہ اس دردِ دل کے لئے کافی ہے، چشمے کی طرح یہ پانی پھوٹتا ہی رہتا ہے اور رُکتا نہیں۔ بعض صاحبِ حال کہتے ہیں کہ رقص و سماع میں بے ہوشی اور فراموشی کے بعد جب ہوش لوٹ آتا ہے تو پھر آپ لوگ پھر سے اس کیفیت سے دستبردار ہو کر نئے سرے سے طہارت کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ بیہوشی سے مسئلہ کے مطابق وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن یہ بیہوشی وہ بے ہوشی نہیں جس سے تقص طہارت ہو جائے۔

یہ تو روح اور دل کے جوش میں آجانے کی کیفیت ہے جس کے نتیجے میں دونوں شور و فغان کرتے ہیں، یہ ظاہری بے ہوشی نہیں یہ تو وہ بے ہوشی ہے جس میں مردِ سماع عالمِ غیب کے نشیب و فراز کی آگہی پاتا ہے اور ظاہر ہے جب وہ اُس دنیا کی خبر پاتا ہے تو پھر وہ اپنے سے بے خبر ہو گا ہی۔ احادیث میں بھی اور دینی علوم کی کتابوں میں بھی

آیا ہے کہ ایک روز ایک اعرابی نے عربی زبان میں یہ رُباعی پڑھی جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند آئی۔ اور اس سے آپؐ کے چہرۂ مطہرہ پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور دوشِ مقدّس سے ردائے مُبارک تک بھی نیچے پائے مبارک تک کھسک آئی اور صحابۂ کبار نے تبرّک کے طور پر اس ردائے مبارک کو اپنے پاس رکھنے کی استدعا کی۔ عربی رباعی (فارسی ترجمہ کی صورت میں) یہ تھی ؎

از نارِ غمش گزیدہ دارم جگری — کو را نہ کند ہیچ فسونی اثری
جُز دوست کہ من شیفتۂ رُوی وَیم — افسونِ علاجِ من نداند دِگری [1]

(اُس کے غم کی آگ میں میرا جگر سراپا مجروح ہے جس پر کوئی دوا اثر نہیں کرتی۔ دوست کے بغیر جس کے دیدار کا میں عاشق ہوں، کوئی اور میری بیماری کا علاج کرنے سے واقف نہیں)۔

دنیوی آلائشوں سے مرشدِ بزرگوار کی منظم جسمانی مشق و محنت اور کٹھن آزمائشوں اور ابتلاؤں اور امتحانوں کی منزل سے گزرنے کے نتیجے میں متصوّفانہ روحانی منزلیں طے کرنے کے اہل ہو کر آپ لازمی مرتبوں سے بھی گزرے جن میں استغراق، توبہ، ورع، فقر، ایثار، زہد خوف و رجا، صبر و توکّل، اور رضا شامل ہیں۔

یہ سب منزلیں دراصل معرفتِ خداوندی، اور حبِّ الٰہی اور رویت و وصلِ الٰہی کی پیش منزلیں ہیں اور ان سب منزلوں سے گزر کر حضرت شاہ ہمدانؒ نے ایک مکمل عارفِ آیاتِ الٰہی، عارفِ تجلّیاتِ الٰہی عارف صفاتِ الٰہی اور عارفِ حقیقتِ ذاتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی کا مرتبہ پایا۔ لیکن ان ساری حیثیتوں میں حضرت شاہ ہمدانؒ وحدت الوجود کے قایل نظر نہیں آتے۔ وحدۃ الوجود سے مراد یہ ہے کہ وجود دراصل ایک ہی ہے یعنی واحد ہے جو تمام موجودات کا سرچشمہ ہے اور ساری کائنات تجلّیات کی صورت میں اسی ایک وجود مطلق سے نکلی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو: نظم المناقب قلمی نسخہ زیر عناوین: "پُرسیدن حقیقت سماع از جناب حضرت سید علی الہمدانی رضؓ" (اور) "در بیان وجہ جوشش سماع می گویند" اور "وجہ برخاستن و رقص و سماع کردن می گویند" نیز ملاحظہ ہو منقبۃ الجواہر۔

اور بالآخر اسی کی طرف لوٹ کر محو ہو جاتا ہے، اس موجودِ واحد کے سوا موجود جو کچھ بھی ہے وہ بے وجود ہے اور اس کا خود کوئی وجود نہیں، وہ تو بس اُسی واحد وجود کی نمود ہے۔ اسے ہمہ اوست بھی کہتے ہیں [لہ] گویا اس لحاظ سے ظاہری آنکھوں سے جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں سب اُسی وجودِ واحد کا جلوہ ہے اور کوئی بھی چیز اس سے الگ نہیں؛ چونکہ اسلام کی بنیادی اور اصولی تعلیم توحید ہے، یعنی خدا صرف ایک ہے اور بس اُسی کی ذات لایق عبادت ہے، اس لیے نظریۂ وحدۃ الوجود اور نظریۂ توحید میں بڑی مشابہت صوفیائے اسلام کو نظر آئی اور انہوں نے وحدۃ الوجود کو توحید کا باطنی پہلو قرار دیا اور اس طرح سے تصوّفِ اسلامی کا لازمی جز و بن گیا اور پھر تصوّف میں جو تجربے ہوئے اُن کے نتیجے میں نئی اصطلاحیں وجود میں آگئیں جیسے استغراق، فنا، بقا، اتحاد بذاتِ حق، محو، فنار الفنا، صحو، سُکر۔ بعض صوفیا کے تجربوں نے جن میں حضرت بایزید بسطامیؒ پیش پیش ہیں، شریعت سے وحدۃ الوجود کو ٹکرایا اور اہلِ شریعت کی نظروں میں اہل وحدۃ الوجود خارج از شریعت قرار پائے اور انہیں گمراہ کہہ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کی بلکہ اس اختلاف کی زد میں حسین ابن منصور حلّاج (وفات ۳۰۹ھ ۹۲۱ء) کو دار پر چڑھایا گیا۔

حضرت شیخ علی ہجویریؒ وحدۃ الوجود کے قائل نہ تھے اور نہ ہی صوفیوں کے خیال کے مطابق سالک کا اپنے وجود کے خدا کی ذات میں گم کر کے اس کے دائم و قایم ہو جانے کے قائل تھے، حضرت ہجویریؒ لکھتے ہیں کہ حادث قدیم ہیں اور عابد معبود میں گم ہو کر متّحد و متصّل ہو جائے یہ ناممکن اور محال ہے، سالک فنا اور بقار میں اپنی بشریت کے ناروا تقاضوں سے پاک ہو کر نیک صفات پاتا ہے اور اخلاص اور بندگی کے صحیح مقام کو دریافت کر لیتا ہے یعنی سالک اپنی بشریت کے ناروا تقاضوں اور خواہشوں سے مطلق پاکیزگی پائے یہی فنا کا مقام ہے اور اس پاکیزگی کو حاصل کرنے کے بعد نیک

[لہ] یہ بھی کہا گیا ہے کہ واحد وجود کی نمود کی حیثیت میں کائنات اُسی واحد وجود سے نکلی ہے اور وہ خود کسی سے نہیں نکلا ہے۔ اس نظریۂ کو ہمہ از وست کہتے ہیں۔

صفات سے مزین ہو کر اخلاص و بندگی کے مقام کو حاصل کرے یہی بقا کا مقام ہے۔ حضرت ہجویریؒ سماع کے قایل تھے لیکن بعض شرائط کے ساتھ، یعنی سماع کی محفل عوام سے خالی ہو یعنی بے خبر لوگ اس میں شامل نہ ہوں۔ سالک جب اشد ضرورت محسوس کرے تب ہی سنے عادت نہ بنائے، اور جب سماع کی محفل ہو تو اس میں مرشد کا ہونا لازمی ہے، سماع کے وقت دل دُنیا کے خیالات و شہوات و لذّات سے مطلق خالی ہو اور قوّال بھی پاک دل اور پاکیزہ خیالات کے اور صاحبِ دل لوگ ہوں۔[1]

حضرت امام غزالیؒ (وفات ۵۰۵ھ) جنہوں نے صوفیوں اور اہلِ شریعت فقیہوں کے درمیان جھگڑے کو اپنی فطری علمی بصیرت اور دینِ اسلام میں گہری نظر رکھنے کی بنیاد پر تصوّف کی نئے سرے سے ترتیب و تدوین کی اور اہلِ شریعت فقہاء کو بھی زیر کر لیا اس تنازعہ کو بہت حد تک ختم کرنے میں کامیاب ہوئے، چنانچہ فقہاء بھی تصوّف کی طرف مائل ہوئے، اس لحاظ سے وہ حجۃ الاسلام کہلائے۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ (وفات ۶۳۸ھ) کا نظریہ وحدۃ الوجود اسلامی دُنیا میں چھا گیا۔ کیونکہ یہ نظریہ ابن العربی کے یہاں کمال کو پہنچا۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ وجود واحد ہے۔ موجود وہی ہے، اور مخلوقات کی ہستی عین خالق کی ہستی یا وجود ہے۔ حقیقت، دونوں کی، یعنی موجود کی اور مخلوقات کی، یا خالق اور مخلوق کی، ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر کوئی خالق اور مخلوق کے وجود میں فرق کا قائل ہے، دراصل وہ خود اپنے اندر کی حقیقت کو سمجھنے سے جاہل ہے۔ ابنِ عربیؒ کہتے ہیں کہ عالم اور اللہ کی نسبت عینیت کی نسبت ہے۔ اس عینیت کا ثبوت یا وہ وجودِ عالم کی نیستی سے دیتے ہیں یا خدا کی ہستی سے، اُن کا کہنا ہے کہ عالم کا وجود ایک وہمی خیالی، برائے نام اور غیر حقیقی وجود ہے اور خارج میں معدوم ہے، عالم ہی اللہ ہے۔ عالم اللہ کی ہی واحد ذات کی تجلّی

---

[1] ملاحظہ ہو: کشف المحجوب مصنّفہ حضرت شیخ علی ہجویریؒ، یہ کتاب فارسی نثر میں تصوّف پر پہلی بے نظیر کتاب ہے، حضرت ہجویری داتا گنج بخشؒ کے لقب سے مشہور ہیں اور لاہور میں آپ کا روضۂ مبارک مرجع مسلمانانِ عالم ہے، آپ نے سنہ ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔

ہے جس میں اُس کی وحدت ہی وحدت موجود ہے اور اس وحدت میں اس نے خود کو نمودار کیا۔ ان تجلّیات سے پرے وحدت کا الگ اور کوئی وجود نہیں اس لیے سالک کو اگر خدا کی جستجو کرنی ہے تو اس عالم سے پرے اسکی جستجو کرنا بے معنی ہے۔ ابن العربیؒ کے بقول وحدۃ الوجود ہی حقیقتِ اسلام ہے اور اس بارے میں وہ قرآنی آیات کریمہ اور احادیثِ مقدّس سے اپنے نظریہ کو تقویت دیتے ہیں[1]

ان کے اس نظریہ نے بعد کے صوفیا اور خود اپنے زمانے کے علماء اور مفکّرین کو سخت متاثّر کیا اور یہ نظریہ بحث و مباحث کا پورے عالم اسلام میں اہم ترین موضوع بن گیا صوفیا نے اسے کیمیا سمجھ کر اپنایا اور صوفی شعراء نے اسے مبالغہ آمیز صورتوں میں پیش کیا اور اس طرزِ عمل سے اسلام کی حقیقی روح کو سخت صدمہ پہنچا۔ گویا ابن العربیؒ کے اس نظریہ کے دُنیوی حیثیت کو ترک کرنے کے درس نے مسلمانوں کو عملی زندگی سے بیزار کر دیا اور اس بے حسی اور خواب آور غیر اسلامی فلسفہ اور نظریہ کے خلاف بالآخر آواز اُٹھی۔ امام ابن تیمیہؒ (وفات ۷۲۸ھ) نے اس کی سخت تنقید کی اور فی ابطال وحدۃ الوجود کے نام سے رسالہ لکھ کر ابن عربیؒ کے نظریہ کو عالمانہ دلائل سے رد کر دیا۔ ان کے بعد ابن خلدون (وفات ۸۰۸ھ) علامہ ابن حجر العسقلانی (وفات ۸۵۲ھ) ابراہیم البقاعی (وفات ۸۵۸ھ) نے بھی اس نظریہ کو ایک بے حقیقت نظریہ ثابت کیا۔ ہندوپاکستان کے برصغیر میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۱۰۳۴ھ) نے ابن العربیؒ کے نظریۂ وحدۃ الوجود کو غلط ثابت کیا۔

ابن العربیؒ نے وحدۃ الوجود کی بنیاد پر انسانِ کامل کی اصطلاح کو وجود میں لا کر اس کی مطلق اکملیت کا اعلان کر دیا[2] ابن العربیؒ نے بعض احادیث مثلاً: اَوَّلَ مَا

---

[1] جیسے: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قرآن) خلق الآدم علیٰ صورتہ (حدیث — آدم کو اپنی ہی صورت پر پیدا کیا) مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (حدیث جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا)

[2] صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ انسان کی رُوح خدا نے خود اس میں پھونکی ہے اس لیے یہ ربّانی عطیہ ہے اور انسان اس دنیا میں ریاضت
(باقی آگے صفحہ پر)

خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِی (اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا) اور لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک (اگر آپ نہ ہوتے یا رسول اللہ! تو میں ہرگز آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) کی روشنی میں کہا کہ کائنات کو پیدا کیے جانے کی وجہ حقیقت محمدیہ ہے صلے اللہ علیہ وسلم، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں میں افضل، اشرف اور اکمل ہیں اسی طرح ساری کائنات میں انسان ہی اکمل اور اشرف مخلوق ہے، دراصل رسولِ اکرمؐ ہی مکمل اور انسان کامل ہیں لیکن دوسروں کو بھی آپؐ ہی کے فیض و رحمت اور برکت سے یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔ حقیقتِ محمدیہؐ ہی حقیقتُ الحقایق ہے اور اس کا مکمل ترین ظہور انسانِ کامل میں ہوتا ہے۔ لے

انسانِ کامل مظہرِ حقیقت ہے۔ وہ کائنات کا نچوڑ ہے، موجودات کا خلاصہ ہے جس کی ذات میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ منعکس ہوتی ہیں، حقیقت محمدیہؐ جس طرح کائنات کی تخلیقی حقیقت ہے اُسی طرح انسانِ کامل بھی کائنات کی تخلیق کی علت ہے، چنانچہ یہ حدیث قدسی کہ: کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں ایک خزانہ تھا چھپا ہوا۔ پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، تب میں نے مخلوق کو پیدا کیا)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور مجاہدے کی راہ سے اللہ کی ذات کے ساتھ متّحد و متّصل ہو سکتا ہے اور مجاہدہ سے مکاشفہ تک پہنچ سکتا ہے اور انسانِ کامل کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی بنیاد حضرت بایزید بسطامیؒ اور حسین ابن منصور حلاجؒ کے زمانے میں پڑ چکی تھی اور سبحانی ما اعظم شانی اور انا الحق کا دعویٰ کر کے انھوں نے پورے یقین سے ثابت کیا تھا کہ روحانی طور پر انسان بھی اللہ تعالیٰ سے اتحاد اور اتصال پیدا کر کے اس مرتبے تک پہنچ سکتا ہے، جہاں انسان کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا بن جاتی ہے لیکن اس اکملیت و کاملیت کا انسانِ کامل کی اصطلاح میں سب سے پہلے ابن عربیؒ نے ذکر کیا ہے اور بعد میں عبدالکریم الجیلیؒ (وفات ۸۳۲ھ) نے اس کے بارے میں انسانِ کامل نام کی ایک مفصّل کتاب لکھی۔ ملاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم صفحہ ۵۱۰، مِٹافزیکس آف رومی مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم، صوفی اِزم مؤلفہ آربری۔

لے دیکھیے صوفی اِزم مؤلفہ آربری چھاپ لنڈن ۱۹۵۰ء۔

ابن العربیؒ کے بقول چونکہ صرف انسانِ کامل ہی حقیقی معنوں میں اللہ کو پہچانتا اور اس سے محبت کرتا اور اُسے دوست رکھتا ہے اس لیے درحقیقت انسانِ کامل ہی کائنات کے وجود کی علّت ہے۔ انسان ہی وہ مخلوق ہے جو ایک آئینہ ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، انسان ہی اللہ کی ذات اور اُس کے صفات کو منعکس کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ خدا بھی اپنی ہستی کو متجلّی اور منعکس کرنے کے لیے اُسی طرح انسان کا محتاج ہے جس طرح ہم اس کے وجود کے محتاج ہیں۔

ابن العربیؒ نے تصوّف کو فلسفیانہ نظریے کی صورت دیدی اور یہ صدی یعنی ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) تصوّف کے عملی اور فلسفیانہ بلکہ علمی ترقی کی صدی تھی اور وحدۃ الوجود اور انسانِ کامل کی مبالغہ آمیز جولانیوں کی وجہ سے اس میں زوال آگیا۔

لیکن اسی تیرھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) میں اسلامی تصوّف کی تاریخ کی ایک عظیم الشان ہستی مولانا جلال الدّین رُومیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق فارسی مثنوی میں تصوّف کے تمام رموز و مسائل پر نہایت روشن بیانی، صراحت اور شرح و تفصیل سے بحث کی اور حیاتِ انسانی کے مسائل پر بھی اپنے نظریات کا اظہار کیا۔ دُنیا کے تمام مفکّرین اس مثنوی سے متاثر ہوئے اور غیر مسلم یورپی مفکّرین بالخصوص دینِ اسلام کی حقیقت اور صحیح تصوّف و عرفانِ الٰہی سے باخبر ہوگئے۔ اسلامی دنیا کے مفکّرین میں حضرت شاہ ہمدانؒ بھی یقیناً مثنوی مولانا روم کے اس نظریہ سے متاثر ہوئے جس میں مولانا روم نے وحدۃ الوجود کے نظریہ سے اختلاف کیا۔ موجودہ صدی میں ہندو پاک برصغیر کے عظیم ترین اسلامی مفکّر حضرت علّامہ اقبالؒ بھی مثنوی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں نے خودی کا نظریہ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔

مولانا رُومؒ کے یہ اشعار اگرچہ نظریۂ وحدۃ الوجود سے ان کے میلان اور رغبت کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

ما چو چنگیم و تو زخمہ می زنی   زاری از ما نی تو زاری می کنی
ما چو نائیم و نوا در ما ز تست   ما چو کوہیم و صدا در ما ز تست

ماکہ باشیم ای تو مارا جانِ جان   تاکہ ما باشیم با تو درمیان
عدمہا ئیم و ہستی ہای ما   تو وجودِ مطلقی فانی نما
باد ما و بودِ ما از دادِ تست   ہستی ما جملہ از ایجادِ تست [1]

(ہم تو بس چنگ کی طرح ہیں اور اس چنگ پر مضراب تم لگا رہے ہو اس لیے اس سے جو آواز نکلتی ہے وہ ہماری آواز نہیں تیری آواز ہے۔ ہم تو بس ایک بانسری کی طرح ہیں اور ہم ہیں آواز تیری دی ہوئی ہے۔ ہم تو پہاڑ کی طرح ہیں جس میں گونج کی آواز ہماری نہیں بلکہ تیری ہے اے جانِ جان! ہماری بساط ہی کیا کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے اپنے ہونے کی بات کریں ہم تو محض معدوم ہیں۔ فانی ہیں وجودِ مطلق تو بس تیرا ہے۔ ہمارا وجود اپنا کہاں، یہ تو تیرا دیا ہوا ہے ہماری ہستی تمہاری تخلیق اور ایجاد ہے، خود ہمارا وجود کہاں؟)

لیکن یہ سب مطلق قدرت اور اس کی رضا، اسکی طاقت و قہّاری، اس کے خدائے متعال اور رفا در برتر ہونے کے مقابلے میں بندہ کی محض عاجزی و افتادگی و محتاجی کا اظہار ہے۔ مولانا رومی وحدۃ الوجود کے فلسفہ یا نظریہ کے مطابق اپنی ذات، اپنی ہستی اور اپنی شخصیت کو وحدتِ الٰہی اور بحرِ یکتائی میں قطرے کی طرح فنا اور نابود کرنے کے قائل نہیں وہ اپنی انسانی عظمت و برتری اور خود کو آزادانہ اور آشکارا طور پر برقرار اور قایم رکھنے کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ (یعنی خدائی اخلاق اپنے اندر پیدا کرو) پر عمل کرنا چاہیئے اور اپنی خودی و عظمت کو استوار تر اور مستحکم تر بنانا چاہیئے۔ انسان کو دُنیا میں باقی رہنا ہے، اپنی اصلی برتری اور شرف مندی کا اظہار کرنا ہے اور تسخیرِ عالم کر کے اللہ کی عظمتوں کو قایم کرنا ہے اور اس کے لیے انسان کو اپنی خودی اور اپنی قیمت و اصلیت کو زندہ رہ کر جاننا ہوگا۔

قیمتِ ہر کالہ می دانی کہ چیست   قیمتِ خود را نہ دانی زاحمقیست
آن اصولِ دین بدانستی تو لیک   بنگر اندر اصلِ خود کو ہست نیک
از اصولیّت اصولِ خویش بہ   کہ بدانی اصلِ خود ای مردِ مہ [2]

---

[1] مثنوی مولانا روم، دفتر اوّل۔ [2] مثنوی، دفتر سوم۔

دہر چیز کی قیمت کو جانتے ہو لیکن کتنی نادانی ہے تیری یہ کہ اپنی قیمت سے ناواقف ہو۔ دین کے اصول کو جان گئے۔ لیکن اب اپنے اندر نگاہ کر کے خود اپنی اصل کو اچھی طرح سے پہچان لو۔ عمومی اصولوں کو جاننے سے بہتر ہے کہ خود اپنے اصل اصول کو اپنی اصلیّت اور حقیقت کو، اے بزرگ مرد! جان لو۔)

مولانا رومؒ اس طرح سے خودی کا تصوّر پیش کرتے ہیں۔ مولانا رومؒ انسان کی انفرادی عظمت اور اس کی خودی کے باقی رہنے اور خودی کو مضبوط بنانے کے مبلّغ تھے، وہ اللہ کی ذات میں فنا یا استغراق کے بارے میں اس بات کے قائل ہیں کہ سورج کے مقابلے میں ستارے ماند پڑ جاتے ہیں لیکن مٹ نہیں جاتے، فنا نہیں ہوتے بلکہ صرف عارضی اور وقتی طور پر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور پھر نورِ آفتاب کی چکا چوند کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ آگ اور آہن، شمع اور سورج کا بھی یہی حال ہے۔

شمع کا نور بھی سورج کے نور کے سامنے واقعی کوئی وجود نہیں رکھتا لیکن بے وجود نہیں ہو جاتا، باقی رہتا ہے اور سرے سے ہی مٹ نہیں جاتا۔ یہی حال لوہے اور آگ کا ہے۔ لوہے کو آگ میں گرم کرنے سے لوہا آگ ہی کی طرح بن جاتا ہے، لیکن اپنے وجود کو بدستور قائم رکھتا ہے۔[1] اسی طرح انسان کی شخصیت، اسکی ذات یا اسکی خودی اور احساس

---

[1] ملاحظہ ہو مثنوی مولانا روم، دفتر دوم، اور دفتر سوم۔

چونکہ سر بر زد ز مشرق قرص خور   نہ ستارہ ماند و نہ از شب اثر
ہم چُنین جویای درگاہِ خدا   چوں خدا آید شود جوینده لا
ہالک آمد پیش وجہش ہست نیست   ہستی اندر نیستی خود طرفہ ایست
اندرین محضر خردہا شد ز دست   چوں قلم اینجا رسید و سر شکست

شمع اور سورج کے بارے میں یہ اشعار:

ہست از روئ بقای ذاتِ اُو   نیست گشتہ وصفِ او در وصف ہو
چون زبانۂ شمع پیش آفتاب   نیست باشد ہست باشد در حساب

(باقی اگلے صفحہ پر)

عظمت باوجود اس کے کہ وہ ربّانی صفات سے مزیّن ہوتا ہے ذاتِ خداوند متعال میں فنا نہیں ہوجاتی بلکہ انسان کا وجود یا خودی اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بالکل الگ رہتی ہے اس لیے انسان کی خودی ایک حقیقت ہے جس کی آدمی کو قدر کرنی چاہیئے اور اس کو پہچان لینا چاہیئے۔

مولانا رُومؒ نے خودی اور عظمت انسانی کے بارے میں یہ خیالات کسی خاص نظریہ کی بنیاد ڈالنے کی نیت سے نہیں کہے بلکہ اُس کے بیکراں بحرِ حیات کے تجربوں کی موجوں میں ایک موج یہ بھی تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہی موج اُن کی وفات کے سات سو سال بعد برصغیر ہند و پاکستان کے چودھویں صدی ہجری کے شہرۂ عالم مفکّرِ اسلام جنابِ ڈاکٹر علّامہ محمد اقبالؒ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مثنوی مولانا رُوم کے غائر مطالعہ کے نتیجے میں ایک مستقل نظریۂ حیات بن جائے گا۔ گویا وحدۃ الوجود کے خواب آور نظریے کے مقابلے میں بلکہ وحدۃ الوجود کے مفلوج کر دینے والے نظریے کے ردِّ عمل کے طور پر (جس وحدۃ الوجود کے مبلّغ اعظم شیخ محی الدّین ابن العربی تھے اور جیسا کہ بیان کیا گیا جس کے بموجب معرفتِ خداوندی کی بنیاد اس بات پر تھی کہ انسان اپنی خودی کو فنا کر کے خدا کی ذات میں گم ہوجائے) مولانا رومؒ نے حرکی اور عملی نظریہ کی بنیاد ڈالی جسے ڈاکٹر اقبالؒ نے اس شان و شوکت کے ساتھ پیش کیا کہ یہ عملی اور حرکی نظریۂ خاص اُن ہی کا ہوگیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہست باشد ذات او تا تو اگر   بر نہی پنبہ بسوزد زان شرر
نیست باشد روشنی نہ دہد ترا   کردہ باشد آفتاب او را فنا

آگ اور لوہے کے بارے میں یہ اشعار:

رنگ آہن محو رنگ آتش است   ز آتشی می لافد و خامش وش است
چون بہ سرخی گشت ہمچون زر کان   پس انا النار است لافش بی زبان
شد ز رنگ و طبع آتش محتشم   گوید او من آتشم من آتشم
آتشم من گر ترا شک است و ظن   آزمون کن دست را بر من بزن
آدمی چون نور گیرد از خدا   ہست مسجود ملائک ز اجتبا

حضرت شاہ ہمدانؒ کا نظریۂ معرفتِ الٰہی بھی بعینہٖ مولانا رُومؒ کا نظریہ تھا۔ عمل اور حرکت کا نظریہ۔ عرفانِ الٰہی کے عظیم رُتبہ تک پہنچنے کے لیے حضرت شاہ ہمدانؒ کا عرفان دنیوی تجلیات و صفات و آیاتِ الٰہی کا بنیادی عرفان تھا۔ آپ نے سات سال کی عمر سے ہی علمی اور دینی اور بعد میں رُوحانی تربیت پاکر آخر عمر تک عمل کو اپنایا۔ گویا اپنی عمر شریف کے ۶۵ سال آپ نے خدا کے لیے خدا کی محبت میں، اور خدا کے اوامر کی تعمیل میں اور قرآن و احادیث اور شریعت اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایک خالص مردِ باعمل کی حیثیت سے گزارے۔

عرفان و تصوّف کی جو منزلیں آپ نے گزاریں اُن کے نتیجے میں اور برگزیدہ صوفیا کی طرح آپ خانقاہ نشین نہیں ہو گئے بلکہ مرشد بزرگوار کی ذاتی تربیت اور راز و نیاز اور رُوحانی اسرار و رُموز کے درس و تدریس سے فراغت کے بعد مُرشد ہی کی خواہش پر آپ کو اللہ کی وسیع دُنیا کو دیکھنے اور اس کی سیاحت کرنے اور آیات و قدرتِ الٰہی کی عظمتوں کا چشم دید مشاہدہ کرنے اور پھر اللہ کے دین حق یعنی اسلام کو جسے اللہ نے خود اپنے لیے پسند کیا ہے، کی حتّی المقدور تبلیغ کرنے کے لیے بھیجدیا گیا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ جب اس مہم پر روانہ ہوئے تب سے آپ اپنی عمر کے آخر تک مسافر مقیم اور مقیم مسافر رہے، چنانچہ آپ کی وفات بھی آپ کے وطن سے باہر اللہ کی راہ میں تبلیغِ دین کی خاطر ہی ہوئی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کا عرفان دُنیا کی وسعتوں میں خالقِ دُنیا کی بے حساب قدرتوں اور اس کی عظیم الشّان نشانیوں اور اُس کی بیکراں صفات کا مشاہدہ کرنے کے نتیجے میں علم اور طریقت دونوں کا امتزاج تھا۔ اس لحاظ سے اُن کا مجموعی عرفان ایک برتر درجہ کا عرفان تھا۔ علم کے لحاظ سے حضرت شاہ ہمدانؒ شریعتِ اسلامی کی پابندی کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کا علم بھی رکھتے تھے اور طریقت کی منزلوں سے گزرنے کے نتیجے میں آپ کی رُوحانی برتری بھی عرفان و معرفتِ الٰہی کا جزوِ لاینفک تھی۔ شریعت اوامرِ دین کی تعمیل ہے اور اس کے نتیجے میں تقویٰ اور تہذیبِ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ طریقت سے عمل میں تقویٰ آجاتا ہے اور طریقت میں پختگی کا درجہ حاصل ہوتا ہے، حضرت شاہ ہمدانؒ نے طریقت کی پختگی کی تحصیل کے نتائج کو محض اپنی ذات کے انتفاع تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اسے کائنات کے اسرار و رموز

کے مطالعہ کے ساتھ مزید پختہ تر بنا دیا۔ اور پھر کلّی نتائج کو سمیٹ کر اپنے علمی مشاہداتی، عرفانی اور دینی تجربات کو حرکت و عمل کے ساتھ استعمال میں لا کر عملی جدّو جہد کے لازوال نقوش اپنے پیچھے چھوڑے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے مشاہداتی عمل میں یقیناً درختوں کے سبز پتّوں کو معرفت کردگار کے دفتر کی صورت میں معائنہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو تاروں اور آسمانوں کی روشنیوں اور وسعتوں کے علاوہ اس زمین کے وسیع غوغا میں بھی دیکھا۔ سرو کے درختوں میں ایستادہ پایا، پھولوں کی رنگ برنگی میں دیکھا، سبزہ پر چھایا ہوا دیکھا، بلبل کے نغموں میں دیکھا، کلیوں کی خاموشی میں پایا، سمندر کی طغیانیوں میں، دریاؤں کے سکون میں، ہواؤں کی روانی، پہاڑوں کے شکوہ، فطرت کی سرمئی صبحوں اور سایہ و روشن شاموں میں ملاحظہ کیا، غروب آفتاب کی دلکشی میں اور چاندنی کی انوار میں پایا۔ نافرمان اور سرکش قوموں کی مٹی ہوئی بستیوں کے آثار و کھنڈرات میں اور اُس کی قہّاری کے عبرت آموز نشانات میں دیکھا۔ زندہ اقوام کے نشیب و فراز میں، افراد کی فقیری و تونگری کی حکمتوں میں، اور جہاں جہاں گئے وہاں وہاں اُس کے وجود مطلق کو پایا۔ اور اس طرح آپ نے عالم طریقت میں اُس وجودِ مطلق کی باطنی دریافت کے بعد اُسے عالم ظاہر میں بھی موجود پایا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ، جیساکہ اوپر بیان ہوا، طریقت کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد ایک زاہد گوشہ نشین نہیں رہے بلکہ ایک زاہد جہان بین ہو گئے، ایک مؤمن مردِ میدان اور عالم باعمل۔ دُنیوی مشاہدات کے نتیجے میں آپ نے عملاً وحدۃ الوجود کا معائنہ کیا، لیکن اس کی اُس مفلوج کر دینے والے تعبیر کے قایل نہیں تھے، جو تعبیر محی الدین ابن العربیؒ نے کر کے رُوح اسلامی میں ایک ناخوشگوار تغیّر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاہ ہمدانؒ کا فلسفۂ وحدۃ الوجود عملی وحدت الوجود کا فلسفہ تھا، بے حسی کا نہیں۔ گرمجوشی، حرکت، جدوجہد اور جوش و خروش کا وحدۃ الوجود تھا۔ قوموں کی تعمیر، قوموں کی تہذیبِ اخلاق، قوموں کی آزادی، سخت کوشی اور کشمکشِ حیات سے نبرد آزما ہونے کا فلسفہ تھا۔

محی الدین ابن العربی نے وحدۃ الوجود کا ذکر اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں کیا ہے،

اور حضرت شاہ ہمدانؒ نے اس کی مختصر شرح حل الفصوص نام کی تحریر کی ہے۔ اور اس میں ابن العربیؒ کے عارفانہ اور اہم مضامین کی بڑی علمی بصیرت کے ساتھ مختصر تفصیل بیان کی ہے لیکن آپ نے وحدۃ الوجود کے اسرار و رموز کو کھولنے کے باوجود بھی عملی دنیا میں اس کی افادیت پر خاموشی اختیار کی ہے بلکہ فصوص الحکم کی اس شرح میں آپ نے انسانِ کامل کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان کامل فقط وہی ہے جو رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ اور اُن کی سنّت کی پیروی سختی کے ساتھ کر کے مرتبۂ اعلیٰ اور درجۂ کمال تک پہنچا ہو۔

حضرت شاہ ہمدانؒ ایک عالم باعمل اور صوفی صافی اور عالم طریقت و عرفان کے ایک برگزیدہ عارف اور ولی اللہ ہونے کے توسط سے عالمِ انسانیت بھی تھے، وہ آدمی کے وجود کو آباد دیکھنا چاہتے تھے، اولادِ آدم کو ہدایت و ارشاد کی راہ پر لانا چاہتے تھے تاکہ آدمی منزلِ مقصود پر پہنچ کر بالآخر سعادت و خوش بختی کی آغوش میں بسر کرے اور میدانِ عمل میں آپ نے اسی غرض سے اپنی دینی اور ایمانی اور رُوحانی فعالیتوں کو نمودار کیا۔ اپنے وطن سے دُور آپ نے بہت سے خارجی ممالک کا سفر کیا اور اللہ کے آثار کا عینی مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے وہاں کے لوگوں میں جہاں جہاں کفر و ظلمت کی حکم فرمائی پائی اُسے مواعظِ حسنہ سے روشنی میں مبدّل کیا۔ جہاں جہاں آپ نے خرافات و اوہام کے نتیجے میں بندگانِ خدا کو ذلّت و بدبختی میں دیکھا وہاں آپ نے ذاتی معاونت اور وسیع النظری کے ساتھ اُنکی جراحتوں کا مداوا کیا۔

دُنیای عمل میں اللہ کے دین کو پھیلانے اور اس طرح سے خود اس کی عظمت کو وسعت دینے کی اس عملی جد و جہد میں آپ نے مجروح انسانیت کی بڑی خدمت انجام دی، جہاں آپ نے حیوانی قوتوں کو انسانی قوّتوں کے مقابل طاقت ور دیکھا وہاں آپ نے اپنی ملکوتی رُوح کی طاقت سے انسانیت کو غالب بنایا اور یہ طاقت آپ نے اس لازوال عشقِ خداوندی سے پائی تھی جس سے آپ دشوار ترین سفروں میں بھی غافل نہیں رہتے تھے، جس جگہ پہنچتے تھے ظاہر اور باطن کے اوامر کی تعمیل کے پابند رہتے تھے یعنی احکام شریعت کی تعمیل میں نماز و روزہ اور باطنی اوامر کی تعمیل میں چلّے کاٹنے اور عبادت خداوندی میں شب بیداری سے

کبھی بھی باز نہ رہے۔ یہی وہ عشق تھا جس نے آپ کو ایک غیر معمولی قوّت عطا کی تھی، یہی وہ جذبۂ الٰہی تھا جس کی وجہ سے آپ دشوار گزار صحراؤں، چٹیل میدانوں، دریاؤں، سخت وخشن پہاڑوں اور سمندروں سے گزر کر لا الہ الا اللہ کی ابدی حقیقت کو اس عالم کے زمان ومکان میں حتی المقدور سعی و کوشش کے ساتھ پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ وہ عشقِ الٰہی تھا جس نے زمان و مکان کے فاصلوں کو توڑ دیا اور اس جنونِ عشق کی برکت سے آپ نے اس پیغامِ سرمدی کے شعلے ہر اس ملک کے لوگوں کے سینوں میں بھڑکائے اور ہزاروں لوگوں کی بے نور آنکھوں کو بینا کر دیا، جہاں ظلمتِ شرک اور کفر کی تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دراصل عشقِ الٰہی کی یہی ایک معجزہ آسا قدرت ہے جو راہِ حق کے مجاہدوں اور بشری اجتماع کے مربّیوں کو تمام اولادِ آدم میں ممتاز بنا دیتی ہے تاکہ اس طرح کے عاشقانِ الٰہی نفس و آفاق سے گزر کر دنیا کو اپنی روحانی روشنی اور انوار کے پرتو اور معنوی فیوض و برکات سے نورانی بنا دیں ؎

گر نورِ عشقِ حق بدل و جانت اوفتد : باللہ کز آفتابِ فلک خوب تر شوی (حافظ)

(اگر اللہ تعالیٰ کے عشق کا نور تمہارے دل و جان پر پرتو افگن ہو جائے، خدا کی قسم آسمان پر چمکتے ہوئے سورج سے بھی بڑھ کر بن جاؤ گے)

حضرت شاہ ہمدانؒ کی عملی جدوجہد نے یہ ثابت کر دیا کہ محض دینی علوم کی تحصیل پڑھنے پڑھانے، اقامتِ نماز، تصوّف و عرفان کی تربیت پانے کے نتیجے میں منزلیں گزارنے کا نام ہی عرفان نہیں بلکہ عرفان یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد اسے مدرسۂ و خانقاہ کی زینت نہ بنا کر اللہ کی کائنات کے ساتھ اسے منطبق کر کے اللہ کے بندوں کے دلوں میں اس کی حقیقت کو اتار کر نوعِ بشر کو کمالِ انسانیت سے آشنا کر دیا جائے، اس کے لیے اللہ کی ذات کے ساتھ کمالِ عشق ہونا چاہیئے جو اُسے اس قابل بنا دے کہ نماز بھی پڑھے تو اللہ کے لیے، قربانی بھی دے تو اللہ کے لیے، زندہ رہے تو اللہ کے لیے اور مرے بھی تو اللہ کے لیے۔

شاہ ہمدانؒ نے عام صوفیوں کے برعکس انزوا اور تن آسانی جو انحطاطِ اجتماع کا

باعث بن سکتا ہے، سے مُنہ موڑ کر انسان کو اوّل اپنے اندر کے اہرمن اور شیطان کو زیر کرنے کے بعد دُنیا میں شیطانی قوّتوں کا قلع قمع کرنے کا درس دیا، اُس کے وہ خود ایک روشن پیکر اور مثالی نمونہ تھے۔ شیطانی طاقتوں سے برسرِ پیکار رہنے سے ہی قوم اندر کی صلاحیتوں کو جگا اور جِلا دے سکتی ہے، اسی سے انسان کی شخصیت میں حُسن و جمال آتا ہے اور یہی کمال انسانیت بھی ہے۔ یہی جہادِ ظاہر اور جہادِ باطن ہے۔ اندر کا شیطان زیر ہو جائے تو یہ جہادِ اکبر ہے، اور اندر سے باہر آ کر عملی دنیا میں شیطان کی حکمفرمائی کو، شیطان کی قوّتوں اور شیطان کے پیرو کاروں کے ساتھ جنگ کر کے اُن کو نابود کر دے یہ جہادِ اصغر ہوگا۔ گویا اس طرح کا مجاہد علمی اور رُوحانی، ظاہری اور باطنی مراحل کو دل کی آنکھوں اور ضمیر کی روشنی سے دریافت کرنے کے بعد اسلام جیسے کامل دین کی سنتّوں، فرائض اور قرآن مجید جیسی عظیم آسمانی کتاب کے رموز و دقائق پر اور فرامینِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ عمل کرتا ہے اور اپنے افکار و عملی جد و جہد کے ساتھ عالم کو مسخّر کرتا ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ کا عرفان جسے آپ نے دنیوی جد و جہد کے ساتھ منطبق کیا ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ایک راستباز صوفی نادانی اور جہالت سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ ایک عارف کے دل میں کائنات کے اسرار و حقایق منکشف اور منعکس ہوتے ہیں۔ تصوّف وحدت و یگانگی کا طرف دار ہوتا ہے۔ صدق و صفا اور صمیمیت کا وفا شعار رفیق ہوتا ہے جو اپنے پیروؤں کو وحدتِ فکر، اتحاد و یگانگت اور اجتماع کو خسارت و ذلّت اور گمراہی و ظلمت سے آزادی کی دعوت دیتا ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے تصوّف و عرفان کی صحیح تربیت پانے کے نتیجے میں قطع نظر اس کے کہ آپ نے ہویٰ و ہوس سے جنگ کی، سخت ریاضتوں کے بازوئے توانا سے نفسانی خواہشات کے پنجوں کو توڑ کے رکھ دیا، اور ایک روشن دل صوفی و عارف کی طرح صحت و استقامت کو متزلزل کرنے والے اور مزاجی اعتدال کو منحرف کر دینے والے تمام امور کو نفس کُشی کی صبر آزما مساعی سے زیر کیا، آپ نے گہرے علمی مطالعات اور مشاہدۂ باطنی سے بلند درجہ اعتدال مزاج اور فکری اعتدال پایا تھا یعنی ظاہر پرست

زاہدوں اور خشک فقیہوں اور ریاکار عالموں، باطنیوں کی افراط گوئی، متکلّموں کی گزاف گوئی، اشعریوں کی غلط بیانیوں اور معتزلہ کی خود ساختہ تعبیروں، فلسفیوں کی پُر گوئی اور تشکیک سے آپ دور رہے، فکر اور عقیدے کی مضبوطی و استواری کے ساتھ نیک افکار کی تلقین کی جن میں نہ تشکیک تھی نہ کوئی تقلید۔ یہ افکار جو آپ کی تعلیمات و تالیفات میں موجود ہیں اخلاق کا بہترین اور رُوحِ انسانی کی پرورش کا بالاترین نمونہ ہیں۔

شاہ ہمدانؒ کے عرفان و تصوّف کی تربیت نے اُن میں سختی سے یہ احساس پیدا کیا کہ آدمی کی بنیادی ناکامیوں اور نامرادیوں کی وجہ وہ تشویش و اضطراب ہے جو اُسے اجتماع میں نشیب و فراز کے وجود سے لاحق ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے عام مفلوک الحال لوگوں کے مُنہ میں زندگی کا شہد کڑوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ آپ نے یہ بھی پالی تھی کہ دراصل آدمی کی نفسانی خواہشات بے حد و حساب ہیں جبکہ اس کی جسمانی قوّت محدود اور زندگی کی سانسیں بھی قابلِ شمار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا تصوّف اہلِ فتوّت کا تصوّف تھا، یعنی اہلِ اخوّت کا تصوّف۔ یہ حضرت شاہ ہمدانؒ کا وہ تصوّف تھا جس کی غرض و غایت مفلوک الحال لوگوں کی جراحتوں پر دستگیری اور لطف و شفقت کا مرہم رکھنا تھا۔ دردمندوں، مسکینوں، محتاجوں کے حق میں بخشندگی اور کارسازی اور افتادہ بیکسوں اور بے سرپرست حاجت مندوں کی مدد کرنا تھا۔ آپ نے یہ تربیت بھی اپنے ہی مرشد بزرگوار سے پائی تھی اور خود آپ اپنے مُریدوں اور ارادت مندوں کو اخی (یا بھائی) کے خطاب سے ہی مخاطب کر کے دینی اخوّت کی تبلیغ کرتے، اور اُن کو بھی اُخوّت و برادری کے اسلامی فریضے کے جذبے سے سرشار کر کے محبّت و شفقت کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بنانے میں کوشاں رہتے تھے، عام محتاج لوگوں کو فتوّت کی برکتوں سے مالا مال کرنے میں شاہ ہمدانؒ کا مقصد ایک حقیقی عارف کی حیثیت سے اُن پر یہ حقیقت آشکارا کرنی تھی کہ کسی شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ ثروت و دولت ہو، اگر موجبِ زحمت نہ ہو، تو بہر حال باطنی دُکھوں کے درد کا مداوا بھی نہیں۔ اپنے پیروؤں کو سمجھانا چاہتے تھے کہ ظاہری علوم و معارف اگر فخر و مباہات کا ذریعہ بن جائیں تو اُن سے دل میں شک و تردّد پیدا ہو سکتا

ہے۔ محض تقلیدی دین داری، تشویش کا باعث بن سکتی ہے، خشک زہد و عبادت، اگر تجارت و گدائی کا ذریعہ بن جائے تو سعادت و سکونِ قلب مِٹ جاتے ہیں، اس لیے عرفان کی عملی صورت یہی ہے کہ بشریت کے درد کی تشخیص پیدا کرنے کی اہلیت پیدا کی جائے اور نیک ترین راہوں سے اس درد کا مداوا کیا جائے، اسی سے سالک کو معنوی اور ظاہری حیات کی لذّت ملے گی اور اُس میں بندگانِ الٰہی کا عشق پیدا ہوگا اور اس راہ سے خدا کا عشق بھی۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے اس طرح سے اپنے عقیدت مند پیرووں میں اُن کی گزشتہ غفلتوں کی وجہ سے کمزور اور سوئی ہوئی قوتوں کو اس طرح کی عملی ریاضتوں سے بھی جگایا اور کام میں لگا دیا اور اس کے نتیجے میں کتنے ہی مفلوک الحال محتاجوں کی دستگیری ہو جانے سے اُن کو حتمی زوال سے نجات مل گئی۔

شاہ ہمدانؒ کے تصوّف و عرفان نے جو ایک اثباتی تصوّف اسلامی تھا عالم اسلام کو یہ درس دیا کہ کمالِ انسانیت کی تنہا راہ حقیقی مسلمانی اور عبودیّت میں ہے۔ شاہ ہمدانؒ نے بتلایا کہ اوامر و احکام شریعت اور اسلامی مستحبات کے نزاکتوں کی پیروی اور معمولی سے معمولی مکروہات و مباحات سے دوری، اور پیرِ رہنما کی ہدایات کی سختی سے اور پابندی کے ساتھ متابعت کی راہ سے ہی طریقت اور شریعت کی رُوح تک پہنچا جا سکتا ہے اور جب یہ عظیم معرفت اور اساسی پہچان حاصل ہو جائے اور سالک اپنے مرشدِ کامل کے آستان پر سرِ تسلیم خم کرے اور اس کے اوامر کو دل و جان سے قبول کر کے ان پر عمل پیرا ہو جائے تو وہ اس کی عالی ہمتی اور بلند تربیت سے مستفید ہو کر آہستہ آہستہ کمال پاتا ہے اور آخر کار کائنات و موجودات کی حقیقتوں اور کائنات کے موجودات کے ساتھ اپنے تعلق کو جانتا اور اس کا ادراک کرتا ہے اور معرفت و عرفان کے مقام پر، جو آفرینش کا منتہائے مقصد ہے سرافراز ہوتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا حضرت شاہ ہمدانؒ جیسے پاکباز و پاک دل صوفی صافی اور عارفِ کامل نے بعض صوفیوں کی طرح مستی اور بے خبری اور اصحابِ سُکر کی طرح بے ہوشی اور زاویہ نشینی کو اختیار نہیں کیا۔ اُن کی جد و جہد سے بھرپور زندگی عمل کے جوش و خروش

سے مالا مال اُن کی مصروفیات، سعی وکوشش سے سرشار اُن کا کردار اور خلاق عالم کی خلقت کے ساتھ اُن کے روابط وقربت پیدا کرنے کے اُن کے عملی عواطف وجذبات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی پاسداری کو شرابِ انگور اور طامات وخرافات سے ماآیاتِ الٰہی اور کائنات میں حقایق قدرت کے مشاہدے اور مطالعہ وزیبا پرستی اور مراقبہ ومکاشفہ کو، پاکوبی اور دست زنی سے بہت دُور سمجھتے تھے یہ عابد پیشہ صوفی کامل ایک ماہر عاشقِ الٰہی تھے اور تجربہ کار سالکِ راہِ عرفان، جنہوں نے اپنی فکری طاقت اور عشق خداوندی کی راہ سے حلاوتِ ذکر کے ہمراہ معشوق کی منزل کو پا لیا تھا۔ شاہ ہمدانؒ نے صبر آزما ریاضتیں کیں، محنتِ شاقّہ والی شب بیداریاں بھی کیں لیکن جسم وتن کو مار نہیں ڈالا۔ یہ محنت ومشقّت، رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذاتی پسند کے ان کے مرشدِ طریقت وشریعت کی ہدایت میں، مشروع ریاضت ومشقت تھی، جس میں عمل اور کوشش وکار کے ساتھ کوئی ٹکراؤ درمیان میں نہیں تھا۔

چلّہ کشی کی حد تک ان مشقّتوں اور ریاضتوں میں زاویہ نشینی بھی تھی اور خلوت گذاری بھی لیکن زندگی کی اور اجتماعی فعالیتوں کا حصّہ قابلِ لحاظ حد تک موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ہمدانؒ مستقبل کی زندگی میں ایک عالم باعمل اور مجاہدِ دینِ اسلام بنے رہے، جنہوں نے جہد وایمان کی بامقصد زندگی گذاری، جنہوں نے اپنے تصوّف وعرفان کے نتائج وثمرات کو احکامِ اسلام اور معارف قرآنی کے ساتھ مطابقت دے کر خدائی دین کی اُن دور ودراز بے دین خطوں میں ترویج کی جہاں خدا کے بندے خدا سے ناشناس تھے۔

شاہ ہمدانؒ کا عرفان یہی تھا اور حق یہ ہے کہ شاہ ہمدانؒ نے لا الٰہ الا اللہ کا حق ادا کر دیا۔

* * *

حضرت شاہ ہمدانؒ کی تعلیمات اُن کے ذاتی تجربات کا خلاصہ ہیں۔ انھوں نے ہمیں بلند اخلاق اور کردار کی عظمت کو اختیار کرنے کی تعلیم دی، اور اس کے لیے حسد، شہوت، غرور، تکبّر، لالچ اور کینہ پروری سے پرہیز کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، رسالہ دہ قاعدہ

ہیں بلند درجات تک پہنچنے کے لیے آپ فرماتے ہیں کہ اپنی خطاؤں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرنا اور اللہ کی راہ میں چلنے کے سلسلے میں تمام رکاوٹوں کو مٹا دینا چاہیئے ۔ لذّتوں اور شہوتوں اور نفسانی خواہشات اور دنیوی علائق کو ترک کر دینا چاہیئے اور اللہ کو محض اللہ کے لیے دوست رکھنا چاہیئے، جنّت کی طلب کے لیے نہیں ۔ اللہ تعالیٰ پر ہی توکّل کرنا چاہیئے وہی مسبّب الاسباب ہے، ایسا کرنے سے اللہ راضی رہتا ہے، قناعت نفسانی آرزوؤں کا توڑ ہے، اس لیے قناعت کو اختیار کرنا چاہیئے۔ نفس پر قابو پانا چاہیئے اور آنکھ اور کان اور زبان کے شَر سے محفوظ رہنا چاہیئے۔ لا الٰہ الاّ اللہ کا ذکر کرنے سے نفس امّارہ کا فساد مٹ جاتا ہے اور دل تاریکیوں سے پاک ہو جاتا ہے، نفسانی اور باطنی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور جمالِ الٰہی کا دیدار ہو جاتا ہے، آدمی حق کی طرف متوجّہ رہے یہی اسکی زندگی کا حاصل ہے، صبر بہت بڑی عبادت ہے یہ تزکیہ و تصفیۂ قلب و روح کے لیے اکسیر ہے اس لیے نفسانی لذّات کو ترک کرنے سے جو صبر کا دوسرا نام ہے، ثبات و استقامت پیدا ہوتی ہے مراقبہ میں مشغول رہے تو آدمی کا مطلب حاصل ہو جاتا ہے اور دلِ مردہ دل زندہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور دل زندہ ہو تو حیاتِ ابدی مل جاتی ہے، اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے کام کرنے سے اللہ خوش ہو جاتا ہے اور سالک بھی ربّانی اوصاف سے متّصف ہو جاتا ہے ۔ اعلیٰ انسانی اخلاق کو اختیار کرنے سے تمام خرابیاں اور بدکرداریاں ختم ہو جاتی ہیں اور اس کے لیے صاحبِ دل اور مردانِ کامل کی ہدایات اور ان کی صحبت پانا لازمی ہے۔

سالک کے سلوک کے بارے میں آپ کی تعلیمات و ہدایات قابلِ غور ہیں، فرماتے ہیں کہ تقویٰ سالک یا صوفی کے لیے بنیادی ضرورت ہے ۔ اور تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ خدائے وُدود کے بغیر دل میں کوئی اور نہ ہو، اس کے بغیر ہر چیز مردود ہو۔ عمل میں سالک کی مساعی ایسی ہوں کہ کسی کو ان کی خبر نہ ہو اور سالک وہی ہے جو دنیوی تعلقات سے بے پروا رہے گا۔

سالک کو ہمیشہ باوضو اور خاموش رہنا چاہیئے، اسے ہمیشہ مرشد کے اوامر کا تابع و مطیع رہنا چاہیئے۔ سالک کے لیے بہتر ہے کہ روزہ سے رہے، کھائے تو اتنا نہ کھائے جو اسکی نیند کا باعث بن جائے لیکن اتنا بھی کم نہ کھائے کہ جسمانی کمزوری اس پر طاری ہو

باطنی تصفیہ اور روحانی تجلیات کے مراحل صرف مرشد کی رہنمائی میں طے ہو سکتے ہیں۔ خلوت میں سالک کو باوضو ہو کر قبلہ رخ بیٹھنا چاہیئے اور مرشد کے ارشادات کے مطابق اوراد و وظائف اور ذکر و اذکار میں سرگرم رہنا چاہیئے۔ خلوت کا حجرہ تنگ و تاریک ہو اور دنیوی روابط کے راستوں سے دور۔ سالک خالص حاجت بشری کے رفع کے لیے یا وضو اور نماز باجماعت میں شریک ہونے کے لیے باہر آجائے اور اس حالت میں عاجزی سے سر جھکا کر چلے، کسی کی طرف نظریں اٹھا اٹھا کر نہ چلے اور لوٹ کر براہِ راست خلوت خانہ میں چلا جائے۔ خلوت میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ذکر کرتا رہے اور یوں کہ تمام اعضا میں اس کی لذت سرائیت کر جائے اور سارے اعضاء اس ذکر میں شریک ہو جائیں۔

خلاصۃ المناقب[1] میں درج ہے کہ نور الدین جعفر بدخشیؒ صاحب خلاصۃ المناقب نے حضرت شاہ ہمدانؒ سے استفسار کیا کہ حضور کیا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: اللہ کہنا عینِ اللہ کو دیکھنا یا آنکھوں سے خون بہانا یا پانی بہانا یا تکلف کے ساتھ وجد پیدا کرنا، کیونکہ

---

[1] یہ قبلاً بیان ہو چکا ہے کہ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی شاہ ہمدانؒ کی تربیت و ارشاد اور روحانی مراتب اور آپ کی ماموریت اور سفر و حضر میں آپ کی دینی عملیات اور مصروفیات کے بارے میں ابھی تک خلاصۃ المناقب ہی قدرے مفصّل اور جامع اور اہم کتاب ہے جس کی قدر و قیمت مطالب کے لحاظ سے (اور اس زمانے کے طرز انشاء اور اسلوب کے لحاظ سے تھی) قابلِ ملاحظہ ہے، مصنّف نور الدّین جعفر بدخشیؒ خود حضرت شاہ ہمدانؒ کے تربیت یافتہ خلیفہ تھے اور ان کے ساتھ بہت عرصہ گزار کر خود ایک صاحبِ کمال بزرگ بن گئے۔ نور الدین جعفرؒ نے اس اہم کتاب میں کہیں بھی فرطِ عقیدت میں نہ اپنے مرشدِ بزرگوار کے بارے میں عجیب و غریب ریاضتوں کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی ناقابلِ یقین کرامتوں کا جیسا کہ بعض مریدوں نے اپنے مرشد کے بارے میں کیا ہے۔ جو کچھ بھی آپ نے حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں لکھا ہے، وہ عینی مشاہدے اور ذاتی تربیت کے تجربات کے حوالے سے لکھا ہے جس میں نہ لااُبالی پن ہے اور نہ ہی مبالغہ آرائی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سادہ و صدق و صفا پر مبنی (باقی اگلے صفحہ پر)

اگرچہ وجد نہ ہو تو پھر صدق و اخلاص کے ساتھ عادت پیدا کرنے کی راہ سے اللہ تعالیٰ اسکے گمان کو راستی میں بدل دے گا۔ ایک بار نورالدین جعفرؒ نے پھر استفسار کیا کہ اسمِ اعظم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ! میں نے عرض کیا کہ مجھ فقیر پر ظاہر ہو گیا ہے کہ اسمِ اعظم بِسمِ اللہ ہے، فرمایا، ہاں دونوں آپس میں متحد ہیں۔ نورالدین جعفرؒ نے ایک بار حضرت شاہ ہمدانؒ سے سُنا کہ سرّ روح سے پاکیزہ تر ہے اور روح سرّ سے شریف تر کیونکہ سرّ کا قیام روح سے ہے۔

نیز یہ بھی ان کی زبانِ مبارک سے سُنا کہ اگرچہ سالک قوی بھی ہو گا جب بھی دو یا تین ساعت سے زیادہ طاقت نہیں لا سکتا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے اجمال کے ساتھ تمام تجلیات کا ذکر اس نظم میں کیا ہے ؎

از کنارِ خویش می یابم و مادم بوی یار　　زان همی گیرم بہ ہردم خویشتن را در کنار
چون کنارم را میانی نیست پیدا ہر زمان　　در میان خونِ دل جانم غمش گیرد کنار[1]
چون میانش را کناری نیست زان در حیرتم　　کانچنانِ نازک میانی نیست دایم بی کنار[2]
نی میانش را کناری نی کنارم را میان　　و ز میان[3] آتشِ عشقش نمی یابم کنار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
بیان میں بعد کے آنے والے عقید تمندوں نے اپنی دماغی تولیدات کا کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ روحانی کمالات کے پیشِ نظر نورالدین جعفرؒ نے حضرت شاہ ہمدانؒ کی جن کرامتوں کا ذکر کیا ہے وہ اسی وجہ سے حق ہیں۔ اور خود یاور بھی۔ ان کرامتوں کا ذکر قبلاً شروع میں ہو چکا ہے۔

[1،2] مطبوعہ چہل اسرار میں یہ شعر یوں درج ہیں:

چون کنارم را میانی نیست پیدا ہر زمان　　در میانِ خونِ دل جانم همی گیرد کنار
چون کنارم را میانی نیست زان در حیرتم　　کانچنان نازک میانی ہست دائم در کنار

[3] چھاپی نسخوں میں درمیان درج ہے۔

بر کنار راست آنکہ سودای میانش در سر است وز میان[1] آن خورد بر گر شود خود بر کنار
نیست کس را از میانش جز کنارا اندر دو کون از میان این چنین دولت کسی جوید کنار
از کنارش[2] گر علی بوئے میانش یافتی در خیال آن میان از خویش گشتی بر کنار

پہلے کنار سے مراد ہے دل اور دوسرے کنار سے مراد ہے مراقبہ اور پہلے میان سے مراد ہے وجودِ مطلق اور دوسرے میان سے مراد ہے تجدّدِ صفات اور مراقبہ پر ثابت رہنا۔ بوی سے مراد ہے ربّانی نفحات جیسا کہ اس حدیثِ مبارکہ میں ذکر ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اِن لِرَبِّکُمْ فِی اَیَّامِ دھرِکم نفحات الا فتعرضوا لھا۔ (یعنی) بیشک تمھارے زمانے کے ایّام میں تمھارے پروردگار کی ربّانی تجلّیاں ہوتی ہیں، خبردار ہو جایئے اور مراقبہ و توجہ کو لازم بنایئے، ان تجلّیات کو پانے کے لیے۔ اور یار سے مراد ہے پروردگار کیونکہ رفیقِ اعلیٰ وہی ہے۔[3]

حضرت شاہ ہمدان رح نے فرمایا کہ ایک بار مجھ پر حال طاری ہوا اور اسی کیفیت میں میں نے امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ سے سُنا کہ فرمایا جب فیض دینے اور فیض لینے یعنی افاضہ اور استفاضہ کی صفت کمال تک پہنچ جائے تو جلال و جمال سے فارغ ہو جاؤ گے۔ ؎

درویش نہ این است نہ آن است نہ اوست بر نقشِ طرازِ او نہ پشت است نہ رُوست
خطی است میانِ ظلمت و نُور بہم کو را نہ سر و پای نہ رنگ است و نہ بوست[4]

مولانا نورالدین جعفر بدخشی رح نے لکھا ہے کہ واردات نامی رسالہ میں حضرت شاہ ہمدان رح فرماتے ہیں، قضا و قدر کے خازنوں نے جب عطا و بخشش کا دستر خوان پھیلا دیا تو اس پر ہر آنے والے کے لیے اس کے لائق لقمہ و نوالہ رکھا گیا۔ خرقانی رح[5] اس دستر خوان

---

[1] چھاپی نسخوں میں از میان درج ہے [2] چھاپی نسخوں میں از میانش آیا ہے۔ [3] ملاحظہ ہو خلاصۃ المناقب۔ [4] خلاصۃ المناقب۔ [5] حضرت علی ابن احمد خرقانی رح جو ابوالحسن خرقانی رح کے نام سے مشہور ہیں۔ مشایخ طریقت میں بڑے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی رح کو آپ سے بے حد عقیدت و محبت تھی، ابوسعید ابوالخیر رح ایک بار خود آپ سے ملنے خرقان گئے اور اپنا قائم مقام بنایا۔ سال ۳۴۸ھ میں قصبہ بسطام کے موضع خرقان میں متولد ہوئے اور سال ۴۲۵ھ میں وفات پائی۔

پروردہ پایا اور ہمدانیؔ نے خزانہ جو عقل وفہم سے بالاتر ہے

خلوت گزینی میں آپ کی مزید تعلیمات اور شیخ جنید بغدادیؒ سے منقول (بقول صاحب خلاصۃ المناقب) ولایت خاص کے لیے اعمال واقوالِ رسولؐ جو موجب ظہور ہیں یوں ہیں :

سالک کو کثافت غیر سے دل کو آئینہ کی طرح پاک وصاف رکھنے کے لیے ہر چیز کی نفی کرنی ہوگی جب ہی وہ محبوب کا عکس اپنے قلب پر پانے میں کامیاب ہوگا۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے آداب میں سے ہے اور قلبی طور پر اپنے مرشد سے شدید رابطہ پیدا کرنا ہوگا۔ یہ آداب یونسؑ میں سے ہے۔ اللہ کے بارے میں فقط اُسی کے مالکِ کل ہونے کے ایمان کو دل میں جگہ دے اور کسی بھی طرح سے اُس کے احکام و اوامر پہ اعتراض نہ کرے اسے راضی برضائے حق کہتے ہیں اور اللہ کی دوامی رضا اسی سے حاصل ہوگی۔

خلوت میں لوگوں سے دُور رہے۔ معمولی رزق سے افطار کرے لیکن ہمیشہ روزہ سے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہمیشہ مستغرق رہے۔ ذکر کرنیوالا اللہ تعالیٰ کا قُرب پانیکی تلاش میں رہتا ہے اس لیے قُرب حق کے آداب کی تعمیل اس پر لازم ہے۔ اُسے دس بار اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ پڑھ کر یا خیر الفاتحین چالیس بار پڑھنا چاہیئے اور پھر سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد یہ دُعا پڑھنی چاہیئے : رَبِّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ وَتَوْفِیْقِ طَاعَتِکَ وَاجْتِنَابِ مَعْصِیَتِکَ یَا رَبِّ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔ وَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ "

پھر اپنے مرشد سے اعانت طلب کرکے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ذکر کرے۔ اپنے سر کو ناف کے برابر جھکا کر لَآ کہے اور دائیں طرف سر اٹھا کر لمبی مدّ کے ساتھ آلہ کہے۔ اِلَّآ کہتے وقت سر کو پھر سے دائیں طرف کو موڑ دے اور لمبا کرکے اللہ کہے۔ سر کا رُخ قلب کی طرف ہونا چاہیئے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ توحیدِ الٰہی میں بھی ظاہر وباطن کے قائل تھے یعنی ان کا نظریہ تھا کہ

توحید کا ظاہر ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر زبان سے کرنا اور باطن حصول معرفت، اور یہ پاکیزگی توکّل، عدل اور توبہ سے پایا جا سکتا ہے۔ خود ان کا بھی الگ ظاہر و باطن ہے۔ پاکیزگی یا طہارت کا ظاہر یہ ہے کہ جسمانی اعضا پاک ہوں اور سالک ہمیشہ باوضو ہو۔ اس کا باطن یہ ہے کہ سالک کا دل دنیوی لذّات و نفسانی خواہشات سے پاک ہو اور اسے ہمیشہ ذکر و اذکار سے پاکیزہ تر بنایا جائے، توکّل کا ظاہر خلوت گزینی ہے اور باطن کا روزہ، خلوت گزینی سے سالک ظاہری وجود کی حیثیت سے سب سے منقطع رہے گا اور روزہ داری سے غذا کی طرف اُس کی توجہ نہیں رہے گی۔ عدل کا ظاہر ہے کہ مُرشد سے دِلی رابطہ رکھے اور باطن یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے۔ توبہ کا ظاہر یہ ہے کہ سکوت اختیار کرے اور باطن یہ کہ ہر چیز سے مُنہ موڑ کر قلب میں فقط یادِ الٰہی کو جاگزین کر دے۔ سکوت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر کسی اور کا ذکر نہ کرے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ نے دُعائے حرزِ یمانی یا دُعائے سیفی کو صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقت میں پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس دُعا کا اثر انہی اوقات میں بیشتر ظاہر ہو جاتا ہے، بدخشان میں اُن کے ایک رفیق شیخ محمد عربؒ نے عرض کیا کہ یا حضرت! میں نے سُنا ہے کہ جو کوئی حرزِ یمانی کو ایک ہزار بار پڑھے گا بشرطیکہ اس کے اول و آخر میں کچھ صدقہ دے تو اُس کے دینی اور دنیاوی حاجتوں کو پورا کرنے کی اللہ تعالیٰ ضمانت دیتا ہے، حضرت شاہ ہمدانؒ نے فرمایا کہ اگر آدمی چالیس بار ہی پڑھے جب بھی کافی ہے بشرطیکہ خلوص کے ساتھ پڑھا جائے۔[1]

صبح کے وقت سالک کے لیے یہ دُعا پڑھنا لازمی ہے: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُشْهِدُكَ وَ اُشْهِدُ مَلٰٓئِكَتَكَ وَاَنْبِيَآئِكَ وَرُسُلِكَ وَجَمِيْعِ خَلْقِكَ بِاَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ، اَللّٰهُمَّ اِنَّ اَحْيَيْتَنِیْ فِیْ هٰذِهِ الْيَوْ..." اور شام کے وقت یہ دُعا: "فِیْ هٰذِهِ اللَّيْلِ فَاَحْيَيْتَنِیْ فِیْ صِحَّةٍ وَعِزَّةٍ

---

[1] خلاصۃ المناقب۔

وَعَافِيَةٍ وَمِنْ كُلِّ بَلِيَّةٍ صُوَرِيَّهٍ وَمَعْنَوِيَّهٍ، وَاَنْ تَوَفَّيْتَنِيْ تَوَفَّنِيْ اِلَيْكَ مُسْلِمًا غَيْرَ مَفْتُوْنٍ، وَاَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ"۔[1]

حضرت شاہ ہمدانؒ نے فرمایا: "اگرچہ طعام کھانے کے بعد بہت سی دُعائیں ہیں جن کو پڑھا جاتا ہے، لیکن یہ بڑی جامع دُعا ہے جو مجھے حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِصَاحِبِ الطَّعَامِ وَلآكِلِيهِ وَلِمَنْ كَانَ سَبَبًا فِيْهِ۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ نِعَمَكَ عَلٰى عِبَادِكَ وَلَا تَنْقُصْهُمْ بِفَضْلِكَ وَجُوْدِكَ وَكَرَمِكَ يَا اَكْرَمَ الْاَكْرَمِيْنَ وَيَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ" اور اگرچہ نام لے کر پڑھنے کی روایت ہے لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسی طرح تعلیم دی ہے۔

رسالہ فتوتیہ میں اخی یا برادر میں کون کون سی صفات ہونی چاہیئے اُن کا ذکر یوں کیا ہے: اخی (بھائی یا برادر) کی اصطلاح کی تعریف کرنے کے بعد یعنی "برادرِ سلوک" کی وضاحت اور فتوّت و جوانمردی اور اس آئین کی اہمیت کی توضیح کے بعد فرماتے ہیں کہ اخی بلند اخلاق کا حامل ہو، پسندیدہ اطوار سے مزیّن ہو، بوڑھوں کا احترام کرتا ہو، جوانوں کے ساتھ پند و نصیحت سے پیش آتا ہو، بچّوں کے ساتھ شفقت سے کمزوروں کے ساتھ رحم سے، مسکینوں کے ساتھ سخاوت و بخشش سے، عالموں کے ساتھ عزّت کے ساتھ اور ظالموں کے ساتھ عداوت کے ساتھ پیش آتا ہو۔

رسالہ درویشیہ میں فرماتے ہیں: اکثر اطاعتیں ایسی ہیں جن کا ضرر بندے کے حق میں گناہوں کے ضرر سے بھی زیادہ ہے اور اکثر گناہ ایسے ہیں جن کے فوائد سالک کے حق میں اطاعت کے فائدوں سے بیشتر ہیں اور یہ حقیقت صاحبِ دل لوگوں کے نزدیک مقرّر ہے کہ ہر وہ اطاعت جو بندے کے غرور و تکبّر کا موجب بن جائے وہ عین گناہ ہے اور ہر وہ گناہ جو طالب کو اعتراف اور عذر و عفو خواہی اور عاجزی و انکساری تک پہنچا دے در حقیقت وہی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو دو مختلف جوہروں سے پیدا کیا ہے، لطیف نورانی

---

[1] رسالہ ذکریہ۔

جوہر سے جو رُوح کہلاتا ہے اور تاریک کثیف جوہر سے جسے جسم کہتے ہیں اور ہر جوہر کو ان ہی دو جوہروں سے غذا، صحت اور بیماری ملتی ہے اور ہر بیماری کے لیے ایک خاص دوا ہے۔ جس طرح سے بدن کی غذا روٹی اور پانی ہے اسی طرح سے دل کی غذا اور رُوح کی غذا اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی محبت و معرفت ہے اور ان جسمانی و روحانی جوہروں کی بیماری کی نشانی یہ ہے کہ غذا ان کی عادت کے برخلاف اِن تک پہنچائی جائے۔ جسم کی بیماری کی علامت یہ ہے کہ فاسد مواد کی وجہ سے غذا سے متنفر ہو جائے اور کھانا کھانے کی رغبت اس میں نہ رہے اسی طرح دل کی بیماری کی نشانی یہ ہے کہ دُنیوی مشاغل اور نفسانی لذات اور جسمانی خواہشات کی وجہ سے ذکر کی شیرینی کی لذت اور اسرارِ معرفت کے ذوق اور محبتِ الٰہی سے محروم ہو جائے، اور ذکرِ حق کی طرف مائل نہ ہو جائے اور اگر کوئی اطاعت کرے بھی یا اللہ کا نام بھی لے تو ایسا کرنا محض رسم و عادت کے سبب سے ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مناجات کرنے کی پاکی اور روح کی روشنیوں سے، جو عنایتِ ازلی کے مخصوص مقربوں اور صدیقوں کی جانوں کے لیے مقرر ہیں، اُسے کوئی حصہ نہیں ملتا۔

اور جس طرح جسم کی بیماری کے اسباب ہیں اور ان اسباب کے ہر سبب کے لیے ایک خاص دوا ہے، جس کی خاصیتوں کے آثار و اثرات سے ماہر طبیب ہی واقف ہیں، اسی طرح سے روح اور دل کی بیماریوں کے اسباب ہیں اور ہر سبب کو دور کرنے کے لیے اطاعات اور اذکار کی اقسام اور عبادات کی اصناف کی روحانی دوائی ہے۔ جس کی حقیقت دین کے حکماء، جو دین کے انبیاء و اولیاء اور مشائخِ طریقت اور علماء ہیں، کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ اور اگرچہ دوائیاں مطلق طور پر دوائیاں ہی ہیں لیکن ہر بیماری کے لیے ایک خاص دوائی ہی فائدہ مند ہوتی ہے اور دوسری دوائی اس کے لیے ضرر رساں ہوتی ہے، اسی طرح اطاعات و عبادات کی قسمیں اگرچہ اطاعت کے لحاظ سے سبھی حق ہی ہیں لیکن ہر شخص کے لیے دل کی بیماری کو دور کرنے کے لیے ایک خاص اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے اور اطاعتوں کی ان اقسام سے جو اس کی حالت کے برعکس ہوں اُسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ضرر ہی پہنچے گا۔ اور اِن باریک نکتوں کے اسرار کو دین کے حکماء، انبیاء اور اولیاء کے بغیر اور

کوئی نہیں جانتا۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کسی پر صفرا غالب آجائے اور وہ اُن دوائیوں سے اس کا علاج کرنا چاہے جو بلغم کے لیے خاص ہوں تو ظاہر ہے وہ ہرگز شفایاب نہیں ہوگا، بلکہ ایسی دواؤں سے تو اس کے صفرا میں اضافہ ہی ہوگا اور وہ ہلاک ہوجائے گا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی قرائت کے ثواب کی عظمت کے باوجود فرمایا کہ اکثر قرآن خوان ایسے ہونگے جن کو قرآن پڑھنے سے سوائے مایوسی اور لعنت و زیان کاری کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ہر چیز کی ایک علامت ہوتی ہے اور صدق طلب کی علامت یہ ہے کہ اپنی قیمت کو پہچاننے کی طرف آدمی متوجہ ہو اور ہر آدمی کی قیمت اس کی ہمت کے مطابق ہوتی ہے اور لوگ اس بارے میں مختلف ہوتے ہیں، عورتوں کی ہمت رنگ و بو، بچوں کی کھیل کود، اہلِ دُنیا کی گفت گو اور اہلِ آخرت کی جستجو اور سالکوں کی صفائی و پاکی کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ آخرت کی رغبت رکھنے والا وہ ہے جو دُنیا کو ترک کر کے آخرت کو ڈھونڈے، طالب وہ ہے جو دونوں کو چھوڑے، سالک وہ ہے جو قربِ الٰہی کی راہ میں ہر طرح کی خواہشات سے مُنہ موڑ لے۔ عارف وہ ہے جو اپنے وجود کی تختی سے اغیار کے نقش کو دھو ڈالے؛

تا بادیۂ درد بیابان نہ بری   از ہیچ طرف راہ بہ درمان نہ بری
تا بر سر نام و کام گامی نہ زنی   بُوئی ز نسیمِ وصلِ جانان نہ بری [1]

ذخیرۃ الملوک میں بدنی اور روحانی تربیت کی تعلیمات کے خیرہ کردینے والے جلوے آدمی کے قلب و روح میں اُتر جاتے ہیں۔ مردم آزاری سے دوری، امر معروف اور نہی منکر، خود بینی و خود پسندی سے دوری، غرور و تکبّر سے فرار، حاجت مندوں مظلوموں اور کمزوروں کی طرف توجہ کرنا اور ان سے ارتباط پیدا کرنا، درخشندہ تعلیمات ہیں اساسی، الہام اور تعلیم و تعلّم کو نماز کی پابندی کے ساتھ ادائیگی سے وابستہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ نماز میں بندہ یوں کھڑا ہو گویا کہ وہ ایک فراری مجرم ہے جو اللہ کی پناہ

---

[1] رسالہ درویشیہ۔

بس آگیا ہے اور یہ اس کی آخری پناہ گاہ ہے اس لیے انتہائی عاجزی و انکساری اور آئینۂ دل کو ہر غیر اللہ سے پاک کر کے اللہ اکبر کہے۔ اللہ اکبر کے ساتھ ہی نفسانی خواہشات کے بتوں کو اس کی عظمت و جلال کی ہیبت سے پاش پاش کرے۔ سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی پاکی اور مطلق قدوسیت کا یقین پیدا کرے۔ اَعُوذُ بِاللہ کہہ کر اپنے نفس کی شیطنت اور آرزوؤں کے شر سے اور نفسانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ کا طلبگار ہو جائے۔

بِسمِ اللہ کہہ کر آئینے کی طرح اللہ کے جلوہ گر ہونے اور اسی کے فیض و برکت سے ہر چیز کے قایم ہونے کا مشاہدہ اور یقین کرے۔ الرَّحمٰن الرَّحیم کہے تو اس کی رحمتوں اور روشنیوں کی برسات کا تماشہ دیکھے۔ الحمدُ لِلّٰہ کہے تو ہر طرف خدائے قادرِ متعال کی جُود و سخا، ربوبیّت اور اس کے الطاف و کرم کو جوش مارتا ہوا مشاہدہ کرے۔ مَالِکِ یَومِ الدِّین کہے تو ہر چیز کو فانی جانے اور صرف اسی کی ذات کو باقی۔ اِیَّاکَ نَعبُدُ کہے تو اللہ کی بندگی کو اپنی خلعت جانے اور اس کے سوا کسی اور کو یاور و مددگار نہ جانے۔ وَ اِیَّاکَ نَستَعِین کہے تو صدق و یقین کے ساتھ سمجھ لے کہ یاری و یاوری کی طاقت اس خدائے غالب کے سوا اور کسی میں نہیں ہے اور سب اسی کے محتاج ہیں۔ اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیم کہے تو نفسانی پستیوں پر فضلِ رحمانی کا غلبہ دیکھے۔ صِرَاطَ الَّذِینَ اَنعَمتَ عَلَیھِم کہہ کر دینی مجاہدوں، متّقیوں اور صالحوں اور خدائی کرامتوں کے صاحبانِ قلب کی راہوں پر چلنے کی تمنّا کرے اور غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیھِم وَلَا الضَّآلِّین کہہ کر یاد کرے اُن بدنصیبوں اور محروموں کو جو خدائی قہر و عتاب کا نشانہ بن کر ہمیشہ کی ذلتوں میں اسیر ہو گئے اور اللہ سے پناہ مانگے[1]

ذخیرۃ الملوک میں تصوف و عرفان اور قلب و رُوح کی بالیدگی کے حاصل کرنے

---

[1] ذخیرۃ الملوک۔ دیکھیے سلطان شرف الدین خضر شاہ کے نام خط جو پکھلی کا بادشاہ تھا، دانش شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی، شاہ ہمدان نمبر صفحہ ۱۶/۱۷۔

کے اطوار و تعلیمات سے قطع نظر عام آدمی کے لیے بصیرت و معرفت کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ اس میں نفسانی تربیت کا طریقۂ کار بھی ہے اور روحانی تربیت حاصل کرنے کے ذرائع بھی صراحت و توضیح کے ساتھ موجود ہیں۔ شاہ ہمدانؒ کی نظر میں اگرچہ تصوّف جس سے اُنکی مُراد تزکیۂ نفس و روح ہے، ہی صحیح تربیت کی راہ سے عرفانِ الٰہی کا زینہ ہے لیکن ان کی تعلیم یہ ہے کہ تصوّف کا خرقہ پہن کر لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر یہ خیال کرنا کہ بس اب منزل پر آ گئے، دراصل گمراہی ہے بلکہ درویش باعمل ہونا چاہیئے اور اسے خود لوگوں میں تزکیۂ نفس پیدا کرنے کی خاطر اُن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چاہیے، اُن میں گھُل مل جانا چاہیئے، اُن کی خدمت کرنی چاہیئے لیکن یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہونا چاہیئے اور اس طرح کی سرگرمیوں میں رہ کر اُسے لحظہ بھر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے۔

ایک مکتوب میں بادشاہ کو جو اعلیٰ انسانی تعلیم دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کو بندگانِ خدا کے ساتھ کتنی محبت تھی اور وہ ایک سلطنت کے سلطانِ قادر کو حاجت مند و وفا شعار رعایا کے ساتھ کن بنیادی حقائق پر حکومت کرنے کی تعلیم دیکر ایک سُلطانِ عادل و شفیق کے وجود سے خوش حال فلاحی سلطنت میں بے فکر رعایا کی آبادی کیسے کسقدر معمور دیکھنا چاہتے تھے، بادشاہ کو لکھتے ہیں:

> ”... جان لو کہ تجھے عمر کے اوقات اور مجموعی ایّام کو، جو محض مہلت و فرصت کے دن ہیں، اُخروی سعادتوں کو حاصل کرنے میں صرف کرنے چاہئیں اور غفلت نہیں برتنی چاہیئے تاکہ ہر سانس میں تمہارا معاملہ حق کے مطابق ہو۔
> اپنے نفس کے ساتھ محاسبہ، جسم کے ساتھ مجاہدہ، دوست کے ساتھ تعاون، ہمسایہ کے ساتھ نیکی، اپنوں کے ساتھ میل جول، رشتہ داروں کے ساتھ رفاقت، بیگانوں کے ساتھ احسان، کمزوروں کے ساتھ مددگاری، بدکاروں سے بیر، ماتحتوں کے ساتھ رحم، یتیموں کے ساتھ شفقت، مسکینوں کے ساتھ محبت، درویشوں کے ساتھ مروّت، دنیا کے ساتھ قناعت، دین میں غیرت، اطاعتِ الٰہی میں ثابت قدمی، نظر میں عبرت،

خاموشی میں غور و فکر، بولنے میں ا.اندازی، حرکت میں نگہبانی، وعدہ کرنے میں وفا، اہلِ حق کے ساتھ الفت و نیک نیتی، نعمتوں پر شکر گزار، مصیبتوں پر صبر کرنے والا، نیکی میں آگے نکل جانے والا اور ایک صاحب فضیلت طلبگار کی طرح سچ بولنے والا ہونا چاہیئے، اور اِن مذکورہ صفتوں کو اپنا فرض جان کر ان پر ہر روز عمل کرنا چاہیئے اور اِن پسندیدہ عادتوں کے زیور سے اپنی پاکیزہ روح کے چہرے کی خوبصورتی کو آراستہ کرنا چاہیئے، اور اِن صفتوں کی خوشبوؤں کی ٹھنڈی ہواؤں اور حلاوتوں کو اپنے بدن کے سارے شہر میں پھیلا دینا چاہیئے۔

تجھے مقرّبانِ الٰہی کے حالات و مقامات اور صدّیقوں کے احوال مثلاً ذکر، فکر، معصیتوں سے کنارہ کشی، خوف، اُمید، غم و اندوہ سے پرہیز، کنارہ کشی، عاجزی، انکساری، پرہیزگاری، پارسائی، اخلاص، توکّل، سپردگی، تسلیم، رضا، صبر، شکر، حیا، صدق، ایثار، قوّت، شگفتگی، عقیدت، یقین، الفت، ذکر، فقر، علم، حکمت، فراست، بصیرت، الہام، اطمینانِ قلب، محبّت، شوق، وجد، غیرت، مروّت، تمکین، توحید، فنا اور بقا وغیرہ کی طرف متوجّہ رہنا چاہیئے اور صاحب دل حضرات کے سینوں کے درجات اور اہلِ کشف و شہود کے بلند مراتب سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔"

کشمیر کے بادشاہ سُلطان قطب الدین شہمیری، جس کے زمانے میں حضرت شاہ ہمدانؒ یہاں تشریف لائے، کے نام پہلی سے جو خط آپ نے لکھا اس میں اُسے کشمیری رعایا پر اس طرح سے حکومت کرنے کی تعلیم دی۔[1]

".... یہ بات چھپی نہیں ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی ذاتی خصوصیات اور استعدادوں کی وجہ سے انسانی نفوس کے طبائع الگ الگ ہیں، قوموں کے اعمال و اقوال مختلف ہیں، اسی طرح بُرے اخلاق مثلاً ظلم و جبر، عداوت، غرور اور حسد

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب دوم صفحہ ۹/۸ مجلہ دانش شاہ ہمدان نمبر، شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی، سرینگر۔

اچھی صفتوں کے مقابلے میں انسانی فطرت میں داخل ہیں۔ لوگوں کے اغراض ومطالب میں بھی اختلاف ہے، اس لیے خدائے عزّ وجل کی حکمت متقاضی ہوئی کہ ایک انصاف پسند حاکم اور بلند مرتبہ اصلاح پسند شخص کے وجود سے آدم کی گوناگوں خصوصیات والی اولاد میں توازن اور برابری قایم کرے تاکہ رُوبرو سچّے احکام کی تلقین کرنے کی قوّت سے وہ دنیوی لوگوں کے اعمال ومشاغل کو نیکی اور راستی کی راہ پر چلائے اور انکی حفاظت کرے اور بلند وبرتر شریعت کے اوامر واحکام کو جاری کرانے میں حتی الامکان سعی کرے، امور کی اصلاح اور اسلامی قوانین کو برقرار کرانے میں خاص وعام میں برابری قایم رکھے اور ملکی قوانین کے اجرا، کرنے سے زبردستوں کے ہاتھوں کو مظلوم لوگوں پر سے کھینچ لے تاکہ ظاہری دنیا کے انتظام اور نظم ونسق کا سلسلہ قایم رہے۔ شریعت کی حدود کے مقدّس مقام میں ظلمت وبدعت داخل نہ ہونے پائیں تاکہ خاص وعام میں حیوانوں اور درندوں کی خصوصیات ظاہر نہ ہوں۔

اس عظیم فرض کو نبھانے کے لیے جن لوگوں کو مخصوص کیا گیا انھوں نے انبیاء اور علماء کی زبان اور عقل وشرع سے ہی راہنمائی کی ہے تاکہ حق کو باطل سے الگ کردیں، نیکی اور فساد میں فرق کریں اور بندگانِ خدا کی خوشنودی اور خوش حالی کے منتظم بن جائیں۔

اس لیے اگر حاکم اور صاحبِ امر، حقوق کی انجام دہی پر قایم رہے گا تو قیامتِ عظیم کے دن وہ خدائے جبّار کے عذاب کے قہر اور گرفتار ہونے کی سختی کی ہیبت سے محفوظ رہے گا۔ ورنہ جزا کی دارالعدالت میں اُسے پوچھ تاچھ کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ لہٰذا حاکم پر اے عزیز! لازم ہے کہ حکومت کے فرائض کی ذمّہ داریوں کی دشواریوں کے بارے میں سوچ لے، اور بندگانِ الٰہی کے حقوق کو ادا کرنے اور ان کے سبھی کام انجام دینے کو آسان نہ جانے اور اللہ تعالیٰ کے راضی یا ناراض ہونے کے نتائج کے اثرات کو حقیر اور

معمولی نہ سمجھے، اور خلفائے راشدین اور نیکو کار سلاطین، اللہ کی رحمت ہو اُن پر، کی سیرت پر غور و خوض کرے، حاکم کو چاہیئے کہ خود کو پسندیدہ روش کی خوبیوں سے الگ اور محروم نہ رکھے، دنیوی نعمتوں کو آخرت کے زیاں کا باعث نہ بنائے، ضعیفوں پر اپنی شفقت اور رحمت کو تنگ نہ بنائے، دُنیا کی فانی دولت پر بھروسہ نہ کرے اور قیامت کے دن کی رُسوائی اور گرفتاری کو یاد کرے اور زندگی کی فرصت کے دنوں کو غنیمت جان لے۔ اے عزیز! تم بھی تو بادشاہوں اور حاکموں اور امیروں میں سے ایک ہو، سلامتی ہو راہ ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر۔"

منہاج العارفین نامی رسالہ اگرچہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی تعلیمات کا مجموعی طور پر خلاصہ نہیں ہے لیکن عام لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک سعادت نامہ ہے جس میں دین و دُنیا کی بہبود کی تحصیل کے لیے نہ فقط اِسلامی اجتماع کے لیے بلکہ تمام بندگانِ خدا کے لیے لازوال ہدایات و تعلیمات موجود ہیں۔ لہ

"خبردار! اللہ سے غافل نہ رہو، سب سے نا امید ہو جاؤ تاکہ تیری اُمّید پوری ہو جائے، کسی کو اذیّت مت دو تاکہ خود امن و سلامتی میں رہ سکو، دنیا کے لیے غمزدہ مت ہو تاکہ پریشان نہ رہو، سب سے الگ ہو جاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکو۔ اگر لوگوں کی چیزوں کا طالب ہو تو پھر تم اُن کے غلام ہو۔ لوگوں سے دوری اختیار کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جائے۔ امن و آسائش دینے والا بن تاکہ خود امن و آسائش میں رہ سکو۔ اہلِ دُنیا کی محبّت سے پرہیز کر تاکہ تیرا دل سیاہ نہ بن جائے، سب کی نظروں میں مفلس ہو جا، اگر محبت کا خواہاں ہے۔ اپنے آپ سے طلب کر اگر جوان مرد ہے۔ گرے ہوئے عاجز لوگوا،

لہ ملاحظہ ہو: منہاج العارفین تالیف حضرت شاہ ہمدانؒ۔ میں تذکرۃ الشعرا کشمیر مؤلفہ پیر حسام الدین راشدی (جلد دوم) سے استفادہ کیا ہے، صفحہ ۹۱۷/ ۹۱۵ -

کے یہاں سے گزر رہو تاکہ تم خودگمر نہ جاؤ۔ حکمِ الٰہی سے مُنہ نہ موڑ، تاکہ سرکش نہ بن جاؤ۔ ناتوانوں کو پالو تاکہ تمہیں کوئی دستگیر ملے۔ لوگوں کو انصاف دو تاکہ ظالم نہ بنو۔ وہ کام کرو جو اللہ کو پسند آجائیں۔ جو تم سے بدی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو۔ دُنیا کی فکر کو دور کردو تاکہ پریشان نہ رہو۔ اپنے اختیار کو کسی کونے میں رکھ دو، تاکہ صاحبِ اختیار بن سکو۔ اللہ سے مدد چاہو تاکہ مدد مل جائے۔ اللہ کے سوا کسی پر) بھروسہ نہ کرو تاکہ پشیمان نہ ہو جاؤ۔ کسی بھی چیز پر مغرور نہ ہو تاکہ ہلاک نہ ہو جاؤ۔ فضول گوئی کو تمام آفتوں کا بیج جان لے۔ حق کے ساتھ رہو اگر ابدی خوشی چاہتے ہو۔ کسی کے حرف پر انگلی نہ رکھو، تاکہ لائقِ سزا نہ بن جاؤ۔ دروازے پر حاضر رہو تاکہ تجھ پر دروازے کو کھول دیں۔ صدق دلی کے ساتھ مانگ تاکہ مل جائے۔ سب کے ساتھ نرمی اور محبّت سے پیش آؤ۔ کسی کی نعمتوں پر حسد نہ کرو، تاکہ عافیت پاؤ۔ سب کا بوجھ اُٹھا تاکہ معزز بن سکو۔ اپنے ماتحتوں پر شفقت کر، تاکہ تجھے نجات ملے۔ بدخوئی چھوڑ، تاکہ خوشی تجھ پر کڑوی نہ بن جائے۔ سب کے ساتھ آسانی برتو تاکہ نجات مل جائے۔ ہر کسی کے ساتھ نہ بیٹھ، تاکہ کہیں تباہ و برباد نہ ہو جائے۔ کاروان کے ساتھ چل کیونکہ راہزن بہت ہیں اور دشمن سرگرمِ عمل۔ اپنا بوجھ کسی پر نہ رکھو اگر عزّت چاہتے ہو۔ کسی پر اپنی بڑائی نہ جتلا: تاکہ ذلیل نہ ہو جائے۔ نصیحت سن تاکہ فائدہ ملے۔ کوشش کرو، فائدہ پاؤ گے۔ اللہ کی پناہ میں رہو تاکہ آزادی مل جائے۔ دنیا کے مال و متاع کا خریدار نہ بن تاکہ نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اپنی سانسوں کا لحاظ کر اگر بیدار رہو۔ اللہ کے پاس بھاگ تاکہ تجھے دشمن سے رہائی مل جائے۔ یار کے بغیر رہ تاکہ یار مل جائے۔ بیکس رہو تاکہ باکس بن سکو۔ بیخود ہو جاؤ اگر بیگانگی چاہتے ہو۔ سب کے بغیر رہو تاکہ اللہ کے ساتھ رہ سکو۔ گناہ چھوڑ دو اگر لقمۂ حلال چاہتے ہو۔ کسی سے توقع مت رکھو تاکہ عزّت ملے۔

توفیق اللہ ہی سے آنے پر یقین کرو، تاکہ مغرور نہ ہو جاؤ۔ لذّتوں کو چھوڑ دو اگر لذّت چاہتے ہو۔ مصائب کے تیروں کا نشانہ نہ بنو، اگر دوست ہو۔ اللہ کے سوا کسی کو دوست نہ بنا، تاکہ تھک نہ جائے۔ جب دُنیا داروں کے ساتھ بیٹھو تو دین کو مت بھولو۔ اللہ کے بغیر کچھ اور مت سوچ اگر طلبگار ہے۔ جان پر کھیل جا اگر سچّا ہے۔ حاجتوں کے پورا کرنے کو بڑا کام جان۔ لالچی نہ بن، کہیں ذلیل و خوار نہ ہوجائے۔ احترام کا لحاظ کر تاکہ خود محترم بنے۔ اللہ کو یاد کر، تاکہ تیرا دل سیاہ نہ ہوجائے۔ لوگوں کو اپنے بارے میں امّیدوار بنا دو۔ بزرگوں کی خدمت کر، تاکہ بزرگی مل جائے۔ خود کو اللہ کے حوالے کر دو، تاکہ صاحبِ سامان بن سکو۔ اپنے آپ کی کوئی قدر نہ جان، تاکہ قدر والا بن سکے۔ اپنے آپ کو مت دیکھ (خود بین نہ بن) تاکہ معرفت حاصل ہوجائے۔ خُوش خُو بن جاؤ، تاکہ ہر کسی کے عزیز بن سکو۔ غصّہ کو کھالے تاکہ راحت ملے۔ خود خواہ نہ بن اگر سعادت کا طلبگار ہے۔ خود اپنی ذات کا خیال نہ کر تاکہ خود اپنی ذات ملے۔ اپنے آپ کو رنج میں رکھ تاکہ راحت ملے۔ خود کو گم کر تاکہ تجھے ڈھونڈیں۔ دل کو لالچ سے خالی کر دے تاکہ آسائش مل جائے۔ اللہ کے کام میں رہ تاکہ تیرے کام بن جائیں۔ کسی کے ساتھ دل کو نہ باندھ تاکہ نقصان نہ ہوجائے۔ تنگیوں میں صبر کر تاکہ شادمانی ملے۔ امانت میں خیانت نہ کر۔ اپنے حق میں غلطی نہ کر۔ جہاں کہیں بھی ہو اللہ کو حاضر جان اور گُستاخ نہ بن۔ صاحبِ سعادت حضرات کا دامن پکڑ، اگر سعادت کا طالب ہے۔ اللہ کو دیکھ، تاکہ خود سے فانی ہوجائے۔ دل کو کسی سے نہ لگا تاکہ دھوکے میں نہ رہو۔ کسی کو نہ دیکھو اگر معرفت چاہتے ہو۔ کسی چیز کے طلبگار نہ بنو تاکہ آزاد ہوجاؤ۔ اپنے عیبوں میں اُتر کر دیکھو اگر پختہ کار ہو۔ کاموں میں آہستگی برت لے، تاکہ شیطان تجھ پر فتح نہ پائے۔ دلوں کو پالو تاکہ اللہ کی خوشنودی پالو۔ سخت معاملات میں خود کو مبتلا نہ کر تاکہ خستہ نہ ہوجائے۔ دوسروں کو

اپنے سے بہتر جان تاکہ خودی سے نجات ملے۔ سختی چھوڑ دے، تاکہ سب کا دوست بن سکے۔ معاف کر دو تاکہ تجھے معاف کر دیں۔ ناچار لوگوں کو پالو۔ دوستی بس وہی ہے جو اللہ کے لیے ہو۔ سمندر میں اُتر جا تاکہ ہیرے مل جائیں۔ بیہودگی میں مشغول نہ رہ تاکہ حسرت و افسوس کا سامنا نہ ہو۔ دلوں کو پالو، اگر ہوشیار رہو۔ راستی سے کام لو تاکہ رستگاری ملے۔ رہبر ڈھونڈو اگر راہرو ہو۔ ویرانوں میں رہو اگر عاشق ہو۔ عورتوں کو کہیں پر بھی مردوں پر ثابت نہ جان۔ ایسا سودا کر جس میں سود ہو۔ اُسی دروازے پر سر رکھ ورنہ چلا جا اور گم ہو جا۔ حکمِ الٰہی پر سرِ تسلیم خم کر اگر اس کا بندہ ہے۔ ایسا سودا کر جس میں حق کا نفع ہو۔ اللہ کا شکر بجا لا، اگر دین و دنیا کی نعمت چاہتا ہے۔ صبر کو اپنا لے اگر عافیت چاہتے ہو۔ سب سے کمزور حیلے کو سب سے طاقت ور قوّت جان۔ دل سے طمع کو دور کر لے تاکہ ذلیل نہ ہو جائے۔ لوگوں سے طمع کا خیال ترک کر دو تاکہ محتاج نہ بن جاؤ۔ غلطیوں کے اندازے کے مطابق سزا دو۔ سخت حالت میں بھی خوشی کے ساتھ وعدہ وفا کر۔ غیبت کو پسند نہ کرو تاکہ اللہ تمہارا دشمن نہ بن جائے۔ دنیا کا غم نہ کھا تاکہ تیرا دل تباہ و برباد نہ ہو جائے۔ کل کا غم نہ کر تاکہ تیری اُمید گھٹ جائے۔ انکساری سے کام لے تاکہ بزرگی مل جائے۔ نعمتوں کی قدر کر تاکہ تجھ سے چھین نہ لی جائیں۔ قناعت کر اگر امیری چاہتے ہو۔ اپنی قدر پہچانو تاکہ قدر والا بن سکو۔ کسی کے عیب نہ نکالو تاکہ خود اپنے عیبوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ خلوص نیت کے ساتھ کام کر تاکہ جزا ملے۔ کسی پر گناہ مت ڈالو تاکہ گناہوں میں گھر نہ جاؤ۔ کسی کو حقارت سے نہ دیکھو تاکہ خود ذلیل نہ ہو جاؤ۔ اپنے اچھے اخلاق کو ترک نہ کرو تاکہ صاحبِ قدر بن سکو۔ ایسے کام کر جن سے پشیمانی نہ ہو۔ دوسروں کے کام کر اگر بیکار رہے۔ سوچ سمجھ کر کام کر تاکہ نقصان نہ ہو۔ موت کو یاد کرتا رہ، تاکہ دل دنیا کی طرف رغبت نہ کرے۔ مخول کرنے کا انجام خراب جان لو۔ منّت لے لیکن منّت نہ رکھ۔

مسکین بن جاؤ مقبول ہو جاؤ گے۔ نیکی سوچ تاکہ نیکی ہی نیکی سامنے آئے۔ چغلخور کو اپنے پاس آنے نہ دو۔ نفس کو ثابت نہ جان یہ دروغ گوئی ہے۔ اگر مفلس ہو تو نقد کا بوجھ مت اُٹھا۔ نفس کا لحاظ کرو تاکہ تنگی نہ محسوس ہو۔ وقت کو پہچان لے اگر صرّاف ہے۔ ہمّت بلند رکھ تاکہ قیمت بڑھ جائے۔ نفسانی خواہش کے خلاف کام کر اگر بہادر ہے۔ ہر حال میں باادب بنو تم مقبول ہو جاؤ گے۔ سب کا یار بن، اگر مردِ راہ ہے۔ دوست کو اتنا یاد کرتا رہ کہ خود کو بھول جا۔ سراپا ہمّت بن تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ خدا کو یاد کرنا راحت کا موجب ہے اِسے جان لو۔"

حضرت شاہ ہمدانؒ نے اِن تعلیمات کا جن کا ہم نے اُن کی فقط چند ہی چیدہ تصانیف سے انتخاب کیا ہے اور جو اُن کے تصوّف اور عرفان کی منزلوں نیز ان کے دنیا اور دُنیا کی مخلوقات کے ساتھ نزدیک روابط کے نتیجے میں ہم تک پہنچے ہیں، دراصل ایک بہتر دُنیا کے وجود میں آجانے کے موجبات اور پیشنہادات ہیں۔ ایک ایسی دُنیا جس میں خالق ومخلوق کے درمیان براہِ راست تعلق ہو، جس میں سلطانوں کی سلطنتیں خدائی احکام پر چلیں اور سلطان ورعایا کے درمیان عدل وانصاف برقرار ہو۔ جس میں محبّت و شفقت کی حکمرانی ہو اور ہمدردی، جذبۂ رحم اور مروّت عام ہو۔ جس میں عام لوگوں کی بدخوئی اور سختی خوش خوئی اور نرمی میں تبدیل ہو جائے، جس میں رعایا خود نیکی کی طرف مائل ہو اور وہ لوازم شریعت کے پابند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی تعلیمات عارفوں، متقیوں، صوفیوں سلاطین اور رعایا اور عوام وخواص اور اہلِ دنیا کے لیے الگ الگ ہیں جیسا کہ ہم نے اوپر انہیں بیان کیا۔

ان سادہ مگر قابلِ عمل تعلیمات کی ایک خصوصیت اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا معلّم خود صاحبِ عمل ولی اللہ تھا جنہوں نے ان تعلیمات پر اوّل خود عمل کیا اور پھر اپنے پیروؤں اور رفقائے کار کو گھر گھر اور گاؤں گاؤں مسجدوں اور خانقاہوں میں جا کر ان پر عمل کرنے کی تاکید وتلقین کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے بڑے صاحبِ دل بزرگوں نے

اس عاملِ بینظیر کو اپنا رُوحانی مرشد بھی بنایا اور دُنیا میں دینی خدمات انجام دینے کی راہ میں اپنا راہبر بھی تسلیم کیا۔ شاہ ہمدان رح کی دینی اور رُوحانی عظمت کا اعتراف اُس زمانے کے سلاطین کو بھی تھا اور عوام و خواص کو بھی۔ عام بندگانِ خدا سے محبت کرنے والے اس عظیم انسان نے شاہی درباروں کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا نہیں کیا کیونکہ یہ خود ایک امیرزادہ تھے اور انھوں نے اوّل سے ہی امیری اور درباری جاہ و شوکت کو ٹھکرا دیا اور دُنیوی فقر و مسکنت کو ترجیح دی۔ شاہ ہمدان رح نے اپنی جاں گداز ریاضتوں اور مشقتوں کے نتیجے میں روحانی برتری پاکر ہمیشہ اخلاصِ خدمت، ایثار اور محبت کی روح پیدا کرنے کی تلقین کی اور اُن کی یہ تلقین قلب و رُوح کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھی کیونکہ وہ خود ان اعلیٰ انسانی اخلاقی بلندیوں کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تصوف و عرفان کی دنیا میں آپ کی تعلیمات کی طرح آپ کی شخصیت تنقید سے بالاتر ہے اور بے داغ ہے۔ [1]

---

[1] بعض مشائخ ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے عام ارشاد و ہدایت کے باوجود ملکی اور دُنیوی اغراض کو نہیں چھوڑا۔ میں ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں۔ سیّد محمد نور بخش (۸۶۹ھ) جو نور بخشی طریقہ کے بانی تھے، نے مہدی اور خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا اور تیمور کے بیٹے شاہ رُخ کے عہد میں کئی بار خروج کیا چنانچہ اس نے اپنے نام کا سکہ بھی رائج کیا۔ نویں صدی ہجری میں خاص طور پر درویش اور صوفی لوگ جو فتوح کے نام سے مریدوں اور عقیدت مندوں سے روزی روٹی حاصل کرتے تھے اور خود دیدارِ الٰہی کے شوق کے نام پر خانقاہوں بلکہ گلی کوچوں اور بازاروں میں رقص و سماع کی نمائش کیا کرتے تھے۔ گدائی اور بھیک منگی کو چھوڑ کر سلطنت و حکومت کے خواب دیکھنے لگے۔

ایک شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ بھی مشائخ کبار میں سے تھے جنہوں نے امیری و امارت پر لات مار کر اپنی ساری زندگی اللہ کے لیے گزاری۔ اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام و شریعت کی تعمیل میں گزاری، اللہ کے دینِ حق کی تبلیغ میں گزاری، اللہ کے بندوں کو ہدایت کی راہ دکھانے میں گزاری، اور اللہ کے لیے ہی جیے اور اللہ ہی کے لیے مرے۔

کتاب کے بارے میں

کشمیری مسلمانوں کے محسنِ اعظم حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی شاہ ہمدانؒ کے حیات مقدّس کے حالات، علمی و دینی کمالات، دینی خدمات، عالم اسلام میں ان کے سفروں، تبلیغِ دین حق کی راہ میں ان کے علمی اقدامات، مشقّتوں کی تفصیل پر مشتمل مفصّل تحقیقی کتاب۔

مصنّف نے کتاب ھذا کو ایران، روس، وسط ایشیاء بالخصوص دوشنبہ، سمرقند، تاشقند، بدخشان، ماوراء النہر، حصار، ختلان وغیرہ کے علمی وادبی اور تحقیقی اداروں اور دانشگاہوں میں موجود مختلف کتب اور بعض منتخب دانشوروں، محققوں اور استادوں سے استفادہ کر کے حضرت شاہ ہمدانؒ کے بارے میں وسیع تر اطلاعات یکجا پہنچا کر ایک کارہائے نمایہ انجام دیا ہے۔

دانشوروں، محققوں، اساتذہ، طالب علموں، عام قارئین کے علاوہ مسلمانوں کے لئے بالعموم اور کشمیری مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک نادر تحفہ۔

Publishers
Haji Sheikh Ghulam Mohd. & Sons
Book Sellers & Publishers
Maisuma Bazar Budshah Chowk
Srinagar, Kashmir, Ph.: 0194-2472206

[redacted]

Rs. 750/-